کتابوں کے درمیاں

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

پیش لفظ

حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی

الحمد لله الذی کفی و سلام علی عباده الذین

اصطفیٰ ، أما بعد !

علم کی دولت اور علم کی صلاحیت اللہ تعالیٰ کی بیش بہا نعمت ہے، جو اس نے اپنے بندوں کو عطا فرمائی ہے۔ اس کے یہ بندے جو کہ مخلوق انسانی ہیں، ان نعمتوں کی بنا پر دوسری مخلوقات پر فائق اور زیادہ کارگزار بنے ہیں، جس کی بنا پر بحر و بر پر ان کو اپنے مقاصد کے لئے اپنی کارگزاری سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ علم کی دولت اور علمی صلاحیت ایک سے دوسرے تک منتقل ہوتی ہے اور منتقل ہونے پر قیمتی سرمایہ بن جاتی ہے، جس کی بنا پر انسان برابر آگے بڑھتا اور ترقی کرتا ہے اور اس کا بہت بڑا ذریعہ اللہ تعالیٰ نے قلم کو بنایا ہے۔ یعنی ضبط تحریر میں لاکر آئندہ آنے والوں کو انسان اپنی معلومات اور تجربات سے واقف کراتا ہے اور وہ کتابوں میں محفوظ ہوکر علم کا بحر بیکراں بن جاتا ہے۔ لہٰذا کتابیں انسان کی ترقی کے لئے بہت بڑا ذریعہ ہیں، ان کا مطالعہ اور ان سے اپنی ضرورت کی معلومات اخذ کرنا انسان کو اپنی زندگی بہتر بنانے اور ترقی دینے میں بڑا ممد و معاون بنتا ہے۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر اس کی بھی ضرورت پڑتی ہے کہ واقف اور تجربہ کار لوگ اپنے سے کم واقف لوگوں کے لئے نشاندہی کریں کہ ان کی ضرورت کے لئے کیا کتابیں ہوسکتی ہیں؟ اور خود اپنا تجربہ پیش کریں کہ ان کو کن زیادہ مفید اور کن پسندیدہ کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملا اور ان میں بنیادی طور پر کیا معلومات اور قابل استفادہ مواد ملا؟ یہ کام اساتذہ کے ذریعہ ان کے شاگردوں کے لئے انجام پاتا ہے اور اسی کے ساتھ عام اہل علم کو ان کے زمانہ کے دانشوروں کے ذریعہ سے اس سلسلہ میں رہنمائی ملتی ہے۔

پروفیسر محسن عثمانی ندوی ان ہی دانشوروں میں ہیں، جنھوں نے اپنے حاصل کردہ علم کو دوسروں کو دینے کا اہتمام کیا اور یہ کام صرف زبانی نہیں؛ بلکہ تحریری طور پر بھی انجام دیا، اپنے عہد

کے اہل علم اور دانشوروں کی تصنیف کردہ کتابوں کو جو ان کی نظر میں عام استفادہ کا ذریعہ بن سکتی ہیں، ان کا اچھا تعارف پیش کیا۔ اس سلسلہ میں ان کی نئی کتاب ''کتابوں کے درمیاں'' اشاعت پذیر ہو رہی ہے، اس میں انھوں نے اپنے مطالعہ میں آئی ہوئی اپنے زمانہ کے مصنفین کی فکر انگیز اور زندگی کی راہوں کو روشن کرنے والی کتابوں کا مفید انداز سے تعارف کرایا ہے۔ ان کتابوں کا انھوں نے اولاً مختلف علمی رسائل میں اپنے مقالات کے ذریعہ تعارف کرایا اور اب وہ ان تعارف کردہ کتابوں کے تعارفی مضامین کو ایک کتاب کی صورت میں شائع کر رہے ہیں۔ یہ متنوع اور مختلف علمی حیثیتوں کے حامل افراد کی کتابیں ہیں، ان افراد میں وقت کی بلند اور اعلیٰ فکر کی حامل شخصیتیں بھی ہیں اور مختلف اندازِ فکر کی شخصیتیں بھی ہیں۔ موضوعات میں بھی تنوع ہے اور ان کے اُسلوبِ نگارش میں بھی تنوع ہے اور یہ تنوع لطف وافادہ دونوں کا حامل ہے، ان کے تنوع اور افادیت کے فرق کے لحاظ سے بھی ان کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہے اور افادیت بھی رکھنے والا ہے۔ اُمید ہے کہ قارئین حضرات پسند بھی کریں گے اور فائدہ بھی اُٹھائیں گے۔

اس طرح عزیز گرامی پروفیسر محسن عثمانی ندوی صاحب کی یہ پیشکش اچھی اور قابل قدر ہے اور ان کی علم دوستی اور علمی افادیت کی حامل ہے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور مفید بنائے۔

محمد رابع حسنی ندوی
(دائرہ شاہ علم اللہ، تکیہ کلاں، رائے بریلی)

۱۴ رشعبان ۱۴۳۰ھ
۶ راگست ۲۰۰۹ء

☆ ☆ ☆ ☆

مقدمہ کتاب

فراغتے وکتابے وگوشۂ چمنے

حافظ شیرازی کا یہ مصرعہ ''فراغتے وکتابے وگوشۂ چمنے'' ہراس شخص کے حافظہ کا جز ہے جسے کتابوں سے تعلق ہے۔ مشہور عربی شاعر متنبّی کے شعر کا مصرعہ ہے'' وخير جليس في الزمان كتابٌ''، یعنی زمانہ میں سب سے بہتر ہم نشیں کتاب ہے۔ قلم اور کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ قرآن مجید میں قلم اور کتاب کی قسم کھائی گئی ہے،'' نٓ والقلم ومايسطرون'' آخری پیغمبر پر سب سے پہلی وحی جو آسمان سے نازل ہوئی اس میں پڑھنے کا حکم دیا گیا تھا۔ گویا یہ اُمت، اُمت اِقراء ہے اور کتاب اور قلم سے اس کا رشتہ ناقابل انفکاک ہے، اسے ہر زمانہ میں علم کی خرد افروزی میں اور فکر کی تازہ کاری میں اور عالم ایجاد کی تحیر سامانیوں میں دوسروں کا امام اور پیشوا اور سب سے ممتاز اور فائق تر ہونا چاہئے تھا۔ اسے '' قلم گوید کہ من شاہ جہانم'' سے لاگ اور لگاؤ ہونا چاہئے تھا، صریر خامہ کو اس کے لئے نوائے سروش ہونا چاہئے تھا اور کتاب خانہ کو اس کے لئے دولت خانہ بننا چاہئے تھا۔ اس کی نظر میں چک بک سے زیادہ '' بک'' کی اہمیت ہونی چاہئے تھی، ایک صاحب قلم کی عزت اس کے نزدیک بڑے بڑے صاحب جبروت بادشاہوں سے بڑھ کر ہونی چاہئے تھی۔ بساط ورق اور بساط قلم کے مقابلہ میں مسندِ عیش وتجمل کو ہیچ ہونا چاہئے تھا، ایک شہنشاہ قلم کی عزت ایک اورنگ نشیں صاحب کروفر سلطان سے زیادہ ہونی چاہئے تھی۔ لیکن وائے حسرت ونامرادی کہ مسلمان اب علم سے دور اور تعلیم سے نفور ہیں۔ اب وہ اس زمانہ میں علم میں دوسروں سے کوسوں پیچھے ہیں اور گردِ کارواں بھی نہیں ہیں اور دوسروں کے علم کا کارواں منزل بکنار ہے، یاران تیز گام نے محمل کو جالیا ہے اور ہم ابھی تک محو نالہ جرس کارواں ہیں۔ ہم لذت علم سے ناآشنا اور شوقِ علم سے بیگانہ ہیں اور قعر مذلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ دنیا میں قومیں قلم اور کتاب کے ذریعہ کیسے ترقی کرتی ہیں اس کی ایک مثال جاپان ہے، ۱۸۵۸ء سے پہلے جاپان دنیا کا ایک گمنام ملک تھا تاریخ کے اسٹیج پر بے نام اور گمنام تھا، جاپانیوں نے صرف ایک صدی میں سائنس اور ٹکنالوجی میں مسلسل مطالعہ اور محنت سے

یورپ سے امامت چھین لی اور ان کا ہم مرتبہ بن گیا۔ اب مغربی ممالک کے بازار جاپان کی مصنوعات سے بھر گئے ہیں، جاپان کی آبادی پندرہ کروڑ سے کچھ زیادہ ہے؛ لیکن سال میں وہاں نو کروڑ کتابیں شائع ہوتی ہیں اور ہر جاپانی سال میں کم از کم دس کتابیں ضرور پڑھتا ہے۔

اُردو کا قاری بس نام کا قاری ہوتا ہے، وہ بقول شخصے نوشتۂ دیوار بھی نہیں پڑھتا ہے وہ کتاب کیا پڑھے گا اور اُردو کا مصنف تو بے چارہ اپنی کتاب صرف چند سو شائع کرتا ہے، بالعموم اپنی جیب سے سرمایہ خرچ کرتا ہے یا کسی اُردو اکیڈمی کے جزوی مالی تعاون سے کتاب شائع کرتا ہے اور پھر اپنی کتاب کو دوستوں میں تقسیم کرتا رہتا ہے اور دوست واحباب بھی کتاب مفت قبول کرتے ہیں؛ لیکن چشم احباب بھی منت کش کتاب بننے کے لئے تیار نہیں ہوتی ہے، احباب بھی ہم قافیہ کتاب کو پڑھتے بالکل نہیں ہیں؛ البتہ اس کی عزت افزائی اس طرح کرتے ہیں کہ اسے طاق نسیاں کا گلدستہ بنا دیتے ہیں۔ ایک بزرگ ہوا کرتے تھے جو سرمہ بنایا کرتے تھے اور سرمہ مفت تقسیم کرتے تھے اور اشتہار کے پرچہ پر انھوں نے یہ شعر لکھ رکھا تھا:

سرمہ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا

کچھ پہلے ایک خبر شائع ہوئی تھی کہ آرٹسٹ ایم ایف حسین کی پینٹنگس لندن میں دس ہزار ڈالر میں فروخت ہو گئیں، یہ تو تصویروں کا اعزاز تھا؛ لیکن اُردو کتابوں میں آپ خون دل سے کتنی ہی پینٹنگس کر لیجئے تحریر کی تقدیر میں ایسی کوئی پذیرائی نہیں ملے گی، لوگ اسے سرمہ مفت نظر سمجھ کر قبول تو کر لیں گے؛ لیکن ان کی آنکھیں پڑھ کر مصنف کا احسان قبول نہیں کریں گی۔

یہ شکایت تو نہ پڑھنے کی ہے اور کتاب اور کتاب خانہ سے دور رہنے کی ہے۔ بچوں میں پڑھنے کا ذوق اور علم کا شوق ختم ہوتا جا رہا ہے، ٹی وی سیریل دیکھنے کی عادت بڑھتی جا رہی ہے۔ پہلے تو مطالعہ کا شوق پیدا کرنا بہت اہم ہے اس کے بعد اس تربیت کی بھی ضرورت ہے کہ مطالعہ کو جہاں تک ممکن ہو سکے با مقصد ہونا چاہئے، قاری کو کسی خاص موضوع کو اپنے لئے منتخب کرنا چاہئے اور اس موضوع پر اہم کتابوں کی ببلوگرافی تیار کرنا چاہئے اور موضوع سے متعلق کتابوں کو مطالعہ میں ترجیح دینا چاہئے۔ یہ اس صورت میں ہوگا جب قاری ریسرچ کرنا چاہتا ہے یا کسی خاص موضوع پر اپنا اختصاصی مطالعہ چاہتا ہے اور اگر یہ نہیں ہے تو موضوع کے بجائے مصنف کے اعتبار سے اسے مطالعہ شروع کرنا چاہئے، یعنی جتنے مشہور اہل قلم ہیں ان میں سے ہر ایک کی دو چار کتابیں اسے

پڑھنا چاہیے اور اس کا مطالعہ سفر اور حضر میں بلا انقطاع جاری رہنا چاہیئے، مطالعہ کے دوران اس کے پاس نوٹ بک ہونی چاہیئے، جس میں خاص باتیں اور خاص عبارتیں جن سے وہ متاثر ہوا ہے نقل کر سکے، مطالعہ کے دوران اسے غور وفکر اور تدبر کی عادت بھی ڈالنی چاہیئے۔ علمی موضوعات اور مسائل کو ہضم کرنے کی پہچان یہ ہے کہ قاری ان موضوعات کو اپنی گفتگو کا موضوع بھی بنائے اور ان کے بارے میں اپنی رائے پیش کر سکے، ایسی رائے جو دوسروں کی آراء کے مطالعہ اور غور وفکر کے نتیجہ میں بنی ہو۔ انسانی کلام دراصل فکر کی دیگ کے چاول کی حیثیت رکھتا ہے، اگر انسان کی گفتگو علم کی خوشبو سے خالی ہے اگر وہ علمی اور فکری مسائل کو تبادلہ خیال کا موضوع نہیں بناتا ہے تو یہ علمی اعتبار سے انسان کے کھوکھلے پن کی علامت ہوتی ہے۔ انسانی گفتگو ایک پیمانہ ہے جس کے ذریعہ انسان کے جغرافیہ علم کا اور مرتبہ فکر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، انسانی علم کا اندازہ صرف گفتگو اور تحریر سے ہوتا ہے، یہ نہ ڈگری سے ہوسکتا ہے اور نہ کسی منصب سے۔ ڈگری تو ایک بار مل جاتی ہے؛ لیکن علم کا درجہ حرارت ہر روز گھٹتا اور بڑھتا ہے، نہ پڑھنے اور کتابوں سے تعلق نہ رکھنے کی وجہ سے ایک سند یافتہ شخص بھی جہالت کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔

انسان کے علمی ذوق اور طالب علمانہ شوق کی پہچان یہ ہے کہ کتابوں کی حیثیت اس کے نزدیک تمام سامان آرائش اور آسائش سے بڑھ کر ہو۔ معروف اسکالر بیرونی کی نگاہ کبھی کتاب سے ہٹی نہیں اور اس کی زندگی میں دو راتوں کے سوا کوئی رات ایسی نہیں گذری جس میں اس نے کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا ہو۔ کارل مارکس نے جس زمانہ میں اپنی انقلابی کتاب داس کیپیٹل لکھی تھی، وہ پہلا شخص ہوتا تھا جو لندن کی لائبریری میں داخل ہوتا تھا اور سب سے آخر میں وہ باہر نکلتا تھا اور ایک بار تو یہ واقعہ پیش آیا کہ لائبریری کا ملازم سر شام باہر سے دروازہ بند کر کے چلا گیا اسے معلوم نہیں تھا کہ کارل مارکس ابھی لائبریری میں مطالعہ میں مشغول ہے اس نے دوسری صبح لائبریری کھولی تو اس نے دیکھا کہ مارکس کتاب کے مطالعہ میں ڈوبا ہوا ہے اور اس کے استغراق کا عالم یہ تھا کہ رات کے گذر جانے کی بھی اس کو خبر نہیں ہوسکی۔ ارسطو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ رات کے وقت اپنے ایک ہاتھ میں کتاب اور دوسرے ہاتھ میں پتھر رکھتا اور جب نیند کا جھونکا آتا اور پتھر ہاتھ سے نیچے رکھی ہوئی پیتل کی تھالی میں گر جاتا تو وہ اس آواز سے چونک جاتا اور غنودگی کو ختم کر کے پھر سے پڑھنا شروع کر دیتا۔ معلوم ہوا کہ جو شخص نیند کا مقابلہ نہیں کر سکے وہ اسکالر نہیں بن سکتا، میکالے مسلسل پانچ پانچ دن تک پڑھنے کا عادی تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک استاد تھے پروفیسر حبیب،

انھوں نے بغیر سوئے ہوئے مسلسل تیرہ دن پڑھنے کا ریکارڈ قائم کیا تھا۔ انسان کا دانشورانہ مزاج کبھی کبھی کسی ماحول میں کتاب پڑھ لینے سے نہیں بنتا ہے، علمی ذوق کا مطلب یہ ہے کہ ہر حالت میں، صحت اور بیماری میں، حالتِ اقامت میں اور حالتِ مسافرت میں، کتابوں کے مطالعہ کا سفر جاری رہے۔

مطالعہ دراصل دوسروں کے تجربات سے استفادہ کا اور تاریخ کی برگزیدہ شخصیتوں سے ملاقات اور ان کی گفتگو سننے کا نام ہے۔ سوانح عمریوں سے اور خاص طور پر خودنوشت سوانح سے اور سفرناموں سے ایک قاری بہت کارآمد معلومات حاصل کرسکتا ہے، کتابوں کے مطالعہ سے انسان کو اپنی کوتاہیوں کا اور کمزوریوں کا احساس ہوتا ہے، جسے وہ دور کرنے کی کوشش کرتا ہے، کتابوں کے مطالعہ سے انسان کے شعور میں پختگی پیدا ہوتی ہے، کتابوں کے مطالعہ سے انسان میں اچھے اور برے کی پرکھ اور تنقید کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، کتابوں کی مطالعہ سے انسان میں فنی تخلیق کی استعداد پیدا ہوسکتی ہے، کتابوں کے مطالعہ سے انسان حیات اور کائنات کے مسائل کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے، کتابوں کے مطالعہ سے انسان آفاق وانفس کی نشانیوں کو بہتر طور پر جان سکتا ہے، اس سے وہ اپنے علم میں اضافہ کرتا ہے اور علم کے اظہار کے مؤثر طریقے دریافت کرتا ہے اور حیوانِ ناطق کے درجہ سے نکل کر حیوانِ ناطق کے مرتبہ تک پہنچتا ہے۔ ایک انسان جب کتاب خانہ میں داخل ہوتا ہے اور کتابوں سے بھری ہوئی الماریوں کے درمیان کھڑا ہوتا ہے تو دراصل وہ ایسے شہر علم میں کھڑا ہوتا ہے جہاں تاریخ کے ہر دور کے عقلاء اور علماء اور اہل علم اور اہل ادب کی روحیں موجود ہوتی ہیں، اس شہر میں اس کی ملاقات امام غزالیؒ، امام رازیؒ، شکسپیر، برناڈ شا، افلاطون، ارسطو، ابن رشد سے لے کر دورِ جدید کے تمام اہل علم اور اہل قلم سے ہوسکتی ہے۔ کتاب خانہ میں بیٹھ کر شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کا مطالعہ دراصل شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے براہ راست ملاقات اور استفادہ کا بدل ہے، کتاب وہ واسطہ ہے جس کے ذریعہ انسان ''حاضرات'' کے عمل کے بغیر اسلاف کی روحوں سے مل سکتا ہے۔

کتاب مصنف کی شخصیت کی بہت بڑی عکاس ہوتی ہے، مصنف کتاب سے شخصی ملاقات کم اہم ہے، اس کی کتاب کا مطالعہ زیادہ اہم ہے، شخصی ملاقات سے انسان چہرہ کے خد وخال دیکھ سکتا ہے، کتاب کے مطالعہ سے انسان مصنف کتاب کے فکر وخیال کو زیادہ سمجھ سکتا ہے اور انسانی شخصیت میں خد وخال کی اہمیت اتنی نہیں ہے جتنی فکر وخیال کی اہمیت ہے، کتنے مصنف ہیں جن کو

ان کے قریبی رشتہ دار اور شب و روز کے ساتھ رہنے والے بھی پورے طور پر نہیں جانتے ہیں؛ کیوں کہ وہ صرف اس کے اسم سے اور جسم سے واقف ہیں اس کے علم سے واقف نہیں ہیں، اس کے افکار وخیالات سے واقف نہیں ہیں۔ شخصیت کی تشکیل میں سب سے اہم چیز افکار وخیالات اور ان کا طریق اظہار ہے دور جاہلیت کے ایک عربی شاعر نے کتنی سچی اور اچھی بات کہی ہے:

لسان الفتی نصف ونصف فؤادہ

ولم یبق الا صورۃ اللحم والدم

یعنی انسانی شخصیت میں آدھی چیز زبان یعنی طریق اظہار ہے باقی نصف حصہ اس کا دل یعنی اس کے افکار وخیالات ہوتے ہیں، اس کے بعد گوشت و پوست اور خون کے سوا کچھ باقی نہیں رہ جاتا ہے۔

کتابوں کے لئے عربی زبان کی ایک تعبیر ''بنات افکار'' ہے، یعنی کتابوں کو معنوی اولاد سے تعبیر کیا جاتا ہے، نسبی اولاد سے کم ان کی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔ جس طرح ایک حدیث نبوی کی رو سے سعادت مند اولاد کی ذمہ داری ہے کہ والدین کے مرنے کے بعد ان کے حلقہ تعلقات کے لوگوں سے حسن سلوک کرے، اسی طرح بعض ایسے فرزندوں کو دیکھا گیا ہے کہ انھوں نے اپنے والد کے چھوڑے ہوئے نامکمل علمی کاموں کو مکمل کرنے کی کوشش کی اور ان کی کتابوں کی دوبارہ اشاعت کا انتظام کیا کیوں کہ کتابوں کی حیثیت معنوی اولاد کی ہے؛ لیکن ایسے سعادت مند فرزند اب کہاں ہوتے ہیں، اب تو فرزند صرف باپ کی کمائی ہوئی دولت کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، باپ کی علمی دولت وثروت سے اور اس کی لکھی ہوئی کتابوں سے ان کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ہے۔

مطالعہ کے لئے صحیح کتابوں کا انتخاب ضروری ہے، کتابیں سمندر کے مانند ہیں، ضرورت اور ذوق کے مطابق کتابوں کا انتخاب کرنا چاہئے، اس میں کسی صاحب علم اور صاحبِ ذوق کی رہنمائی بھی اشد ضروری ہے، دل کے بارے میں جگر مرادآبادی کا شعر ہے:

کامل رہبر قاتل رہزن

دل سا دوست نہ دل سا دشمن

جگر مرادآبادی نے دل کے بارے میں جو بات کہی ہے وہ کتاب پر اس سے بھی زیادہ صادق ہوتی ہے، کتابیں انسان کو ساحل ہدایت تک پہنچاتی ہیں، کتابیں انسان کو گمراہی کے بھنور میں ڈبوتی بھی ہیں، کتابیں انسان کو گم کردہ راہ بھی بناتی ہیں وہ کامل رہبر بھی ہیں اور قاتل رہزن بھی

ہیں۔

راقم سطور کو بہت سی کتابوں کے پڑھنے کا موقعہ ملا ہے، انگریزی کا یہ مقولہ بالکل درست ہے کہ بعض کتابیں صرف چکھنے، بعض چبانے اور بعض ہضم کرنے کے لئے ہوتی ہیں۔ اس کتاب میں ۵۷ کتابوں کا تذکرہ ہے، یہ سب مفید کتابیں ہیں، یہ وہ کتابیں ہیں جن کے بارے میں کسی سیمینار میں مقالہ پیش کیا گیا یا ان پر مقدمہ لکھا گیا یا ان کے بارے میں تعارف اور تبصرہ قلم سے نکلا اور کہیں شائع ہوا، کتابوں کے بارے میں شائع شدہ مضامین کا یہ مجموعہ ہے جو کتاب سے محبت کرنے والوں کی خدمت میں نذر ہے:

گر قبول افتد زہے عز و شرف

محسن عثمانی ندوی

☆ ☆ ☆ ☆
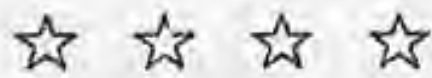
کتابوں کے درمیاں

اسلامیات

قرآن کریم تاریخ انسانیت کا سب سے بڑا معجزہ اور تاریخ تدوین سیرت

۷ ستمبر ۲۰۰۳ء کی شام وہ شامِ ہمایونی تھی اور اس دن کا جشن وہ جشن بہاراں تھا جس میں دو خوبصورت کتابوں کی رسم اجراء تھی، دو روح پرور موضوعات کا قران السعدین تھا، ''قرآن اور سیرت نبوی'' زندگی میں ان ہی دونوں کی حسن آمیزش کا نام سبیل السلام ہے جو حیاتِ انسانی کے لئے سب سے بڑا انعام ہے۔ یہ دونوں موضوعات سدا بہار ہیں ان دونوں کتابوں کے اور ان دونوں سدا بہار اور گلشن بکنار موضوعات کے مصنف بزرگ و عظیم، صاحبِ فکر مستقیم' ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم اور مہبط وحی مکہ معظّمہ میں مقیم، مکہ مکرمہ کی ام القریٰ یونیورسٹی کے معلم قدیم حضرت مولانا عبد اللہ عباس ندوی ہیں۔ قرآن و سیرت کے موضوعات پر ان کے خامہ عنبر شمامہ نے اتنے پھول کھلائے ہیں اور گلوں میں اتنے رنگ بھر دیئے ہیں کہ ان کی نگارشات پر دامان باغباں اور کف گلفروش ہونے کا گماں ہونے لگتا ہے۔ قرآنی موضوعات پر ان کی عربی اُردو اور انگریزی کتابوں کو دیکھئے تو ایک طویل فہرست نظر آتی ہے، ایک کتاب عربی میں قرآن مجید کے ترجموں پر ہے، ایک کتاب تفسیری انحرافات پر ہے، ایک بہت ضخیم قاموس معجم انگریزی زبان میں قرآنی الفاظ پر ہے، اسی طرح ان کی ایک کتاب (Learn the Language of Quran) ہے اور کئی کتابیں ہیں ، ندوۃ العلماء کے بعد اعلیٰ تعلیم انھوں نے یورپ میں لیڈس یونیورسٹی میں حاصل کی اور اقبال کی زبان میں ان کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے:

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانہ سے
شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

لیکن دار العلوم سبیل السلام میں قرآن کریم کے اعجاز کے موضوع پر مولانا کی جس کتاب کی رسم اجراء انجام پائی اس کی حیثیت موتیوں کے ہار میں واسطۃ العقد کی ہے۔ خوش رنگ اور خوش نما

پھولوں کے درمیان گل سرسبد کی ہے یا ستاروں کے جھرمٹ میں چاند کی ہے۔ اس کی حیثیت صرف یہ نہیں ہے کہ حضرت مولانا عبداللہ عباس ندوی کے بافیض قلم گوہر رقم کی اہم ترین کتاب ہے؛ بلکہ اس کی اہمیت اس اعتبار سے ہے کہ اُردو زبان کے ذخیرہ میں یہ بے حد بیش قیمت اضافہ ہے، عربی زبان میں اس بے حد اہم موضوع پر کتابیں موجود ہیں؛ لیکن اُردو زبان کا دامن اپنی گراں مائیگی اور وسعت کے باوصف اور کچھ ترجموں کے باوجود اس موضوع پر باقاعدہ اور باضابطہ تصنیف سے خالی تھا، اب وہ خلا پُر ہو گیا ہے جو اُردو زبان کی ابتدائے آفرینش سے آج تک چلا آرہا تھا۔

یہ کتاب اگرچہ قرآن کے اعجاز کے موضوع پر ہے اور قرآن کی زبان عربی مبین ہے؛ لیکن اس کتاب کی ایک بے حد اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان لوگوں کے لئے بھی بے حد مفید ہے جو عربی زبان سے واقف نہیں اور ان کے لئے بھی نفع بخش ہے جو مدارس عربیہ کے طلباء ہیں یا اساتذہ ہیں۔ اس کتاب میں اقسام القرآن اور امثال القرآن اور دوسرے علوم قرآنی پر بھی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، جس کی وجہ سے کتاب کی اہمیت دو چند ہو گئی ہے، جو لوگ دل سے قرآن مجید کی عظمت کے قائل ہیں اور اس کے معجزہ ہونے پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں، اس کتاب کو پڑھ کر علم و تحقیق کی روشنی میں علی وجہ البصیرۃ قرآن کے اعجاز کے قائل ہو جائیں گے اور معجزہ ہونے کی دلیلیں عقل کی گرفت میں آجائیں گی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے پڑھنے والا قرآن مجید سے تعلق میں اضافہ محسوس کرے گا، قرآن کی تلاوت میں اس کا دل لگنے لگے گا ، کتاب کی کامیابی اور مصنف کتاب کی خوشی اور خوش بختی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ انسان کو اپنے رب کی کتاب سے مربوط کردے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس سعادت میں مصنف کتاب کے ساتھ مولانا محمد رضوان القاسمی بھی شریک و سہیم ہو چکے ہیں، جنھوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ اور بڑے انتظام کے ساتھ یہ کتاب شائع کی اور اس کے لئے جشن منعقد کیا، مولانا عبداللہ عباس ندوی کے قلم کی حسن کاری کے تذکرہ کا یہ محل نہیں، جہاں قرآن کے حسن و جمال کی جلوہ آرائیوں کا موضوع ہو وہاں ایک بندہ کے حسن قلم کا تذکرہ کیسے ممکن ہے۔ لیکن اس بات کو کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ مولانا کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ ان کی تصنیف روح پرور اور نشاط انگیز ہوتی ہے اور ہر قسم کے دعویٰ سے اور تنقید اور تنقیص سے خالی ہوتی ہے، انھوں نے اپنی نگارشات میں ادعائی انداز اور ہیچمدان دیگرے نیست کا اُسلوب اور لن ترانیوں کا رنگ کبھی اختیار نہیں کیا، اخلاص کے ساتھ قرآن اور سیرت پر کام کرنے کا سب سے بڑا فائدہ انھیں اس وقت ملنے والا ہے، جب وہ

قرآن مجید کے نازل کرنے والے اور اپنے رسول کو مبعوث کرنے والے کے پاس جائیں گے، اللہ تعالی ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے اور ان کی کتابوں کی برکتوں کا کچھ حصہ ان کی کتابوں کے مطالعہ کرنے والوں کو بھی عطا فرمائے، آمین۔

مولانا کی کتاب ''قرآن تاریخ انسانیت کا سب سے بڑا معجزہ'' کے ساتھ مولانا کی دوسری کتاب جس کے اجراء اور رونمائی کی رسم انجام دی گئی، وہ ہے ''تاریخ تدوین سیرت''۔

تعلیم یافتہ اُردوداں حلقہ اس سے واقف ہے کہ اُردو زبان کا دامن سیرت پر کتابوں سے مالا مال ہے۔ پہلے سرسید نے خطبات احمدیہ تصنیف کی اور ولیم میور کے اعتراضات کا جواب دیا، اس کے بعد تین سلیمان سامنے آئے شاہ سلیمان پھلواروی، قاضی سلیمان منصور پوری اور سید سلیمان ندوی، تینوں نے میدان سیرت میں عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ بعض اہل علم ان تینوں سلیمانوں کو ملا کر ''سلامنہ ثلاثہ'' کہتے ہیں، مولانا عبداللہ عباس ندوی کو اول الذکر سے خانوادہ نسب وقرابت کی اور مؤخر الذکر سے خانوادہ علم ومعرفت کی نسبت حاصل ہے، مولانا کے خانوادہ نسب و وطن اور خانوادہ علم ومعرفت کے دونوں کے ایک مشترک فرزندِ جلیل شاہ جعفر پھلواروی ندوی ہیں، جنھوں نے اولاً تذکرہ جمیل کے نام سے اور پھر پیغمبر انسانیت کے نام سے منفرد طرز کی سیرت پر کتابیں لکھی، پھر مولانا عبداللہ عباس ندوی کے استاذ اور محترم ومربی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایک سے زیادہ کتابیں سیرت پر موجود ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا علی میاں کی تمام تصنیفات عشق رسول کے عطر سے معطر اور سیرت نبوی کے نور سے منور ہیں۔

رواں ہو برگ گل تر سے جیسے بوئے شمیم

مولانا عبداللہ عباس ندوی کی شخصیت بھی شیشہ محدب کا وہ آتشیں نقطہ ہے جو بے شمار کرنوں کا نقطہ اتصال ہے، سیرت نبوی ﷺ اور اس کے متعلقات پر ان کی کتابیں تسلسل کے ساتھ سامنے آتی رہی ہیں اور اس موضوع پر کام سے ان کا قلم کبھی تھکتا نہیں، بقول شاعر:

شرع محبت میں ہے عشرت منزل حرام

ان کا قلم عشرت منزل سے ناواقف، مسلسل رواں رہتا ہے، ردائے رحمت، عربی زبان کی نعتیہ شاعری، پیغمبر اخلاق وانسانیت سے لے کر تاریخ تدوین سیرت تک ان کا قلم مسلسل چمن سیرت میں خوش رنگ وخوشبودار پھول کھلاتا رہا ہے، اُردو میں تاریخ تدوین قرآنی تفسیر لکھی گئی تھی، تاریخ تدوین حدیث موجود تھی، تاریخ تدوین فقہ پر بھی کام ہو چکا تھا؛ لیکن تاریخ تدوین سیرت پر

باقاعدہ کتاب پہلے موجود نہ تھی۔

زیر تعارف کتاب میں عرب اور علم تاریخ کے نام سے فاضلانہ مقالہ ہے اس مقالہ میں خلافت راشدہ کے بعد سے سیرت و مغازی پر تمام کاموں کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں، سیرت نبوی ﷺ کے مآخذ و مصادر پر عالمانہ روشنی ڈالی گئی ہے، ہر کتاب کی علمی اور تاریخی حیثیت متعین کی گئی ہے، مضامین سیرت کے عنوان کے تحت سیرت پر بے شمار کتابوں کی فہرست دی گئی ہے ان علماء کا نام دیا گیا ہے جنھوں نے اس فن کو نکھارا سنوارا، سیرت پر کتابوں کا غیر مختتم سلسلہ ہے ہر کتاب کا رنگ جدا گانہ، بقول شاعر:

نیا ہے لیجئے جب نام ان کا
بڑی وسعت ہے میری داستاں میں

قرآن مجید اور سیرت طیبہ کے موضوع پر ان دو کتابوں کی تصنیف کے بعد جن کے اجراء کی رسم انجام پائی مولانا عبداللہ عباس ندوی کو زیر لب یہ شعر پڑھنے کا حق حاصل ہوگیا ہے:

حاصل عمر نثارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

اس کتاب کا باب سوم مضامین سیرت کا خصوصی مطالعہ حرز جاں بنا لئے جانے کے لائق ہے، کتاب پر حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کا مقدمہ ہے، آخر میں مولانا محمد رضوان القاسمی کے قلم سے سیرت پر اُردو زبان میں کتابوں کی قیمتی ببلوگرافی ہے۔

ان دونوں کتابوں کی رسم اجراء سے پہلے مولانا عبداللہ عباس ندوی مدظلہ نے بخاری شریف کی آخری حدیث کا طلبہ اور اساتذہ کے سامنے درس دیا، کتابوں کی رسم اجراء کی یادگار محفل میں مولانا حمید الدین عاقل حسامی، مولانا سلیمان سکندر، جناب محترم عبدالرحیم قریشی، جناب عبد اللہ مسقطی، شہر کے دینی مدارس کے اساتذہ اور اہل قلم اور دانشور جمع تھے، یہ دونوں کتابیں دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد نے شائع کی ہیں، کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ اور دیدہ زیب ہے اور ہر صاحب ذوق شخص کے لئے ان کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے۔

اس موقعہ پر علامہ ابن قیمؒ کی کتاب کا اُردو ترجمہ مولانا خورشید انور ندوی استاذ دارالعلوم سبیل السلام کا کیا ہوا ''جنت اور اہل جنت'' کے نام سے شائع ہوا، اس کتاب کی رسم اجراء بھی اسی موقعہ پر انجام پائی، یہ کتاب جنت کا شوق پیدا کرنے کے لئے اکسیر کی حیثیت رکھتی ہے۔

اُمید ہے کہ یہ کتابیں جلد مکتبہ ندویہ، نشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دوسرے مشہور مکتبوں میں بھی دستیاب ہوں گی۔

☆ ☆ ☆ ☆
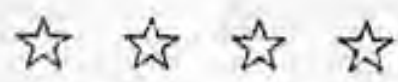
مکرراتِ قرآن — ایک تعارف

یہ عالم رنگ و بو، یہ جہان نور نکہت، یہ کائنات زیب و زینت اللہ بدیع السماوات والارض کی بے مثال تخلیق ہے، اس میں حسن کاری اور دل فریبی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے، خود قرآن مجید میں اس کا کئی جگہ ذکر ہے ''**ولقد زینا السماء الدنیا بمصابیح**'' جب اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں نادرہ کاری موجود ہے تو خود اس کے کلام میں جو اس کی صفت ہے اعجاز بیان اپنے عروج پر کیوں کر نہ ہوگا۔ چوں کہ انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے، اس لئے تجمیل اور تزئین کی صفت خداوندی کی نمود اس کی تمام صنعت میں پائی جاتی ہے اور وہ اس کے لئے شعوری کوشش بھی کرتا ہے، وہ اپنے کلام کو بھی بلاغت نظام بنانے کی سعی کرتا ہے اور اس کے لئے اس نے بیان و بدیع کے قواعد تیار کر ڈالے ہیں وہ صناعی کے جوہر دکھاتا ہے، وہ آرائش وزیبائش کا ہنر اختیار کرتا ہے۔ وہ جب قلم کا استعمال کرتا ہے تو نثر میں موتی پروتا ہے اور شعر کو حسن تخیل سے آبدار بناتا ہے، فنون لطیفہ کے تمام اقسام، تعمیر، آرائش، مصوری، نقاشی، رقص اور موسیقی، شاعری سب انسان کے ذوقِ جمال کی شہادت دیتے ہیں اور یہ جمال آرائی اور یہ حسن افروزی اسے خلاق ازل کی طرف سے ارزانی کی گئی ہے، جو سرچشمہ کمال اور منبع حسن و جمال ہے۔ یہ دراصل اسی ذات جمیل کا فیضان حسن و جمال ہے جو اس کائنات کے ذرہ ذرہ میں بکھرا ہوا نظر آتا ہے، انسان کی حس جمال اسی کی پروردہ اور آفریدہ ہے ؛ لیکن اس نے شاعرانہ ترنگ میں اپنے جمالیاتی ذوق اور حسن آفرینی پر اتنا فخر کیا ہے کہ اپنے کلام کو اس نے روکش جمال فطرت قرار دے دیا ہے۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم

کلامِ الٰہی فصاحت و بلاغت کا بلند ترین اور روشن ترین نمونہ ہے؛ لیکن اس سے وہی شخص لطف اندوز ہوسکتا ہے اور کیفیت وجد سے سرشار ہوسکتا ہے اور انبساط کے سمندر میں غرق ہوسکتا ہے جو عربی زبان کے محاسن کو اچھی طرح جانتا ہو اور زیورات لفظی کی پرکھ رکھتا ہو، ورنہ ایک محروم ذوق جمال اور نامحرم جوہر کمال کے نزدیک ذرہ بے مقدار اور آفتاب عالم تاب دونوں یکساں ہیں وہ ریگ زار اور لہلہاتے ہوئے مرغزار میں باعتبار حسن کوئی فرق نہیں محسوس کرسکتا ہے، وہ اپنی بے ذوقی اور کم علمی کی وجہ سے حسن بیان کو سمجھ نہیں سکتا ہے وہ الٹا معترض بھی ہوسکتا ہے کہ قرآن میں ایک ہی بات کو ایک ہی لفظ کو مکرر سہ کرر کیوں کہا گیا ہے۔ اس کتاب میں اسی مفروضہ اعتراض کا جواب ہے اور تکرار کے سربستہ راز سے پردہ اٹھایا گیا اور اس کے اسباب کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، قرآن کی ادبی صنعتوں کا، قرآن میں علم معانی کے ایجاز واطناب ومساوات حذف وتکرار وغیرہ کے استعمال کا، علم بیان کے تشبیہ مجاز استعارہ اور کنایہ وغیرہ کے شواہد کا، علم بدیع کے تجع طباق مراعات النظیر تضاد اور عکس تجنیس اشتقاق ترصیع وغیرہ کی مثالوں کا شمار مشکل ہے قرآن کی آیتیں ان مثالوں سے بھری ہوئی ہیں۔ قرآن کی ہر آیت فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے ایک شاہکار ہے تاہم قرآن کے ادبی اعجاز پر مولانا عبیداللہ عباس ندوی صاحب کی ایک مؤقر اور معتبر کتاب پہلے سے موجود ہے؛ لیکن یہ کتاب صرف مکررات قرآن یعنی قرآن کی صرف صنعت تکرار سے متعلق ہے۔ تکرار زبان کا عیب بھی ہے اور ہنر بھی ہے، اگر تکرار بے ضرورت اور بے محل ہے تو ذوق سلیم پر بار ہے اور اگر مقتضیات کلام کے مطابق ہے تو عروس کلام کے گلے کا ہار ہے، تکرار کے برمحل ہونے اور سیاق و سباق کے مطابق ہونے سے زبان کی قبا میں چار چاند لگ جاتے ہیں، اس سے طبیعت شگفتہ اور روح بالیدہ ہوتی ہے۔ اُردو زبان میں قرآن کے مکررات کے موضوع پر پہلی بار کتاب سامنے آرہی ہے، عربی میں بھی اس موضوع پر کتاب نایاب تو نہیں؛ لیکن کمیاب ضرور ہے، اس پر مواد کا حصول مشکل اور جوئے شیر لانے کے مرادف ہے۔ اس موضوع کی افادیت سے انکار ممکن نہیں کہ لفظ ومعنی کی اقتضائے کلام کے مطابق تکرار گویا صناعی اور نگوں کی ریزہ کاری ہے اور ایک طرح کی مرصع سازی اور فن ہے، اس سے آہنگ میں نغمگی پیدا ہوتی ہے اور نغمگی میں اضافہ ہوتا ہے اور اس اضافہ سے تاثیر میں قوت پیدا ہوتی ہے، لفظ کی تکرار مفہوم میں بھی زور پیدا کردیتی ہے۔ لفظوں کی

آواز سے، تکرار کے ساز سے اہتزاز کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اسی لئے سورہ رحمٰن میں یہ آیت ’’فبأی الآء ربکما تکذبان‘‘ کی تکرار فردوس گوش اور سامعہ نواز ہے، ’’فإن مع العسر یسراً إن مع العسر یسراً‘‘ تکرار کی دوسری مثال ہے، اس میں صفت تجنیس کے ساتھ تکرار نے تاکید معنوی کے ساتھ ادبی طمطراق کی شان پیدا کر دی ہے، ’’کلا سوف تعلمون ثم کلا سوف تعلمون‘‘ میں تکرار تاکید کے لئے ہے۔ قرآن میں علم معانی علم بیان اور علم بدیع کی تمام صناعیوں کو سمجھنا انسان کو صناع ازل سے اور اس کی کتاب سے قریب کرتا ہے، کتاب کے حسن زبان کی خوبیوں سے آشنا کرتا ہے اور دل کو نور اور روح کو سرور عطا کرتا ہے؛ کیوں کہ انسان کے حواس خمسہ میں سے ہر ایک حس تربیت یافتہ نہ ہوگی تو حسن شناسی بھی ممکن نہ ہو سکے گی اور حسن شناسی نہ ہوگی تو زبان کے زیور کی مرصع کاری کا احساس نہ ہوگا۔ پھر زبان اشعار میں بھی جملہ کی اور لفظوں کی تکرار پر معترض ہوگی؛ کیوں کہ اشعار میں اس صنعت کا استعمال عام ہے اہل زبان جانتے ہیں کہ تکرار کہیں کہیں کس قدر بلیغ ہوتی ہے، مثال کے طور پر اُردو کے چند اشعار پیش ہیں:

لیا پہلے تو ہاتھوں میں مگر پتھر پہ دے مارا
میں کہتا رہ گیا ظالم مرا دل ہے مرا دل ہے

آنی وفانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات کارِ جہاں بے ثبات

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

علی کا عدو دوزخی دوزخی
علی کا محبّ جنتی جنتی

غالب خستہ کے بغیر کونسے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا وحشت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے شانے پر پریشاں ہوگئیں

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن
لیکن اپنا اپنا دامن

ہستی شاعر اللہ اللہ
خاک نشین اور عرش نشیمن

جس طرح حذف کہیں کلام کو بلیغ بناتا ہے اسی طرح سے کسی چیز یا کسی لفظ کا مکرر ذکر بھی بلاغت کی جان بن جاتا ہے، مذکورہ بالا اشعار سے اندازہ ہوگا کہ تکرار نے کس طرح کلام میں جان پیدا کردی ہے۔ جب عام مضمون کے لئے تکرار باعث حسن ہوتا ہے تو مقدس ترین اور بلند ترین اور روشن ترین مضمون کو دلوں میں جاگزین کرنے کے لئے تکرار کی اہمیت سمجھ میں آسانی سے آسکتی ہے، یہ کتاب اپنے موضوع پر اہل ذوق کے لئے تحفہ گراں مایہ کی حیثیت رکھتی ہے، جو شخص مولانا عبد اللہ عباس ندوی کی کتاب ''قرآن تاریخ انسانیت کا سب سے بڑا معجزہ'' کے ساتھ اس کتاب کا بھی مطالعہ کرلے گا، وہ عربی زبان سے ناآشنا ہونے کے باوجود قرآن کے محاسن زبان اور ادبی اعجاز کی ایک جھلک ضرور پالے گا اور اس کی حلاوت اور لطافت اور بلاغت کا کسی قدر ذوق آشنا بن جائے گا۔ جن لوگوں نے قرآن کے ادبی اعجاز کے موضوع پر مولانا کی مذکورہ کتاب پڑھی ہے انھوں نے مولانا کے عالمانہ خیالات کو، نکتہ دانی کی جودت طبع کو اور ان کے پیش کردہ نکات کو اور مجموعی طور پر کتاب کی اثر انگیزی اور افادیت کو سراہا ہے۔ پیش نظر کتاب مذکورہ بالا کتاب کے ساتھ قرابت محرمانہ اور میر کے الفاظ میں ''کمند ناز پر ایک اور تازیانہ'' کی حیثیت رکھتی ہے۔ عروس زبان کے جلوؤں کو بے حجاب دیکھنے کے لئے زبان پر درک اور اس پر دست رس ضروری ہے۔ مولانا ندوی کے قلم کا کمال یہ ہے کہ اس نے ایک بیگانہ زبان شخص کے حصہ میں بھی، اہل زبان کے برابر نہ سہی، حسن بلاغت کلام کا دور کا جلوہ فراہم کر ہی دیا ہے اور اسی کے ساتھ قرآن کی زبان کو سیکھنے کی آتش

شوق کو تیز اور اسپ ہمت کو مہمیز کر دیا ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے؛ کیوں کہ قرآن کی اعلیٰ درجہ کی فصاحت اور بلاغت کا اندازہ اُردو ترجمہ پڑھنے والوں کو ہو ہی نہیں سکتا ہے اُردو زبان میں قرآن کا کوئی ترجمہ نہیں جو اصل متن کی دل نشینی کے عشر عشیر حصہ کو منتقل کر سکا ہو، یہ بات بجا ہے کہ یہ کام تمام مشکل کاموں میں سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ لوگوں نے اس اہم کام کی طرف توجہ ہی نہیں کی اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ مترجمین کا دو تین اشخاص کو مستثنیٰ کر کے ادب سے کوئی تعلق اگر تھا تو وہ محرمانہ نہیں؛ بلکہ رقیبانہ تھا، ان ترجموں سے فہم اور تذکیر کا فائدہ تو حاصل ہو جاتا ہے؛ لیکن ان سے اعجاز قرآن کو پورے طور پر سمجھنا مشکل ہے۔ جن حضرات کی اپنی اُردو نثر اُبالی ہوئی کھچڑی کی مانند پھیکی بے نمک اور بے مزہ ہو وہ قرآن کے بلیغ کلام کا بلیغ زبان میں ترجمہ کیسے کر سکتے ہیں، قرآن کا اُسلوب سرمدی اعجاز سے معمور ہے۔ قرآنی اُسلوب کی معجزانہ شان کی ایک جھلک دکھا دینا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے، اس صورتِ حال میں قرآن کے ادبی محاسن کے جلوؤں کو دکھانا اور ان پر پڑے ہوئے پردوں کو ہٹانا بہت قابل ستائش کام ہے۔ مولانا کے قلم سے قرآن کی یہ وہ خدمت ہے جس کا اعتراف مدتوں کیا جائے گا اور لوگ اسے ان کا کارنامہ بلکہ ان کی تصنیفات کا سرنامہ قرار دیں گے اور اس کی اصل جزا تو ان کو روز مکافات میں روز مکافات کے مالک کی طرف سے ملے گی، جس کی خوشنودگی کے لئے انھوں نے یہ کام کیا ہے۔

قرآن کریم اور سیرت نبوی اب مدتوں سے مولانا کا صبح و شام کا مشغلہ ہے، خاک مدینہ ان کے لئے اکسیر اور ان کا دل فتراک محبت کا نخچیر ہے اور اس کیفیت میں روز افزوں اضافہ ہے۔ صاف یہ محسوس ہوتا ہے کہ شام زندگی میں پرندہ کو جنت کے آشیانہ کی فکر ہے، زبان اشخاص پر تبصرہ کے سلسلہ میں غیر معمولی طور پر محتاط ہو چکی ہے، گویا ہمہ وقت اپنا احتساب ہے، مولانا نے بہت سے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے؛ لیکن اگر اب کوئی ان سے قرآن اور سیرت اور اس کے متعلقات کے سوا کسی موضوع پر لکھوانا چاہے تو شاید وہ یہ جواب دیں گے:

چسکا پڑا ہے جام کا شغل ہے صبح و شام کا
اب میں تمہارے کام کا ہم نفس رہا نہیں

''قرآن تاریخ انسانیت کا سب سے بڑا معجزہ'' ان کی بہت مقبول کتاب ہے، اس کتاب کے علاوہ ان کی تصنیفات میں قرآنی موضوعات کو تلاش کیا جائے تو عربی میں ''شرح کتاب النکت فی اعجاز القرآن ترجمان معانی القرآن الکریم وتطور فہمہ

عند العرب'' اور ''مذاهب المنحرفين في التفسير'' کے نام سے اور عربی اور انگریزی دونوں میں ''قاموس القرآن الكريم'' اور ''تعليم لغة القرآن الكريم'' کے نام سے کتابیں ملیں گی۔ سیرت کے موضوعات پر ''پیغمبر اخلاق و انسانیت، تاریخ تدوین سیرت، ردائے رحمت، عربی میں نعتیہ کلام، ارشادات نبوی کی روشنی میں نظام معاشرت، فضائل درود و سلام، آفتاب نبوت کی چند کرنیں'' ان کی کتابیں ہیں، ادب و بلاغت و منطق و سوانح پر کتابیں جو ان کے زرنگار قلم سے نکلی ہیں وہ الگ ہیں۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن پھلواری شریف میں حاصل کی تھی، پھلواری کے چمن علم سے فیضیاب ہونے کے بعد انھوں نے ندوۃ العلماء کے گلشن علم و ادب سے فیض حاصل کیا۔ مولانا عبد السلام قدوائی ندوی اور شاہ حلیم عطا صاحب جیسے اربابِ کمال سے کسبِ کمال کیا، دینیات اور ادبیات میں ملکہ حاصل کیا، یورپ میں بھی تعلیم حاصل کی اور مکہ مکرمہ کی یونیورسٹی میں معلم بھی رہے۔ چندے مقیمِ آستان غیر بھی ہوئے اور مستقل طور پر ساکن دیارِ خیر بھی ہوئے، طواف کوئے ملامت بھی کیا اور آستانہ حرم پر جبیں سائی بھی کی، مشرق و مغرب کے میخانے بھی دیکھے اور دونوں کے بادہ گسار بھی ہوئے؛ لیکن مولانا کے علم و فضیلت کے جوہر اور علمی و دینی ادبی اور تصنیفی کارناموں کے پس پردہ اصل روح ''میر کارواں'' کی کارفرما رہی ہے اور مولانا کو روشنی وہیں سے ملتی رہی ہے، بقول اقبال:

اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

(مقدمہ کتاب)

☆ ☆ ☆ ☆
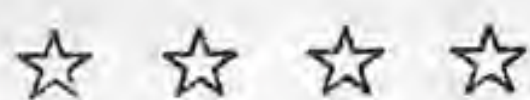
قرآن وحدیث سے متعلق
دو اہم کتابوں کا تعارف

مسلمان ناموس رسول کی حفاظت کے لئے اپنی جان تک قربان کر سکتے ہیں، وہ اپنی کوتاہیوں کے باوجود عشق نبوی سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں۔ جب ناموس نبوی کی حفاظت کے لئے تیغ باقی نہیں رہتی تو عشق ہی حصار کا کام دیتا ہے، عشق یوں تو مختصر سہ حرفی لفظ ہے؛ لیکن عظیم قوت کا سرچشمہ ہے اور طوفان کے مقابلہ میں انسانوں کو ثابت قدم رکھتا ہے۔ یہ عشق رسول ہی ہے جو ملی حمیت اور خودداری پیدا کرتا ہے، یہ عشق رسول ہے جو بدر وحنین جیسے معرکہ زار میں مومن کو مرد آہن بناتا ہے اور وہ سرفروشی کی تمنا کرنے لگتا ہے، یہ عشق رسول ہے جو اطاعت پر آمادہ کرتا ہے، اسی لئے عربی شاعر نے کہا ہے:

لو کان حبک صادقا لأطعته
إن المحب لمن یحب مطیع

عارف رومی نے عشق کو جملہ امراض کا علاج بتایا ہے:

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما

اور عارف رومی کے کلام سے فیض یاب شاعر مشرق اقبال نے کہا:

آدمی کے ریشہ ریشہ میں سما جاتا ہے عشق
شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے محبت وجان نثاری عشق اور فدا کاری کس درجہ میں تھی اس کا اندازہ عروہ بن مسعود ثقفی کے اس بیان سے ہوتا ہے جس میں انھوں نے بتایا تھا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بلغم تھوکتے تو وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں کسی کے ہاتھ پر آتا اور وہ اپنے چہرے اور جسم پر مل لیتا، جب آپ وضو کرتے تو پانی کے قطروں کو ہاتھ پر لینے کے لئے

ایسا لگتا کہ لوگ لڑ پڑیں گے اور جب آپ بات کرتے تو سب اپنی آوازیں پست کر لیتے اور فرط تعظیم سے کوئی آپ کو گھور کر نہیں دیکھتا۔ عروہ بن ثقفی نے محبت اور جان نثاری کا یہ منظر دیکھا تو انھوں نے رفقاء سے بیان کیا اور ان میں سے ایک نے کہا کہ ہم لوگوں نے بخدا قیصر و کسریٰ کے دربار دیکھے ہیں، میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کے ساتھی اس کی اتنی تعظیم کرتے ہوں جتنی محمد کے ساتھی محمد کی تعظیم کرتے ہیں۔

کافروں نے صحابی رسول حضرت خبیب اور زید بن دثنہ کے قتل کا ارادہ کیا، قریش کے لوگ اس ارادہ سے جمع ہوئے ابوسفیان بن حرب بھی ان میں موجود تھے، قتل سے پہلے انھوں نے پوچھا زید بتاؤ کیا تم پسند کرو گے کہ تمہاری جگہ محمد ہوتے اور ہم انھیں قتل کر دیتے اور تم اپنے اہل و عیال کے ساتھ آرام سے ہوتے، حضرت زید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: خدا کی قسم مجھے تو یہ بھی منظور نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے مکان میں ایک کانٹا بھی چبھے اور میں اہل و عیال کے درمیان آرام سے رہوں۔

آج کل کے نام نہاد روشن خیال اور عصریت کے دلدادہ حضرات کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر پروانہ وار نثار ہونا اور ان کے خلاف سب وشتم کرنے والے کو برداشت نہ کرنا جذباتیت اور مجنونانہ حرکت ہے؛ حالاں کہ ایسے گستاخ شخص کو برداشت نہ کرنا عین تقاضہ ایمان ہے اور اسلام کی تاریخ سے اسی کا ثبوت ملتا ہے۔ قابل اعتراض بات یہ ہے کہ دوسروں کو اس احتجاج میں اذیت دی جائے اور ان کی املاک اور جائداد کو نقصان پہنچایا جائے، دانائی اور حکمت کی بات یہ ہے کہ دوسروں کو بھی اس نوعیت کے احتجاج میں شریک کیا جائے کہ کوئی بھی شریف النفس انسان خواہ اس کا کوئی مذہب ہو، کسی بھی مذہبی مقتدی اور پیشوا پر کیچڑ اچھالنا پسند نہیں کر سکتا ہے اور غیر مسلموں میں ایسے شریف النفس انسان ہزاروں کی تعداد میں مل سکتے ہیں۔ غیر مسلموں کو سیرتِ رسول سے نبی رحمت سے واقف کرانے کی ضرورت ہے، افسوس ہے ہم مسلمان یہ ضروری کام انجام نہیں دیتے ہیں اور ہم نے مفروضہ کے طور پر بلا استثناء سب کو اسلام اور پیغمبر اسلام کا دشمن سمجھ لیا ہے۔ قرآن کیا ہے؟ سیرت رسول کیا ہے؟ حدیث کسے کہتے ہیں؟ اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟ ان موضوعات پر کتابیں پڑھے لکھے غیر مسلم حضرات تک پہنچانا مذہبی فریضہ ہے ہر مسلمان اپنے پڑوسیوں کو اور ان لوگوں کو جو اس کے تعلقات کے دائرہ میں آتے ہیں، ایسی کتابیں پڑھنے کے لئے دے سکتا ہے۔

قرآن و سیرت و حدیث کے تعارف پر کئی اچھی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں؛ لیکن کم ایسا

ہوا ہے کہ ایک گھرانے نے یہ دونوں خدمتیں انجام دی ہوں اور خاندان اور دودمان ایک ہو، زمان و مکان بھی ایک ہو، قرآن میں ایسے پیغمبروں کا تذکرہ ہے، جن کی اولاد و احفاد میں پیغمبر ہوتے رہے۔ اس لئے اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ ابن غوری اور سید عبدالماجد غوری اور زکریا غوری یہ سب مل کر قرآن و حدیث کی خدمت کا بیڑا اٹھائیں اور ایں خانہ ہمہ آفتاب است کا مصداق بن جائیں۔ ایسا اشتراک عمل اور جذبہ خدمت دین اور تصنیف و تالیف کا ذوق اور مقاصد کا اتحاد ایک ہی خاندان میں نظر تو آسکتا ہے؛ لیکن بمشکل اور کم کم، والد ابن غوری ماشاء اللہ صاحبِ علم اور صاحبِ قلم اور بیٹے سید عبدالماجد غوری اور زکریا غوری ان کے نقش قدم پر گامزن، بیٹوں کو اگر والد کے علمی و دانی اور مذہبی وراثت میں حصہ نہ ملے تو بقول اقبال:

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر لائق میراث پدر کیوں کر ہو

والد محترم (ابن غوری) نے کتاب لکھی ہے ''قرآن میں کیا ہے'' یہ کتاب نہ صرف مسلمانوں کے پڑھنے کے لائق ہے؛ بلکہ اس لائق ہے کہ ہندوستان کی مقامی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو اور غیر مسلم بھی اسے پڑھیں۔ انھوں نے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے قرآن کی سورتوں کے خلاصے اس میں سلیس اور شگفتہ زبان میں پیش کر دیئے گئے ہیں مصنف کتاب نے صرف مضامین قرآن ہی نہیں جمع کئے؛ بلکہ بہت سی رائج الوقت رسموں اور طریقوں پر گرفت بھی کی ہے۔ قرآن میں ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کون ظالم ہوگا جو اللہ کی مسجدوں کو اس سے روکے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے اور ان کی بربادی کی کوشش کی جائے، اس آیت کی تشریح میں مصنف نے یہ نوٹ لکھا ہے'' یہ جو آج کل مسجد کے سامان کی حفاظت اور بیت الخلاء کی صفائی کے نام پر نماز باجماعت کے اوقات کے علاوہ مسجد کو تالا لگا کر مسافروں اور عمل کے طالبوں کو فرض و نفل نمازیں پڑھنے اور قرآن کی تلاوت کرنے سے محروم کیا جا رہا ہے تو کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ بھی مسجد سے روکنے کی تعریف میں آتا ہو'' مصنف نے صرف سوالیہ نشان لگایا ہے واقعہ ہے کہ یہ طریقہ درست نہیں۔ مفسر قرآن مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب نے کئی بار اس طریقہ عمل پر تنقید کی ہے، انھوں نے اپنی تقریروں میں یہاں تک کہا ہے کہ غیر مسلموں کو بھی اس طرح کی ضرورتوں کے لئے مسجدوں میں آنے دینا چاہئے تا کہ وہ مسلمانوں کی عبادت گاہوں سے مانوس تو ہوں، افسوس ہے کہ سرزمین حرم تک میں مسجدوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا جاتا ہے، وہاں تو کچھ پہلے تک چوریاں بالکل نہیں ہوتی تھیں، وہاں وہ خوف تھا

جو ہر استبدادی نظام میں پایا جاتا ہے اور وہ ہے مسلمانوں کا باہم ملنا اور باہمی مشاورت۔ مسلم ملکوں کا غیر جمہوری نظام مسلمانوں کے ملنے جلنے اور باتیں کرنے سے اور ان کے پلیٹ فارم بننے سے خائف رہتا ہے، نماز با جماعت کے ختم ہونے کے تھوڑی دیر بعد مسجد میں داخلہ پر پابندی لگا دی جاتی ہے، دروازوں پر تالے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ حالاں کہ مسجدیں عبادت گاہ ہیں صرف باجماعت فرض نماز کے لئے نہیں؛ بلکہ ہر نماز کے لئے، ایک مسافر بعد میں بھی آ کر ان میں نماز پڑھ سکتا ہے اور قرآن کی تلاوت کر سکتا ہے۔

مولانا علی میاں نے کتاب کے مقدمہ کے اخیر میں لکھا ہے:

ہماری دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ابن غوری صاحب کی اس کوشش کو قبول فرمائے اسے ان کے اور اُمت مسلمہ کے حق میں نافع بنائے اور تمام مسلمانوں اور انسانوں کو قرآن کے چشمہ فیض سے سیرابی کی توفیق عنایت فرمائے۔

مولانا علی میاں نے صرف مسلمانوں کا نام نہیں لیا ہے؛ بلکہ انسانوں کا لفظ بھی لکھا ہے، یعنی ان کی دُعاء بھی یہی ہے کہ اس کتاب کے ترجمے ہوں اور وہ تمام انسانوں تک پہنچیں، ہم بھی یہی دُعاء کرتے ہیں۔

ایں دُعاء از من و از جملہ جہاں آمین باد

والد (ابن غوری) نے کتاب قرآن کے بارے میں لکھی اور ان کے صاحب زادگان (عبد الماجد غوری اور زکریا غوری اول الذکر متعدد وقیع عربی کتابوں کے مصنف بھی ہیں) نے ''علوم حدیث'' کے نام سے بیش قیمت کتاب مرتب کی دونوں نے مل کر رائیت علم دین بلند کیا ہے، گویا قرآن اور حدیث کی خدمت ایک ہی خاندان میں جمع ہوگئی۔ حدیث کی حجیت سے انکار بھی بعض دانشوروں کا فیشن بن گیا ہے، حدیث سے انکار کے بعد کوئی مسلمان مسلمان نہیں رہ سکتا ہے، ایسے مسلمان کا نکاح بے قبول اور عقد بے ایجاب ہے۔ یہ کتاب اصطلاحاتِ حدیث کے صرف تحقیقی اور علمی موضوع پر مشتمل نہیں ہے؛ بلکہ حدیث کا اُسلوب، اس کے مقاصد، حجیت حدیث، صحابہ کرام کا حدیث سے شغف، حدیث کی سماعت کے لئے دور دراز کے اسفار کی تاریخ، اس کی بقاء کے لئے حکمتِ الٰہی کا راز، تدوین حدیث اور اس کی تاریخ جیسے نہایت مفید عنوانات اور موضوعات پر مشتمل ہے۔ ان عنوانات نے کتاب کو صرف حدیث کے منتہی طلبہ کے لئے نہیں؛ بلکہ عام مسلمانوں کے لئے مفید اور قابل توجہ بنا دیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک اہم اضافہ کی حیثیت رکھتی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو جمع کیا گیا ہے اور یہ حدیثیں جس شغف اور اہتمام اور تحقیق و استناد کے ساتھ جمع کی گئی ہیں اس کی مثال دنیا کا کوئی دوسرا مذہبی لٹریچر نہیں پیش کر سکتا ہے۔ بیسوں کتابوں میں یہ حدیثیں جمع کی گئی ہیں، سینکڑوں کتابیں ان کی شرح میں لکھی گئی ہیں، لوح دہر پر ان کا نقش اس طرح محفوظ کیا گیا ہے کہ وہ نقش دوام بن گیا ہے۔ دنیا میں نہ گور سکندر باقی ہے نہ قبر دارا موجود ہے؛ لیکن پیغمبر آخر الزماں کی حدیثیں ہی نہیں؛ بلکہ ان کے جامعین اور شارحین کا نام بھی تاریخ کے نگار خانہ میں اس خدمت حدیث کے طفیل باقی ہے اور باقی رہے گا۔ قیامت تک کروڑوں انسان صاحب سیرت و حدیث کی غلامی پر نہیں؛ بلکہ ان کے غلاموں کی غلامی پر فخر کرتے رہیں گے اور جب کبھی بھی کوئی دریدہ دہن اور گستاخ بدزبانی کا اور اہانت کا مرتکب ہوگا اور ذات عالی مقام کو سب و تشنیع کا نشانہ بنائے گا پورا عالم اسلام زلزلہ بردوش اور صاعقہ آسا بن جائے گا اور دنیا کے اخبارات احتجاج کی خبروں سے بھر جائیں گے اور اس خروش طوفان کے مقابلہ میں خس و خاشاک کی ذلت اور رسوائی ایسی ہوگی کہ غیر مسلم حکمران اور فرماں روایان سلطنت بھی اس کی توبیخ اور مذمت پر مجبور ہوں گے۔ لیکن نوائے شکوہ جور زماں اور شکایت روش باغباں اور حکایت دل بریاں سنانا اور محرم کی مجسم داستان بن جانا کافی نہیں، ایک شمیم گیسوئے عنبر فشاں ایک زمزمہ جاں نواز یعنی ایسی تحریروں کی ضرورت ہے جو دوسروں کو بھی احترام پیغمبر پر مجبور کر دے۔ ایسی مشعل فکر روشن کرنے کی ضرورت ہے کہ لوگوں کو یہ بات سمجھ میں آجائے کہ کیونکر ایک مسلمان بے عمل تو ہو سکتا ہے؛ لیکن پیغمبر عالی مقام کے سلسلہ میں کوئی بے توقیری گوارا نہیں کر سکتا ہے۔ ہم کتاب کا خیر مقدم کرتے ہیں اور مختلف زبانوں میں اس کے ترجمہ کی سفارش کرتے ہیں۔

در دل مسلم مقام مصطفیٰ است
آبروئے ما زنام مصطفیٰ است

☆ ☆ ☆ ☆

ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب خطبات بھاولپور

چمن میں دیدہ ور ماہ وسال کی سینکڑوں گردشوں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ دنیا میں انسان پیدا ہوتے رہتے ہیں، ڈاکٹر حمید اللہ جیسا گوہر کمیاب پوری ایک صدی میں بھی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ ایسے ہی ایک دیدہ ور اور قابل صد فخر انسان تھے، علمی کارنامے ایسے کہ بڑے سے بڑے اورنگ سلطنت پر بیٹھنے والے اہل علم کی نظر میں ان کے مقابلہ میں ہیچ؛ لیکن تواضع ایسا کہ اس سے زیادہ تواضع بس خاکدان ارضی ہی کے نصیب میں آیا۔ استغناء کی یہ مثال کہ فیصل ایوارڈ کو قبول کرنے کے لئے بھی تیار نہیں، کتابوں کی رائلٹی ملتی تو غریبوں میں تقسیم کردیتے، پاکستان کا دس لاکھ کا ایوارڈ استمزاج کے بغیر دے دیا گیا تو تحقیقاتِ اسلامی کی لائبریری کو دے دیا۔ ایک فقیر بوریہ نشین تھا ایک درویش خدا مست تھا قرآن وحدیث اور سیرت نبوی جس کی تحقیقات کی جولانگاہ تھی، برلن کے کتاب خانہ سے صحیفہ ہمام بن منبہ کو دریافت کرنے والے وہ تھے، گم گشتہ سیرت ابن اسحاق کو تلاش وجستجو کے بعد ڈھونڈھ نکالنے والے وہ تھے، مکاتب نبوی کو تلاش کرنے اور ایڈٹ کرکے شائع کرنے کا رکارنامہ انھوں نے انجام دیا، علم وتحقیق کی دنیا میں ان کے یہ وہ احسانات ہیں جنھیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

قرآن مجید کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا تو ہزاروں فرانسیسی مشرف بہ اسلام ہوئے، ڈاکٹر حمید اللہ جب حیدرآباد سے گئے تو پھر واپس نہیں آئے؛ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے کسی ملک کی شہریت قبول نہیں کی ۷۰ سال تک بغیر پاسپورٹ کے رہے محض ایک پناہ گزین کی حیثیت سے ''کن فی الدنیا کأنک غریب او عابر سبیل'' کی جیتی جاگتی تصویر اور اقبال کے اس شعر کا نمونہ:

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر اس کا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

خطبات بہاولپور سیرت النبی ﷺ پر ان کے بیش بہا خطبات ہیں اور ان خطبات میں انھوں نے سیرت کے موضوع پر تحقیقی افکار کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ یہ خطبات ہیں جو ارتجالا پیش کیے گئے تھے، سامنے کوئی نوٹ بھی نہیں ہوتا تھا، آخر میں سوالات و جوابات کا وقت ہوتا اس کتاب میں سوالات اور جوابات بھی جمع کر دیئے گئے ہیں۔

ہم اس مؤخر الذکر کتاب کے تعارف کی ابتداء کتاب کی انتہا یعنی اس کے آخری مقالہ سے کرتے ہیں، ڈاکٹر حمید اللہ پہلی وحی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> پہلی وحی سے آپ سب لوگ واقف ہیں کہ وہ سورہ اقراء کی پہلی پانچ آیتیں ہیں، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے آپ ﷺ کی اُمت کو حکم دیا گیا ہے، اس کے بعد ہمارے مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ تین سال کے لئے ایک وقفہ رہا جس کے لئے فترۃ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اس دوران کوئی نئی وحی نہیں آئی؛ لیکن دوسری وحی نہ آنے کے باوجود یہ ایک عجیب وغریب بات ہے کہ تبلیغ کا کام شروع ہو گیا، ان پہلی آیتوں میں صاف طور پر تبلیغ کا حکم نہ ہونے کے باوجود عملاً اس کا آغاز ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ اس کے بعد لکھتے ہیں:

> جب پہلی وِحی نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں تھے، میرے علم میں یہ دسمبر کا مہینہ تھا مکہ میں سخت سردی پڑ رہی تھی وحی کے فوراً بعد آپ ﷺ شہر واپس آجاتے ہیں اور اپنے مکان پہنچ کر اپنی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرماتے ہیں: ''**زملونی زملونی**'' (مجھے کمبل اُڑھاؤ مجھے کمبل اُڑھاؤ)۔

ڈاکٹر حمید اللہ کی یہ عبات پڑھ کر میں چونک اُٹھا، راقم سطور کو دسمبر جنوری اور ہر موسم میں مکہ جانے کی توفیق وسعادت حاصل ہوئی ہے؛ لیکن سخت سردی سے جس کا حوالہ ڈاکٹر حمید اللہ نے دیا ہے، کبھی سابقہ نہیں پیش آیا، مکہ مکرمہ میں سردی صرف اس چیز کا نام ہے کہ ایر کنڈیشن اور پنکھے نہ چلائے جائیں، مجھے اکثر یہ محسوس ہوا ہے کہ مکہ مکرمہ کے لئے یہ خدائی انتظام ہے ورنہ اگر وہاں سخت سردی پڑتی جس کا حوالہ ڈاکٹر صاحب کے خطبہ میں آیا ہے تو دسمبر کے مہینہ میں صرف احرام کی چادر

میں ملبوس ہوکر داخل ہونے والے جو ہر موسم میں عمرہ کے لئے آتے ہیں بیمار پڑ جایا کرتے، ڈاکٹر صاحب نے کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا ہے، غالباً انھوں نے ''زملونی زملونی'' کے لفظ سے قیاس کرلیا ہے، حالاں کہ سردی کا احساس اور رعشہ کی اعصابی کیفیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس تحیر خیز واقعہ کی وجہ سے بھی پیش آسکتی ہے جو غارِ حرا میں پیش آیا۔

ڈاکٹر حمید اللہ کی اہم خصوصیت جو اس کتاب کے مطالعہ سے عیاں ہوتی ہے وہ ان کا اسلام کی تعلیمات کو ان کے صحیح توازن کے ساتھ قبول کرنا ہے، افسوس ہے کہ امت میں یہ توازن کھویا گیا ہے۔ چنانچہ معاشرہ میں حال یہ ہوگیا ہے کہ اونٹ کو تو مسلم نگل لیا جاتا ہے اور مچھروں کو چھانا جاتا ہے، بڑی خرابیوں کے دور کرنے پر زور صرف کرنے کے بجائے چھوٹی چھوٹی باتوں پر قوت تقریر صرف کی جاتی ہے۔ ایک مثال یہ کہ ابھی چند روز پہلے سال کے آخری دن ۳۱ر دسمبر کو جمعہ کے خطبہ میں ایک امام وخطیب نے یہ کہا کہ (Happy New Year) زبان سے کہنا حرام ہے اس سے دوزخ کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ میں نے نماز جمعہ کے بعد امام صاحب سے کہا کہ عرب دنیا میں اور خاص طور پر سعودی عرب میں یکم محرم کو نئے سال کی مبارکباد دینے کا رواج ہے، دینی جماعتیں سماجی تنظیمیں حکومتی حلقے سب مبارکباد کا اہتمام کرتے ہیں اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ انھوں نے جواب میں کہا وہ تو اسلامی ہجری قمری تقویم ہے اس کے نئے سال میں مبارکباد دینا درست ہے، میں نے جواب میں کہا کہ شمسی تقویم بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منسوب کی جاتی ہے اور چوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہم زیادہ صحیح عقیدہ رکھتے ہیں اور ان کو پیغمبر مانتے ہیں، خدا کا بیٹا نہیں مانتے اس لئے اس عیسوی تقویم پر ہمارا حق دوسروں سے زیادہ ہے، میں یکم جنوری کی مبارکبادیوں کی ہمت افزائی تو نہیں کرتا؛ لیکن اسے حرام کے درجہ میں رکھنا تجاوز ہے، غیر مسلموں کے ساتھ ملاقات میں نئے سال کی مبارکباد میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں نے یہ واقعہ اس لئے نقل کیا کہ خواتین کے پردہ کے سلسلہ میں بھی تصور اور نظریہ کی بے اعتدالی پائی جاتی ہے، ایک خاتون خواہ کتنی ہی دیندار ہو، نماز، روزے کی پابند ہو؛ لیکن اگر وہ روایتی پردہ کا التزام نہیں کرتی ہے تو وہ آزاد اور بے دین سمجھی جاتی ہے اور وہ نماز روزہ کی پابندیوں سے آزاد ہو؛ لیکن صرف نقاب پوش ہو تو اسے دیندار سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ اس موضوع پر اپنے ایک خطبہ کے بعد ایک سوال کے جواب میں جو کہتے ہیں اس سے ان کے فکری توازن کا اندازہ ہوتا ہے، وہ کہتے ہیں:

عورتوں کے پردے کا قرآن میں حکم دیا گیا ہے اور یہ ہر زمانے کے لئے

ہے، ہماری بہنوں اور بیٹیوں کو پردہ کرنا چاہئے نہیں کریں گی تو حکم عدولی ہوگی اور جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا ہے خدا کے احکام اور ممانعتوں میں ایک تدریج نظر آتی ہے، مثلاً یہ کہ قتل اور جھوٹ دونوں حرام ہیں؛ لیکن سزاؤں کی شکل مختلف ہے اس تدریج کی وضاحت کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ پردہ اولین درجہ کے واجبات میں نہیں یعنی یہ مسئلہ توحید اور ایمان کے برابر کا نہیں اس لئے یہ کہنا مناسب لگتا ہے کہ چوں کہ پردے کی تاکید ہے، لہٰذا اس پر عمل کرنا چاہئے اگر ہماری بہنیں اس پر عمل کریں گی تو اللہ کی خوشنودی حاصل کریں گی اور اگر اس پر عمل نہیں کریں گی تو اُمید رکھنی چاہئے کہ اللہ پاک اس کوتاہی پر انھیں معاف کردے گا۔

اسی موضوع پر اس سوال کے جواب میں کہ پردہ سے زندگی کے معاملات میں دشواری پیش آسکتی ہے، مزید اظہار خیال کرتے ہوئے وہ یہ کہتے ہیں:

چرچ سے وابستہ عیسائی خواتین جو لباس زیب تن کرتی ہیں وہ بالکل اسلامی لباس سے ہم آہنگ ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆
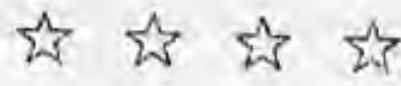
مقالاتِ سیرت

ایک روح پرور اور مشام جاں کو معطر کرنے والی کتاب

بیسویں صدی کے نصف آخر میں اسلامی علوم و تحقیق کے دو سب سے معتبر رسالے اُردو زبان میں شائع ہوا کرتے تھے، ایک ماہنامہ معارف جو مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کی ادارت میں دارالمصنفین سے شائع ہوتا تھا، دوسرا مجلّہ برہان جو مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی ادارت میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوا کرتا تھا۔ ماہنامہ معارف تو اب بھی دارالمصنفین سے شائع ہوتا ہے جس کے مدیر خوش تحریر اس وقت جناب ضیاء الدین اصلاحی ہیں، ماہنامہ برہان مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اور مولانا اکبرآبادی کے انتقال کے بعد بند ہوگیا۔

۱۹۴۰ء میں جب مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ کا ادارہ قائم ہوا تو اس کی پہلی کتاب ''مقالاتِ سیرت'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ مصنف کا نام محمد آصف قدوائی تھا، کتاب پر تبصرہ ماہنامہ برہان میں شائع ہوا اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے کتاب کی تعریف کرتے ہوئے تقریباً یہ الفاظ لکھے تھے کہ یہ کتاب مولانا سلیمان ندوی کی خطبات مدراس کے مرتبہ اور معیار کی ہے۔ انھوں نے اس کتاب کی تعریف میں بہت سی باتیں لکھیں، اس کتاب کے مصنف جناب محمد آصف قدوائی صاحب کی انگریزی زبان پر بے پناہ قدرت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ انھوں نے مولانا علی میاں کی کتاب ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' کا ترجمہ کیا اور اس ترجمہ کی داد انگلستان کے کئی اہل قلم نے دی۔

ڈاکٹر محمد آصف قدوائی نے ۱۹۴۷ء میں علم سیاست میں پی ایچ ڈی کیا اور ان کے اس مقالہ کے ممتحن لندن کے مشہور فاضل پروفیسر لاسکی تھے اور انھوں نے پرزور الفاظ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دیئے جانے کی سفارش کی تھی۔ ڈاکٹر محمد آصف قدوائی اعلیٰ تعلیم یافتہ، انگریزی اور اُردو کے انشاء پرداز تھے، خاندان باا ثر تھا اور اربابِ حل وعقد سے تعلقات اور مراسم بھی گہرے تھے۔ اگر حالات اپنے طبعی رفتار پر چلتے رہتے تو اسباب کی اس دنیا میں انھیں کسی بلند منصب پر فائز ہونا

چاہیے تھا؛ لیکن کبھی کبھی بادِ مخالف کے سازگار نہ ہونے کی وجہ سے سفینہ ساحل مراد تک نہیں پہنچتا ہے۔ محمد آصف قدوائی بیمار ہوگئے اور عمر کے ایک طویل حصہ میں وہ صاحب فراش رہے اور مفلوج رہے اور اپنے گھر میں گویا مقید اور اسیر تھے؛ لیکن یہ ایسی ثمر آور بیماری تھی جس پر بے ثمر صحتوں کو قربان کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنا علمی سفر جاری رکھا، بیماری کی حالت میں بے شمار کتابوں کے انگریزی میں ترجمے کیے اور اُردو میں ایک کتاب ''مقالاتِ سیرت'' کے نام سے لکھی۔ سیرت پر انگریزی، اُردو میں جو کچھ لکھا گیا تھا، اس کے مطالعہ کا نچوڑ اور ماحصل یہ مقالات ہیں جو مقالات سیرت کے نام سے شائع ہوئے، پہلے مقالہ کا عنوان ہے اسلام میں نبوت کا تصور، دوسرا اور تیسرا مقالہ حیاتِ طیبہ پر روشنی ڈالتا ہے، چوتھا مقالہ معجزات کے بارے میں ہے اور پانچویں مقالہ کا عنوان ہے ''خلق عظیم''، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارم اخلاق پر بہت اچھی روشنی ڈالی گئی ہے اور چھٹے مقالہ کا عنوان ''پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور تلوار'' ہے، کامیاب ترین پیغمبر ﷺ اور سرور کائنات ﷺ باقی دوسرے مقالوں کے عنوان ہیں۔ سیرتِ طیبہ پر دنیا کی مختلف زبانوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے، ان کا شمار کرنا بھی مشکل ہے اور ہمیشہ سیرت پر نئے انداز کی کتابیں سامنے آتی رہتی ہیں، یہ کتاب بھی سیرت کے موضوع پر ایک اہم اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے، سیرت کا موضوع ہمیشہ ترو تازہ گلاب کے مانند شاداب ہے۔

نیا ہے لیجئے جب نام ان کا
بڑی وسعت ہے میری داستاں میں

دنیا انقلابات کا گہوارہ ہے اور انسانی ذہن خود تغیر پذیر ہے، ہمیشہ نئے نئے سوالات ذہن میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، جن کی روشنی میں ہمیشہ ایک نئی کتاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ مقالات سیرت بھی بہت سے نئے مسائل کا احاطہ کرتی ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور تلوار کے موضوع پر آج تک بہت کچھ لکھا گیا ہے؛ لیکن ''مقالاتِ سیرت'' کا یہ مقالہ منفرد اور مؤثر ہے۔ بحیثیت مجموعی اس کتاب میں سیرت نبوی ﷺ کا خلاصہ اور عطر آگیا ہے، خاص بات یہ کہ پوری کتاب بہت شگفتہ اُسلوب میں اور کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان میں لکھی گئی ہے، ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

انسانی فطرت کی رنگا رنگی، طبائع کا تنوع اور ایک واقعہ یا حالات سے
مختلف لوگوں کے متاثر ہونے کی کیفیات میں جو اختلاف ملتا ہے اس کا

اقتضا یہ ہے کہ ہمارا نظام اخلاق ایسا متوازن ومعتدل ہو کہ اس میں نرم و گرم جمالی اور جلالی دونوں قسم کی قوتوں کا مناسب امتزاج پایا جائے۔ وہ ایک طرف اگر فولاد کی صلاحیت رکھتا ہو تو دوسری طرف ماں کے دل کا گداز بھی، وہ طاقت وسختی کا بھی مظہر ہو اور مسکنت اور عاجزی کا بھی۔ کوہ گراں بھی ہو اور آب رواں بھی، شعلہ بھی ہو اور شبنم بھی، نہ وہ شروع سے آخر تک مسیحیت کی انفعالیت اور عاجزی کی تشریح ہو اور نہ شریعت موسوی کی قانونیت اور سختی ہی کی توضیح؛ بلکہ ان دونوں کو اپنے آغوش میں لے کر ایک ایسا بسیط اور توازن پیدا کرے کہ امن وعدل، بلند ہمتی واستقلال، قوت وحرکت، آزادی وحق گوئی، عزم ووقار، عاجزی وفروتنی، رحم وعفو، حلم وبردباری، صبر وسکون، رفاقت ومحبت، استغنا وقناعت، توکل وسخاوت، عصمت وحیا، شجاعت ومردانگی، سیر چشمی وبلند نظری، غرض تمام انسانی اوصاف اس میں نمایاں ہوں جو غضب وشہوت کی قوتوں کا استیصال نہ کرے؛ کیوں کہ اس طرح یہ دنیا ایک وسیع قبرستان بن جائے گی۔

لطف اظہار کتاب کا جوہر خاص ہے، ڈاکٹر آصف قدوائی کی اس کتاب میں استدلال اور مطالعہ بھی ہے اور خوبصورت طرز تحریر بھی ہے اور سیرت کے بہت سے اہم گوشے سامنے آجاتے ہیں۔ جس شخص کو سیرت کی ضخیم کتاب پڑھنے کا موقع نہ ہو اسے کم از کم ''مقالاتِ سیرت'' ضرور پڑھنا چاہئے، یہ کتاب بہت سی ضخیم کتابوں کی قائم مقام ہے۔ زبان وبیان کی دلکشی کے اعتبار سے اسے ادب کی کتاب بھی سمجھنا چاہئے۔ کتاب کا بہت جامع تعارف وپیش لفظ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کے قلم سے ہے اور انھوں نے اس کتاب کی دل کھول کر تعریف کی ہے، یہ سیرت کے عطر بیز پھول ہیں، جنھیں ہر شخص حاصل کرسکتا ہے اور اپنی روح کے لئے روحانی غذا فراہم کرسکتا ہے، ادبی حاسہ کے لئے بھی کتاب میں تسکین کا سامان ہے؛ کیوں کہ قلم کی پختگی اور زبان کی شگفتگی کتاب کا امتیاز خاص ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

سیرت کے موضوع پر ایک البیلی کتاب

کیا کوئی تصور کر سکتا ہے کہ سیرت طیبہ کے موضوع پر کوئی کتاب اس طرح بھی لکھی جا سکتی ہے، جس میں احمد، محمد، مصطفیٰ، آنحضرت، رسول اکرم اور خاتم النبیین اور آپ کے دوسرے ناموں میں سے کوئی نام بھی کہیں نہ لیا گیا ہو۔ کتاب سیرت کی ہو؛ لیکن آغاز سے لے کر اختتام تک اور بسم اللہ کی (ب) سے تمت کی (ت) تک آپ کے نام کی صراحت سے بالکل خالی ہو؛ لیکن ایک کتاب ایسی ہی ہے، جس میں آپ کا نام نامی اسم گرامی کہیں مذکور نہیں۔ پوری کتاب آپ کی سیرت پر ہے اور کاوش تحقیق کی صیقل گری سے آراستہ ہے اور عشق رسول میں ڈوبی ہوئی ہے اور انداز بیان ایسا ہے کہ ہر سطر دل میں ترازو ہو جائے؛ لیکن مصنف نے کہیں آپ کا نام نہیں لیا، یہاں ایک شعر یاد آیا، جس میں شاعر نے باانداز غزل محبوب کا نام نہ لینے کی بات کہی تھی:

ہزار حشر میں پرسش ہوئی مگر میں نے
نہ دل کے داغ دکھائے نہ ان کا نام لیا

کتاب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک کہیں نہیں لیا گیا، شاید فاضل مصنف کو یہ احساس ہے کہ مشک وگلاب سے زبان قلم کو دھونے کے بعد بھی آپ کا نام لکھنا بے ادبی ہے۔ چنانچہ مصنف نے نام کو مضمر رکھتے ہوئے کتاب جس انداز سے ضمیر غائب سے شروع کی ہے اسی انداز سے کتاب ختم بھی کی ہے، قلم سے کتاب کا حسن آغاز ملاحظہ ہو جیسے کنج لب سے صبح طلوع ہوتی ہو، جیسے ساز عقیدت سے نغمہ سحر پھوٹتا ہو:

> ''یوں آنے کو تو سب ہی آئے، سب میں آئے سب جگہ آئے (سلام ہو ان پر) کہ بڑی کٹھن گھڑیوں میں آئے؛ لیکن کیا کیجئے کہ ان میں جو بھی آیا جانے ہی کے لئے آیا۔ پر ایک اور صرف ایک جو آیا اور آنے ہی کے لئے آیا، وہی جو آگنے کے بعد پھر کبھی نہیں ڈوبا، چمکا اور چمکتا ہی چلا جا رہا ہے، بڑھا اور بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے، چڑھا اور چڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ سب جانتے ہیں اور سبھوں کو جاننا چاہئے کہ

جنھیں کتاب دی گئی اور جو نبوت کے ساتھ کھڑے کئے گئے، برگزیدوں کے اس
پاک گروہ میں اس کا استحقاق صرف اسی کو ہے، اس کے سوا اور کس کو ہو سکتا ہے جو
پچھلوں میں بھی اسی طرح ہے جس طرح پہلوں میں تھا، دور والے بھی اس کو ٹھیک
اسی طرح پا رہے ہیں اور ہمیشہ پاتے رہیں گے جس طرح نزدیک والوں نے پایا
تھا، جو آج بھی اسی طرح پہچانا جاتا ہے جس طرح کل پہچانا گیا تھا، اسی کے اور
صرف اسی کے دن کے لئے رات نہیں، ایک اسی کا چراغ ہے جس کی روشنی بے
داغ ہے"۔

فاضل مصنف نے اپنے خامہ زرنگار سے علم وفضل کے خزانے لٹائے ہیں، انھوں نے
بھارت ورش کا بھی جائزہ لیا ہے، انھوں نے ویدک دھرم اور بدھ مت کی تاریخیت سے بحث کی ہے
اور لکھا ہے کسی مؤرخ کے پاس اتنا تیل نہیں کہ اس کا چراغ ویدک دھرم کے اساطیر اور اختراعی
داستانوں سے اصل حقیقت کو سامنے لا سکے یا بدھ مت کے بانی کپل دستو کو اس انداز سے پیش
کر سکے جیسا کہ وہ واقعی میں تھا۔ آرین دھرم کی بربادی کا الزام بدھوں اور جینیوں کے سر پر تھوپا جاتا
ہے؛ لیکن ایران کی سرزمین میں وہ آگ کس نے لگائی کہ زرتشت اور اس کے کارنامے جل کر بھسم
ہو گئے، یہاں تک کہ بعض مؤرخین اس کے وجود کو فرضی مانتے ہیں۔ مصنف طویل بحث کرنے کے
بعد سوال کرتا ہے "سمجھ میں نہیں آتا کہ ب جب جانے ہی کے لئے آتے تھے وہ جب چلے گئے تو
اب ان کی تلاش میں لوگ سرگرداں کیوں ہیں؟

مصنف نے ثابت کیا ہے کہ دنیا میں بیشتر قوموں کے پاس صرف اپنے بزرگوں کے نام
باقی رہ گئے ہیں نام کے سوا کام کا کوئی تنکا بھی باقی نہیں ہے، اب لوگ صرف لکیر پیٹتے ہیں، گیا ہے
سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر، اب مرگھٹ پر نالہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں جو چلا گیا وہ اب آنے والا
نہیں۔ مصنف نے اپنی تاریخی بصیرت سے قارئین کو بتایا کہ دنیا میں کوئی مذہبی کتاب قابل اعتماد
نہیں اصل تورات ناپید ہے صرف اس کے غلط سلط ترجمے دنیا میں پائے جاتے ہیں اور سب تحریف
شدہ ہیں، آخر تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل شدہ کیسی کتاب ہے جس میں حضرت موسیٰ
علیہ السلام کی تجہیز وتکفین تک کے واقعات درج ہیں اور جس میں پیغمبروں پر حرام کاری کا الزام لگایا
گیا ہے، جس میں فحش گالیاں تک موجود ہیں، ایسی کتاب دین وشریعت کا سرچشمہ کیسے بن سکتی
ہے۔ مصنف کی ژرف نگاہی نے قاری کو یہ روشنی دکھائی ہے کہ انجیل کا حال دو دو تین تین آنے کی

بازاری قسم کے میلادناموں میلاد سعیدی اور میلاد شہیدی سے زیادہ بہتر نہیں، ان ہی بے سروپا رسالوں کا نام انجیل رکھ دیا گیا ہے اور اسی قسم کی مسخ شدہ انجیلی رسالوں میں سے چار کا انتخاب کر کے یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب کھوئی ہوئی انجیل مل گئی، خدا کی کتاب مل گئی اور چار انجیلوں کا انتخاب کس طرح کیا گیا؟ مشرقی روم کے ایک شہر میں ایک گرجا میں پچاسوں انجیلیں تہ بہ تہ رکھی گئیں اور ایک طرف جبہ و دستار والے پادری یہ دُعاء مانگتے رہے کہ جو انجیلیں ان میں جھوٹی ہیں وہ گر جائیں، کہا جاتا ہے کہ سب انجیلیں گر گئی تھیں، صرف چار باقی رہ گئی تھیں جنھیں سر پر اٹھالیا گیا۔ مصنف نے مذہبی پیشواؤں کی پیشین گوئیاں بھی تفصیل کے ساتھ دے دی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مہاتما بدھ نے ایک آنے والے کی پیشین گوئی اپنے ماننے والوں سے کی تھی۔ یہ پیشین گوئیاں آج بھی موجود ہیں، تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جب سے آسمان پر مہتاب چمکتا آیا ہے اور جب سے اس دنیا میں مہر نیم روز مشرق و مغرب کو منور کرتا رہا ہے، اُفق عالم پر ایک ہی شخصیت ایسی رہی ہے جو چمکی اور اس کی چمک ہمیشہ باقی رہی اس کی تعلیمات اندھیروں کو روشن کرتی رہیں اور جو آج بھی اتنا ہی روشن ہے، جتنا پندرہ سو برس پہلے تھا، اس کو چھوڑ کر کوئی شخصیت اور اس پر جو کتاب نازل ہوئی اس کو چھوڑ کر کوئی کتاب دنیا میں باقی نہیں رہی۔ اس ایک شخصیت کے سوا ہر شخصیت پس پردہ چلی گئی اور اس ایک کتاب کے سوا ہر کتاب زمانہ کے دست برد کا شکار ہو گئی، اب یہ پوتھیاں ہیں جن میں کچھ حقیقتیں ہیں اور کچھ افسانے ہیں اور جو صحیح اور غلط کا ملغوبہ ہیں، حق اور باطل کا آمیزہ ہیں اور جن پر لوگوں کے مذہب کی عمارت قائم ہے اور یہ بات اتنی سچی اور اتنی زیادہ عالم آشکارا ہے کہ ان مذاہب کے ماننے والے بھی اپنی کتابوں کی حرف بحرف صحت کا دعویٰ نہیں کرتے ہیں۔ دنیا میں کونسی کتاب ہے جو قرآن کے ہم مرتبہ ہو سکتی ہے اور کونسی شخصیت ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم دوش بن سکتی ہے۔ اس پوری کتاب میں آپ کا کہیں نام نہیں لیا گیا، سیرت کے واقعات سے لطیف نتائج پیدا کئے گئے ہیں، کتاب کی دوسری خصوصیت البیلا اُسلوب بیان ہے سطر سطر سے وارفتگی کا اظہار ہے، پوری کتاب والہانہ انداز میں لکھی گئی ہے، مصنف اپنے اُسلوب بیان میں منفرد ہے، جیسے صاف و شفاف ندی گاتی اور گنگناتی ہوئی سنگ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی گذر رہی ہے، ذیل کی چند سطریں کتاب کے اُسلوب کا نمونہ ہیں:

پھر جب مکہ والوں نے سب کو دیکھا اس وقت سے دیکھا جب وہ ان میں
بے باپ کا ہوا، بے ماں کا ہوا، انھوں نے اس کو جانا اس وقت سے جانا

جب شہر کی صبح کو بیاباں میں چوپایوں کے ساتھ گذار کر شام کرتا تھا،
انھوں نے اس کا تجربہ کیا جب وہ اپنے اندر صرف امانت کی شعاعیں اور
صداقت کی کرنیں ان کے اندر مسلسل جذب کر رہا تھا، اس عجیب و غریب
نظارہ کے وہی گواہ تھے، جب ان ہی کے آگے مکہ کا سب سے بڑا غریب
حجاز کا سب سے بڑا امیر کر دیا گیا تھا؛ لیکن ان ہی کے سامنے" صلہ رحمی،
حمل کل، کسب معدوم، قری ضیف، اعانت علی نوائب الحق" کے بہتے
ہوئے دھاروں میں سے سب کچھ بہا کر اپنے کو غریب کر لیا تھا۔

کتاب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہیں؛ لیکن قاری کو موضوع سے آشنا کرنے کے لئے کتاب کا نام رکھا گیا ہے" النبی الخاتم" کتاب کا مصنف اگر چہ مردم خیز ریاست بہار کے قصبہ گیلان کا باشندہ تھا؛ لیکن اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے ۱۹۲۰ء میں اسے عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبہ دینیات میں استاذ مقرر کیا گیا، مصنف کا نام ہے مناظر احسن گیلانی، مولانا گیلانی ۱۹۴۹ء میں شعبہ کے صدر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے، اس عجیب و غریب البیلی کتاب کے علاوہ ابوذر غفاری، تدوین حدیث، امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی اور ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم ان کی مشہور کتابیں ہیں، شیریں گفتاری اور شگفتہ بیانی کی خصوصیات رکھنے والا یہ بے بدل عالم ۱۹۵۶ء میں اپنے وطن میں ابدی نیند سو گیا اور دنیا اس خوش قلم مصنف کی بارش قلم سے محروم ہوگئی۔

☆ ☆ ☆ ☆

نیا ہے لیجیئے جب نام ان کا!

مولانا محمد رابع حسنی ندوی صدر مسلم پرسنل لا بورڈ کی ایک کتاب نقوش سیرت کے نام سے پہلے شائع ہو چکی ہے، جو سیرت پر مختلف مضامین کا مجموعہ ہے اور اب سیرت پر ایک مکمل اور جامع کتاب ان کے قلم سے رہبر انسانیت کے نام سے منظر عام پر آئی ہے۔ سیرت کا موضوع سدا بہار ہے، ہر کتاب بادِ نو بہار ہے اور ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است کا مصداق ہے۔ سیرت کے موضوع پر لہلہاتے ہوئے چمن میں اب ایک اور گل تر کا اضافہ ہو گیا ہے اور وہ ہے رہبر انسانیت، سیرت پر کئی وقیع کتابیں ملتے جلتے نام سے پہلے شائع ہو چکی ہیں۔ شاہ جعفر پھلواروی ندوی کی کتاب پیغمبر انسانیت اپنے انداز کی منفرد کتاب ہے، نعیم صدیقی کی کتاب محسن انسانیت سیرت کے لٹریچر میں ایک اہم اضافہ ہے اور اب ایک نیا اہم اضافہ رہبر انسانیت ہے۔ یہ اضافہ اس لئے اہم ہے کہ سیرت طیبہ اور جزیرۃ العرب کی تاریخ اور اس کا جغرافیہ مدتوں مولانا محمد رابع حسنی ندوی کے مطالعہ کا اور تدریس کا موضوع رہا ہے۔ ان کی کتابیں جغرافیہ جزیرۃ العرب اور حج اور مقاماتِ حج ان کے جغرافیائی ذوق کی آئینہ دار ہیں۔ سیرت کے موضوع پر ان کی یہ نئی کتاب ایک عمر کے مطالعہ کا اور غور و فکر اور تحقیق کا حاصل ہے، کتاب اگرچہ علمی ہے؛ لیکن زبان سادہ سلیس اور عام فہم ہے اور چوں کہ غیر مسلم ذہن کی رعایت بھی کی گئی ہے، اس لئے ہندی اور انگریزی اور مختلف زبانوں میں کتاب کا ترجمہ دعوتی نقطۂ نظر سے بھی مفید ثابت ہوگا۔ سیرت طیبہ کے مطالعہ میں مصنف کا نقطۂ نظر کس قدر متوازن اور صائب ہے اس کا اندازہ قدم قدم پر ہوتا ہے۔ مصنف کے قلم سے مقدمہ کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:

> حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی مقرر کیا گیا اور ان کی ذمہ داری کے کاموں میں عقیدہ توحید کی صحت اور اپنے رب واحد کی عبادت اور اس کے حکموں پر چلنے کے ساتھ اس کے دیئے ہوئے علم سے صحیح فائدہ اٹھانے اور اجتماعی نظام کو انسانی اور شریفانہ نظام بنانے کی ذمہ داری رکھی گئی۔

جب تک دین اور اس کے تمام اجزاء اور احکام پر اور شریعت میں ان کی درجہ بندی پر قاری کی نظر نہ ہوگی ان جملوں کی معنویت اس کے سمجھ میں نہیں آسکتی ہے۔ ان مختصر جملوں میں وہ معیار پوشیدہ ہے جس سے دینی شخصیتوں اور دینی جماعتوں کی کوششوں کو ان کے طرز فکر کو بھی جانچا اور پرکھا جاسکتا ہے۔ بظاہر یہ بہت سادہ جملے ہیں؛ لیکن ان کے توازن کو وہی شخص محسوس کرسکتا ہے جس کی نظر دین کے مزاج پر بھی ہو اور مختلف جماعتوں اور اداروں کے مزاج پر بھی ہو۔ یہ بالکل ممکن ہے ایک شخص عبادت گذار ہو، تہجد گذار ہو، دیندار ہو؛ لیکن اس کے باوجود وہ مزاج شناس دین نہ ہو مزاج شناس رسول نہ ہو۔ دین کے بارے میں انسان کی فکر میں توازن پیدا ہوتا ہے، سیرت نبوی کے بار بار مطالعہ سے اور اس میں غور وفکر کی عادت سے، علم کا مرتبہ عبادت سے بلند اسی لئے رکھا گیا ہے۔

کتاب میں ظہور قدسی سے پہلے دنیا کے ملکوں کا حال بہت تفصیل سے بتایا گیا ہے؛ لیکن یہ حال مولانا علی میاں صاحب کی کتاب نبی رحمت میں بھی تفصیل سے ہے۔ کسی شخص کی کامیابی کا اندازہ اس سے بھی کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنے چاروں طرف افراد کی کیسی تربیت کی، سیرت کی اس کتاب کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت اور صحبت سے تیار ہونے والے اشخاص کے حالات بھی بیان کردیئے گئے ہیں؛ تاکہ پڑھنے والوں کو اندازہ ہو کہ انسانیت کی کیسی عظیم الشان نرسری تیار ہوگئی تھی۔ آسمان نبوت کے ان چاند تاروں سے بڑھ کر زیادہ حسین اور روشن تارے چشم فلک نے نہیں دیکھے تھے، مکی زندگی اور مدنی زندگی دونوں کی تفصیلات حالات اور واقعات کتاب میں مفصل موجود ہیں، صرف واقعات نہیں بیان کئے گئے ہیں؛ بلکہ ان کا مؤرخانہ اور فلسفیانہ تجزیہ بھی ہے؛ لیکن سب کچھ اس سادگی بیان کے ساتھ ہے کہ عام آدمی بھی ان سے مستفید ہوسکتا ہے۔ اس کتاب میں بعض ایسی خصوصیات ہیں جو سیرت کی دوسری کتابوں میں نہیں ملتی ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مکہ معظّمہ میں کیوں ہوئی، اس موضوع پر کتاب میں جو مواد ہے وہ سیرت کی عام کتابوں میں نہیں ملتا ہے، قدم قدم پر جغرافیائی تفصیلات سے مصنف کتاب کا جغرافیائی ذوق آشکار ہے۔ جغرافیہ کے ساتھ جب تاریخ کا مطالعہ بھی وسیع ہو تو اس سے وہ دانشوری پھوٹتی ہے، جو کسی تصنیف کو باوقار اور وزن دار بنادیتی ہے۔ کتاب میں قدم قدم پر حالات اور واقعات اور زمان ومکان اور تاریخ وتمدن کی عالمانہ تفہیم ملتی ہے۔ تورات اور انجیل اور ویدوں میں بعثت کی بشارت کا تذکرہ ہے، شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات اور

امتیازات کا بیان ہے، عربوں میں بت پرستی کیسے عام ہوئی عربوں کی سماجی اور اخلاقی عادات کیا تھیں، ان سب کے بارے میں عام فہم؛ لیکن دل نشین انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔ پھر اسلام نے معاشرہ میں جو انقلاب پیدا کیا اس کی تصویر پیش کی گئی ہے، عربوں کا تذکرہ ہو اور ان کی تاریخ ہو، ان کے مقامات ہوں اور ساتھ میں سیرت طیبہ کا بیان ہو اور پھر مولانا محمد رابع حسنی ندوی کا قلم ہو تو پھر ایسا لگتا ہے معلومات کا دریا رواں ہو گیا ہے یا پہاڑی ندی ہے جو پر خروش انداز میں بہ رہی ہے۔

مولانا محمد رابع حسنی نے دائی حلیمہ کے یہاں اور وادی بنو سعد میں طفلی کا زمانہ ابن ہشام کے حوالے سے تفصیل سے لکھا ہے۔ راقم سطور کو دیار بنو سعد اور اس جگہ کو دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی، جہاں شق صدر کا واقعہ پیش آیا تھا۔ یہ راہ جان بوجھ کر بہت ناہموار اور دشوار گذار رکھی گئی ہے کہ کہیں کوئی محبت کا مارا مکین کی وجہ سے مکان کی محبت میں نہ گرفتار ہو جائے، چنانچہ غار حرا اور غار ثور تک دیکھنے کی ہمت افزائی نہیں کی جاتی ہے۔ بانی سلطنت کی یادگاروں کو محفوظ کرنے میں کوئی قباحت نہیں سمجھی جاتی ہے؛ لیکن فخر موجودات خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے متعلق آثار اور تاریخی مقامات کے دیکھنے کو شرک کا مرادف قرار دیا جاتا ہے، چشم حیراں ہے کہ اس کی حیرانی نہیں جاتی۔

کتاب کی پوری توصیف ممکن نہیں ہے، مصنف نے جس سادگی اور سہل زبان کے ساتھ سیرت طیبہ کو پیش کیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے، سیرت کے موضوع پر ایک جامع اور مکمل کتاب سامنے آئی ہے، کتاب کا شمار اُردو زبان میں سیرت کی اہم کتابوں میں ہوگا۔

کتاب پر قیمتی پیش لفظ سید محمد واضح حسنی ندوی معتمد تعلیمات دار العلوم ندوۃ العلماء کے قلم سے ہے۔ انھوں نے سیرت کے موضع پر مستشرقین کی کتابوں کا جائزہ لیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ انھوں نے حقیقت پسندی اور غیر جانب داری کا ثبوت نہیں دیا؛ لیکن بہت سے عیسائی ہیں، جنھوں نے وسعت ظرفی کے ساتھ مسلمانوں کی رواداری اور حسن سلوک کا اعتراف کیا ہے۔ مقدمہ نگار نے ان کی کتابوں کا بھی حوالہ دیا ہے، مقدمہ نگار کا مطالعہ وسیع ہے، عربی کے ساتھ انگریزی کتابیں بھی ہمیشہ ان کے مطالعہ میں رہتی ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆

ارکانِ اربعہ

بہار کے موسم میں غزل خوانی کی جاتی ہے، رمضان کا مہینہ بھی نیکیوں کا موسم بہار ہے، اس موسم میں نغمہ لطیف کو چھیڑنے کے لئے بھی کسی ساز اور کسی آواز کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ روحانیت محسوس طریقہ پر مادیت پر غالب آسکے، تاکہ عبادت میں حلاوت پیدا ہوسکے اور سوز عشق کی کیفیت اور لذت پیدا ہوسکے۔

ارکانِ اربعہ اس دور کے میر کارواں اور مجدد عصر رواں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تصنیف لطیف ہے۔ لطیف کا لفظ یہاں بر بنائے قافیہ نہیں ہے؛ بلکہ فی الواقع یہ کتاب لطافت و روحانیت کی شاہکار کتاب ہے۔ مولانا کی شخصیت لاکھوں ستاروں کی جھرمٹ میں ماہ کامل کے مانند تھی معدن انسانیت کے اس ہیرے کے مانند تھے، جس کا ہر پہلو درخشاں ہوتا ہے۔ ان کی جاں پرسوز تھی نگاہ بلند تھی اور سخن دل نواز تھا، وہ اس شبنم کے مانند تھے جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک پیدا ہوتی ہے۔ مولانا بہت بڑے مصنف تھے، عرب دنیا اور عالم اسلام میں ان کی کتابیں ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں، تاریخ دعوت وعزیمت ان کی بہت مقبول کتاب ہے یہ وہ سلک گہر ہے جس کے درنایاب نگاہوں کو خیرہ کرتے ہیں، حقیقت میں یہی وہ کتاب ہے جسے تاریخ اسلام کا حقیقی نام دیا جاسکتا ہے، ورنہ تاریخ اسلام کے نام پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ فرماں روایان وقت اور ان کے دربار کے چاروں طرف گردش کرتی ہیں۔ جو شخص تاریخ اسلام کا مکمل اور مفصل مطالعہ کرنا چاہتا ہے، اسے چاہئے کہ علامہ شبلیؒ کی سیرۃ النبی ﷺ پہلے پڑھے اور کئی جلدوں والی اس کتاب کا مطالعہ اگر ممکن نہ ہو تو مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ایک جلد کی کتاب نبی رحمت پڑھ لے، اس موضوع پر اور بھی بہت اچھی کتابیں موجود ہیں۔ اس کے بعد مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی صدیق اکبر پڑھے اور اس کے بعد علامہ شبلیؒ کی مشہور کتاب الفاروق، حضرت عثمان کی سیرت کے مطالعہ کے لئے سعید احمد اکبر آبادی کی کتاب عثمان ذوالنورین بھی اچھی کتاب ہے، اگرچہ اس کتاب کا معیار ان ہی کی کتاب صدیق اکبر کی طرح بلند نہیں ہے۔ حضرت علی ؓ کی سیرت پر مولانا ابوالحسن علی کے خامۂ عنبر شامہ

شائع ہوئی کتاب المرتضیٰ کے نام سے شائع ہو چکی ہے اور اس موضوع پر جتنی کتابیں منظر عام پر آئی ہیں، ان میں سب سے بہتر ہے۔ خلافت راشدہ کے آسمان پر نور کی بارش کرنے والے ستاروں کی ضیاپاشی سے کسبِ نور کرنے کے بعد تاریخ دعوت وعزیمت کی پانچ جلدوں کا مطالعہ کرنا چاہئے کہ اس کے بغیر تاریخ اسلام کا ہر مطالعہ ناقص اور نامکمل کہلائے گا۔

ارکانِ اربعہ دراصل دین اسلام کے شعائر اور عبادات کی صحیح تشریح اور ان کے مقاصد کو اور اسرار دین کو دلوں میں جاگزیں کرنے کی سعی مشکور ہے۔ امام غزالیؒ سے لے کر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی تک جن لوگوں نے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج اور ان کے اسرار وحکم کے بارے میں جو کچھ خامہ فرسائی کی ہے یہ کتاب اس کا عطر مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں نماز بھی ہے، رمضان کا روزہ بھی ہے، زکوٰۃ بھی ہے، جسے اکثر لوگ رمضان میں نکالتے ہیں اور ان سب کے ساتھ حج کی عاشقانہ عبادت کا بیان ہے، جس کا موسم رمضان کے تھوڑے عرصہ کے بعد آتا ہے۔ اس لئے اس کتاب سے استفادہ کا خاص موسم رمضان کا مہینہ ہے اس میں رمضان اور روزے کے فضائل یا مسائل زیادہ نہیں بیان کئے گئے ہیں، اس کتاب کا موضوع دوسرا ہے۔ اس میں انسان کی نفسیات اور اس کے مزاج سے بھی گفتگو کی گئی ہے، روزے کے سلسلے میں اس پر گفتگو ہے کہ انسان نہ تو حیوان ہے نہ فرشتہ اور یہ کہ انسان کو اگر خلیفہ بنایا گیا ہے تو خلافت کے تقاضے کیا ہیں روح اور جسم کی باہمی کشمکش کی حقیقت کیا ہے، انسان کے اندر متضاد میلانات کیوں پائے جاتے ہیں، ان پر قابو کس طرح پایا جاسکتا ہے، معدہ کی پرستش اور اس کے مہلک اثرات معاشرہ پر اور خود انسان پر کیا پڑتے ہیں، انسانیت کے اعلیٰ مقصد کی تکمیل کس طرح سے ہو سکتی ہے روزے کے حقیقی مقاصد کیا ہیں اور اعلیٰ اخلاقی مقاصد کی تکمیل کے لئے نبوت کی چارہ سازی کیوں ضروری ہے؟ اعتکاف کا باب بھی ہے اور معاشرہ پر روزے کے اصلاحی کردار کو بہت نمایاں کیا گیا ہے۔ پھر اس کے بعد دوسرے مذاہب میں جو روزہ پایا جاتا ہے اس سے اسلام کے روزے کا تقابلی علمی مطالعہ بھی اس کتاب میں موجود ہے، اس سلسلہ میں مصنف نے مشرق اور مغرب کی تمام کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے اور ان سب کے حوالے دیئے ہیں۔ انھوں نے رمضان کو عبادات کا عالمی موسم اور اعمال صالحہ کا جشن عام قرار دیا ہے، اب مضامین میں رمضان کے ذکر میں عبادات کے جشن اور موسم بہار کی ترکیب عام طور پر استعمال کی جانے لگی ہے؛ لیکن اس کا استعمال سب سے پہلے مولانا ہی کے لطافت خیز اور روح انگریز قلم سے ہوا ہے۔

مولانا نے ارکانِ اربعہ اور عبادات کے بیان میں ہر جگہ فطرت انسانی اور اس کی

باریکیوں کا ذکر کیا ہے اور عبادات کا فطرت انسانی سے ربط ظاہر کیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب فضائل اور مسائل کی کتابوں سے بالکل مختلف ہے، یہ کتاب اسرار دین کی تشریح کے موضوع سے متعلق ہے، رمضان کے مہینہ میں اس کتاب کے مطالعہ سے نہ صرف روزے میں؛ بلکہ نمازوں میں بھی جان پڑ جاتی ہے اور زکوۃ کا ادا کرنا ٹیکس ادا کرنے کی طرح ناگوار نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ ایک خوشگوار فریضہ بن جاتا ہے۔

مولانا کی رحلت کو ابھی چند سال ہی گذرے ہیں، افسوس کے وہ ناوک فگن اُٹھ گیا، جس کے تیر بھی دل نشین ہوتے تھے، وہ زبان خاموش ہوگئی ہے جس کے نطق پر ارباب حکومت بھی گوش برآواز ہوجاتے تھے، وہ قلم تھم گیا جو نصف صدی تک مسلسل اسلامی موضوعات پر گوہر بار رہا تھا، وہ مثالی شخصیت دنیا سے اُٹھ گئی جس نے اپنے اخلاق وکردار سے سلف صالحین کا نمونہ پیش کیا تھا، وہ عارف باللہ مصنف دنیا سے چلا گیا جو ایک طرف سوانح نگاری میں جانشین سلیمان وشبلی تھا، دوسری طرف تزکیہ وتصوف کے میدان میں جانشین جنید وشبلی تھا، ان کی یہی جامعیت تھی کہ جس نے ان کو اپنے معاصرین اور ارباب کمال میں امتیازی حیثیت دے دی تھی۔

☆ ☆ ☆ ☆
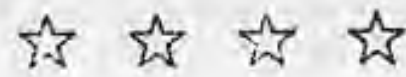
ازالة الخفا فی خلافة الخلفاء

خلافت راشدہ کی تاریخی دستاویز اور عہد جدید میں اس کی معنویت

ازالۃ الخفا کی ابتداء میں کتاب کے مصنف حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کا رہوارِ قلم یوں حرکت میں آتا ہے:

می گوید فقیر حقیر ولی اللہ عفی عنہ، کہ دریں زمان بدعت تشیع، آشکارا شدو
نفوس عوام، بشبہات ایشان متشرب گشت، واکثر اہل این اقلیم دراثبات

خلافت ، خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین شکوک بہم رسانیدند۔ (ازالۃ الخفا: ۱/۱)

فقیر حقیر ولی اللہ عفی عنہ کہتا ہے کہ اس زمانہ میں تشیع کی بدعت کا شیوع ہوا ،عوام کی طبیعتیں ان کے پیدا کئے ہوئے شبہات سے گہرے طور پر متاثر ہوئیں ، اس علاقہ کے اکثر باشندوں کے دل میں خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ثبوت خلافت کے بارے میں طرح طرح کے شکوک واعتراضات پیدا ہوگئے۔

حضرت شاہ صاحب کی نظر بہت عمیق تھی ، انھوں نے محسوس کیا کہ اگر اس فرقہ کج اندیش کا نظریہ بار آور ہوا تو پھر پورا دین مشکوک ہو جائے گا ؛ کیوں کہ خلفائے ثلاثہ کے بارے میں کج فکری اور کج اندیشی پورے دین کو ساقط الاعتبار بنا دینے کے ہم معنی ہے۔ چنانچہ انھوں نے خلافت راشدہ پر ایک دستاویزی کتاب لکھی اور خلفاء کی سیرت کے نقوش کو دلوں پر مرتسم کر دیا یہ علم کی خدمت بھی تھی ، دین کی خدمت بھی تھی اور علم تاریخ کی خدمت بھی تھی۔

خلافت راشدہ خیر القرون کا حصہ اور حضرت شاہ ولی اللہ کی زبان میں نبوت کا بقیہ ہے۔ اسلام کے اجتماعی نظام کا یہی عہد معتبر ترین آئینہ ہے اور خلافت راشدہ کی اہمیت کو کم کرنا یا خلفائے ثلاثہ کا انکار کرنا اسلام کے ایک ستون کو جسے امامت کبریٰ یا خلافت علی منہاج النبوۃ کہتے ہیں ، منہدم کرنے کے مرادف ہے ؛ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس ستون کو منہدم کرنے کی کوشش ، خواہش اور سازش کی جاتی رہی ہے۔ اس لئے اس عہد کی تاریخ کو ایک معتبر وثیقہ کے طور پر مرتب کر دینے کا نام صرف ایک علمی خدمت نہیں ؛ بلکہ بنائے دین کو استوار کرنے کا تاریخ ساز کارنامہ ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ''ازالۃ الخفا فی خلافۃ الخلفاء'' لکھ کر یہ کارنامہ انجام دیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اس عہد کی تاریخ اور خلفاء اربعہ کی سیرت اس طرح مرتب کی ہے کہ خلافت راشدہ کا عہد قرآن کی آیات کی تفسیر اور وعدہ ربانی کی تکمیل کی شکل میں سامنے آتا ہے اور پڑھنے والا یہ یقین کرنے لگتا ہے کہ اس عہد کا انکار یا اس کے بڑے جزء پر عدم اعتماد آیات قرآنی اور وعدہ ربانی کے انکار کا ہم معنی ہے۔

خلفائے راشدین آسمان نبوت کے سب سے زیادہ درخشاں چاند ستارے ہیں، خلفائے ثلاثہ کی رتبہ شناسی کا انکار آسمان نبوت کے تب وتاب کو کم کر دینے کا ہم معنی ہے۔ بدقسمتی سے

مسلمانوں کا ایک فرقہ جو حق پر نہیں، خلفائے ثلاثہ کی عظمت کا انکار کرتا ہے؛ بلکہ ان کے خلاف زبان درازی کرتا ہے، لہٰذا خلیفۂ رابع کو ''خلیفۂ رسول اللہ بلافصل'' قرار دیتا ہے۔ آج ہماری اس تحریر کا موضوع ہے کہ جس گرامی شخصیت کو خلیفۂ رسول اللہ بلافصل قرار دیا جاتا ہے، خود ان کی رائے خلفائے ثلاثہ کے بارے میں کیا ہے ہم نے اپنی اس تحریر کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی تاریخ ساز کتاب ازالۃ الخفا کی روشنی میں مرتب کیا ہے۔

حضرت علی کے اقوال سے پہلے موضوع سے متعلق چند حدیثوں کو اور شاہ صاحب کی تاویلات قرآنی کو بھی سامنے رکھنا چاہئے۔ حضرت ابو سعید کی روایت کردہ حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر نبی کے لئے دو وزیر اہل آسمان سے اور دو وزیر اہل زمین سے ہوتے ہیں، میرے دو وزیر اہل آسمان سے جبرئیل اور میکائیل ہیں اور اہل زمین سے ابوبکر وعمر ہیں، اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔ سورہ نور میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں اور عمل و کردار کو صالح بنانے والوں سے خلافت کا وعدہ فرمایا ہے، اس آیت استخلاف سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے خلفائے راشدین کے ذریعہ اپنے وعدہ کی تکمیل فرمائی ہے۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ آیت استخلاف کا یہ مفہوم سب سے پہلے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ذہن میں آیا، حضرت عمر فاروق نے صحابہ سے عراق کی جنگ میں بنفس نفیس شریک ہونے کے ارادہ کے سلسلہ میں مشورہ لیا تو حضرت علی نے یہی آیت استخلاف پیش کرتے ہوئے ان کو فتح کا اطمینان دلایا اور بنفس نفیس جانے کے ارادہ سے باز رکھا۔ حضرت علی کا یہ قول ''نہج البلاغۃ'' میں موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ میرے بعد خلافت تیس برس رہے گی، خلفائے اربعہ کی خلافت راشدہ کا ثبوت اس حدیث سے ملتا ہے، اس حقیقت کو بھی سامنے رکھنا چاہئے کہ صحیفہ قرآن اور حفظ قرآن کا وعدہ بھی خلفاء ثلاثہ کے عہد میں پورا ہوا ہے۔

حضرت علی حضرات شیخین حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے اس درجہ قائل ہیں کہ ان کو سب سے افضل اور اللہ اور اس کے رسول کے سب سے زیادہ مخلص قرار دیتے ہیں، حضرت علی کے یہ اقوال خود حضرات شیعہ کے کتابوں سے ثابت ہیں۔ شرح میسم مطبوعہ تہران جلد ۱۳۱ اور نہج البلاغہ قسم دوم مطبوعہ مصر صفحہ ۳۰ پر حضرت علی کے ارشادات موجود ہیں، ہر شخص ان اقوال کو آسانی سے پڑھ سکتا ہے۔ ترمذی کی حدیث حضرت علی سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوبکر وعمر انبیاء و مرسلین کے سوا تمام پیرانِ اہل جنت کے سردار ہیں، پھر آپ نے حضرت علی کو کہا اے علی! ان

دونوں کوتم اس کی خبر کر دینا، اس روایت کو اولاً حسن اور اولاد حسین رحمہم اللہ نے بھی بیان کیا ہے، یہ روایت دوسرے صحابہ کرام نے بھی بیان کی ہے۔

ابن ماجہ میں عبداللہ بن سلم نے حضرت علی کا قول نقل کیا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بہتر ابوبکر ہیں اور ابوبکر کے بعد سب سے بہتر عمر ہیں۔

علقمہ بن قیس نے حضرت علی سے روایت بیان کی ہے جسے امام احمد نے نقل کیا ہے۔ حضرت علی نے ممبر پر فرمایا کہ کیا میں تمہیں اس شخص کو جوامت میں نبی کے بعد سب سے بہتر ہے نہ بتادوں، پھر انھوں نے حضرت ابوبکر کا ذکر کیا، پھر فرمایا کہ کیا میں دوسرے شخص کو بھی نہ بتادوں (جو ان کے بعد سب سے بہتر ہیں) پھر حضرت عمر کا ذکر کیا۔

امام شعبی سے روایت ہے وہ ابووائل سے روایت کرتے ہیں، وہ کہتے تھے کہ حضرت علی ابن ابی طالب سے فرمایا گیا کہ آپ لوگوں پر کسی کو خلیفہ کیوں نہیں بناتے، آپ نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو اپنا خلیفہ نہیں بنایا کہ میں بھی کسی کو اپنا خلیفہ بناؤں، اگر خدا کو لوگوں کے ساتھ بھلائی منظور ہوگی تو وہ عنقریب میرے بعد کسی ایسے شخص پر متفق کر دے گا جو سب میں بہتر ہوگا۔

ابوعمر نے استیعاب میں حکم بن حجل سے روایت کی ہے کہ حضرت علی فرماتے تھے کہ جو شخص مجھے ابوبکر اور عمر پر فضیلت دے گا میں اس پر مفتری کی حد (اسی درے) جاری کروں گا۔

ترمذی میں ہے کہ حضرت علی نے حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر نبی کے ساتھ نجباء اور رقباء ہوتے ہیں، مگر مجھے چودہ نجباء اور رقباء عطا ہوئے ہیں، ہم لوگوں نے حضرت علی سے پوچھا کہ وہ کون ہیں، انھوں نے فرمایا کہ میں اور میرے دونوں بیٹے (حسن اور حسین) اور جعفر اور حمزہ اور ابوبکر وعمر، مصعب بن عمیر اور بلال، سلمان فارسی اور عمار، عبد اللہ بن مسعود اور ابوذر اور مقداد (رضی اللہ عنہم)۔

ترمذی میں ہے کہ ابوحیان تیمی نے اپنے والد سے اور انھوں نے حضرت علی سے روایت کی ہے، وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ رحم کرے ابوبکر پر (انھوں نے بڑے بڑے نیک کام کئے ہیں) مجھے اپنی بیٹی بیاہ دی اور مجھے دار ہجرت (مدینہ) تک سوار کر کے لائے اور بلال کو اپنے مال سے خرید کر کے آزاد کیا، اللہ رحم کرے عمر پر، سچ کہتے ہیں اگر چہ وہ تلخ ہو، ان کو حق (بات بولنے) نے اس حال پر پہنچادیا کہ حق (بولنے) کے سبب کوئی ان کا دوست نہیں رہا،

اللہ رحم کرے عثمان پر (وہ ایسے باحیا ہیں کہ) فرشتے ان سے حیا کرتے ہیں، اللہ رحم کرے علی پر، خداوندا جس طرف وہ پھریں ان کے ساتھ حق کو بھی اسی جانب پھیر دے، (اس حدیث سے خلافت راشدہ کی اسی ترتیب کا اشارہ ملتا ہے)۔

ابوعمر نے استیعاب میں حسن (بصری) سے روایت کی ہے، وہ قیس بن عباد سے روایت کرتے ہیں کہ وہ کہتے تھے، مجھ سے حضرت علی بن ابی طالب نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرض وفات میں کچھ دن اور کچھ راتیں ایسی تھیں کہ جب اذان ہوتی تھی تو آپ فرماتے کہ (اے لوگو) ابوبکر سے کہہ دو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھادیں، پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو میں نے اس پر نظر کی کہ نماز اسلام کی علامت اور دین کا ستون ہے، لہٰذا (جب ابوبکر اس میں ہمارے امام ہو چکے تو) ہم نے اپنے دنیا کے (سردار ہونے کے) لئے اس شخص کو پسند کرلیا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے دین (کی سرداری) کے لئے پسند فرمایا تھا، پس بلا تکلف ہم سب نے حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔

ریاض النضرۃ میں اسید بن صفوان سے روایت ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق نے انتقال فرمایا تو ان پر ایک چادر اڑھادی گئی اور مدینہ رونے والوں کی آواز سے گونج اٹھا، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دن رونے والوں کی آواز سے گونج اُٹھا تھا، پھر حضرت علی تشریف لائے، آپ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے جاتے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے کہ آج خلافت نبوت کا خاتمہ ہوگیا...... حضرت علی نے فرمایا کہ اے ابوبکر! آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوست تھے، آپ ان کے مونس تھے، آپ ان کے مرجع اور معتمد تھے اور آپ ان کے رازدار اور مشورہ دینے والے تھے اور آپ سب سے پہلے اسلام لائے، آپ سب سے زیادہ خالص الایمان تھے اور سب سے زیادہ مضبوط یقین کے تھے اور سب سے زیادہ خدا کا خوف رکھتے تھے، سب سے زیادہ اللہ کے دین کے لئے نافع تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگہداشت میں سب سے فائق تھے اور سب سے زیادہ اسلام (مسلمانوں) پر شفقت کرنے والے تھے، سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق رفاقت ادا کرنے والے تھے، بارگاہ رسالت میں سب سے زیادہ مقرب تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سب سے زیادہ باعزت تھے، اللہ تعالیٰ آپ کو اسلام کی طرف سے اور اپنے رسول کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے، (حضرت ابوبکر کی شان میں حضرت علی کی طویل تقریر کا یہ محض اقتباس ہے)۔

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے مناقب بہت ہیں، ہم نے ان مناقب کے پھولوں میں صرف ان پھولوں کا انتخاب کیا ہے جو زیب دامانِ علی اور ان کے اقوال جلی ہیں۔ حضرت علی نے ان دونوں حضرات کی تحسین و تعریف میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا، اگر شیعہ حضرات اپنے مسلک میں اعتدال پیدا کرلیں اور تمام خلفاء راشدین کے قائل ہوجائیں اور صحابہ کو مجروح کر کے ختم المرسلین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کارنامہ حیات کو مجروح نہ کریں تو شیعہ سنی اختلاف کی خلیج کم کی جاسکتی ہے۔

اب خلفائے ثلاثہ میں حضرت عثمان ذوالنورین کا نام باقی رہ جاتا ہے، ازالۃ الخفا میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے وہ روایات نقل کی ہیں جو حضرت علی سے منقول ہیں اور جن میں حضرت عثمان کے رتبہ کا بیان ہے۔

حاکم نے دو سندوں سے روایت کی ہے، ایک سند وہ ہے جس میں ہارون بن اسماعیل خزاز ہیں، اس روایت میں ہے کہ قیس بن عباد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا کہ وہ بروز جنگ جمل فرماتے تھے، خداوندا! میں عثمان کے خون سے تیرے سامنے اپنی براءت ظاہر کرتا ہوں، مجھے شرم آتی ہے کہ اس قوم سے بیعت لوں جس نے ایک ایسے شخص کو شہید کیا ہے جس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیا ہم اس شخص سے حیا نہ کریں جس سے فرشتے حیا کرتے ہیں"۔

حاکم نے بروایت حاطبی بیان کیا ہے کہ حضرت علی نے عمار بن یاسر اور محمد بن ابی بکر سے فرمایا اور محمد بن حاطب کو مخاطب کر کے کہا کہ اے محمد بن حاطب جب تم مدینہ جاؤ اور تم سے حضرت عثمان کی نسبت پوچھا جائے تو تم کہنا کہ حضرت عثمان ان لوگوں میں تھے جو ایمان لائے پھر خدا سے ڈرے اور ایمان لائے پھر خدا سے ڈرتے رہے اور نیک کام کرتے رہے اور اللہ دوست رکھتا ہے نیک کام کرنے والوں کو، (حضرت عثمان کے سلسلہ میں یہ حضرت علی کی شہادت ہے)۔

ازالۃ الخفا فی خلافۃ الخلفاء کے حرف آغاز میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا تھا کہ شیعیت کا زور بڑھ رہا ہے اور اسلامی عقائد اس سے متاثر ہو رہے ہیں اور یہ کتاب اسلامی عقائد کے دفاع کے لئے اور خلفائے ثلاثہ پر اعتماد بحال کرنے کے لئے ترتیب دی گئی ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے انتقال کو ڈھائی سو سال ہو گئے؛ لیکن اس کتاب کی قیمت اہمیت اور معنویت میں اضافہ ہوا ہے کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ اس موضوع سے متعلق شاہ صاحب کے وفور علم کی طغیانی اور اشہب قلم کی جولانی کی ضرورت آج جس قدر ہے، پہلے شاید اس قدر نہ تھی، یہ کتاب اس لائق تھی کہ

دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہوتے، اس کے مشمولات کی عام اشاعت ہوتی؛ لیکن ابھی تک عربی زبان تک میں کوئی ایسا قابل قبول دلنشیں ترجمہ منظر عام پر نہیں آیا جس کی حجۃ اللہ البالغۃ کی طرح علمی حلقوں میں پذیرائی ہو سکے۔ ازالۃ الخفاء کا عربی ترجمہ المجلس العلمی ڈابھیل سے ہوا تھا؛ لیکن وہ عرب ملکوں میں اور اہل زبان کے حلقوں میں نہیں پہنچ سکا، جن لوگوں نے ترجمہ کے کام کا بیڑا اٹھایا ہوگا انھیں عربی زبان کے جدید اُسلوب ادب کی خبر ہی نہ ہوگی۔ علامہ شبلی نعمانی نے اس عہد میں عربی لکھنے والوں کا تذکرہ اس کالم میں کیا ہے، جو وہ الہلال میں لکھا کرتے تھے اور جس کا نام ہوتا تھا" نظرے خوش گذرے" انھوں نے فرنگی محل کے ایک استاذ کی عربی دانی کا نمونہ پیش کیا تھا، "جاء الحکیم ورأی النبض وکتب النسخة" یعنی حکیم صاحب تشریف لائے اور انھوں نے نبض دیکھی اور نسخہ تحریر فرمایا، درست عربی جب ہوتی جب 'جاء الطبیب وجس النبض وکتب الوصفة' لکھتے۔

ازالۃ الخفا کی اس دور میں اہمیت یہ ہے کہ اب ایک پورا ملک روئے زمین پر واقع ہے جو مسلک شیعیت کی اشاعت میں اس قدر سرگرم ہے کہ پہلے کبھی نہیں تھا۔ رات دن حکومت کی سرپرستی میں اربوں ڈالر خرچ کر کے مختلف موضوعات پر وہاں سیمینار منعقد ہوتے ہیں، جن میں اہل سنت کو دعوت دی جاتی ہے اور شیعیت سے متعلق لٹریچر تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس حکومت کے جتنے سفارت خانے ہیں وہ سب شیعیت کی تبلیغ کے مراکز ہیں ہر سال ہزاروں کی تعداد میں لڑکوں اور لڑکیوں کو دنیا کے مختلف ملکوں سے اسکالرشب دے کر بلایا جاتا ہے، اور "قم" کے مدرسوں میں انھیں داخل کیا جاتا ہے۔ یہ طلبہ وہاں سے فارغ ہو کر اپنے ملکوں میں تعلیم کے سنٹر قائم کرتے ہیں، حکومت ایران ان تعلیم گاہوں کے قیام کا خرچ برداشت کرتی ہے۔ آج ازالۃ الخفا کی دنیا کی بہت سی زبانوں میں ترجمہ کی ضرورت ہے اور دنیا میں اس کی عمومی اشاعت کی ضرورت ہے، ایران میں المتحولون کے نام سے کئی جلدوں میں ضخیم انسائیکلوپیڈیا تیار ہوئی ہے، جس میں ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو سنی سے شیعہ ہو گئے، اگر "ازالۃ الخفا اور تحفہ اثنا عشریہ" جیسی کتابوں کی اشاعت نہیں ہوگی تو ہر سال اس انسائیکلوپیڈیا کی ایک نئی جلد منظر عام پر آتی رہے گی۔

آخر میں اس کا اظہار بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنا شمار ان لوگوں میں کرتا ہوں جو تحزب اور فرقہ بندی سے دور رہتے ہیں اور مسلکی تعصب کو پسند نہیں کرتے ہیں، ہم شیعہ سنی اتحاد کے داعی بھی ہیں اور علامہ اقبال کے ہم نوا بھی، جنھوں نے کہا تھا:

اے گرفتار ابوبکر و علی ہوشیار باش

لیکن اگر وہ تحریک چلائی اور پھیلائی جائے جس سے عظمت صحابہ مجروح ہوتی ہے اور خلفائے ثلاثہ کے سلسلہ میں دل میں میل آتا ہے تو پھر میرے نزدیک اس تحریک کا مقابلہ بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ شیعہ حضرات بھی انسان ہیں اور وہ بھی عقل وفہم رکھتے ہیں ان کے سامنے اس لٹریچر کو پیش کرنے کی ضرورت ہے جس سے صحابہ کرام اور بالخصوص حضرت ابوبکر وعمر وعثمان کے بارے میں حسن ظن پیدا ہو، اس لئے کہ ان حضرات کے بارے میں سوء ظن درحقیقت ختم نبوت پر الزام ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی تربیت واصلاح میں ناکام ونامراد ثابت ہوئے اور تاریخ میں ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے، جنھوں نے اپنے نقطۂ نظر کی اصلاح کرلی اور پہلے شیعہ تھے پھر سنی ہو گئے اور علی گڑھ میں نواب محسن الملک کا اسم گرامی اس کے لئے معروف ہے، ازالۃ الخفاء کا جو شخص ترجمہ دوسری زبانوں میں کرے گا وہ محسن الملک بھی ہوگا اور محسن الملۃ بھی ہوگا۔

☆ ☆ ☆ ☆
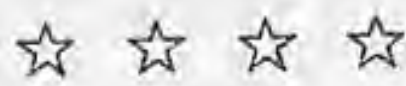
خانوادۂ نبوت پر انگریزی میں ایک نئی کتاب

شاعر نے کہا تھا:

نیا ہے لیجئے جب نام ان کا
بڑی وسعت ہے ان کی داستاں میں

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور سیرت پر دنیا کی مختلف زبانوں میں کتابوں کا سیلاب آیا ہوا ہے اور ہر زمانے میں اور دنیا کی بہت سی زبانوں میں سیرت پر کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جارہی ہیں، یہ ایک نہ ختم ہونے والا مبارک سلسلہ ہے۔ ایسا نہیں کہ کتابوں میں صرف مضامین کی تکرار ہے؛ بلکہ ہر کتاب میں ایک طرفگی ہے اور ایک نیا پن ہے۔ قابل مبارکباد ہیں وہ

اشخاص جن کے نام سیرت نگارانِ رسول ﷺ کے سلسلہ زریں میں آتے ہیں، قیامت کے دن جب لوگ گروہ در گروہ اُٹھائے جائیں گے اور جنت کی جانب لے جائے جائیں گے تو ایک گروہ ان خوش قسمت انسانوں کا ہوگا جنھوں نے خدا کے حبیب سے محبت کی تھی اور سیرت کی کتاب لکھ کر اس محبت کا رجسٹریشن کروالیا تھا اور کتاب لکھ کر اس محبت کو مستحکم کر دیا تھا۔ اس طلائی سلسلہ میں اب پروفیسر شمیم علیم کا بھی نام ہے، جن کی کتاب (Prophet Muhammad and His Family) کی رسم اجراء کی مبارک محفل کچھ پہلے منعقد ہو چکی ہے، یہ کتاب پروفیسر شمیم علیم کی عشق رسول کی دستاویز ہے اور ان کے لئے زادِ آخرت اور اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں بدگمانی اور غلط فہمی کا شکار ہونے والوں کے لئے ایک چشم کشا کتاب۔

قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ ہم آپ کے ذکر کو سربلند کریں گے، اس دنیا میں کیسے کیسے ناموں کے نشان مٹ گئے، نہ گور سکندر ہے نہ قبر دارا ہے؛ لیکن اللہ کے حبیب ہی کا نام نہیں؛ بلکہ اللہ کے حبیب کی حدیثوں کی روایت کرنے والوں کا نام بھی اور ان احادیث کو جمع کرنے والوں کا نام بھی اور آپ کی سیرت کے لکھنے والوں کا نام بھی آپ کے نام نامی اور اسم گرامی کے طفیل تاریخ کے حافظہ میں محفوظ ہو گیا ہے۔ کیا انسانیت کی پوری تاریخ میں کسی اور کا نام ہے جو اتنا بلند ہو، اتنا روشن ہو جس کا ذکر اتنا وسیع ہو اور اتنا عالم گیر ہو اور جس کا نام خدا کے نام کے ساتھ دن میں پانچ بار پوری دنیا میں شہر شہر گاؤں گاؤں محلے محلے میں میناروں کی بلندیوں سے لیا جاتا ہو، ایسی سطوت اور دلوں پر ایسی حکومت اور ایسی شہرت اور ایسی عزت کیا کسی اور نام کی بھی دنیا میں پائی جاتی ہے؟

خاندان نبوت کے حالات پر جو کتاب لکھی جائے وہ سیرت کی کتاب ہے اور سیرت کی کتابوں کا سلسلہ قرن اول ہی سے شروع ہو گیا تھا، ابتداء اس طرح سے ہوتی ہے کہ حالات نبوی اور غزوات نبوی پر حدیثیں اور روایتیں جمع کی گئیں، پھر اس کے بعد تصنیفات کا دور شروع ہوا اولین سیرت نگاروں میں ابن اسحاق کا نام آتا ہے جو پہلی صدی ہجری میں ۸۵ھ میں پیدا ہوئے دوسری صدی ہجری میں ان کا انتقال ہوا۔ پھر ابن ہشام کا نام آتا ہے، جو تیسری صدی کے ممتاز مؤرخ اور سیرت نگار ہیں، جنھوں نے مفصل سیرت ابن اسحاق کو سامنے رکھ کر سیرت کی تلخیص پیش کی ہے؛ لیکن یہ تلخیص بھی بہت ضخیم اور مبسوط ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ سیرت کا موضوع کتنا مبارک ہے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے یہ حضرات سیرت کی تصنیف کا کام شروع کرتے ہیں، آستانہ نبوت کے

فرش سے اٹھتے ہیں اور شہرت اور ناموری کے عرش تک پہنچ جاتے ہیں، سیرت پر کام ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ اس وقت سے آج تک سینکڑوں کتابیں سیرت پر بے شمار زبانوں میں لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جارہی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی اور ہر کتاب کی اپنی خصوصیت ہوگی اور اپنی انفرادیت ہوگی، ''ہر گلے رارنگ و بوئے دیگر است'' مثال کے طور پر اُردو زبان کو دیکھئے علامہ شبلی اور علامہ سید سلیمان ندوی کی سیرت النبی ﷺ سات جلدوں میں سیرت پر انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے، زبان و ادب کے اعتبار سے بھی یہ کتاب اہم ہے، شبلی نے کتاب کا آغاز اپنے ان اشعار سے کیا ہے:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا

مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

پھر اُردو میں سیرت کی کتابوں میں قاضی سلیمان منصور پوری کی رحمۃ اللعالمین ہے، مولانا عبد الرؤف دانا پوری کی اصح السیر ہے، نعیم صدیقی کی محسن انسانیت ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی نبی رحمت ہے، مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی سیرۃ المصطفیٰ ہے، ڈاکٹر حمید اللہ کی محمد رسول اللہ اور خطبات بھاولپور ہے، سر سید احمد خاں کی خطبات احمدیہ ہے اور پھر سید سلیمان ندوی کی خطبات مدراس ہے، ڈاکٹر آصف قدوائی کی مقالات سیرت ہے۔ ہمارے یہاں بعض سیرت کی کتابیں فکشن کے انداز میں بھی لکھی گئی ہیں، عبد الحلیم شرر کی ''جویائے حق'' اور ماہر القادری کی ''در یتیم'' ناول کے اُسلوب میں سیرت کی کتاب ہے۔ کتابوں کی بہت طویل فہرست میں سے صرف چند نام یہاں لئے گئے ہیں، اسی طرح سے ہندوستان میں انگریزی میں سیرت پر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جسٹس امیر علی کی اسپرٹ آف اسلام اور ہسٹری آف سارا سانس مشہور کتابیں ہیں، اسی طرح سیرت کی ایک کتاب کا نام ہے ''فلیم آف ڈی ڈیزرٹ'' جو مسٹر گابا کی تالیف ہے اور بھی انگریزی میں کتابیں ہیں، صرف نام لکھے جائیں تو اس کے لئے کئی صفحات درکار ہیں، آج سیرت کی انگریزی کتابوں میں ایک نئی کتاب کا اضافہ ہو رہا ہے، یہ پروفیسر شمیم علیم کی کتاب ''پروفٹ محمد اینڈ ہز فیملی'' ہے۔

پروفیسر شمیم علیم ۳۵ سال تک عثمانیہ یونیورسٹی سے بحیثیت استاد وابستہ رہی ہیں اور اب

امریکہ میں مقیم ہیں، اُردو اور انگیزی دونوں زبانوں میں لکھتی رہیں ہیں، دونوں زبانوں میں کئی کتابوں کی مصنفہ ہیں ان کا اشہب قلم دونوں زبانوں میں اپنے جوہر دکھاتا ہے اور ابھی مستقبل میں ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آئیں گی، شاعر نے کہا تھا: ''ترے جنون کا خدا سلسلہ دراز کرے'' میں کہتا ہوں ترے سخن کا یا ترے قلم کا خدا سلسلہ دراز کرے، شاعر نے اپنے ممدوح کو مبارکباد دی تھی: '' تم سلامت رہو ہزار برس اور ہر برس کے دن ہوں پچاس ہزار'' یقیناً شعر میں مبالغہ ہے اور دُعاء میں بھی مبالغہ ہے؛ لیکن یہ دُعاء اگر کسی ادیب اور مصنف کو دی جائے تو اس میں مبالغہ نہیں: کیوں کہ ادیب اور اسکالر کی تصنیفات صدیوں تک لائبریریوں میں محفوظ رہیں گی اور آنے والی نسلیں ان سے استفادہ کریں گی، ایک اچھی اور وقیع کتاب لکھ کر انسان اپنی عمر میں کئی صدی کا اضافہ کرلیتا ہے ، پروفیسر شمیم علیم نے بھی کئی صدیوں کا اضافہ کرلیا ہے۔

امریکہ میں نائین الیون کے بعد اسلام پر جب دہشت گردی کا الزام لگایا جانے لگا تو انھیں خیال ہوا کہ اسلام کے بارے میں اور پیغمبر اسلام کے بارے میں ایسی کتاب لکھی جائے، جس سے شبہات ختم ہوں اور اسلام کی صحیح تصویر لوگوں کے سامنے آئے۔ یہ کتاب اپنے انداز میں منفرد ہے، ایک خاتون کو سب سے زیادہ لگاؤ خاندان سے ہوتا ہے، اس لئے یہ سیرت کی ایسی کتاب ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے خانوادہ پر روشنی ڈالتی ہے۔ کتاب کا پہلا باب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے لئے خاص ہے، دوسرا باب ازواج مطہرات کے بارے میں ہے جن کی حیثیت امہات المومنین کی ہے اور ان کے ساتھ بحیثیت شوہر آپ ﷺ کا سلوک کیا تھا اس پر کتاب کے اس باب میں روشنی ڈالی گئی ہے، تیسرے باب میں فرداً فرداً تمام ازواج مطہرات کی شخصیت کا خاکہ ہے، آخری باب اولاد و احفاد کے بارے میں ہے۔ پروفیسر شمیم علیم قابل مبارکباد ہیں، خدا کرے چمنستانِ سیرت کی یہ شمیم جان فزا دور دراز کے ان ملکوں تک پہنچے جہاں انگریزی زبان بولی جاتی ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

امام رازیؒ

امام رازیؒ، تاریخ اسلام کی اہم اور موقر علمی شخصیتوں میں ہیں، وہ مفسر بھی ہیں، فلسفی بھی ہیں، متکلم بھی ہیں، اُردو میں امام رازیؒ کے بارے میں مولانا عبدالسلام ندوی نے تحقیقی کتاب لکھ کر ایک خلا پر کردیا تھا، مولانا عبدالسلام ندوی کا نام علمی ادبی اور تحقیقی حلقوں میں مشہور و معروف ہے، وہ علامہ شبلی کے شاگرد، دارالمصنفین کے رکن اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، اہل علم کے لئے عبدالسلام ندوی کا نام کتاب کے معتبر اور مستند ہونے کی ضمانت ہے، پھر دارالمصنفین کی ہر کتاب علمی اور تحقیقی زاویہ سے اور اُسلوب بیان کے اعتبار سے عمدہ معیار کی ہوتی ہے۔ اگر ایک انسان صرف دارالمصنفین کی تمام کتابوں کو پڑھ ڈالے اور ان کتابوں کا مواد اسے ایک حد تک متحضر ہو جائے تو پھر وہ بیک وقت ادیب مؤرخ اور اسلامی علوم وفنون کا معتبر عالم بن جائے گا، شاید ہی کسی اور علمی اور تصنیفی ادارے کو یہ امتیاز خاص حاصل ہوگا۔ اسلامی علوم وفنون کی خدمت کے اعتبار سے اُردو زبان کا نمبر عربی زبان کے بعد آتا ہے اُردو زبان کو یہ شرف شاید حاصل نہ ہوتا اگر دارالمصنفین جیسا ادارہ وجود میں نہ آتا، ایک طرف اُردو زبان کا یہ امتیاز ہے دوسری طرف اہل اُردو کے تغافل کا انداز ہے، مشکل سے ایسے قدردانوں کے گھر ملیں گے، جہاں دارالمصنفین کی کتابوں کا سٹ موجود ہو۔ تاریخ اسلام میں بنو امیہ کا زمانہ کشور کشائی اور فتوحات کا زمانہ ہے، علوم نقلیہ اور عقلیہ کی اقلیم کی کشورستانی کا زمانہ عباسیوں کی حکومت سے شروع ہوتا ہے، حکمت و فلسفہ اور علم کلام کے میدان میں بڑے بڑے امام اور مجتہدین اس دور میں پیدا ہوئے۔ امام غزالی اور امام رازی حکماء اور متکلمین کے درمیان بہت ممتاز تھے، علامہ شبلی نے امام غزالی پر کتاب لکھ کر ان کی کتاب حیات کو اہل علم کے سامنے پیش کردیا۔ فلسفہ و کلام کے دوسرے ستون امام رازی تھے، مولانا عبدالسلام نے امام رازی کے نام سے کتاب لکھ کر عظمت رازی کے راز سے پردہ اٹھایا، انھوں نے امام رازی کے خیالات اور نظریات کی تشریح کی، امام رازی کے خیالات ان کی تفسیروں اور دوسری کتابوں میں جن کی تعداد ۸۰ کے قریب ہے، بکھرے ہوئے ہیں، انھیں یکجا کرنا اور مرتب شکل میں پڑھنے والوں کے لئے پیش کردینا ایک علمی کارنامہ ہے۔

امام رازی کا زمانہ بہت سے فرقوں اور فلسفوں کا زمانہ ہے ، اس لئے مجادلوں اور مناظروں کا بازار گرم رہتا تھا، امام رازی مناظروں کے میدان کے شہسوار تھے، ان کی کتاب جو مناظروں پر مشتمل ہے اب شائع ہو چکی ہے، اس کتاب میں انھوں نے ہندوستان آنے کا بھی ذکر کیا ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ وہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں گئے اور انھوں نے دیکھا کہ اس ملک کے کفار خدا کے وجود پر متفق ہیں؛ لیکن ہندوستان کے سفر کی زیادہ تفصیل نہیں ملتی ہے۔ کثرت مناظرہ نے امام رازی کو نقصان بھی پہنچایا، بہت سے فرقے ان کے دشمن جاں بن گئے، دلیلوں سے امام رازی شکست دے دیتے تھے؛ لیکن دلیل سے دل کو زیر نہیں کیا جا سکتا تھا، اسی لئے حق کی اشاعت کے لئے مناظروں کا طریقہ کبھی مفید نہیں سمجھا گیا، دلیلوں کی جنگ بھی تلوار کی جنگ کی طرح ہوتی ہے، تلوار سے جسم زخمی ہوتے ہیں اور دلیل سے دماغ؛ لیکن دل دماغ کا تابع نہیں ہوتا ہے۔ اکثر حالات میں دماغ دل کا محکوم ہوتا ہے اور دل کے حکموں کی بجا آوری میں دلیلیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لاتا ہے، امام رازی نے اپنی صلاحیت ذہانت اور قوت تقریر کا لوہا سب سے منوالیا تھا، ان کی حیثیت ایک امام اور شیخ الاسلام اور واجب التعظیم عالم کی بن گئی تھی۔ ان کے وقت کا ایک ایک لمحہ علمی مشغلہ میں گذرتا تھا، کھانا کھاتے وقت جب کتاب ہاتھ سے چھوٹ جاتی تو انھیں اس کا قلق ہوتا ان کے علم کا شہرہ چاردانگ عالم میں گونج رہا تھا؛ لیکن اس مجسم عقل و دماغ شخص کو ایک مجسم سوز و گداز دل کے سامنے جھکنا پڑا اور بالآخر وہ مرد صالح شیخ نجم الدین کبریٰ کے ہاتھ پر بیعت بھی ہو گئے۔ ان کا علمی مرتبہ اس قدر بلند تھا کہ سلاطین وقت ان کی قدر دانی کرتے تھے، اس لئے کہ وہ کشور علم و قلم کے سلطان تھے، جب کہ سلاطین زمانہ کی سلطانی رقبہ زمین پر ہوتی تھی، اس علمی وجاہت کی وجہ سے وہ خوش حال اور فارغ البال شخص بن گئے تھے اور ان کی مفلوک الحالی کا زمانہ ختم ہو گیا تھا، یہ شعر ان کے حسب حال بن گیا تھا:

قلم گوید کہ من شاہ جہانم
قلم کش را بدولت می رسانم

امام رازی خوش قسمت تھے کہ ان کے زمانہ میں قلم شاہ جہاں ہوتا تھا اور قلم کش مرفہ الحال ہوتے تھے، اب اس دور میں قلم کش غربت مآب ہوتا ہے، اگر وہ اُردو زبان کا قلم کش ہو تو وہ نانِ شبینہ کا محتاج بھی ہو سکتا ہے اور سدرمق کے لئے زکوٰۃ و صدقات کا مستحق بھی ہو سکتا ہے۔ اب امام رازی کے عہد کی طرح اہل قلم اور اہل علم پر زر پاشی کرنے والے ارباب اقتدار و اختیار باقی نہیں رہے، امام

صاحب نے علمی وجاہت اوراہل حکومت پراثر ورسوخ کی وجہ سے اتنی دولت کمائی کہ شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے، ان کا جب انتقال ہوا تو انھوں نے ترکہ میں اسی ہزار اشرفیاں چھوڑیں۔ بادشاہ خوارزم شاہ خودان سے ملنے کے لئے ان کے گھر پر آتا تھا، ایک باشاہ ایک جلیل القدر عالم کے دروازہ پر کھڑا ہوتا تھا۔ ان کے تلامذہ کی کثرت کا یہ حال تھا کہ جب وہ چلتے تھے تو تین سو تلامذہ ان کے جلو میں چلتے تھے، وہ شاہی فوج میں ہر ہفتہ وعظ بھی کہتے تھے، انھیں وعظ گوئی میں کمال حاصل تھا، عربی فارسی دونوں زبانوں میں وعظ کہتے تھے، ان کی مجالس وعظ میں شاہانہ جاہ وجلال پایا جاتا تھا۔ ہرات کی جامع مسجد کے صدر ایوان میں ان کے لئے منبر بنایا گیا تھا، جب وہ وعظ کہتے تو امراء اور اعیان سلطنت شریک ہوتے، ترکی غلاموں کی دو صفیں تلواروں سے ٹیک لگائے کھڑی ہوتیں۔

امام رازی اگرچہ معقولات کے امام تھے اور اسلام کے ہر عقیدہ پر بے شمار عقلی دلیلیں رکھتے تھے، پھر بھی کہا کرتے تھے کہ جو شخص بوڑھی عورتوں کے دین کا پابند ہو کر مرے وہی کامیاب ہے۔ وہ اپنے نفس کا محاسبہ بھی کرتے تھے اور نماز روزہ میں کمی نہیں کرتے تھے اور آخر عمر میں امام رازی کہا کرتے تھے کہ فلسفہ اور حکمت و منطق میں تعمق اور غور و فکر میں وہ فائدہ نہیں جو قرآن مجید میں غور کرنے میں فائدہ ہے۔ امام صاحب کی تصنیفات یوں تو ہر موضوع پر ہیں اور ۸۰ سے زیادہ ہیں؛ لیکن ان کا سرمایہ کمال فلسفہ اور علم کلام اور علم تفسیر ہے، وہ ان علوم کی مملکت کی اورنگ زیبی کرتے نظر آتے ہیں اور ان میدانوں میں کوئی ان کا ہمسر اور ہم دوش نہیں۔ فلسفہ کے رد پر کتابوں کا سلسلہ تو پہلے شروع ہو چکا تھا اور ارسطو کی عقلیت کا طلسم ٹوٹنا شروع ہو چکا تھا یحییٰ نحوی، نظام معتزلی، حسن بن موسیٰ نوبختی اور ابوبکر باقلانی اور شیخ شہاب الدین مقتول کے تابڑ توڑ حملوں سے فلسفہ نیم جاں اور مرغ بسمل بن چکا تھا۔ امام غزالی نے فلسفہ کی بنیادوں پر تیشہ چلایا اور فلسفہ کے رد میں تہافت الفلاسفہ لکھی اور اخیر میں جب امام رازی کی باری آئی تو انھوں نے فلسفہ ارسطو کی رہی سہی وقعت بھی خاک میں ملادی، انھوں نے فلسفہ کی دھجیاں اُڑادیں۔ مقصد یہ تھا کہ فلسفہ کے زیر اثر عقائد اسلام پر جو حملے ہوتے تھے، ان حملوں کا خاتمہ کردیا جائے اور فلسفہ اتنا کمزور ہو جائے کہ اسے مذہب کے خلاف کھڑے ہونے کی ہمت نہ ہو سکے اور فلسفہ کے مقابلہ میں ذہنوں میں جو احساس کمتری پایا جاتا تھا وہ مٹ جائے۔ فلسفہ کی دیوار جو ارسطو نے بلند کی تھی اور جسے فارابی اور ابن سیناء نے سہارا دیا تھا منہدم ہوگئی، امام رازی کا میلان عقلیت کی طرف بہت زیادہ تھا، بعض مسائل میں وہ فرقہ جبریہ کے ہم نوا نظر آتے ہیں؛ لیکن اکثر کلامی مسائل میں ان کی رائے مجتہدانہ ہے، وہ کسی کے پابند نہیں ہیں۔

امام رازی نے خدا کے وجود اور عقیدۂ توحید، عقیدۂ رسالت اور معجزات وغیرہ پر دلیلیں پیش کیں اور علم کلام کے ذریعہ مذہب کا اثبات کیا مسئلہ خیر وشر کو اور جزا اور سزا کو عقل سے ثابت کرنے کی کوشش کی۔ احادیث میں خبر آحاد پر بحث کی اور یہ ثابت کیا ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ علم ظنی حاصل ہوتا ہے، اس لئے عقائد کے باب میں خبر آحاد مقبول نہیں، صرف فروعی احکام کے لئے قابل قبول ہیں۔ امام رازی چوں کہ بہت بڑے فلسفی اور متکلم تھے؛ اس لئے کتاب بھی فلسفیانہ بحثوں سے بھری ہوئی ہے۔ لذت والم اور رنج وغم کی حقیقت کیا ہے، زہر اور مضر اشیاء کیوں پیدا کی گئی ہیں، سعادت اور لذت کیا چیز ہے، دنیا میں انسان کے وجود کی غرض وغایت کیا ہے، بیماری اور مصیبت کیوں آتی ہے؟ قیامت کا آنا کیوں ضروری ہے، عبادت اور عبودیت کی حقیقت کیا ہے، جنت اور اس کی نعمتوں کا راز کیا ہے، جبر واختیار کا مسئلہ کیا ہے، قیامت میں رؤیت باری کس طرح ممکن ہے، کسی شئی کو دیکھنے کے لئے جسم مکان اور حیز کا ہونا ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ ان سب چیزوں سے بے نیاز ہے، پھر آخر رؤیت باری آخرت میں کس طرح ہوگی، یہ اور بے شمار مسائل ہیں جن کو اہل دل وجدان کے ذریعہ حل کرتے ہیں اور دلیل نقلی سے ثابت کرتے ہیں اور امام رازی دلیل عقلی کے ذریعہ۔ انسان کو کبھی کبھی پاسبان عقل کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔

امام رازی کی کتابوں میں تفسیر کبیر بہت مشہور ہے، اس تفسیر میں حکماء اور فلاسفہ کے اقوال بہت زیادہ آگئے ہیں، اس حد تک کہ اس تفسیر کے بارے میں کسی قدر مبالغہ کے ساتھ کہا گیا کہ اس میں سب کچھ ہے سوائے تفسیر کے۔ جس طرح علامہ شبلی کی کتاب الغزالی ہر صاحب علم کی آنکھوں کا سرمہ ہے، مولانا عبدالسلام ندوی کی کتاب امام رازی بھی مطالعہ کے لائق ہے۔ فاضل مصنف نے جگہ جگہ امام رازی کے دلائل پر عقلی اعتراض بھی وارد کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے علوم عقلیہ کے بحر میں صرف شناوری نہیں کی ہے، غواصی بھی کی ہے، اور ہزاروں لولوئے لالہ لے کر نکلے ہیں۔ مشاہیر اسلام میں ابھی بہت سی شخصیتیں ہیں، جن پر لکھنا قرض اور اہل علم پر فرض ہے، جیسے شیخ عزالدین ابن سلام اور امام الحرمین، ابن خلدون پر لکھا گیا ہے؛ لیکن ان کے شایان شان ابھی کتاب نہیں آئی ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے کتاب ''امام رازی'' لکھ کر ایک بہت بڑے خلا کو پُر کیا ہے، کتاب دارالمصنفین نے شائع کی ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

علامہ شبلی کی کتاب ''الغزالی'' کی عصر حاضر میں معنویت

شبلی کی ''الغزالی'' ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی، ایک صدی گذر جانے کے باوجود بھی کتاب کی اہمیت اور اس کی قیمت باقی ہے۔ پہلے یہ جان لینے کی ضرورت ہے کہ امام محمد ابو حامد الغزالی کا مشہور نام غزالی حرف ''ز'' کی تخفیف کے ساتھ ہے یا حرف ''ز'' تشدید کے ساتھ، اقبال کا شعر ہے:

رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی

عرف عام میں نام امام غزالی ہے، حرف ''ز'' کی تخفیف کے ساتھ، یہی اقبال نے باندھا ہے، ورنہ اگر ''ز'' پر تشدید پڑھیں گے تو شعر وزن سے خارج ہو جائے گا؛ لیکن علامہ شبلی کا اصرار ہے کہ نام غزّالی ہے حرف ''ز'' پر تشدید ہے اور انھوں نے اس کی کئی دلیلیں بھی دی ہیں اور اپنی کتاب کا نام جو ''الغزالی'' رکھا ہے تو ''ز'' پر تشدید بھی دے دی ہے؛ تاکہ لوگ اسے غزّالی پڑھیں حقّانی اور دلّالی کے وزن پر۔

امام صاحب کی پیدائش ۴۵۰ھ میں طوس خراسان میں ہوئی جو قدیم فارس اور موجودہ ایران میں واقع ہے، انھوں نے تعلیم کے لئے جرجان کا قصد کیا اور امام ابو نصر اسماعیلی سے تعلیم حاصل کی۔ درس کے افادات وہ ضبط تحریر میں لاتے تھے، انھوں نے جن اوراق میں یہ افادات لکھے تھے وہ بوقت واپسی دوسرے سامانوں کے ساتھ چوری ہو گئے، انھیں اس کا بہت غم تھا، وہ کسی صورت سے پتہ چلا کر کے چور کے پاس پہنچے اور عرض گذار ہوئے اور عاجزی کے ساتھ ملتمس ہوئے کہ تم تمام سامان لے لو؛ لیکن وہ دولت علم جن اوراق وقراطیس میں محفوظ ہے انھیں واپس کر دو؛ کیوں کہ ہم نے انھیں کے سیکھنے کے لئے جرجان کا سفر کیا تھا، چور سن کر ہنسا کہ تم نے کیا خاک علم کی دولت حاصل کی کہ ایک کاغذ نہ رہا تو تم کورے کاغذ کی طرح ہو گئے، جس پر کچھ لکھا ہوا نہیں ہوتا

ہے۔ چور نے ان کی کاپیاں واپس کر دیں؛ لیکن چور کی یہ بات امام غزالی کے دل میں تہ نشیں ہوگئی، بالکل تیر نیم کش کی طرح جو پار نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ جگر میں اُتر کر ٹھہر جاتا ہے اور مسلسل خلش کا سبب بنتا ہے اور بے قرار رکھتا ہے۔ اب انھوں نے جو کچھ سیکھا تھا اور جو کچھ انھوں نے بعد میں پڑھا اور علم حاصل کیا وہ سارا زبانی یاد کر لیا اور اسے اپنے حافظے کا جز بنالیا، یعنی سفینہ کی دولت کو انھوں نے سینہ کی دولت بنالیا اور پھر وہ اپنی یادداشت کی وجہ سے زندہ اور متحرک کتب خانہ بن گئے اور اب ان کو رہزن کا خوف باقی نہ رہا۔

رہا کھٹکا نہ چوری کا دُعاء دیتا ہوں رہزن کو

علوم کی تحصیل اس درجہ تک پہنچ گئی تھی کہ ان کے اپنے دیار کے علماء ان کی تشفی نہیں کر سکتے تھے نہ ان کی برابری کر سکتے تھے۔ دولت قرطاس کو ذہن کی سلوٹوں میں سمیٹ لینے کا خیال انھیں چور کے طنزیہ جملہ کے بعد آیا، غور کرنے کی بات ہے کہ امام غزالی کی شخصیت پر اس چور کا کتنا بڑا احسان ہے اور امام غزالی کے واسطہ سے اس چور کا پوری اسلامی تاریخ پر کتنا بڑا احسان ہے، نہ وہ چور امام غزالی کا سامان چوری کرتا نہ امام غزالی امام غزالی بنتے نہ اسلامی کتب خانہ کو ''احیاء العلوم'' جیسی مذہب واخلاق پر کتاب اور ''المنقذ من الضلال'' جیسی حصول یقین پر کتاب اور تہافتہ الفلاسفہ جیسے رد فلسفہ اور اسلامی عقائد کے اثبات کی کتاب حاصل ہوسکتی۔ بہت سی چیزیں جن کو انسان زحمت سمجھتا ہے، رحمت ثابت ہوتی ہیں اور فرد کے یا قوم کے فائدہ کے لئے ہوتی ہیں، قرآن میں ہے ''عسیٰ أن تكرهوا شيأ وهو خير لكم'' اسی کو انگریزی میں (Blessing in disguise) کہتے ہیں۔ مولانا آزاد انگریزی حکومت کے زمانہ میں جیل نہ جاتے تو غبار خاطر جیسی ادب کی شاہکار کتاب کیسے وجود میں آتی صرف مولانا آزاد نے نہیں؛ بلکہ بہت سے لوگوں نے جیل میں رہ کر نا قابل فراموش کتابیں لکھی ہیں۔ جب علامہ ابن تیمیہ سے جیل کے پاسبانوں نے متاع لوح وقلم چھین لی تو انھوں نے زبانِ حال سے کہا کہ ''خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے'' اور پھر انھوں نے اپنے علم کو بطور مجاز نہیں؛ بلکہ بطور حقیقت نوشتہ دیوار بنادیا اور کوئلہ سے دیواروں پر لکھنے لگے۔ بہت سے ادیبوں نے صاحبِ فراش ہوکر کتابیں لکھی ہیں، اسی طرح کسی ادیب کے پیر میں اگر لنگ ہوجائے اور خدا کی زمین اس پر تنگ ہوجائے اور وہ عصائے پیری کا استعمال کرنے لگے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ قرطاس وقلم کی دنیا میں اب اس کا سفر زیادہ ہونے لگے گا، علامہ شبلی کے ساتھ بھی یہی ہوا، جو نہ صرف ''الغزالی'' بلکہ بے شمار علمی ادبی اور تاریخی کتابوں کے مصنف ہیں۔

امام غزالی کو جب اپنے وطن میں کوئی ایسا شخص نہ ملا جس سے وہ علم کی مزید تحصیل کرتے تو باہر نکلے کہ وہ پھول سر چڑھا جو وطن سے نکل گیا۔ امام صاحب نیشا پور گئے اور امام الحرمین کی خدمت میں حاضر ہوئے، جو مدرسۂ نظامیہ نیشا پور کے مدرس اعظم تھے، امام الحرمین کا نام عبد الملک اور لقب نظام الدین تھا؛ لیکن ان کو امام الحرمین اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ مکہ مدینہ میں درس دے چکے تھے اور ان کی شہرت کا آفتاب عروج پر تھا اور ان کا حلقۂ درس مرجع عوام و خواص تھا۔ سلاطین وقت ان کا احترام کرتے، ایک بار بادشاہ وقت ملک شاہ سلجوقی نے ایک حکم دیا، امام الحرمین نے اعلان کیا کہ ملک شاہ سلجوقی کا حکم غلط ہے باشاہ نے احتراماً اپنا حکم واپس لے لیا اور اسے امام الحرمین کے سامنے جھکنا پڑا۔ اب امام غزالی کو جو خود جید عالم تھے، امام الحرمین جیسا استاد ملا اور امام الحرمین کو غزالی جیسا شاگرد، امام الحرمین کا جب انتقال ہوا تھا تو نیشا پور کے تمام بازار بند ہو گئے تھے، ان کے کئی سو شاگردوں نے دوات و قلم توڑ دیئے کہ اب کون ہے، جس کے افادات نوٹ کئے جائیں گے اور پھر سال بھر ان کا ماتم ہوتا رہا۔ پھر امام غزالی کی شہرت بعد میں اپنے استاد سے بھی زیادہ ہو گئی ، امام غزالی کو زمانہ بھی ایسا ملا جو علمی کاموں کے لئے سازگار تھا، ملک شاہ سلجوقی کی حکومت کا زمانہ تھا جو دور اندیش اور علم دوست باشاہ تھا اس کا وزیر نظام الملک طوسی اپنے عدل، تدبر اور حسن انتظام کے لئے ملک گیر شہرت رکھتا تھا۔ ممالک اسلامیہ میں تعلیم گاہوں کا جال بچھا ہوا تھا، ملک میں امن و امان کا دور دورہ تھا، سلطنت وسیع اور پر رونق تھی، دولت کی بھی کمی نہ تھی اور راوی چین ہی چین لکھتا تھا، نظام الملک نے امام غزالی کو مدرسہ نظامیہ نیشا پور کے مسند درس کے لئے منتخب کیا اور اس سے امام صاحب کی عزت اور شہرت میں مزید اضافہ ہوا، نیشا پور کے مدرسۂ نظامیہ جیسے ادارہ کے مسند درس پر فائز ہونا وہ منصب تھا، جو آج کے دور میں کسی بڑی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہونے سے بھی زیادہ بلند تھا اور جو بڑے بڑے اہل کمال کی منتہائے آرزو ہوا کرتا تھا۔

امام غزالی کی شہرتِ علم آسمان سے باتیں کر رہی تھی؛ لیکن یہاں سے ان کی زندگی کا ایک نیا موڑ شروع ہوتا ہے، اچانک انھوں نے اقلیم شہرت و جاہ کے تاج و تخت کو خیر باد کہا اور ویرانہ گردی اور بیاباں نوردی کی راہ لی۔ چشم ظاہر کے لئے امام صاحب کے اس اقدام کو سمجھنا بھی آسان نہیں ہوگا کوئی اعزاز اور شہرت کو خیر باد نہیں کہتا؛ لیکن علوم میں کمال حاصل کر لینا اور چیز ہے اور حقیقت کا سراغ پالینا اور چیز ہے، یہی مفہوم ہے اقبال کے اس شعر کا:

علم سے دولت بھی ہے عزت بھی ہے شہرت بھی ہے

ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

عزت واقبال کی دنیا امام غزالی کے لئے فتح ہو چکی تھی؛ لیکن ان کا ضمیر کہتا تھا کہ یہ سب دنیاداری اور دنیا پرستی ہے، ضمیر ان سے کہتا تھا'' بندہ تخمین وظن کرم کتابی نہ بن'' حقیقت تک پہنچنا صرف کتابوں کے ذریعہ ممکن نہیں اور بہت سے ارباب ظاہر جلوہ حقیقت کو پانے سے محروم رہ جاتے ہیں اور حقیقت تک رسائی کے لئے ترستے ہیں۔ ان کا طائر بلند ہمت اس کے لئے تیار نہ تھا کہ وہ اس شہرت پر قناعت کریں، انھیں محسوس ہوا کہ عزت وشہرت کے باوجود وہ ہلاکت کے غار کے قریب پہنچ گئے ہیں اور یہ عزت اور شہرت آخرت میں کچھ بھی فائدہ پہنچانے والی نہیں۔ رومی اور رازی دونوں تاریخ میں غزالی کے بعد آئے؛ لیکن'' سوز وساز رومی'' اور'' پیچ وتاب رازی''، یعنی عقل ودل کی کشمکش اتنی شدید ہوئی کہ امام غزالی کی زبان رُک گئی، جیسے زبان پر تالا پڑ گیا ہو، قوت باضمہ نے جواب دے دیا، وہ گویا بیمار پڑ گئے، انھوں نے جاہ منصب کو خیر باد کہنے کا عزم مصمم کرلیا، لوگوں نے مخالفت کی۔ عوام کے نزدیک تو دین کا بلند ترین منصب انھیں حاصل تھا اور امام صاحب خود اپنے آپ کو دین میں مفلس اور قلاش سمجھ رہے تھے، انھوں نے بغداد اور تخت علم اور مسند درس کو خیر باد کہا، انھوں نے خلوت نشینی اور مجاہدات کی راہ اختیار کی اور سلوک عشق کی منزلیں طے کیں اور اس نتیجہ تک پہنچے کہ سعادت اخروی کی صورت صرف یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کیا جائے اور نفس کو خواہشات سے روکا جائے اور اس کا ذریعہ دنیا سے انقطاع اور توجہ الی اللہ ہے اور صوفیاء ہی اللہ کے راستہ کے سالک ہیں اور ان کی سیرت بہترین سیرت ہے۔ انھوں نے شیخ ابوعلی فارمدی کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان سے تصوف کی تعلیم حاصل کی۔ جب وہ گیارہ سال دشت نوردی اور روحانی تکمیل کے عالم میں رہ چکے اور منزل مقصود ان کو مل چکی تو پھر وہ خلوت سے جلوت کی طرف واپس آئے؛ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو ان سے کام لینا تھا اور یہ خلوت سے باہر نکلنے سے ہی ممکن تھا اور پھر اس زمانہ کے قلبی واردات اور مجاہدات کی روداد انھوں نے لکھی اور اس کتاب کا نام'' المنقذ من الضلال'' رکھا، یعنی گمراہی سے بچانے والی کتاب، جس میں بتایا گیا ہے کہ حقیقت اور مقصد اصل ہے باقی چیزیں ظواہر اور اشکال اور رسوم ہیں، اُردو کے شاعر مجروح سلطان پوری نے اس بات کو اپنے انداز سے کہا ہے:

مجھ سے کہا جبریل جنوں نے ، یہ بھی وحی الٰہی ہے
مذہب تو بس مذہب دل ہے ، باقی سب گمراہی ہے

امام غزالی نے ترک دنیا کے زمانہ میں اور راہ سلوک طے کرنے میں شام و فلسطین میں وقت گذارا اور جب واپس آئے تو سلطان وقت سنجر اور وزیر فخر الملک کی درخواست پر نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ کی مسند درس قبول کی؛ لیکن کچھ عرصہ کے بعد اسے بھی خیر باد کہا اور اپنے وطن طوس واپس آئے اور یہاں انھوں نے مدرسہ و خانقاہ کی بنیاد ڈالی، امام غزالی نے ''احیاء العلوم'' جیسی زندہ جاوید کتاب تصنیف کی اور اس میں علماء اور مشائخ کی ریاکاریوں کی قلعی بھی کھولی ہے، اس سے علماء کا ایک طبقہ ان سے ناراض بھی ہو گیا تھا۔

ایک بار امام غزالی کا سنجر کے شاہی دربار میں جانے کا اتفاق ہوا، دربار شاہی کے طمطراق اور کروفر اور جلال و جبروت کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے ان کی طبیعت بھی باقتضاء بشری متاثر ہوئی۔ انھوں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ قرآن کی کوئی آیت پڑھو اس نے آیت پڑھی جس میں یہ تھا ''الیس اللہ بکاف عبدہ'' یعنی کیا اللہ اپنے بندہ کے لئے کافی نہیں ہے، امام صاحب سے دربار کا سارا رعب جاتا رہا، اس کے بعد انھوں نے عالمانہ شان سے سنجر کو نصیحتیں کیں اور کہا کہ اس وقت مسلمانوں کی گردنیں مصیبت اور تکلیف سے ٹوٹی جاتی ہیں اور تمہارے گھوڑوں کی گردنیں طوق زریں کے بار سے، اور یہ زمانہ شخصی حکومتوں کا زمانہ تھا؛ لیکن امام صاحب نے امراء اور سلاطین پر اور ان کے ظالمانہ نظام پر تنقید کی اور علماء کو برا کہا جو ان سے عطیات وصول کرتے ہیں۔ انھوں نے سلاطین سلجوقیہ کے امیروں کو خطوط لکھے جن میں عدل و احسان پر زور دیا اور حقوق کی پامالی پر تنقید کی، انھوں نے اپنی کتاب احیاء علوم الدین میں مسلمانوں کے ہر طبقہ کی غلطیوں اور کمزوریوں کا پردہ چاک کیا اور ان کو ان کی اصلاح کی تدبیریں بتائیں۔ احیاء العلوم درحقیقت ہمہ گیر اصلاح و تربیت کی کتاب ہے۔ غزالی کی سیرت سے یہ سبق ملتا ہے کہ علماء حق کو حکومت کے عطیات سے محترز رہنا چاہئے اور اہل حکومت کی صلاح سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔

نیشاپور کی طرح بغداد کے مدرسہ نظامیہ کی بھی شہرت اور عزت تھی، سرکاری حلقوں نے ان پر بہت دباؤ ڈالا اور اصرار کیا کہ وہاں کی مسند درس کو زینت بخشیں؛ لیکن امام صاحب طوس میں اپنے مدرسہ اور خانقاہ کو چھوڑ کر جانے کے لئے تیار نہیں ہوئے اور کہا کہ میں تنخواہ قبول نہیں کرتا اور بغداد میں میری کوئی جائداد نہیں کہ جس سے میری گذر بسر ہو اور طوس میں تقریباً ڈیڑھ سو طلبہ مجھ سے علم کی تحصیل کرتے ہیں ان کا نقصان ہوگا اور ان کے علاوہ بغداد میں علمی مجادلوں اور مناظروں کا بازار گرم رہتا ہے اور اب میری طبیعت کو ان سے مناسبت نہیں۔

امام غزالی کا ۵۰۵ھ میں انتقال ہوا، ان کی عمر اس وقت ۵۵ سال تھی، انتقال کا واقعہ کتابوں میں مذکور ہے کہ انھوں نے وضو کر کے صبح کی نماز پڑھی پھر کفن منگوایا اور کفن کو بوسہ دیا اور کہا کہ "آقا کا حکم سر اور آنکھوں پر" پھر لیٹ گئے اور روح پرواز کر گئی۔

امام غزالی نے عمر بھی کم پائی ۵۴ یا ۵۵ برس اور اس میں بھی گیارہ بارہ سال بادیہ پیمائی اور صحراء نوردی میں گذارے، بایں ہمہ ان کی تصنیفات کی تعداد کافی ہے، جتنی ان کی عمر ہے اس سے بھی بہت زیادہ ہے اور ہر تصنیف لطیف شفائے دل اور سرمۂ نگاہ ہے۔ ان کی بعض کتابیں انقلاب آفریں اور عہد ساز ہیں اور اسلامی لٹریچر میں ایسا اضافہ ہیں کہ کبھی ان کو فراموش نہیں کیا جا سکے گا، ان کتابوں نے پورے عالم اسلام پر گہرا اثر ڈالا۔ اسپین میں ایک شخص محمد بن عبد اللہ تومرت نے کتاب احیاء العلوم پڑھی اور اس نے امام غزالی کی صحبت اختیار کی اور پھر اس کی کوششوں سے اسپین میں انقلاب آیا جس کا تذکرہ ابن خلدون نے کیا ہے، یعنی حکومت کا نظام بدل گیا۔ اُصولِ فقہ، منطق، فلسفہ، علم کلام اور تصوف و اخلاق ہر موضوع پر ان کی کتابیں ہیں اور اعلیٰ معیار کی ہیں، 'المنقذ من الضلال' اور 'تهافة الفلاسفه' اور کیمیائے سعادت کا آج بھی علمی حلقوں میں چرچا رہتا ہے اور ان سے امام غزالی کے خیالات و افکار منضبط کئے جاتے ہیں۔ المنقذ من الضلال ان کی تلاش حق کی کہانی ہے، تهافة الفلاسفه میں انھوں نے فلسفہ میں الٰہیات اور طبیعیات کو اپنی پرزاز اعتماد تنقید کا نشانہ بنایا اور فلسفہ کی کمزوریوں سے پردہ اٹھایا؛ لیکن ان کی وہ معرکۃ آراء کتاب جو آج بھی اہل ذوق کے علمی اور دینی حاسہ کو پوری غذا پہنچاتی ہے اور نفس کی تربیت کرتی ہے اور اہل دل کے یہاں جس کی مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے وہ ان کی کتاب احیاء العلوم ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس کتاب کو زبانی یاد کیا ہے، بہت سے لوگوں نے اسے بیس بار اور پچیس بار پڑھا ہے، شیخ محی الدین اکبر اسے کعبۃ اللہ کے سامنے بیٹھ کر پڑھتے تھے، شاذلی سلسلہ کے ایک مشہور بزرگ گذرے ہیں جن کا نام قطب شاذلی تھا، وہ ایک دن لوگوں کے سامنے احیاء العلوم لے کر آئے اور اپنے جسم پر کوڑوں کے نشان دکھائے اور بتایا کہ میں اس کتاب کا منکر تھا، آج شب کو امام غزالی نے مجھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں پیش کیا اور کتاب سے بے اعتنائی اور استہزاء کے جرم میں مجھے کوڑے لگائے گئے۔ احیاء العلوم کی برکت اور اس کے فضائل میں لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں، اس کتاب کی ۷۰ سے زیادہ شرحیں لکھی گئی ہیں، یورپ کی تقریباً تمام زبانوں میں اس کتاب کا ترجمہ ہو چکا ہے، امام غزالی نے اس کتاب کے ذریعہ اسرار

بیان کئے اوراس کے ساتھ علم اخلاق کو باقاعدہ مدون کیا ہے۔ اس سے پہلے علم اخلاق صرف مواعظ کی شکل میں موجود تھا اوراس موضوع پر کوئی کتاب تھی تو بس واعظانہ اور ناصحانہ انداز کی تھی، دو تین کتابیں علم اخلاق پر غیر ناصحانہ انداز میں ضرور لکھی گئی تھیں؛ لیکن وہ بہت زیادہ فلسفیانہ اور عمیق تھیں اور مذہبی پہلو سے نہیں لکھی گئی تھیں۔ امام صاحب کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے اپنی اس کتاب میں فلسفہ اور مذہب دونوں کو جمع کر دیا تھا، کتاب آج کے دور کے لئے بہت مفید ہے؛ کیوں کہ کتاب میں بہت سے ان اخلاقی امراض کا گہرا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے، جو آج عام ہو چکے ہیں اور پھر ان کا علاج بھی لکھا گیا ہے۔

مثال کے طور پر غیبت کا تذکرہ ہے کہ آج یہ مرض دنیا میں سب سے زیادہ مسلمانوں میں پایا جاتا ہے اوران کی ہر محفل کے لئے یہ باعث گرمیٔ محفل ہوتا ہے۔ قرآن میں غیبت کرنے کو مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مماثل کہا گیا ہے، ''مردہ گوشت'' کا کباب اب مسلمانوں کی مرغوب غذا ہے، غیبت اب پانی اور ہوا کی طرح ان میں عام ہو چکی ہے، کتاب کا بہت مؤثر حصہ وہ ہے جس میں دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی عظمت کا بیان ہے اوراصلاح اور تہذیب نفس پر زور دیا گیا ہے۔

اس کتاب کی مقبولیت کا عالم یہ رہا ہے کہ صدیوں تک لوگوں نے اسے تعویذ کی طرح گلے اور سینہ سے لگا کر رکھا اور اسے زاد سفر اور سعادت اخروی کی کلید سمجھتے رہے، احیاء العلوم کے بہت سے موضوعات امام صاحب کی فارسی کتاب کیمیائے سعادت میں آ گئے ہیں۔ دراصل امام صاحب نے احیاء العلوم کو فارسی کا لباس پہنایا ہے، کتاب کی تحریر جادو کی تاثیر اور زبردست قوت تسخیر رکھتی ہے، اس کتاب میں تحلی بالفضائل اور تخلی عن الرذائل پر زور ہے، اس سے بہت سی زندگیوں میں انقلاب آیا ہے، احیاء العلوم کا اُردو ترجمہ بھی موجود ہے اور یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جس نے اس کتاب کا مطالعہ نہیں کیا ہے اس کا مطالعہ ناقص اور نامکمل رہ گیا۔

کتاب میں امام صاحب نے مسلمانوں کے بہت سے طبقوں کے جن میں سلاطین سے لے کر علماء تک شامل ہیں بہت سے عیوب بیان کئے ہیں، اس لئے بہت سے لوگ بدظن بھی ہوئے اوران کی مخالفت بھی ہوئی اور مخالفت میں کتابیں بھی لکھی گئیں، ایک اہم اعتراض یہ ہے کہ اس میں موضوع احادیث نقل کی گئی ہیں، مخالفت میں یہ کتابیں بھی اس پہلو سے اہم ہیں کہ مسلمان علماء اس زمانہ میں شخصیت پرستی کے عیب سے محفوظ تھے اور تنقید کرنے کی جرأت رکھتے تھے۔

افاداتِ غزالی

۱- احیاء العلوم پوری کتاب اسرار شریعت یا فلسفہ اخلاق پر ہے، فلسفہ اخلاق کا سب سے مہتم بالشان موضوع یہ ہے کہ اخلاق کی غرض و غایت کیا ہے یعنی ہم کو کیوں برائیوں سے بچنا چاہئے اور کیوں اچھی باتیں اختیار کرنی چاہئیں یعنی اعمال کا اصل محرک کیا ہے۔ واعظین شیوہ بیان اور مجمع زہاد کا کہنا ہے کہ لذائذ بہشت کا حصول اور عذاب جہنم کا خوف، یعنی ثواب اور عقاب اعمال کا اصل مصدر اور محرک ہے۔ امام غزالی نے لکھا ہے کہ اعمال کا منبع اور مصدر اخلاص ہونا چاہئے اور اخلاص کہتے ہیں اللہ کی خوشنودی کے لئے کسی کام کے کرنے کو یا نہ کرنے کو، اگر کوئی شخص اس لئے عبادت کرتا ہے کہ بہشت کے مزے لوٹے تو عبادت کرنے والا حریص اور طمع کا مریض ہے مخلص نہیں۔

۲- آج دنیا میں مادہ پرستی کا زور ہے، مادہ کے سوا لوگوں کو کچھ نظر نہیں آتا ہے، اسی لئے مادہ پرستوں کو خدا کا وجود سمجھ میں نہیں آتا ہے اور اسی لئے حقیقت نبوت بھی سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ ایک انسان پر بغیر مادی واسطہ کے خدا کی وحی کیوں کر آسکتی ہے۔ امام صاحب کہتے ہیں کہ حقیقت تک رسائی کے لئے اور نبوت کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے تصوف سے شناسائی ضروری ہے، جس نے تصوف کا مزہ نہیں چکھا وہ نبوت کی حقیقت کو نہیں جان سکتا وہ صرف نبوت کا نام جان سکتا ہے، انھوں نے المنقذ من الضلال میں لکھا ہے کہ صوفیوں کے طریقہ کی مشق سے مجھ کو نبوت کی حقیقت اور اس کا خاصہ بدیہی طور پر معلوم ہو گیا ہے۔

۳- انھوں نے ملکہ نبوت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حقائق اشیاء کے ادراک کی ایک قوت ہوتی ہے یہ قوت کسی میں کم کسی میں زیادہ اور کسی میں زیادہ تر ہوتی ہے اور ترقی کرتے کرتے کسی انسان میں یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ کسب و تعلیم کے بغیر ان کو حقائق اشیاء کا ادراک ہوتا ہے، ان کو کسی قسم کا بیرونی علم نہیں ہوتا ہے؛ لیکن اس قوت کی وجہ سے ان کو خود بخود اشیاء کا علم ہو جاتا ہے، اسی قوت کا نام ملکہ نبوت ہے اور اسی علم کو الہام اور وحی کہتے ہیں۔

۴- امام صاحب کہتے ہیں یہ ملکہ نبوت ہر شخص میں موجود نہیں ہوتا ہے، اس لئے جو کوئی نبی نبوت کا اعلان کرتا ہے تو عام طور پر اسے حالات سے پہچانا جاتا ہے۔ جالینوس کی تصنیفات دیکھنے سے

اس کے طبیب ہونے کا قطعی علم ہو جاتا ہے امام شافعی کی کتابیں ہمیں یقین دلاتی ہیں کہ وہ فقیہ تھے۔ اسی طرح جب ایک انسان قرآن مجید کو پڑھتا ہے تو نبوت کے دعویٰ کا ثبوت قرآن کے ہر لفظ سے ملتا ہے، انسان کو یقین ہونے لگتا ہے کہ قرآن کا حامل بجز پیغمبر کے اور کوئی شخص نہیں ہوسکتا ہے۔

۵- نبوت کی بحث میں معجزات اور خرق عادات کا مسئلہ مہتم بالشان رہا ہے، فلسفہ کی مشکل یہ ہے کہ وہ ہر جزئیہ کو کلیہ کا تابع کرتا ہے اور ہر چیز کی علت اور سبب ڈھونڈھ کر نکالتا ہے؛ لیکن چوں کہ خرق عادت علت و معلول کے سلسلہ کو بالکل توڑ دیتا ہے اس لئے بعض اہل فلسفہ نے معجزہ کا انکار کیا ہے اخوان الصفاء کے ارکان بھی اسی گروہ میں شامل ہیں علامہ ابن حزم ظاہری جو محدث ہیں وہ کہتے ہیں کہ علت و معلول کا سلسلہ اگر چہ اصل ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے اظہار کے لئے کبھی اس سلسلہ کو توڑ دیتا ہے اور اسی کا نام معجزہ ہے۔ امام غزالی نے بھی اس مسئلہ پر گفتگو کی ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ معجزہ کے واقعات جو منقول ہیں ان کی تین قسمیں ہیں۔ ایک حسی یعنی وہ خدا جو نطفہ سے آدمی اور مادہ سے جاندار پیدا کرسکتا ہے وہ اس بات پر قادر ہے کہ سنگ ریزے میں جان ڈال دے اور حیوان کو گویائی کی قوت عطا کر دے، دوسری قسم خیالی اور تمثیلی ہے اس میں زبان حال تمثیل کے طور پر محسوس اور مشاہدہ ہو جاتی ہے اور یہ پیغمبروں کا خاصہ ہے۔ مثال کے طور پر ایک انسان یہ خواب دیکھتا ہے کہ اونٹ اس سے باتیں کر رہا ہے یا کوئی مردہ اسے کچھ دے رہا ہے یا اس کی انگلی چاند یا سورج بن گئی ہے، انبیاء کو یہ چیزیں بیداری میں نظر آتی ہیں۔ تیسری قسم عقلی ہے جیسے قرآن میں ہے کہ تمام چیزیں خدا کی تسبیح پڑھ رہی ہیں اس کا یہ عقلی مطلب نکل سکتا ہے کہ تمام مخلوق اپنے وجود سے خدا کی گواہی دے رہی ہیں۔

۶- معجزہ کے امکان کے بعد یہ بحث بھی آتی ہے کہ کیا وہ نبوت کی لازمی دلیل ہے، بوعلی سینا اسی کے قائل ہیں کہ پیغمبر کے لئے معجزہ کا ہونا ضروری ہے تاکہ سب کو اس بات کا یقین ہو کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔ امام غزالی کے نزدیک پیغمبر ہونے کی دلیل کے لئے شق قمر ضروری ہے اور نہ لاٹھی کا عصا بن جانا؛ بلکہ نبی کے ارشادات اور ہدایات بھی کافی ہوسکتے ہیں۔ اس زمانہ کے ایک آزاد فکر شاعر نے اس سے ملتی جلتی بات کہی کہ حق سے آگاہی کے لئے کائنات میں غور و فکر کافی ہے؛ لیکن ہر ایک میں یہ ملکہ نہیں ہوتا ہے وہ کہتا ہے:

ہم جیسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

۷ - امام صاحب کے سینکڑوں افادات میں سے ایک افادہ تکلیفات شرعیہ اور عذاب و ثواب سے متعلق بھی ہے۔ اہل الحاد اور مخالف مذہب لوگ عذاب وثواب کو اور بعث بعد الموت یعنی آخرت کو خلاف عقل سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ مذہب اور خدا انسان کی ایجاد ہے اور دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے اور ایک عربی شاعر نے کہا:

اموت ثم بعث ثم نشر

حدیث خرافة یا ام عمرو

یعنی مرنا اور پھر زندہ ہونا اور پھر چلنا پھرنا اے اُم عمرو یہ سب باتیں خرافات ہیں۔ اہل الحاد کا کہنا ہے کہ اگر خدا کو مان بھی لیا جائے تو عذاب وثواب اس کی شان سے بعید ہے؛ کیوں کہ ان کے نزدیک انتقام کی خواہش انسان کی خصوصیت ہے خدا انتقام نہیں لے سکتا ہے۔ دوسری دلیل مخالف مذہب لوگ یہ دیتے ہیں کہ سزا تو اس لئے ہوتی ہے کہ مجرم دوبارہ جرم نہ کرے، اگر آخرت کو مان لیا جائے تو وہاں کی سزا کے بعد مجرم کی دوسری زندگی کہاں ہے کہ اسے راہ راست پر آنے کا موقعہ مل جائے اور پھر یہ کہ خدا کو اس سزا سے کیا فائدہ ہے۔ امام صاحب نے اس کے جواب میں لکھا ہے کہ عالم جسمانیات میں اسباب وعلل کا سلسلہ جاری ہے سنکھیا قاتل زہر ہے گلاب محرک نزلہ ہے، اگر کوئی شخص سنکھیا کھالے اور مر جائے تو اس پر یہ اعتراض نہیں ہوسکتا ہے کہ خدا نے اسے کیوں مار دیا۔ بالکل اسی طرح عالم روحانیت میں بھی اسباب وعلل کا نظام قائم ہے، اچھے کاموں سے روح کو انبساط حاصل ہوتا ہے، برے افعال سے روح میں آلودگی پیدا ہوتی ہے جو شخص کسی فعل بد کا مرتکب ہوتا ہے اسی وقت اس کی روح پر خاص اثر مرتب ہو جاتا ہے اسی کا نام عذاب ہے۔ فرض کرو ایک شخص نے چوری کی اس سے اس کا ضمیر اور نفس داغدار ہو چکا اور اس پر دھبہ لگ گیا یہ اس کے فعل بد کا لازمی نتیجہ ہے، الا یہ کہ انسان توبہ کر کے گناہ کے دھبہ کو دھودے۔ تکلیفات شرعیہ کے بارے میں اشاعرہ کا خیال ہے کہ اس سے صرف تعمیل احکام مقصود ہے، جس طرح آقا اپنے نوکر کا امتحان لیتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ تمام رات ہاتھ باندھے کھڑے رہو، حکم سے نہ آقا کا کوئی فائدہ ہے اور نہ نوکر کا، یہ تعمیل حکم کا امتحان ہے تمام احکام شریعت کی یہی حیثیت ہے۔ امام صاحب نے اس خیال کی مخالفت کی ہے اور لکھا کہ شریعت کے جس قدر اوامر اور نواہی ہیں وہ انسان کے فائدے کے لئے ہیں یا تو کام اس کے لئے مفید ہے اس لئے اس کا حکم دیا گیا ہے یا اس کے لئے مضر ہے اس لئے اس کو اس سے روکا گیا ہے، بالکل اسی طرح جیسے ایک طبیب اور معالج اپنے مریض کو کسی

کے کھانے کا حکم دیتا ہے اور کسی چیز کے کھانے سے روکتا ہے۔

۸- مذہب میں روح کی بحث بھی معرکۃ الآراء بحث ہے، شارع نے روح کی حقیقت بتانے سے انکار کیا ہے کہ یہ سب کے سمجھ میں نہیں آسکتی ہے، جو چیز کہ صرف خواص کے لئے ہو شارع اس کی تفصیل نہیں بیان کرتا ہے، لوگوں نے سوال کیا تھا کہ روح کی حقیقت کیا ہے اللہ نے کہا کہ آپ کہہ دیجئے کہ یہ امر ربی ہے: "ویسألونک عن الروح قل الروح من امر ربی"۔

امام غزالی نے اس راز سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے لکھا کہ وہ جوہر ہے جسم نہیں اس کا تعلق بدن سے ضرور ہے؛ لیکن وہ اس سے متصل ہے نہ منفصل نہ داخل ہے نہ خارج نہ حال ہے نہ محل۔ جسم نہ ہونے کی دلیل انھوں نے یہ دی ہے کہ روح اگر جسم ہوگی تو اس میں طول اور عرض ہوگا اور اس کے اجزاء بھی ہوں گے اور اس کا بھی امکان ہوگا کہ ایک جزء میں ایک چیز پائی جائے دوسرے جزء میں اس کا نقیض یعنی ایک ہی زمانہ میں وہ کسی ایک چیز سے واقف بھی ہوگی اور ناواقف بھی اور یہ محال ہے اور متصل اور منفصل اور داخل اور خارج نہ ہونے کی دلیل یہ کہ یہ تمام باتیں جسم کے خواص ہیں، جب روح جسم ہی نہیں تو متصل اور منفصل اور داخل اور خارج کچھ بھی نہیں ،مثال کے طور پر ایک پتھر کو عالم اور جاہل نہیں کہہ سکتے کہ یہ وصف جاندار کے لئے خاص ہیں اور پتھر سرے سے جاندار نہیں۔

علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ امام غزالی نے روح کے وجود کی کوئی عقلی دلیل نہیں پیش کی اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ روح کا وجود ایک وجدانی امر ہے، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ادراک اور تعقل مادہ کا کام نہیں ہوسکتا ہے، مادہ ایک بے حس اور بے جان چیز ہے دقیق خیالات اور علوم و فنون مادہ سے انجام نہیں پاسکتے؛ بلکہ کوئی اور جوہر لطیف ہے جس سے یہ کرشمے سرزد ہوتے ہیں اور اس کا نام روح ہے۔ شبلی پھر یہ لکھتے ہیں کہ یہ استدلال وجدانی ہے، اگر کوئی منکر انکار پر آمادہ ہو اور کہے کہ تم نے جو کچھ کہا وہ دعویٰ کا اعادہ ہے، دلیل نہیں؛ کیوں کہ ممکن ہے مادہ ہی ایک خاص ترکیب پا کر بعض خاص نیرنگیوں کا مظہر ہو جیسے آج کل بعض خودکار آلات ہوتے ہیں جیسے گھڑی چلتی رہتی ہے، جیسے مزامیر سے اور ارغنوں سے دلکش اور مؤثر نغمے نکلتے ہیں اگر چہ کہ ان میں روح کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا ہے، اگر کوئی یہ کہے تو ہم دلیل سے اس کی زبان نہیں بند کرسکتے۔

۹- امام غزالی نے تصوف کے ذکر میں الہام کی حقیقت بھی بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انسان کو اشیاء کا جو ادراک ہوتا ہے وہ استنباط استدلال اور تعلیم و تعلم سے ہوتا ہے؛ لیکن کبھی ایسا بھی

ہوتا ہے کہ غور وفکر کے بغیر دفعتاً ایک شئ کا ادراک ہو جاتا ہے اور کچھ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ کہاں سے ہوا اور کیوں کر ہوا، اصطلاح تصوف میں اس کا نام الہام ہے، یہ الہام مجاہدہ اور تزکیۂ نفس سے ہوتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان پہلے تمام تعلقات سے کنارہ کش ہو، اہل وعیال اور جاہ ومنصب دوست واحباب کسی چیز سے کوئی مطلب باقی نہ رہے، ایک گوشہ میں بیٹھ کر خدا کی طرف متوجہ ہو کسی چیز کا خیال نہ آنے پائے اور زبان سے اللہ اللہ کہتا جائے، رفتہ رفتہ یہ مشق اس قدر بڑھے کہ زبان سے حرکت نہ ہو اور تصور میں زبان سے اللہ کا لفظ نکلتا ہی جائے، پھر یہ تصور جمایا جائے کہ اللہ کا لفظ دل سے نکل رہا ہے اور یہ تصور اس درجہ تک پہنچ جائے کہ حرف وصوت کا خیال دل سے جاتا رہے اور اللہ کا تصور دل میں اس طرح راسخ ہو جائے کہ کسی وقت یہ تصور جدا نہ ہو۔ جب یہ حالت پیدا ہو جائے گی تو مکاشفہ شروع ہو جائے گا، ابتداء میں برق خاطف کی طرح آ کر نکل جائے گا، پھر ترقی ہوتی جائے گی اور ثبات ودوام حاصل ہوگا۔

احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ مکاشفہ سے نبوت حشر ونشر ملائکہ شیطان جنت ودوزخ عذاب قبر پل صراط اور میزان وغیرہ تمام چیزوں کی حقیقت کا پتہ چل جاتا ہے۔

امام غزالی کی اس دور میں معنویت

شبلی کی کتاب ''الغزالی'' پڑھ کر ہر شخص غزالی کی تصنیفات پڑھنے کا خواہشمند بن جاتا ہے، خاص طور پر احیاء العلوم کی طلب بڑھ جاتی ہے، مادہ پرستی اور آخرت فراموشی کے اس دور میں غزالی کی کتابیں کیمیاء اثر ہیں اور زہر کا تریاق مہیا کرتی ہیں۔

امام غزالی کی تمام تصنیفات نہایت عالمانہ ہیں، ہر تصنیف لطیف ہے، سلک گہر ہے اور اس میں غواصی کرنے والوں میں ہر ایک کو گوہر نایاب اور در شاہوار اور لولوے لالہ ملتا ہے؛ لیکن امام غزالی کی اہمیت اور معنویت اس دور میں اس سے بھی سوا ہے۔ امام غزالی کا دور تقلید کا اور تقلید میں بھی جامد تقلید کا تھا، اس زمانہ میں بہت سے فرقے تھے معتزلہ، باطنیہ اشعریہ، ماتریدیہ، حنبلیہ، ہر فرقہ حق کو اپنے لئے خاص سمجھتا تھا اور دوسرے کو برسر باطل سمجھتا تھا۔ تقلید کا ایسا نشہ سوار تھا کہ بڑے بڑے عالم جو اپنی اپنی جگہ پر تحقیق کا پہاڑ ہوتے اور تدقیق کا سمندر تھے وہ بھی اپنے فقہی یا کلامی مسلک سے اس طرح وابستہ ہوتے کہ سر مو انحراف بھی جائز نہیں سمجھتے تھے، جو شافعی ہوتا وہ ایسا شافعی

ہوتا کہ بال کے برابر بھی اس سے تجاوز نہیں کرتا۔ یہی ہر مسلک کا ظاہر یہ حنفیہ اور مالکیہ کا حال تھا جو اشعری ہوتا وہ متکلمین کی کسی بات کو قبول نہیں کرتا اور جو ماتریدی ہوتا وہ بھی اپنے مسلک کی ہر بات پر جما رہتا تھا، کسی کو اپنے دائرہ سے ہٹنے اور چوں وچرا کرنے کی مجال نہ تھی اور مسلکی شدت اتنی زیادہ تھی کہ دوسرے فرقہ کو گمراہ بلکہ کافر تک کہا جاتا تھا۔ ملک شاہ سلجوقی کے زمانہ میں شیعوں اور اشعریوں پر مساجد میں برسر منبر لعنت کی جاتی، نظام الملک نے اشاعرہ کی لعنت تو بند کرادی؛ لیکن شیعہ بیچارے اسی طرح ہدف لعن رہے۔ امام غزالی نے دین ودانش سے اور قوت علم سے اور اپنے سوز وگداز سے تقلید کے برفاب کو توڑ دیا اور پگھلا دیا لعنت اور تکفیر سے روکا، امام غزالی شافعی تھے اور اشعری تھے؛ لیکن بہت سے مسائل اور معاملات میں انھوں نے دوسرے مسلک کی حمایت کی اور فتنہ تکفیر کی سخت مخالفت کی اور ہر کلمہ گو کو مسلمان قرار دیا چاہے اس کا عقیدہ کچھ بھی ہو۔ بہت سے مسلمان شیعوں کو مسلمان نہیں سمجھتے تھے، انھوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ وہ چاہے حضرت علی کی خلافت بلافصل کے قائل ہوں یا چاہے امام مہدی کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ ہو کہ وہ عراق کے سرداب میں موجود اور مخفی ہیں وہ مسلمان ہی ہیں۔ امام صاحب نے بلاخوف لومۃ لائم شجاعت کے ساتھ مسلکی عصبیت اور اس بارے میں شدت کی مخالفت کی اور تفرقہ اندازی اور باہمی جدال سے اور مناظرہ سے روکا اور کہا کہ مناظرہ سے فریق مخالف میں اور بھی تصلب اور تشدد پیدا ہوتا ہے اور ان میں ہدایت کے بجائے عداوت پیدا ہوتی ہے۔ مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرونے کی ضرورت آج پہلے سے بھی زیادہ ہے، کتاب الغزالی مسلمانوں میں یہ شعور پیدا کرتی ہے۔

تمام مسلمانوں کے بارے میں ان کی طبیعت میں ریشم کی سی لطافت اور نرمی تو تھی ہی اس سے آگے بڑھ کر ان کی ہمدردی اور لطف عمیم غیر مسلموں کو بھی اپنے دامن میں جگہ دیتی تھی۔ وہ اپنے رسالہ تفرقہ میں لکھتے ہیں کہ ''اکثر نصاریٰ روم اور ترک (غیر مسلم) جو ہمارے زمانہ میں ہیں ان کو رحمتِ الٰہی انشاء اللہ شامل ہوگی'' ان کا کہنا تھا کہ بجز ان کفار کے جن کے سامنے اسلام کی حقیقت پورے طور پر ظاہر کردی جائے اور ان پر حجت کا اتمام کردیا جائے اور پھر وہ ایمان نہ لائیں، باقی سب معذور ہیں، وہ زبان حال سے کہتے ہیں کہ ''ماجاء نا من نذیر'' یعنی ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا حق پہنچانے والا آیا ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اصلی کافر وہی منکر ہے، جس کے سامنے حق کھول کر پیش کردیا گیا ہو اور وہ قبول کرنے سے انکار کردے، کافر کے معنی ہی انکار کرنے والے کے ہیں اور جب حق پیش ہی نہیں کیا گیا تو انکار کہاں لازم آیا، قیامت کے دن خطرہ میں تو وہ حق

پرست انسان ہوگا، جوحق کی دولت پر کنڈلی مار کر بیٹھا رہا اور اس نے دولت اسلام کو دوسروں کے سامنے پیش ہی نہیں کیا، حالاں کہ پیش کرنے کی اس پر ذمہ داری ڈالی گئی تھی۔

امام غزالی نیشاپور اور بغداد میں رہے یہ سب مسلمانوں کی آبادی کے ملک تھے، انھوں نے جہاں جہاں کا سفر کیا وہاں بھی مسلمان ہی بستے تھے، اگر وہ ایسے ملک میں ہوتے جہاں کی اکثریت غیر مسلم ہوتی تو وہ اپنے فکر عبقری اور ذہن نو ایجاد کے مطابق اور اپنے ان خیالات کے مطابق جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے صرف روایتی انداز میں مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کا کام نہ کرتے ؛ بلکہ غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام حکمت کے ساتھ پہنچانے کی اسکیمیں تیار کرتے۔ وہ اہل علم صلحاء کو مشورہ دیتے کہ اپنے اپنے علاقہ اور محلّہ میں اس کام کے لئے برابر مشاورت کریں کہ محلّہ کے غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام کیسے پہنچایا جائے اور ظلمت کو نور سے کیسے بدلا جائے؛ کیوں کہ مسلمان علماء اور صلحاء اپنے نوافل اور عبادت واذکار کے باوجود اس بارہ خاص میں قیامت کے دن محاسبہ سے بچ نہیں سکتے ہیں، وہاں غیر مسلموں کا ہاتھ اور ان کا گریبان ہوگا۔

امام غزالی کے مجددانہ کارناموں میں تعلیم کی اصلاح بھی ہے اور ان کے اس کام کی عصر حاضر میں بڑی معنویت ہے۔ آج علماء کا ایک گروہ کہتا ہے کہ ہم عصری تعلیم اپنے مدارس میں اس لئے داخل نہیں کر سکتے کہ اس کی کوئی گنجائش نہیں اور ہمارا مقصد صرف شرعی علوم میں مہارت پیدا کرنا ہے۔ امام صاحب لکھتے ہیں کہ آج بہت سے ایسے شہر ہیں جس میں صرف یہودی اور عیسائی طبیب ہیں اور ان کی شہادت فقہ کے طبی مسائل میں جائز نہیں اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ طب کوئی نہیں سیکھتا اور سب فقہ پر گرے پڑتے ہیں تاکہ قضا کا عہدہ ملے حکومت ہاتھ آئے ہم عصروں پر تفوق ہو، مخالفین کو زیر کیا جائے۔ اسی طرح امام صاحب نے علوم متداولہ کی تعلیم میں تبدیلیوں کا مشورہ دیا، امام صاحب نے فقہ اور منطق کے بارے میں جو رائے ظاہر کی وہ دنیائے اسلام میں بالکل نئی صدا تھی اور یہ ان ہی کا حوصلہ تھا کہ یہ رائے ظاہر کر سکے۔ امام صاحب نے علوم کی تقسیم ضروری اور غیر ضروری ہونے کے اعتبار سے کی اور انھوں نے اپنے زمانہ کے علماء کی مخالفت کی پرواہ نہیں کی، ان کی اصلاحات تعلیم کی کوششوں کا اثر رفتہ رفتہ ظاہر ہوا اور دنیوی علوم کے پڑھنے اور پڑھانے کا اتنا وقت نکل آیا کہ فقہاء اور محدثین بھی ریاضی داں اور حساب داں ہونے لگے۔ آج جدید علوم میں مسلمانوں کی مہارت کی ضرورت سب سے زیادہ ہے، علماء مدارس سے یہ کوئی نہیں کہتا ہے کہ وہ عصری علوم میں مہارت پیدا کرلیں؛ لیکن کم از کم مدارس کے طلباء کو ان سے بالکل بے خبر تو

نہ رکھیں۔ آج دنیا میں مسلمانوں کی بربادی اور شکست وہزیمت ان کے سائنس اور صنعت وٹکنالوجی اور ایجاد واکتشاف میں پیچھے رہ جانے کی وجہ سے ہے، امام غزالی اگر موجود ہوتے تو ان علوم کی تحصیل کا صور پھونک دیتے؛ کیوں کہ غلبہ اسلام کے لئے ان کا حصول ضروری ہے۔

صرف ''الغزالی''، نہیں بلکہ شبلی کی تمام کتابوں کا مطالعہ اسلام سے اور تاریخ اسلام سے وابستگی پیدا کرنے کے لئے اور اپنے شاندار ماضی کا شعور پیدا کرنے کے لئے اور اپنے مذہب اور دینی تاریخ پر اعتماد بحال کرنے کے لئے ضروری ہے۔

علامہ شبلی کی تمام کتابیں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

☆☆☆☆
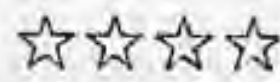
مولانا جلال الدین رومی اُردو کتابوں کے حوالہ سے

مولانا جلال الدین رومی کو علامہ اقبال نے اپنا پیرو مرشد قرار دیا تھا اور کہا تھا:

پیرِ رومی مرشدِ روشن ضمیر
کاروانِ عشق و مستی را امیر

رومی سے جذبۂ عقیدت نے ان سے یہ شعر کہلوایا:

رومی آں عشق و محبت را دلیل
تشنہ کاماں را کلامش سلسبیل

آج سے کچھ پہلے برصغیر میں دینی خانوادوں میں مثنوی مولانا روم کے پڑھنے کا عام رواج تھا، آتش رومی کے سوز میں لوگ امراض قلب کا مداوا ڈھونڈتے تھے؛ لیکن بتدریج خرد پر فرنگیوں کا فسوں غالب آتا گیا اور مولانا روم سے دوری بڑھتی گئی، اقبال نے زمانہ حاضر اور مادیت کے امراض کا علاج مولانا روم کی مثنوی اور ان کے کلام کو قرار دیا ہے۔

یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں مولانا روم کی یاد کا سال منایا جارہا ہے، یخ بستہ دلوں کو گرم کرنے کا یہ بہترین موقع ہے، دلوں کی انگیٹھیوں کو جو سرد ہوچکی ہیں مولانا روم کے آتشیں کلام سے دوبارہ گرم کیا جاسکتا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ مثنوی کو اپنے غور وفکر

اور مطالعہ کا موضوع بنایا جائے۔ فارسی میں ملا بحر العلوم کی شرح بہت مفصل ہے، مثنوی کی اُردو میں بھی بہت ساری شرحیں لکھی جا چکی ہیں، جو لوگ فارسی نہیں جانتے ہیں وہ ان شرحوں کے ذریعہ عشق کی حرارت اور حلاوت حاصل کر سکتے ہیں، اُردو میں مولانا سجاد حسین میرٹھی نے مثنوی پر بہت اہم کام کیا ہے اور اس کی شرح دس بارہ جلدوں میں کی ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نے بھی مثنوی کی تلخیص کی ہے اور شرح لکھی ہے، مثنوی کی تفہیم میں مولانا عبد الماجد دریابادی کا نام بھی لیا جا سکتا ہے، اُردو زبان میں قاضی تلمذ حسین صاحب کی صاحب المثنوی بہت اہم کتاب ہے، یہ کتاب ۱۹۶۷ء میں دار المصنفین سے شائع ہوئی تھی؛ لیکن اس کتاب میں مطبعی اغلاط بہت رہ گئی تھیں، اب حال میں ایک ناشر نے اغلاط کی درستگی کے بعد کتاب کو خوبصورت انداز میں شائع کر دیا ہے۔ سیرت وسوانح کے اعتبار سے یہ بہت محققانہ کتاب ہے، کتاب کے مصنف قاضی تلمذ حسین نے مثنوی اور اس کے مصنف سے متعلق اور بھی کئی کتابیں جیسے مرأۃ المثنوی وغیرہ لکھی ہیں۔ مولانا روم اور ان کا کلام ان کے علم وتحقیق اور غور وتدبر کا خاص میدان رہا ہے، علمی اور تحقیقی حلقوں میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا، جس نے علامہ شبلی نعمانیؒ کی ''سوانح مولانا روم'' کا نام نہ سنا ہو، یہ کتاب سو برس پہلے ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی تھی، شبلی کی اس کتاب میں سوانح سے زیادہ مثنوی کی خصوصیات اور موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے۔ علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ لوگ مولانا روم کو شاعر سمجھتے ہیں اور فقر و تصوف کے حوالہ سے جانتے ہیں؛ لیکن مولانا روم حقیقت میں ایک عظیم متکلم اسلام بھی تھے، علامہ شبلی ایک محقق تھے اور ان کی ہر کتاب ایک تحقیقی رنگ رکھتی ہے۔ اس کتاب میں علامہ شبلی کی ایک اہم تحقیق یہ ہے کہ مولانا روم نے اپنی غزلوں کے مقطع میں عموماً شمس تبریز کا نام استعمال کیا ہے، اس لئے لوگوں نے غزلوں کے دیوان کو شمس تبریز کی طرف منسوب کر دیا اور دیوان کے سرورق پر شمس تبریز کا نام بھی لکھ دیا اور اسے دیوان شمس تبریزی سے موسوم کیا۔ علامہ شبلی نے ''غلطی ہائے مضامین'' کی طرف اشارہ کیا ہے اور قطعی دلیلوں سے ثابت کیا ہے کہ یہ سارا کلام مولانا روم کا ہے، مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ جب وہ روم گئے تھے تو مولانا روم کے سلسلہ جلالیہ کی مجلس سماع میں شریک ہوئے تھے، انھوں نے اس رقص کی منظر کشی کی ہے۔

ایک نئی کتاب ''مولانا رومی کا پیام عشق'' کے نام سے شائع ہوئی ہے، اس کے مصنف پروفیسر لطیف اللہ ہیں، کتاب پہلے پاکستان میں شائع ہوئی تھی، اس کے بعد اس کا نیا ایڈیشن نئی کتاب پبلشرز دہلی نے خوبصورت انداز میں شائع کیا ہے، یہ کتاب قابل مطالعہ ہے اور اس میں ہر

جگہ فارسی اشعار کے اُردو تراجمے اہتمام کے ساتھ دے دیئے گئے ہیں۔ باب اول مولانا روم کے ذہنی وفکری نشوونما کے متعلق ہے، باقی دو ابواب جہان عشق اور پیام عشق سے متعلق ہیں، کتاب رومی کے پیام عشق کا احاطہ کرتی ہے۔ حیدرآباد کے اقبال اکیڈمی نے بھی جلال الدین رومی پر خصوصی نمبر شائع کیا ہے، جس میں اُردو ادب اور اقبالیات کی مشہور شخصیتوں کے مضامین ہیں، زیادہ تر مضامین میں اقبال کے حوالہ سے رومی کا مطالعہ کیا گیا ہے، جو شخص رومی اور اقبال کے روحانی اور قلبی رشتہ کو سمجھنا چاہے اس کے لئے یہ خصوصی شمارہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔

ایک اور کتاب ہے جو مولانا روم سے متعلق اُردو لٹریچر میں بہت اہمیت کی حامل ہے، یہ خاص رنگ اور کیفیت کی کتاب ہے اور اس کتاب کے ذریعہ مولانا روم کی تجدیدی شان بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ یہ کتاب بہت اثر آفریں بھی ہے، ادب آموز بھی ہے، وجد انگیز بھی ہے اور وجدان خیز بھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف کا حال صاحبِ مثنوی کے حال سے مماثل ہے، اس نے مثنوی اور صاحبِ مثنوی کا جن الفاظ میں تعارف کرایا ہے، اس میں سوز کی وہ کیفیت ہے جو قاری سے چھپتی نہیں۔ عشق کا سرور، یقین کا نور، محبت کا سوز وساز اور دل کا درد وداغ، ایسا لگتا ہے کہ رگِ ساز میں صاحب ساز کا لہو رواں ہے، کتاب کا نام ہے تاریخ دعوت وعزیمت حصہ اول، اس کتاب کا آخری باب مولانا جلال الدین رومی کے تجدیدی کارناموں سے متعلق ہے۔ کتاب کے مصنف کا نام ہے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ کتاب میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح مولانا روم نے عقلیت کے بت پر اس وقت ضرب لگائی، جب اس کی پرستش عام ہوگئی تھی اور ہر شخص عقلی تاویلات میں اُلجھا ہوا تھا، اس زمانہ کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا ابوالحسن علی ندوی اس کتاب میں لکھتے ہیں:

> قیاس واستدلال کے غلو نے خواہ دماغوں کو کتنی ہی جولانی بخشی ہو، دلوں کی حرارت اور یقین کی روشنی کو نقصان پہنچایا تھا۔ متکلمین نے اپنی قوتِ استدلال اور مقدمات ونتائج کی آراستگی سے معترضین کی زبانوں کو خاموش کردیا تھا؛ لیکن وہ قلوب کو سکینت وایمان اور اہل شک وارتیاب کو یقین واذعان عطا کرنے میں ناکام رہے تھے۔ ان کے اس طریقہ بحث واستدلال نے دماغوں اور دلوں میں بیسوں گرہیں ڈال دی تھیں، جن کو علم کلام سلجھانے سے قاصر تھا، وجدان جو علم ویقین کا بہت بڑا سرچشمہ ہے، علم کلام کی مسلسل بے اعتنائیوں؛ بلکہ تحقیر کی وجہ سے بالکل معطل ہوتا

جارہا تھا، ظاہری حواس خمسہ کے سوا کسی اور باطنی حاسہ کا وجود نہیں تسلیم کیا جارہا تھا۔ سارا عالم اسلام ایک کلامی بحران میں مبتلا تھا اور سب پر ایک عقلی ظاہریت چھائی ہوئی تھی۔ اُمت کی قوت عمل اور اس سے بڑھ کر حرارتِ عشق جو اس اُمت کا سرمایہ، اس کی طاقت کا سر چشمہ اور نبوت کا فیضان ہے سرد ہوتی جارہی تھی، دل سوز سے خالی اور حرارت عشق سے عاری ہوتے جارہے تھے۔ فلسفیانہ مباحث اور علم کلام کی معرکہ آرائیوں نے عالم اسلام کو ایک 'مدرسہ' میں تبدیل کردیا تھا، جس میں قیل وقال تو بہت تھی؛ لیکن زندگی، محبت و معرفت اور نگاہ نایاب تھی، اہل قلوب کے روحانی جزیروں میں البتہ عشق کا سرور اور یقین کا نور پایا جاتا تھا، ورنہ عالم کا عالم الفاظ کے طلسم میں گرفتار اور ظواہر ومحسوسات کا پرستار تھا۔

قونیہ بلاد اسلام ترکی میں واقع ہے، جسے مولانا روم کے مسکن و مدفن ہونے کا شرف حاصل ہے، یہ سارے علاقے پہلے رومن امپائر میں شامل تھے، جس کی وجہ سے مولانا جلال الدین کے ساتھ رومی کی نسبت شہرت پاگئی۔ یورپ سے جغرافیائی قربت بہت بڑی وجہ تھی کہ یورپ کے مؤرخین اور مستشرقین نے مولانا روم کے ساتھ خاص اعتنا برتا، مثنوی کے انگریزی اور یورپ کی دیگر زبانوں میں ترجمے ہوئے اور مولانا روم کو موضوعِ تحقیق بنایا گیا۔ اس کے علاوہ مسیحیت میں بہت زیادہ زور مودت ورحمت پر اور ترکِ دنیا پر ہے اور مولانا روم کا پیام عشق ومحبت کا روحانیت کا پیام ہے۔ مولانا روم اور تصوف کے سلسلوں سے عیسائی مستشرقین کی خاص دلچسپی کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ اس کو اپنے دل کی آواز اور رہبانیت کا ایک ساز سمجھتے ہیں، چنانچہ مولانا روم پر کام کرنے والوں میں نکلسن اور انا میری شمل اور ولیم سی چٹک (William C Chittick) کے نام شامل ہیں۔ مؤخر الذکر امریکی مستشرق ہیں، اس موقع پر یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ خود مولانا روم کے دست حق پرست پر روم یعنی موجودہ ترکی میں ۱۸ ہزار عیسائی اور یہودی مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ مولانا روم کے سلسلہ 'مولویہ' کے ذریعہ ترکی میں بڑے پیمانہ پر اسلام کی اشاعت ہوئی ہے، مولانا روم ہزاروں نومسلموں کے لئے مرشد اول کی حیثیت رکھتے ہیں، تصوف نے اس میدان میں جو کام کیا ہے اس پر خود ہندوستان کی تاریخ شاہد عدل ہے۔ قدیم زمانہ میں خانقاہیں اسلام کی خاموش نشر گاہیں تھیں، افسوس یہ ہے کہ اب بیش تر خانقاہیں کسبِ زر اور جلب منفعت کا ذریعہ بن گئی ہیں،

بقول اقبال:

میراث میں آئی ہے انھیں مسند ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

مولانا جلال الدین رومی سے متعلق علم وادب کی راہ قدیم ہے اور یہ بہت سے قافلوں کی گذرگاہ رہی ہے ہر زبان میں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ تازہ واردان بساط میں ایک اہم نام ڈاکٹر مسعود انور علوی کا ہے، انھوں نے ''حضرت مولانا جلال الدین بلخی رومی'' کے نام سے ایک اچھی کتاب جو ظاہری اور معنوی حسن سے منور اور روحانیت کی خوشبو سے معطر ہے تیار کی ہے۔ وہ شروع سے مولانا روم کے شیدائی رہے ہیں، مجالس سماع میں رومی کا کلام انھوں نے اتنا سنا ہے کہ وہ ان کے حافظہ کا حصہ بن گیا ہے تصوف سے روحانی اور خاندانی دونوں مناسبتوں کی وجہ سے اور ترکی میں مولانا رومی کے مزار کی زیارت کی وجہ سے ان کی کتاب وقیع اور اثر انگیز اور خوشبودار ہوگئی ہے اور'' داستان فصل گل خوش می سراید عندلیب'' اور'' ذکر الحبیب حبیب'' کا مصداق بن گئی ہے۔ اُردو میں غالب نے اسی مفہوم کو'' ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا'' کہہ کر ادا کیا ہے۔ قونیہ میں مولانا روم کی قبر کی زیارت نے تصنیف کتاب کے لئے خاص طور پر مہمیز کا کام کیا ہے، انھوں نے قبر کی اور آثار اور تبرکات کی تصویریں بھی دی ہیں جو اور کسی کتاب میں نہیں ہیں۔ مولانا روم کی شخصیت ایسی تھی کہ جسے مجموعہ خوبی کہا جاسکتا ہے، یہ ممکن نہیں کہ انسان کے دل میں گداز ہو اور سینہ میں سوز وساز ہو اور پھر انسان مولانا روم کے کلام سے متاثر نہ ہو۔ اُردو زبان وادب کا ذوق رکھنے والوں کو خاص کر اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے کہ یہ کتاب صرف سوانح کی مؤثر کتاب نہیں ہے بلکہ اس میں جگہ جگہ مولانا روم کے کلام کے ترجمے بھی دے دیئے گئے ہیں، دور جدید میں یہ کتاب اپنی معنویت کے لحاظ سے علامہ اقبال کے اس شعر کا مصداق ہے:

سپاہ تازہ برانگیزم از ولایت عشق
در حرم خطرے از بغاوت خرد است

مختلف کتابوں کے مطالعہ سے مولانا روم کی شخصیت کے بارے میں جو باتیں سامنے آتی ہیں، وہ یہ ہیں کہ وہ ۶۰۵ ھ میں بلخ میں پیدا ہوئے، اس وقت وہاں خوارزم شاہ کی حکومت تھی، مولانا رومی کے والد'' بہاؤ الدین ولد'' بلخ سے ہجرت کر کے قونیہ آگئے تھے، جو ایشیائے کوچک میں تھا اور جسے روم بھی کہتے تھے۔ مولانا اپنے والد کے ساتھ جب قونیہ آئے تو ان کی عمر چھ سال کی تھی، کچھ ہی

پہلے کا زمانہ امام فخر الدین رازی کا بھی تھا جو امام میدان عقل و منطق تھے اور یہی زمانہ فرید الدین عطار اور محی الدین عربی کا بھی ہے جو صاحبِ قلب و حال تھے، شیخ شہاب الدین سہروردی اور ان کے مرید شیخ سعدی کا عصر بھی زیادہ دور نہیں، گویا اس زمانہ میں سرِ آسمان علم و فضل کے کئی چاند چمک رہے تھے۔ مغلوں کی ترک وتاز اور غارت گری کا زمانہ بھی یہی ہے، مولانا قونیہ آئے جسے مولانا کے اسلاف کے مسکن و وطن ہونے کا شرف حاصل ہوا، اس وقت وہاں جو بادشاہ حکمراں تھا وہ علاء الدین کیقباد تھا، مولانا روم کی تعلیم و تربیت دمشق اور حلب میں ہوئی، جہاں اس وقت بے شمار دار العلوم اور اسلامی علوم وفنون کے مراکز قائم تھے۔

روحانیت کی دنیا میں جلال الدین رومی کے شیخ و مرشد کون تھے؟ ان کے مرشد اول سید برہان الدین تھے، جو مولانا روم کے والد کے مرید وخلیفہ تھے، مولانا روم نے ان سے ابتداءً ظاہری اور باطنی استفادہ کیا، سید برہان الدین کے انتقال کے بعد مولانا روم کے اصل مرشد کی حیثیت سے جن کا نام آتا ہے، وہ شمس الدین تبریز ہیں۔ روایات میں آتا ہے کہ شیخ شمس الدین تبریز کو ان کے پیر بابا کمال نے حکم دیا تھا کہ تم روم جاؤ اور وہاں ایک دل سوختہ ہے اسے روشن کر آؤ۔ شمس الدین تبریز اور مولانا روم کی ملاقات کی داستان عجیب وغریب ہے، ایک روایت میں آتا ہے کہ شمس تبریز جب مولانا روم کے پاس پہنچے تو ان کو کتابوں کے درمیان گھرا ہوا پایا، حضرت شمس نے پوچھا کہ یہ سب کیا ہے؟ مولانا روم نے جواب دیا کہ یہ وہ چیز ہے جسے تم نہیں جانتے، شمس تبریز نے جلال میں آکر اپنے باطنی تصرف سے کتابوں میں آگ لگادی، مولانا روم نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ جواب ملا یہ وہ چیز ہے جسے تم نہیں جانتے۔

مولانا روم کا تعلق شمس تبریز سے بڑھتا گیا، افادہ اور استفادہ کے لئے کئی مہینے مرشد اور مسترشد ایک ساتھ رہے تھے، یہاں تک کہ شمس تبریز کی نظر کیمیاء اثر نے مولانا روم کی کایا پلٹ دی، آتش عشق شعلہ زن ہوا، کثافت دور اور عقل ناتمام کافور ہوئی، وہ عقل کے مدرسے سے اُٹھ کر عشق کے میکدے میں آگئے، شمس الدین تبریز کی صحبت اور تربیت کی وجہ سے وہ منزہ اور مصفی ہوگئے، انھوں نے شمس تبریز کی فیض رسانیوں کا اعتراف اس طرح کیا ہے:

شمس تبریز بما راہ حقیقت بنمود

ما بفیض قدم اوست کہ ایماں داریم

شمس الدین تبریز کا فیض اثر تھا کہ رومی کی وہ مثنوی وجود میں آئی، جس کے اشعار سرتاپا

وجد و حال اور کیفیت وصل و وصال ہو گئے ہیں اور ہمیشہ کے لئے اہل دل کے لئے سرمایۂ ذوق و معرفت بن گئے ہیں۔ مولانا روم نے شمس تبریز کے نام جو خطوط لکھے ہیں، ان میں ان کے لئے راحتِ روح و جاں کے الفاظ استعمال کئے ہیں، وہ علماء ظاہر کو واقفِ اخبار رسول اور شمس تبریز کو واقفِ اسرار رسول کہتے ہیں۔ مولانا روم گرم دل و خوش اختلاط تھے، جب کہ شمس الدین تبریز خلق سے انقطاع کلی رکھتے تھے، رومی کے مزاج میں لطف و جمال تھا، شمس تبریز کے یہاں رنگ جلال تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت شمس کا شمار مثالِ خضر ''اولیائے مستورین'' میں ہوتا ہے اور مولانا روم کا شمار 'اولیائے مامورین' میں ہوتا ہے اور جو شخص مامور بالہدایت ہوتا ہے اس میں جلال کے بجائے جمال کا رنگ ہوتا ہے؛ کیوں کہ اسے خلق سے تعلق رکھنا ہوتا ہے، مولانا روم جذب کے عالم میں اور استغراق کی کیفیت میں کبھی کبھی لوگوں کے ہجوم سے بچنے کے لئے میکدہ میں جا کر بیٹھ جاتے تھے؛ لیکن نفس آتشیں اور تصرف باطنی کا یہ عالم تھا کہ جس میکدہ میں بیٹھ جاتے اس کی قسمت بدل جاتی وہ جگہ مقدس بن جاتی، عقیدت کیش امراو اکابر اسے خرید کر مسجد بنا ڈالتے، مولانا روم نے ان واقعات کی طرف بھی نشان دہی کی ہے:

در خانہ خمار و خرابات کی دید است
معراج و تجلی و مقامات افندی

ایک جگہ اور کہتے ہیں:

در کوئے خرابات مرا عشق کشان کرد
واں دلبر عیار مرا دید نشان کرد

رند پارسا ریاض خیر آبادی کا شعر مولانا روم پر پوری طرح صادق آتا تھا، جن کے فیض سے میکدہ مسجد سے بدل جاتا تھا۔

جہاں ہم خشت خم رکھ دیں بنائے کعبہ پڑتی ہے
جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے

مولانا روم کا پیام عشق حقیقی کا پیغام ہے، مثنوی نے سینکڑوں انسانوں کو مقامِ ولایت تک پہنچایا ہے، ان کے نزدیک عشق حقیقی تمام امراض نفسانی و باطنی کا علاج ہے، وہ کہتے ہیں کہ دل کو اس عشق کا مسکن و مخزن بنانا چاہئے اور اسے آلودہ ہوا و ہوس نہ ہونے دینا چاہئے، وہ عشق کی تعریف میں یوں نغمہ سرا ہیں:

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت ناموسِ ما
اے کہ افلاطون و جالینوس ما

مولانا روم کے نزدیک دل کا جو تزکیہ ہوتا ہے تو اس سے وہ ادراکات حاصل ہوتے ہیں جو حواس سے حاصل نہیں ہوتے ہیں، انسان جب عشق حقیقی کے مرتبہ تک پہنچ جاتا ہے تو نماز میں اس کا سجدہ سجدۂ قربت (واسجد واقترب) بن جاتا ہے، چنانچہ مولانا روم کو یہ مرتبہ حاصل تھا، انھوں نے اپنے نماز کی منظر کشی اس طرح کی ہے۔

بخدا خبر نہ دارم چوں نماز می گذارم
کہ تمام شد رکوعے کہ امام شد فلانے

افسوس کہ اس دور میں عشق کا میکدہ ویران اور عقل کا مدرسہ بہت آباد ہے، سوز عشق کو مشینوں نے ختم کر دیا ہے اور روحانیت کو دنیا کی صنعتی تہذیب نے ایک ملبہ سے تبدیل کر دیا ہے، جس کا ماتم اقبال نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے
وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پُرکار و سخن ساز ہے نمناک نہیں ہے

اس پُرکاری اور سخن سازی کا علاج اقبال نے مولانا روم کی شخصیت میں دریافت کیا ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں:

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

اس دور میں جب کہ مادیت کا سیل بلاخیز خانقاہوں اور ایمان کی پناہ گاہوں تک پہنچ گیا، سوچنے کی ضرورت ہے کہ انسانیت کو اس مرض سے نجات کس طرح دلائی جاسکتی ہے رومی کے نزدیک اس کا علاج محبت و عشق اور جاں گدازی اور دل سوزی ہے، ہوس دید اور نوش ونشید کے سمندر میں یہی لائف بوٹ ہے، جو انسان کو ساحل مراد تک پہنچا سکتا ہے، اس خرمن کائنات میں یہی

ایک کام کی چیز ہے اور یہی دیدہ و دل کا حاصل ہے باقی سب کچھ لاحاصل ہے، یک دانہ محبت باقی ہمہ کاہ۔

لیکن اس مقام بلند تک جس کا نام عشق ہے پہنچنا آسان نہیں یہ وہ فراز کوہ ہے جہاں تک پہنچنے کے لئے کسی مرد راہ بیں کسی دانائے راز کسی محرم اسرار کی ضرورت ہوتی ہے۔ مولانا جلال الدین رومی اس مقام بلند تک پہنچے تو اس راہ کے سالکین سے انھوں نے استفادہ کیا، یہ کہانی انا میری شمل نے تفصیل کے ساتھ اپنی تحریروں میں سنائی ہے، مولانا روم نے کن کن روحانی شخصیتوں سے استفادہ کیا اور ان کے جام لبریز سے مئے گساری کی یہ کہانی ان ہی کی زبان سے سنئے، ہم ان کی تحریروں کا صرف خلاصہ پیش کررہے ہیں۔ یہ بات معلوم ہے کہ مولانا جلال الدین رومی کی پیدائش بلخ میں ہوئی تھی، ابراہیم بن ادہم جو روحانی فقر و غنا کے امام تھے، بلخ ہی میں پیدا ہوئے تھے دنیا سے ان کی بیزاری اور بے نیازی گوتم بدھ کے زہد اور ترک دنیا سے بہت ملتی جلتی ہے اور یہ شہر بودھ مذہب کا مرکز بھی رہ چکا تھا، اس لئے ترکِ دنیا اور ترکِ جاہ و منصب کی روایات کا اور ابراہیم بن ادہم کی درویشانہ زندگی نے جلال الدین رومی کی شخصیت پر اثر ڈالا ہوگا۔

رازی اور رومی دو بالکل مختلف مکتبِ فکر کے نمائندے ہیں، رازی کے انتقال کے پچاس سال کے بعد ان کے بارے میں مولانا روم کا قول یاد رکھنے کے قابل ہے کہ:

اگر عقل کی آنکھوں سے ہدایت کی تلاش ممکن ہوتی تو فخر الدین رازی گلستانِ مذہب کے سب سے بڑے پاسبان ہوتے۔

مولانا روم اپنی کم عمری میں عظیم صوفی شاعر فرید الدین عطار سے بھی ملے تھے اور سن رسیدہ صوفی شاعر نوجوان جلال الدین رومی سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے اور انھوں نے جلال الدین رومی کو اپنی مثنوی اسرار نامہ کا ایک نسخہ بھی عطا فرمایا تھا، مولانا روم پر فرید الدین عطار اور ان کی مثنوی کا اثر ضرور پڑا ہوگا؛ کیوں کہ فرید الدین عطار معمولی درجہ کے صوفی نہ تھے۔ پھر مولانا روم جب شام گئے تو وہاں بھی روحانی شخصیتوں اور علماء سے ان کا بہت قریبی رابطہ رہا تھا، ان کے والد بہاء الدین ولد کا نام پہلے آچکا ہے، جن سے مولانا نے روحانی استفادہ کیا تھا، پھر روحانیت کی تلاش کے سفر میں مولانا کی ملاقات برہان الدین محقق سے ہوئی اور ان سے انھوں نے صوفیانہ زندگی کے اسرار و رموز کی معرفت حاصل کی، فاضل استاد نے لائق شاگرد کے اندر ان کے والد کے نثری کارنامے ''معارف'' کے مطالعہ کا شوق بھی پیدا کیا اور جلال الدین رومی اپنے شیخ کی ہدایت کے

مطابق خلوات اربعینیہ کے محرم اسرار بھی بنے اس دوران وہ مراقبات میں اس طرح ڈوبے کہ صوفیانہ کشف والہام کے آسمان پر نیر تاباں بن کر اُبھرے۔ مولانا روم کے روحانی رفیق صلاح الدین زرکوب بھی تھے، جن کے یہاں چاندی سونے کے ورق کوٹنے کا کام ہوتا تھا، یہ کوٹنے کی آواز ایسی وجد آفریں ہوتی کہ وہ مولانا روم کو اکثر رقص کناں کر دیتی، موسیقی ریز آواز مولانا کے دل کو بے خود بنا دیتی۔ مولانا روم نے بہت سے صوفیاء کرام سے استفادہ بھی کیا، ان میں محی الدین بن عربی اور شیخ سعد الدین حموی اور شیخ اوحد الدین کرمانی کے نام ممتاز ہیں، آپ ان بزرگوں کے حلقوں میں شریک ہوتے تھے، مولانا روم نے یوں تو بہت سے صوفیہ سے کم یا زیادہ استفادہ کیا؛ لیکن جب انھوں نے شمس تبریز کی شکل میں شمس درخشاں کو دیکھ لیا تو اس کی کرنوں سے اپنے نہاں خانہ دل کو منور کر لیا اور انھوں نے شمس کی شخصیت سے ربط و استفادہ کا ایسا گہرا تعلق قائم کیا جس کی نظیر تصوف کی تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے۔ الغرض عشق حقیقی کی دنیا میں مقام پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں اس کے لئے روحانی شخصیتوں سے استفادہ بہت ضروری ہے اور مادیت کی دلدادہ اور فریب کُن دنیا میں اس کا رواج کم ہوتا جارہا ہے، انا میری شمل پر مکتبہ جامعہ نے ''دانائی راز انا میری شمل'' کے نام سے مضامین کا مجموعہ شائع کیا، مولانا روم کی شخصیت پر بہت اچھا مواد اس کتاب سے بھی مل جاتا ہے۔

مولانا روم کی شخصیت پر جتنی کتابیں منظر عام پر آئی ہیں، ان سب میں اس کا بھی تذکرہ ہے کہ ان کی زندگی ایک پابند شریعت صوفی کی زندگی تھی، رقص و سرود محبت الٰہی سے لبریز دل کے لئے بمنزلہ دوا اور شفا تھا، نادانی ہوگی اگر ان کے سکر سرور کے پہلو کو تو لے لیا جائے اور شریعت کی پابندی کو نظر انداز کر دیا جائے۔

☆☆☆☆

تکبیر مسلسل

خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات ہو یا رہ ورسم خانقاہی ہو جو حالات سے بے خبری، خلوت گزینی سیکھاتی ہو اور میدان سے فرار اور کنارہ کشی کی تلقین کرتی ہو، مزاج اسلام سے ہم آہنگ نہیں۔ اسلام بے عملی نہیں سکھاتا ہے، یہ سب چیزیں شاعر اسلام کی نظر میں طریق راہبانہ ہیں اور انھوں نے ان کو اپنے اشعار میں مذہب ملا و جمادات و نباتات سے تعبیر کیا ہے، اقبال کے نزدیک:

ملا کی اذاں اور ہے مجاہد کی اذاں اور
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

اقبال وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل کے قائل ہیں اور اس کو مذہب مردان خود آگاہ و خدامست قرار دیتے ہیں اور اس کو زندہ قوم کی پہچان اور جذبۂ جہاد کا نشان سمجھتے ہیں۔ بلاشبہ مسلمان اس ملک میں مختلف مشکلات سے دو چار ہیں اور ہر ایک مشکل ان کے راستہ کی رکاوٹ ہے، زندہ قوموں کے لئے خطرہ کی چیز راستہ کی رکاوٹ نہیں ہوتی، خطرہ کی بات ایک زندہ انسان کے لئے یہ ہے کہ وہ مقصد اور منزل کو بھول جائے اور مادیت اور آرام پسندی ہی کو مقصد بنالے۔ اہل ہمت کبھی ہمت نہیں ہارتے ہیں، ان کا عزم راسخ ہر مشکل کو آسان بناتا ہے، اہل یقین کا فیصلہ اور اصحاب عمل کا حوصلہ تاریخ کے دھارے کو بدل دیتا ہے، یہی پیغام حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی ''تکبیر مسلسل'' کا ہے، یعنی اس کتاب کا جو ''تکبیر مسلسل'' کے نام سے شائع ہوئی ہے جو دینی تعلیمی کونسل میں ان کے خطبات کا مجموعہ ہے۔

مولانا علی میاں نے اپنے خطبات میں فرمایا ہے کہ وہ باشعور مسلمان جن کے ہاتھ زمانہ کی نبض پر ہیں ان کے نزدیک موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ نئی نسل کے ایمان کی اور ان کی تہذیب کی حفاظت کس طرح کی جائے، یہ جان کی حفاظت سے بھی زیادہ ضروری ہے، یہ وہ ایمانی حس ہے جس کا رشتہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے جذبۂ پیغمبرانہ سے جا کر ملتا ہے کہ انھوں نے بوقت دم واپسیں اپنی اولاد سے پوچھا تھا ''ماتعبدون من بعدی؟'' میرے بعد تم کس

کی عبادت کروگے؟ یعنی آئندہ نسلوں کی اسلامیت کا غیر مشکوک اطمینان حاصل کرنا بھی ضروری ہے اور یہ بالکل کافی نہیں ہے کہ ہم صرف فسادات کے مسئلہ پر غور کریں، یا صرف ان کے معاشی مسئلہ کے حل کی تدبیر کریں اور ان کے لئے ملازمتوں میں کامیابی یا تجارت میں فروغ پر مطمئن ہوجائیں۔ مسلمان کسی حیوان کا نام نہیں ہے جس کے لئے راتب کامل جانا کافی ہو، مسلمان وہ ہے جو اپنی تمام ملی و دینی خصوصیات کے ساتھ جینے کا عزم کرتا ہے اور مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کو غذا اور دوا سے بھی زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اس اُمت کا شیرازہ اور گلدستہ عقیدہ وعمل کے دھاگے سے بندھا ہوا ہے، عقیدہ وعمل کو نکال دینے کے بعد شیرازہ منتشر ہوجائے گا، اس اُمت کے جسم سے جان نکل جائے گی اور صرف ایک ڈھانچہ باقی رہ جائے گا اور وہ ڈھانچہ بھی کتنے دن باقی رہے گا، بے دینی اور الحاد کی باد صرصر اسے اُڑا لے جائے گی۔ اعلیٰ دینی تعلیم کے لئے تو بڑے مدارس موجود ہیں جو دین اسلام کے قلعے ہیں؛ لیکن یہ بڑے مدارس بھی سودمند نہ ہوں گے اگر بنیادی سطح (Grassroot level) پر نئی نسل کی دینی تربیت کا انتظام نہ ہوا، صرف سرکاری اسکولوں میں بچوں کو داخل کرادینے کے بعد مطمئن ہوکر بیٹھ جانا تو خطرہ کا الارم ہے اور بے شعوری کی علامت ہے۔ بچے کے ذہن کو مسموم کرنے والا اور ہندو میتھالوجی (Mythology) کو ذہنوں میں راسخ کرنے والا مواد اسکولوں کے نصابِ تعلیمی کا جز بن چکا ہے، جو دینی تربیت کا عین ضد ہے اور نئی نسل کی اسلامیت کے لئے خطرہ ہے۔ اسی خطرہ کے تدارک کے لئے دینی تعلیمی کونسل قائم ہوئی تھی، جس کے بانی جناب قاضی عدیل عباسی مرحوم تھے اور حضرت مولانا علی میاں صاحب اس کے صدر تھے، قاضی عدیل عباسی صاحب کے بھانجے جناب ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی نے اس کتاب میں مولانا علی میاں صاحبؒ کے خطباتِ صدارت کو جمع کردیا ہے اور یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہر گھر میں پڑھی جائے؛ کیوں کہ وہ خطرہ آج بھی باقی ہے، جس کی وجہ سے یہ کونسل قائم کی گئی تھی، مولانا علی میاں نے ایک خطبہ میں فرمایا کہ:

> شرعی اعتبار سے کسی ایسے ماحول میں مسلمانوں کو رہنے کی اجازت نہیں ہے جہاں وہ اپنے اور اپنے بچوں کے لئے دینی ماحول فراہم نہ کرسکتے ہوں اور جہاں اسلام سے وابستہ رہنا ناممکن ہوجائے۔ اسلام میں ہجرت کا فلسفہ یہی ہے، اس لئے اس بارے میں متفکر رہنا اور بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کی ہر ممکن کوشش کرنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔

ظاہر ہے کہ اسکولوں سے بچوں کو ہٹایا نہیں جا سکتا ہے انھیں اسکولوں میں
تعلیم دلانا بھی ضروری ہے اور یہ کوشش بھی ضروری ہے کہ وہ امتیازی
نمبروں سے پاس ہوں؛ لیکن یہ کام بنیادی دینی تعلیم اور مادری زبان کی
قیمت پر ہرگز نہیں ہونا چاہئے، ورنہ یہ تعلیم روحانی اور ایمانی نسل کشی کے
مرادف ہوگی۔

مسلمان عوام بے شعور ہو سکتے ہیں؛ لیکن مسلمانوں کی قیادت اللہ کے فضل سے بے شعور نہیں ہے، اسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے، نازک سے نازک حالات میں بھی مفید اور تعمیری کام انجام دیتی رہی ہے۔ ریاست اتر پردیش میں جہاں اُردو کے ساتھ انتہائی ناروا سلوک کیا گیا وہاں مسلمانوں کی قیادت نے دینی تعلیمی کونسل قائم کی اور قریہ بقریہ مکاتب کا جال بچھا دیا جہاں بچوں کو اُردو زبان، قرآن کی ناظرہ تعلیم اور دینیات کی ابتدائی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، حساب انگریزی اور ہندی کو بھی نصاب میں رکھا گیا۔ ان مکاتب کی تعداد ہزاروں میں ہے اور ان کے اخراجات کی کفالت مقامی باشندے کرتے ہیں، جن لوگوں نے اپنے نونہالوں کو ان مکاتب میں داخل کیا انھیں اطمینان حاصل ہوا، ان کے بچوں نے اُردو زبان بھی سیکھی اور ابتدائی دینی تعلیم بھی حاصل کی، جو بچے ان مکاتب میں اسکول کی تعلیم کی وجہ سے داخل نہیں ہو سکتے تھے ان کے لئے صباحی اور شبینہ مکاتب قائم کئے گئے۔ نقصان ان مسلمانوں کا ہوا جو ان مکاتب سے بے نیاز رہے اور انھوں نے گھر پر بھی اپنے بچوں کی دینی تعلیم کا اور اُردو زبان سیکھنے کا انتظام نہیں کیا، ہر شہر میں بکثرت ایسے والدین نظر آتے ہیں جو خود تو اُردو زبان سے اور دین سے واقف ہیں؛ لیکن اس دولت کو اور اس ورثہ کو انھوں نے اپنی اولاد کی طرف منتقل کرنے کی کوشش نہیں کی، چنانچہ ان کے بچے دین سے بے بہرہ ہیں اور اُردو زبان سے ناآشنا ہیں اور ان کے اندر کوئی ملی شعور نہیں پایا جاتا ہے۔ وہ تعلیم جو انسان سے اس کی خودی چھین لے اور مذہب اور تہذیب سے بیگانہ بنا دے اور صرف معیشت سے سروکار رکھے وہ حقیقی تعلیم نہیں، اکبر الٰہ آبادی نے اس خطرہ کو محسوس کر لیا تھا اور کہا تھا کہ ''دل بدل جائیں تعلیم بدل جانے سے'' اور اقبال نے عصری تعلیم کے پروردہ نوجوانوں کو ''کم نگاہ و بے یقین و نا اُمید'' اور ''شیشہ رو تاریک جاں روشن دماغ'' قرار دیا ہے، ایک سیکولر ملک میں بچوں کے مذہب اور تہذیب کی حفاظت کی ذمہ داری کا بار والدین کو ہی اٹھانا ہے، اس کے بغیر زندگی موت کے مانند ہے اور اہل ضمیر اہل شعور اور اہل غیرت کے نزدیک ''زندگی نما موت موت نما

زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہوتی ہے'' وسائل کی کمی کا بہانہ، نقصان کا اندیشہ وقت کی کمی کا شکوہ مریض قوموں اور ضعیف دلوں کی بیماری ہے۔

اسکولوں کے نصاب سے ایک مذہب اور ایک تہذیب کی بالادستی کو ختم کرنا اور ایک ہی فرقہ کی شخصیتوں کے ذکر کو نکالنے کی کوشش کرنا اور اس کے لئے آئینی جنگ کرنا جماعتوں کا کام ہے۔ دینی تعلیمی کونسل اور دوسری تنظیموں نے اس میدان میں کام انجام دیا ہے اگر اس میدان میں مکمل کامیابی حاصل بھی ہو جائے تو بھی دینیات کی تعلیم تو سرکاری اسکولوں میں نہیں دی جاسکتی ہے، ان کی فکر تو والدین کو کرنی ہے اور اس کا انتظام ان ہی کو کرنا ہے وہ اس کا گھر پر انتظام کریں، یا محلّہ کی مسجد میں اس کے لئے مکتب قائم کریں۔ وقت یا سرمایہ کی کمی کا کوئی بھی عذر قبول نہیں ہوسکتا ہے، ہندوستانی مسلمان ایک فیصلہ کن موڑ پر کھڑے ہوئے ہیں، ایک راستہ مذہبی اور تہذیبی ارتداد کی طرف جاتا ہے اور دوسرا راستہ عزت و بلندی کی طرف، مسلمانوں کو یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ ایک زندہ قوم ہیں، تاریخ میں انھوں نے پوری دنیا کو اور اس ملک کو فیض پہنچایا ہے اور وہ اب بھی ذہنی اور اخلاقی حیثیت سے کوئی دیوالیہ قوم نہیں۔

بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

مسلمانوں کی عصری تعلیم بے حد ضروری ہے اسکولوں میں پڑھانا بھی ضروری ہے، ان کو اقتصادی اعتبار سے مضبوط اور مستحکم بنانا بھی نہ صرف دنیاوی اعتبار سے؛ بلکہ دینی اعتبار سے بھی اہمیت رکھتا ہے؛ لیکن اگر مسلمان عقیدہ وعمل کے اعتبار سے مسلمان ہی نہ رہیں تو پھر ان کی کوششوں کا کیا حاصل اور ان کا کیا فائدہ؟ اس لئے نئی نسل کے ایمان اور اسلام کی حفاظت کا کام بالکل بنیادی کام ہے اور اس سے غفلت وہ جرم ہے جسے تاریخ معاف نہیں کرے گی۔ نصاب تعلیم کے اندر اور اسکول کے ماحول میں جو زہر ہوتا ہے اس کا تریاق مہیا کرنا بھی والدین کی ذمہ داری ہے، ببول کے سائے میں بیٹھنا ایک مجبوری ہے؛ لیکن بچوں کو اس کے کانٹوں سے بچانا بھی ضروری ہے، ہمارے آباء واجداد نے تہذیب وروایات کو ایمانداری کے ساتھ ہم تک پہنچایا تھا، اب ہماری باری ہے کہ ان روایات کو نئی نسل تک پہنچائیں۔ ایمانی کیفیات پیدا کرنے کے لئے گھر کے اندر تھوڑی دیر کے لئے ترجمہ قرآن وحدیث اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور سیرت صحابہ رضی اللہ عنہم اور سیرت مصلحین اُمت کا اجتماعی مطالعہ بہت مفید ہے، کبھی کبھی نوجوانوں کو دینی کاموں کے حلقوں سے بھی واقف کرنا چاہئے اور ان کو دینی جلسوں میں لے جانا چاہئے، سارا مسئلہ فکرمندی اور جذبِ دروں کا ہے۔

اگر فکر موجود ہے تو دینی تعلیم وتربیت کے چراغ کو بہت زیادہ تیل بتی کے بغیر بھی فروزاں رکھا جاسکتا ہے، اگر جذب دروں اور سوز فزوں نہیں تو پھر ہزاروں حیلے اور بہانے ہیں، اسی فکر مندی اور سوز دل کو پیدا کرنے کے لئے یہ کتاب جو ظاہری اور معنوی دونوں خوبیوں سے مزین ہے، شائع کی گئی ہے۔

ہر مسلمان کو اس بات کا عزم کرنا ہے کہ اسے اس ملک میں رہنا ہے اور اسے سیرت وکردار کا آب ورنگ عطا کرنا ہے، اسے اس ملک کی تعمیر وترقی میں بھی حصہ لینا ہے اسے امن وامان اور باہمی اعتماد کی فضا بھی قائم رکھنی ہے۔ نشیمن میں آگ لگانے والوں کے خلاف ہم وطنوں کے ساتھ مل کر جدوجہد بھی کرنی ہے اور اسی کے ساتھ اسے اس ملک یں اپنی تمام ملی خصوصیات کے ساتھ رہنا ہے اور اسے اپنی آئندہ نسلوں کی اسلامیت کا یقین بھی حاصل کرنا ہے اور ان کو اپنے کو زیادہ بہتر مسلمان بنانا ہے، پھر ان کے لئے عصری تعلیم کا انتظام کرنا ہے اور اس دین رحمت کا اپنے ہم سایوں کے درمیان تعارف بھی کرانا ہے، خوش اخلاقی اور خوش کرداری کے ذریعہ بھی اور کتابوں کے ذریعہ بھی۔

کتاب ''تکبیر مسلسل'' ندوہ بک ڈپو، ندوۃ العلماء لکھنؤ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

☆☆☆☆

قاموس الفقہ — ایک عظیم الشان کتاب

میں مقدمہ وتقریظ لکھنے کے کام کو اس وقت تک ٹالتا رہتا ہوں جب تک لکھنے سے کوئی مفر باقی نہ رہے، میری تحریریں جب تک دل کا تقاضہ نہ بن جائیں میرے قلم سے نہیں نکلتیں اور جب کوئی مضمون یا کتاب کے لکھنے پر دل و دماغ کے تقاضے کا غلبہ رہتا ہے میں کوئی دوسری فرمائشی چیز نہیں لکھ سکتا، اس لئے میرا شمار زود نویس اور بسیار نویس لوگوں میں نہیں ہوتا۔ ''قاموس الفقہ'' اگر چہ بہت اہم اور شاہکار کتاب ہے، لیکن اس کی تقریظ اس سبب سے تعویق والتواء کا شکار رہی کہ دوسرے تقاضے ذہن پر غالب رہے، تاخیر کچھ زیادہ ہوگئی، یہ خیال بھی سدراہ بنا رہا کہ کتاب اس جلیل القدر عالم کے قلم سے ہے جو فقہ اسلامی پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ انشاء پرداز بھی ہے۔ اس کی تحریریں آراستگی اور مشاطگی کی بہت شعوری کوششوں اور خون جگر کی کشید کے بغیر ادبی اعتبار سے نفیس اور آبدار ہوتی ہیں، ان کی تحریروں کے درمیان ایسے جملے ملتے ہیں جنھیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نسیم سحر کا جھونکا آگیا، بقول فیض: ''جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم'' پانچ جلدوں میں علم الفقہ پر اس اہم کتاب اور مولانا خالد سیف اللہ رحمانی جیسے زبان شناس اور ادیب کی تصنیف پر کچھ لکھنے سے بے ادبی کا احساس ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ میں خود کو فقہ کے موضوع پر کسی اہم کتاب کے لئے تقریظ لکھنے کا مستحق نہیں سمجھتا تھا، کیوں کہ فقہ کے معمولی مسائل اور جزئیات تک میں اہل علم سے پوچھتا ہوں، لیکن کہنے والے نے ایک بلیغ بات الأمر فوق الأدب کہی ہے، اس لئے میں نے لکھنے پر آمادگی ظاہر کردی۔

دین اسلام انسانی دنیا کے نام خدا کا آخری پیغام ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخری رسول ہیں اور ان کی لائی ہوئی شریعت آخری شریعت ہے جو ہر زمانہ کے لئے رشد وہدایت ہے، ہر شخص کے لئے دستور حیات ہے، ہر شعبہ زندگی کے لئے راہ عمل ہے، خیر وشر معروف ومنکر حلال و حرام ہر چیز بین اور واضح ہے۔ علماء اور فقہاء نے قرآن وسنت سے اس کے احکام کو اور ان کے مآخذ کو اور ان کے اُصولوں کو مدون کردیا ہے، ہزاروں کتابیں طویل اور مختصر ان کی بصیرت اور محنت کی آئینہ دار ہیں، دنیا کے کسی مذہب میں احکام وقوانین کی وہ تفصیل نہیں ملے گی جو دین اسلام میں ملے

گی، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ دین مکمل ضابطہ حیات ہے اور جب تک اس دنیا کا نظام قائم ہے یہ نظام زندگی ہے۔ جس طرح کائنات کا تکوینی نظام ایک ہے اور اس میں کوئی تعدد نہیں، اسی طرح سے تشریعی نظام بھی ایک ہے اور صرف وہی اللہ کی بارگاہ میں معتبر ہے۔ وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيناً فلن يُقْبَلُ مِنه۔

عصر حاضر کے نظام تعلیم میں انسان کے خودساختہ قوانین کو کلیدی حیثیت حاصل ہے، ماہر قانون وہ ہے جس نے لاکالج سے ڈگری حاصل کی ہو، انصاف کی عدالت میں جج وہ مقرر کئے جاتے ہیں جنھیں ان قوانین میں درک حاصل ہو۔ زمین اللہ کی، قانون غیر اللہ کا، غیر اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کے ماہرین عزت ومرتبت کے حامل اور شریعت اسلامی میں فضل وکمال رکھنے والے نادان اور غافل۔ اس دنیا کا پورا نظام زندگی ایک انقلاب کا منتظر ہے، وہ انقلاب جو معیار علم کو بدل دے انداز نظر میں تبدیلی پیدا کردے، زمانہ ایک زلزلہ کا منتظر ہے، وہ زلزلہ جس سے بلندیاں پست ہوجائیں اور پستیاں بلندیوں سے بدل جائیں۔ علامہ اقبال نے کہا تھا کہ اس دور کا مجدد وہ ہوگا جو اسلام کے قوانین کی برتری کو دنیا کے سامنے مبرہن کردے یہ زلزلہ بردوش کام اور نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے، اس دعوت حق اور اتمام حجت کے لئے مغربی قوانین اور اسلامی قوانین دونوں پر گہری نظر ضروری ہے، اس تقابلی مطالعہ کے لئے اسلامی قوانین کی ان کتابوں سے بھی مدد ملے گی جو اُردو زبان میں مرتب کی گئی ہیں، اُردو کی ان کتابوں کا فائدہ ان لوگوں کو بھی پہنچے گا جو عربی زبان سے واقف نہیں اور وہ اسلامی نظام قانون اور فقہ اسلامی سے اُردو کے ذریعہ واقف ہونا چاہتے ہیں۔

ہندوستانی علماء کا اُردو زبان میں فقہ اسلامی کی خدمت کا طویل ریکارڈ موجود ہے، گردش روزگار نے تعلیمی نظام کی کایا پلٹ دی ہے، براہ راست عربی زبان کے ذریعہ اسلامی علوم کی تحصیل ہر شخص کے لئے ممکن نہیں، ضرورت اس بات کی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کے لئے اُردو زبان کے ذریعہ اسلامی علوم کو قابل حصول بنایا جائے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ ہر موضوع پر برصغیر کے علماء نے تصنیفات کا مستند ذخیرہ تیار کردیا ہے۔ ہندوستان میں جب مسلم حکومت ختم ہوچکی تھی اور اسلامی شریعت کا اقتدار باقی نہیں رہا تھا اس وقت کے نامساعد حالات میں انفرادی علمی کوششوں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، غالباً سب سے پہلے فتاویٰ عالمگیری اور ہدایہ کا اُردو ترجمہ سامنے آیا جو امیر علی کا کیا ہوا تھا، شرح وقایہ کا اُردو ترجمہ مولوی وحید الزماں لکھنوی نے کیا، درمختار کا اُردو ترجمہ مولوی خرم علی نے غایۃ الاوطار کے نام سے کیا، عقد الجید کا اُردو ترجمہ مولانا محمد احسن صدیقی نانوتوی

نے سلک مروارید کے نام سے شائع کیا، قدوری کا اُردو ترجمہ ضروری کے عنوان سے مولوی عبدالعزیز نے کیا، منیۃ المصلی کا اُردو ترجمہ عبدالرحمٰن حسام الدین نے صلوٰۃ الرحمٰن کے نام سے کیا، آخر میں مشہور کتاب الفقہ علی المذاہب الأربعہ کا ترجمہ عاصم حداد کے قلم سے منظر عام پر آیا۔ الغرض فقہ کی اہم کتابوں کے ترجمے کی کوششیں شروع ہوئیں تاکہ عربی اور فارسی زبان کی حکومتی سرپرستی کے ختم ہونے پر ہندوستانی مسلمانوں کا رشتہ فقہ کے لٹریچر سے باقی رہے۔ اُردو زبان میں فقہ کے لٹریچر کا جائزہ لیتے وقت مولانا تھانوی کی بہشتی زیور کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں، اس کتاب کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اب بھی والدین اپنی بیٹیوں کو شادی میں جہیز کے طور پر قرآن مجید کے ساتھ ساتھ یہ کتاب بھی دیتے ہیں۔ مولانا مجیب اللہ ندوی کی کتاب اسلامی فقہ بھی قابل تذکرہ ہے، اس طرح مولانا منہاج الدین مینائی کی کتاب ''اسلامی فقہ'' مولانا انوار اللہ صاحب فاروقی کی کتاب ''حقیقۃ الفقہ''، مولانا عبدالشکور صاحب کی کتاب ''علم الفقہ'' اور عاصم حداد کی ''فقہ السنۃ'' بھی تذکرہ کے قابل ہے۔ اُردو زبان میں فتاویٰ کے کئی قابل قدر مجموعے منظر عام پر آئے ہیں، مولانا مودودی کی رسائل ومسائل اور اس سے ملتی جلتی دوسری کتابیں شائع ہوچکی ہیں، بچوں کے لٹریچر میں مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کی کتاب تعلیم الاسلام بھی مقبول کتاب ہے، اس میں بھی فقہ کے ضروری مسائل آگئے ہیں۔ فقہ کی الگ الگ جزئیات اور عنوانات پر بھی بے شمار کتابیں اُردو میں آگئی ہیں، جیسے اسلام کا قانون فوجداری اور اسلامی عدالت اور کرایہ کے مکانات کی شرعی حیثیت وغیرہ۔ عربی زبان میں کویت میں مرتب کردہ فقہ کی ضخیم اور متعدد جلدوں میں انسائیکلو پیڈیا کا اُردو ترجمہ بھی جلد منظر عام پر آنے والا ہے، اس عظیم کام کی ترتیب اور ترجمہ اور نگرانی میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے دست راست ''قاموس الفقہ'' کے مؤلف مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی کوششیں شامل رہی ہیں۔

اُردو زبان کے ذریعہ فقہ اسلامی کی خدمت ہندوستان کی فقہی خدمات کا محض ایک گوشہ ہے، اگر عربی اور فارسی زبان کی کتابوں کو بھی شامل کیا جائے تو ہندوستان کا مقام فقہ اسلامی کی خدمت کے میدان میں سب سے زیادہ بلند نہیں تو بہت بلند ضرور ہے۔ فتاویٰ تاتارخانیہ اور فتاویٰ عالمگیری اور فوائد فیروز شاہی فتاویٰ حمادیہ اور فتاویٰ ابراہیم شاہیہ جیسی مبسوط کتابیں تیار کی گئی ہیں، ہدایہ کی ۱۵ رشرحیں اور شرح وقایہ کی ۱۸ رشرحیں لکھی گئیں، اُصولِ فقہ میں ملا محب اللہ بہاری کی مسلم الثبوت کا مرتبہ مسلم ہے، ابوالبرکات حافظ الدین نسفی کی کتاب المنار کی نو شرحیں ہندوستان میں لکھی

گئیں جن میں شیخ احمد امیٹھوی (ملا جیون) کی نور الانوار سب سے زیادہ مقبول اور مشہور ہوئی۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید بھی فقہ کے دائرہ میں آتی ہے۔ یہاں استقصاء مقصود نہیں ، مولانا عبدالحی حسنی کی کتاب الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند اور نزہۃ الخواطر میں ان کے علاوہ بھی بہت سے نام مل جائیں گے، یہاں صرف فقہ اسلامی سے متعلق چند نام ہیں جو گنائے گئے ہیں ورنہ قرآن وحدیث ومعقولات وتاریخ اور سیرت وسوانح دیگر اسلامی علوم اور ان کے اصحابِ کمال کا ذکر کیا جائے تو ہندوستان کا آسمان علم ہر طرف پھیلی ہوئی کہکشاں سے جگمگ کرتا ہوا نظر آئے گا۔

ہندوستان میں جدید مسائل کے فقہی حل کی کوششوں میں فقہ اکیڈمی کے سالانہ جلسوں کا ذکر بھی ضروری ہے، جس میں پورے ملک سے اور بیرون ہند سے مشاہیر علماء بلا اختلاف مسلک شریک ہوتے رہے ہیں اور نئے پیدا ہونے والے مسائل پر اپنا نقطہ نظر پیش کرتے رہے ہیں، پھر ان مقالات پر مشتمل مجلہ فقہ اسلامی کے ضخیم نمبروں کی اشاعت ہوتی رہی ، اجتماعی اجتہاد کی یہ وہ کوشش ہے جس کی نظیر اسلامی دنیا میں مشکل سے ملے گی۔ جس ملک میں اس کی نظیر ہے وہاں اس طرح کے کام کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے اور اس کے لئے بڑے بڑے بجٹ مختص ہوتے ہیں، ہندوستان کی مقہور اقلیت کے مفلوک الحال علماء جب اس طرح کی عظیم الشان علمی اور فقہی تحریکیں برپا کرتے ہیں جن کی قوت وتاثیر اور علمی وقار کا بیرون ہند کے علماء اعتراف کرتے ہیں، تو محسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ مسلمانوں کی حکومت واقتدار کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گل ہو گیا لیکن علم دین اور فکر اسلامی کا شعلہ ابھی تک شعلہ مستعجل نہیں ثابت ہوا ہے، اس کی آب وتاب اس کی حرارت اور ضوء فشانی باقی ہے۔ بیسویں صدی کے اواخر میں فقہ اسلامی کے میدان میں یہ باوقار کام بلا تشبیہ عہد عباسی کے اس اجتماعی فقہی کام کی یاد دلاتا ہے جس کی امامت امام ابوحنیفہؒ کے ہاتھ میں تھی اور جن کے حلقہ فکر و اجتہاد میں علم کے مختلف میدانوں کے ماہرین جمع تھے، قیاس واجتہاد میں امام ابو یوسفؒ امام زفرؒ اور امام محمدؒ جیسے نابغہ روزگار، علم حدیث میں یحیٰ بن زکریا اور حفص بن غیاث اور حبان جیسے عبقری اور عبداللہ بن مسعودؓ کے پرپوتے قاسم بن معن جیسے عربی زبان وادب اور بلاغت کے ماہر اور داؤد طائی اور فضیل بن عیاض جیسے متورع اور متقی جیسے لوگ جمع تھے۔ امام ابوحنیفہؒ کا کارنامہ حیات یہ ہے کہ انھوں نے فقہ اسلامی کے کام کو انفرادی دائرہ سے نکال کر اجتماعی دائرہ میں داخل کر دیا تھا، فقہ اکیڈمی کا کام اسی اصل کی ایک نقل ہے، اسی نمونہ کی پیروی ہے اور اس لئے تحسین وآفرین کے لائق

ہے۔

دورِ آخر میں بھی جب سیاسی طاقت کی کلید ہاتھ سے نکل چکی تھی کتابوں کا یہ عظیم الشان ذخیرہ اور خدمات کا یہ شاندار ریکارڈ فیض رسانی ہے ہندوستان کے ان مخلص علماءِ حق کی جنھوں نے سلطنتوں کی تخویف وتحریص سے مستغنی ہوکر اور حبِ جاہ وزر سے بے نیاز ہوکر کتاب وسنت سے وابستگی اختیار کی اور عوام وخواص میں اس وابستگی کا صور پھونکا اور اپنے پیغام اسلام کو ہر گوش حق نیوش تک پہنچا دیا۔ آج ہندوستان کے عظیم الشان مدارس اسلامیہ اور ہندوستان کی بڑی بڑی دینی اور اصلاحی تحریکیں اسلاف کی کوششوں کا نتیجہ اور ان کے لئے صدقہ جاریہ ہیں، حالات کی تبدیلی کی وجہ سے رنگ وروغن اور خدوخال میں کچھ فرق ضرور واقع ہوا ہے، لیکن بنیادی طور پر اسی پودے کا قلم ہے جو ہماری تاریخ میں شجر سایہ دار اور ثمر دار کی طرح نظر آتا ہے۔ ان ہندوستانی مدارس اور ہندوستانی تحریکوں کا ابر فیض رساں پورے عالم پر برسا ہے، آج عالم اسلام میں اسلامی بیداری پیدا ہوئی اور ہو رہی ہے اس کے پس پردہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی قلم اور قدم سے کوشش شامل ہے۔ دنیا میں جہاں رُجوع الی اللہ اور تعلق مع اللہ اور عبادات واخلاق کے نظام کو درست کرنے کی جو کوششیں جاری ہیں، ان میں مولانا محمد الیاسؒ کی تحریک تبلیغ بھی ایک عامل ہے۔ اسلامی ملکوں میں شریعت کے نفاذ کے جو مطالبے ہو رہے ہیں اور اس کے لئے جو کشمکش پیدا ہوئی ہے، اس میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریک کی بازگشت بھی پائی جاتی ہے۔ برصغیر کی یہ نمایاں خدمات منصۂ شہود پر نہیں آتیں اگر اس کی تاریخ میں علماء اور فقہاء وفضلاء کا خونِ دل اور سوزِ دروں شامل نہ ہوتا، اور فقہ اکیڈمی کی اجتماعی تحریک بھی جس کے بانی حضرت قاضی مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ تھے، اس کے پس منظر میں یہاں کے علماء کا علمی اور تحقیقی ذوق اور سوادِ قلم ہے جو روشنی پھیلا تا رہا ہے۔

”قاموس الفقہ“ کے مصنف اسی مؤخر الذکر مکتب فکر کے دیدہ ور اور صاحب بصیرت عالم ہیں، ”جدید فقہی مسائل“ پر پہلے ان کی کتاب شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہے، ان کا قلم رواں اور علم بحرِ بے کراں ہے، وہ صرف اور صرف قلم کے دھنی نہیں عمل کے میدان کے شہسوار بھی ہیں، المعہد العالی ان کی فکر جمیل اور سعی مسلسل کا زندہ اور تابندہ نقش مثالی ہے۔

معاجم اور قوامیس کے اس دور میں فقہی اصطلاحات والفاظ کو حروف تہجی کی بنیاد پر اُردو زبان میں مرتب کرنے کی ضرورت تھی تاکہ فقہی مسئلہ تلاش کرنے والے اسی سہولت کے ساتھ اپنی مراد پالیں جس سہولت کے ساتھ وہ ڈکشنری اور انسائیکلوپیڈیا سے مستفید ہوتے ہیں۔ اسی ضرورت

کے پیش نظر یہ عظیم الشان کتاب ’’ قاموس الفقہ ‘‘ مرتب کی گئی ہے، دریا کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے، ہزاروں صفحات کا عطر، ایک پورے کتب خانہ کا لب لباب ، اور توازن اور اعتدال علمی سفر میں مصنف کا ہم رکاب رہا ہے۔

(تقریظ کتاب قاموس الفقہ شائع کردہ: کتب خانہ نعیمیہ، سہارنپور، دیوبند)

☆☆☆☆
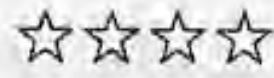
تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک

اُردو زبان میں تصوف کے موضوع پر کتابوں کی کمی نہیں؛ لیکن مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی یہ کتاب حقیقتِ تصوف کو سمجھنے میں بہت معاون ثابت ہوتی ہے اور تصوف کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں اس کتاب سے دور ہو جاتی ہیں۔ تصوف کا مقصد اس تصور کائنات کا اذعان ہے، جو قرآن وسنت نے پیش کیا ہے، اس کا مقصد حقائق اسلام پر پختہ ایمان اور گہری بصیرت حاصل کرنا ہے، حقیقی اسلامی تصوف رضائے الٰہی کے حصول اور نفس پر قابو پانے اور اخلاق کا تزکیہ کرنے کا نام ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ بندہ کے اندر یہ شعور پیدا ہو جائے کہ وہ خدا کا بندہ ہے اور خدا کی بندگی اور اطاعت میں اس کو اپنی زندگی گزارنی چاہئے۔ خدا کی وحی پر کامل ایمان قضاء وقدر پر یقین اس کے اوامر کا اتباع، اس کی عظمت وجلال کے سامنے اظہار عجز ونیاز، اس کے غضب کا خوف اس کی خوشنودی کی طلب، مصائب وآلام پر صبر، محرمات سے اجتناب، لغو کاموں اور لایعنی باتوں سے گریز اور سکوت وخاموشی، ذکر اللہ کی کثرت، مستحبات کی انجام دہی، نوافل کا اہتمام، دل میں انسانیت کا درد، خلق خدا کی خدمت، دین کی تبلیغ واشاعت شر وباطل کے خلاف حسب موقع جہاد اور شریعت اسلام کے نفاذ کے لئے حسب استطاعت اور حسب امکان سعی، یہ سب چیزیں اس کے لئے قال نہیں بلکہ حال بن جائیں، اس کے دل میں ان باتوں کا شوق اور ان کا ذوق پیدا ہو جائے، ان ہی کیفیات کا حصول تصوف کا مقصد ہے، حقیقی اسلامی تصوف یہی ہے۔ حقیقی اسلامی تصوف یہ نہیں ہے کہ سالکِ راہ تصوف ہمیشہ کے لئے دنیا سے منہ موڑ لے، گھر سے اور اپنی ذمہ داریوں سے دست بردار ہو جائے، اپنے اوپر وجد وحال طاری کر لے، اسے نہ دنیا کا ہوش رہے نہ اپنی ذات کا، تجرد کی زندگی اختیار کر لے اور اگر شادی کر لے تو اپنی بیوی کو بیوہ بنا کر رکھے، اپنے اوپر دیوانگی طاری کر لے اور سرود ورقص میں مشغولیت اختیار کر لے اور تھرکنے لگے اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو گریباں چاک کر لے، جنگل کی راہ لے، یہ سب جوگیوں اور عیسائیوں کا طریقہ ہو سکتا ہے یہ وہ تصوف نہیں جو احسان کی کیفیت سے عبارت ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے اسلامی تاریخ کی درخشاں شخصیتوں کی سوانح حیات مرتب

کی ہے۔ انھوں نے حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی سیرت پر مفصل اور جامع کتابیں تصنیف کی ہیں، انھوں نے عصر حاضر کے بھی اہل اللہ کے احوال پر خامہ فرسائی کی ہے۔ وہ ان شخصیتوں سے متاثر ہیں جن کے یہاں شریعت اور طریقت میں کوئی تضاد نہیں، اس لئے ان کے پیش نظر وہی تصوف صحیح ہے جو پورے طور پر شریعت کا پابند ہے اور جس میں مقام عبدیت سے بڑھ کر اور کوئی مقام نہیں اور جس کا مقصد اللہ کی ذات سے محبت، اس کی عبادت اس کی اطاعت اور اس کے لئے کامل انقیاد ہے۔ انھوں نے تصوف وسلوک پر اپنی کتاب میں اسی تصوف کو پیش کیا ہے جو علماء ربانیین کا تصوف ہے اور جس کے بغیر عبادات جسد بے روح کی طرح ہیں اور داخلی کیفیات سے خالی ہوتی ہیں۔ داخلی کیفیات سے بے پرواہی اور تزکیہ اخلاق سے غفلت چوں کہ عموم بلوی کی شکل اختیار کر چکی ہے اور تصوف اور حاملین تصوف کو تنقید کا نشانہ بنانا چوں کہ زمانہ کا چلن اور وقت کا فیشن بن چکا ہے اسی لئے مولانا نے اس کی ضرورت سمجھی کہ تصوف کو اپنی تصنیف کا موضوع بنائیں اور انھوں نے ”ربانیة لا رهبانية“ کے نام سے پہلے عربی زبان میں کتاب لکھی، اس کتاب کی روشنی میں تصوف وسلوک سے متعلق مولانا کا نقطۂ نظر پیش کیا جارہا ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی شخصیت بیسویں صدی کی عظیم شخصیت تھی، نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے عالم اسلام کے لئے ان کی ذات گرامی کی حیثیت ایک رہنما کی ہے۔ ان کو لوگ ممتاز عالم دین، عظیم مصنف، ادیب وخطیب اور سحر طراز انشاء پرداز اور مختلف اصلاحی اور دعوتی تحریکوں کے علم بردار اور متعدد دینی اداروں کے ذمہ دار کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ لیکن ان سب سے ماوراء حضرت مولانا کی ایک اور شخصیت ہے اور ان کا ایک اور میدان ہے وہ ہے تزکیہ اور احسان یا تصوف وسلوک کا۔ مولانا اس میدان کے نہ صرف شہسوار بلکہ اس کے مبصر اور مجدد بھی ہیں ”ربانیة لا رهبانية“ مولانا کی اس موضوع پر باقاعدہ کتاب ہے اور مختلف کتابوں اور اصلاحی مضامین میں اس موضوع سے متعلق ان کی تحریریں ملتی ہیں، اُردو میں اس کتاب کا نام ہے ”تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک“۔

اس مضمون میں تصوف وسلوک سے متعلق مولانا کے خیالات پیش کئے جارہے ہیں،
تصوف کے میدان میں مولانا کے بہت سے خیالات اجتہادی نوعیت کے حامل ہیں ان میں توازن اور اعتدال ہے اور ان کا قلم افراط وتفریط سے محفوظ ہے، اہل دل اور اصحابِ قلوب کے تمام خیالات سے ضروری نہیں کہ اتفاق کیا جائے؛ لیکن ان کے بارے میں بدزبانی شدید نقصاندہ ہوتی ہے۔ صوفیاء کرام اور عارفین باللہ کے بارے میں زبان وبیان کی احتیاط کی ضرورت ہے، ورنہ تجربہ یہ

ہے کہ دنیا ہی میں اس کا نقصان محسوس ہونے لگتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاءُ وا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلاًّ لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّکَ رَؤُفٌ رَّحِيْمٌ۔ (الحشر:۱۰)

اور ان کے لئے بھی جو ان (مہاجرین) کے بعد آئے اور دُعاء کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار، ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں گناہ معاف فرما اور مومنوں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ نہ پیدا ہونے دے، اے ہمارے پروردگار تو بڑا شفقت کرنے والا مہربان ہے۔

اس آیت میں مسلمانوں کی آئندہ نسلوں سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ اسلاف کے بارے میں ان کا رویہ شرحِ صدر اور اعترافِ حق کا ہونا چاہئے، صدق و اخلاص، دین کی خدمت اور اسلامی سرحدوں اور قلعوں کی پاسبانی کے میدان میں جو سبقت اور فضیلت ان کو حاصل ہے اس کو دل سے تسلیم کرنا چاہئے، ان کی طرف نئی نسل کے دلوں میں کوئی کینہ اور کوئی نفرت نہ ہو، ان کی خدمات کے اعتراف میں ان کو انقباض اور تکلیف نہ ہو ان کی زبان ان کے لئے دُعاء گو اور ثنا خواں رہے اور وہ ان فروگزاشتوں سے جن سے کوئی فردِ بشر محفوظ نہیں رہتا درگزر سے کام لے اس لئے کہ جو اجتہاد کرتا ہے اس کے ساتھ خطا و صواب کا احتمال رہتا ہے، اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت کے سوا اور دوسرے تمام لوگوں کی تعلیمات میں رد و قبول دونوں چیزوں کی گنجائش ہے۔

اس آیت کا ہم سے یہ مطالبہ بھی ہے کہ ہم سلف صالحین اور ایمان و احسان کے شعبہ کے امام و پیشرو بزرگوں کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے اور ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے اور ان پر کسی قسم کا حکم لگانے میں احتیاط سے کام لیں اور ان میں کسی عجلت اور جذباتیت کا مظاہرہ نہ کریں؛ کیوں کہ سلوک و تصوف کے میدان میں ایسی ایسی ہستیاں گزری ہیں جن کے احسان سے پورے پورے ملک اور قومیں سبکدوش نہیں ہوسکتی ہیں اور جن کی کوششوں سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو دولت اسلام اور نعمت ایمان ملی اور مرتبہ احسان حاصل ہوا احساس فرض اور ادائے قرض کا کم سے کم تقاضہ ان کی خدمات کا خوش دلی کے ساتھ اعتراف ہے۔ مولانا اصطلاح ''تصوف'' کے

بارے میں کہتے ہیں:

اصطلاحات کا ظلم

اصطلاحات نے بعض اوقات حقائق کے ساتھ زیادتی کی ہے، دنیا کے ہر علم وفن، زبان و ادب اور دین و مذہب میں اس زیادتی کی ایک طویل روداد ہے، ان اصطلاحات کی وجہ سے اختلاف اور تنازعہ کا لا متناہی سلسلہ اُٹھ کھڑا ہوا اور مختلف مکاتب خیال وجود میں آگئے، دلائل اور مناظرے کی محفلیں آراستہ ہوگئیں اور لوگ مختلف جماعتوں میں تقسیم ہوگئے۔

اگر ہم ان نئی اصطلاحات اور عرفی ناموں کو ترک کر کے عہد ماضی کی طرف واپس ہوں جب ان حقائق کے لئے بہت سادہ اور عام فہم الفاظ مستعمل تھے اور بڑی سہولتوں کے ساتھ ان کیفیات اور معانی کی ترجمانی کی جاتی تھی اور ان الفاظ کو اختیار کرلیں جو ہمارے اسلاف کے یہاں رائج تھے تو یہ مسئلہ اسی وقت حل ہوجائے گا اور تمام جماعتوں میں صلح ہوجائے گی۔ ان ہی اصطلاحات میں ایک اصطلاح تصوف ہے، جو ہم لوگوں میں بہت رائج ہے اس سلسلہ میں طرح طرح کے سوال کھڑے ہوئے اور بحثوں کا ایک طویل سلسلہ قائم ہوگیا، سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوا کہ اس لفظ کی حقیقت و مراد کیا ہے، اس کا مأخذ و منبع کیا ہے، آیا وہ صوف سے ماخوذ ہے یا صفا سے ،صفو سے نکلا ہے یا صفہ سے، یا وہ ایک یونانی لفظ صوحنا سے لیا گیا ہے، جس کے معنی حکمت بتائے جاتے ہیں۔(دیکھئے: بیان ''تصوف'' دائرۃ المعارف بستانی)

آخر یہ لفظ کہاں سے برآمد کیا گیا اور کس طرح اس کا رواج ہوا، جب کہ نہ قرآن وحدیث میں اس کا وجود ملتا ہے اور نہ صحابہ کرام اور تابعین کے اقوال میں اور نہ خیر القرون میں اس کا سراغ ملتا ہے اور ایسی چیز جس کا یہ حال اور جس کی یہ تاریخ ہو بدعت کہلانے کی مستحق ہے، غرض کہ اس طرح تصوف کے حامیوں اور مخالفوں میں ایک قلمی اور لسانی معرکہ برپا ہوگیا۔ اگر ہم اس اصطلاح کو ترک کردیں جس سے ہم دوسری صدی میں روشناس ہوئے، جیسا کہ (کشف الظنون: ۱/ ۲۸۰) بحوالہ امام قشیری موجود ہے۔ قرآن وحدیث اور عہد صحابہ وتابعین کی طرف رُجوع کریں اور کتاب وسنت کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کریں تو ہمیں نظر آئے گا کہ قرآن دین کے ایک شعبہ اور نبوت کے ایک اہم رکن کی طرف خصوصیت سے توجہ دلاتا ہے اور اس کو تزکیہ نفس سے تعبیر کرتا ہے اور ان چار ارکان میں اس کو شامل کرتا ہے، جن کی تکمیل حضور صلی اللہ علی وسلم کے

منصب نبوت سے متعلق اور مقاصد بعثت میں شامل تھی۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلاً مِنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ آیَاتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلَالٍ مُّبِیْنٍ۔ (الجمعة:۲)

وہی ہے جس نے اٹھایا امیوں میں سے ایک رسول انھیں میں کا، پڑھ کر
سناتا ہے ان کو اس کی آیتیں اور ان کو سنوارتا ہے اور سکھلاتا ہے کتاب
اور دانائی اور اس سے پہلے پڑے ہوئے تھے وہ صریح بھول میں۔

تزکیہ سے مراد یہ ہے کہ انسانی نفوس کو اعلیٰ اخلاق سے آراستہ اور رذائل سے پاک صاف کیا جائے مختصر الفاظ میں تزکیہ کی وہ شکل مطلوب ہے جس کے شاندار نمونے اور مثالیں ہم کو صحابہ کرام کی زندگی میں نظر آتی ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ زبان نبوت اسلام اور ایمان کے ساتھ ایک خاص درجہ اور مرتبہ کا ذکر کرتی ہے اور اس کو احسان سے تعبیر کرتی ہے، جس سے مراد یقین کے استحضار کی وہ کیفیت ہے جس کے لئے ہر صاحب ایمان کو کوشاں رہنا چاہئے اور جس کا شوق ہر مرد مومن کے دل میں موجزن ہونا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ احسان کیا ہے، آپ نے فرمایا تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ جیسے تم اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

جب ہم شریعت اسلامی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال واقوال پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو حصوں میں منقسم تھے ایک کا تعلق افعال وحرکات اور اُمور محسوسہ سے تھا، مثلاً قیام، قعود، رکوع، سجود، تسبیح واذکار، ادعیہ احکام ومناسک، فن حدیث نے اس کی روایت اور تدوین کی خدمت انجام دی، علم فقہ نے اس سے مسائل اور جزئیات استخراج کرنے کا بیڑا اٹھایا اور محدثین اور فقہاء اُمت نے دین کو اس طرح محفوظ کر دیا کہ اُمت کے لئے اس پر عمل پیرا ہونا آسان ہو گیا۔

دوسری قسم وہ ہے کہ جس کا تعلق ان باطنی کیفیات سے ہے جو ان افعال وحرکات کے ساتھ لازم وملزوم ہیں اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں قیام وقعود، رُکوع وسجود، ذکر و دُعاء، وعظ ونصیحت، گھر کے ماحول، میدان جہاد غرض ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہیں۔ ان کیفیات کی تعبیر ہم اخلاص واحتساب، صبر وتوکل، زہد واستغناء، ایثار وسخاوت، ادب وحیاء، خشوع وخضوع، انابت وتضرع دُعاء کے وقت دل کی شکستگی، دنیا پر آخرت کو ترجیح، رضاء الٰہی اور دیدار کا شوق اور اس طرح

کی اور دوسری باطنی کیفیات اور ایمان واخلاق سے کرسکتے ہیں جن کی حیثیت جسم انسانی میں روح کی اور قالب ظاہر میں قلب کی ہے اس علم کو جو اول الذکر کی شرح وتفسیر سے متعلق ہے فقہ ظاہر کہا جاسکتا ہے تو وہ علم جو ان کیفیات کی تشریح کرتا ہے اور ان کے حصول کے لئے رہنمائی کرتا ہے، فقہ باطن قرار دیا جاسکتا ہے۔

تزکیہ و احسان کا لفظ ہی زیادہ مناسب ہے

حضرت مولاناؒ کا خیال یہ ہے کہ زیادہ مناسب تو یہ تھا کہ ہم اس علم کو جس کا کام تزکیہ نفوس اور تہذیب اخلاق ہے اور جو نفس انسانی کو فضائل شرعیہ سے آراستہ اور لسانی واخلاقی رذائل سے پاک وصاف کرتا ہے اور کمال ایمان و درجہ احسان، اخلاق نبوی کی پیروی، روحانی و باطنی کیفیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع وتقلید کی دعوت دیتا ہے، تزکیہ واحسان کے نام سے ہی یاد کرتے یا کم از کم فقہ باطن ہی کہتے اور اگر ایسا ہوتا تو شاید اختلاف ونزاع کی نوبت ہی نہ آتی اور سارا جھگڑا ختم ہو جاتا؛ لیکن محض اصطلاح کے فرق کی وجہ سے نزاع وجدال میں مبتلا ہو جانا اہل دانش کا کام نہیں:

الفاظ کے پھندے میں اُلجھتے نہیں دانا
صیاد کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

کسی متعین شکل اور کسی مخصوص راستہ پر عدم اصرار زیادہ مناسب ہے

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا یہ مجتہدانہ کارنامہ ہے کہ وہ تزکیہ واحسان کے لفظ کو ہی زیادہ مناسب قرار دیتے ہیں؛ البتہ لفظ تصوف سے انھیں کوئی چڑھ بھی نہیں ہے، جس طرح ہم صلاۃ و صیام کے لئے نماز وروزہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور ان الفاظ سے ہمیں کوئی وحشت نہیں ہوتی۔

مولانا کا میدان تصوف میں دوسرا مجتہدانہ کارنامہ یہ ہے کہ وہ تصوف کی متعین شکل اور طریقہ پر اصرار کو پسند نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں:

احسان اور فقہ باطن سب علمی وشرعی حقائق اور دین کے مسلمہ اُصول ہیں، جو کتاب وسنت سے ثابت ہیں اگر اہل تصوف اس مقصد کے حصول کے لئے کسی خاص اور متعین راستے یا شکل پر اصرار نہ کرتے اور وسیلہ کے بجائے مقصد پر زور دیتے تو اس مسئلہ میں آج سب یک زبان ہوتے اور

اختلاف کا سر رشتہ ہی باقی نہیں رہتا۔

اس صورتِ حال سے ہم کو اندازہ ہوتا ہے کہ اس اصطلاح ''تصوف'' نے دین کی کتنی عظیم کتنی روشن اور کتنی اہم حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے اور بہت سے لوگوں کے لئے اس حقیقت کے حصول میں مانع ہو گیا ہے، بہت سے لوگ تو ہمت ہی ہار بیٹھے ہیں اور انھوں نے اس کا خیال ہی ترک کر دیا؛ لیکن ہم سب کو قیودِ اصطلاحات اور خواہشات وعقلیات سے آزاد ہو کر سوچنا چاہئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اصطلاحات کے پردہ کی وجہ سے اور مروج نام کی وجہ سے ہم ایک اہم دینی حقیقت سے گریز اختیار کر لیں۔

تصوف کو بدنام کرنے والے

لیکن تصوف کی بدنامی کی ایک وجہ خام کار اور پیشہ ور صوفیاء کے طبقہ کا وجود میں آنا بھی ہے، اس طبقہ میں بھی علماء سوء کی طرح صوفیاء سوء پیدا ہوئے، ان میں فاسد العقیدہ لوگ بھی اٹھے، جنھوں نے اہل تصوف میں بڑے ہونے کا دعویٰ کیا، ان سے معاشرہ میں بگاڑ اور فساد پیدا ہوا۔ درحقیقت انھوں نے اپنی نفس پرستی کے لئے تصوف کو آلہ کار بنایا تھا؛ لیکن اگر علماء سوء کے وجود کی وجہ سے علم دین کا انکار نہیں کیا جا سکتا تو صوفیاء سوء کے وجود کی وجہ سے تصوف یا تزکیہ واحسان کا انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

جس طرح سے علماء سوء کی فکری گمراہیوں کا پردہ چاک کرنے کے لئے اہل حق اٹھے، اسی طرح خام صوفیاء اور ان کی شطحات اور ان کی تاویلات کے اثرات کو مٹانے کے لئے ان ہی صوفیاء میں سے مجددِ دین بھی اُٹھتے رہے اس طرح سے طب نبوی کی (جس کا مقصد نفس کی بیماریوں کا علاج ہے) ہر زمانہ میں تجدید کا کام بھی جاری رہا اور اس علم پر پڑے ہوئے گرد وغبار کو صاف کیا جاتا رہا۔

بہر حال اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہوگا کہ عبادت کا شوق، درجہ احسان اور حلاوت ایمان کے حصول کے لئے ہمت وحوصلہ کی اور اس راستہ کے راہ سواروں کے لئے رہبر اور رہنما کی ضرورت پڑتی ہے اور اس میدان میں توجہ اور کوشش کے بغیر لذات اور خواہشات کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ مادیت کی سطوت وقوت کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور نہ محبت وشوق کی چنگاری کو ہوا دی جا سکتی ہے اور نہ باطنی امراض کا علاج کیا جا سکتا ہے اور جس ملک اور جس معاشرہ میں اس طب نبوی

کے ماہرین نہیں رہے اور لوگوں کی اس کی طرف توجہ نہیں ہوئی وہاں دولت کی اندھی محبت، انانیت اور شہرت کی خواہش اور طاقت سے مرعوبیت، حسد، بخل اور تکبر سے امراض زیادہ نشو ونما پاتے رہے۔

خلاء کو پُر کرنے پر اصرار

حضرت مولانا ابوالحسن ندویؒ تزکیہ کی کسی خاص اور لگی بندھی اور متعین شکل پر زور نہیں دیتے ہیں جس کا رواج عام ہوا اور جس کا نام آخری دور میں تصوف پڑا اور نہ وہ تصوف کے حاملین میں سے سب کو ہر طرح کی غلط روی سے بری سمجھتے ہیں اور نہ ان کو معصوم قرار دیتے ہیں؛ البتہ وہ یہ ضرور چاہتے ہیں کہ اس خلاء کو جو زندگی میں اور معاشرہ میں واقع ہوگیا ہے پُر کیا جانا چاہئے اور تزکیہ واحسان اور فقہ باطن کو پھر سے تازہ کیا جانا چاہئے، جس طرح اسلاف نے اس کو اپنے اپنے زمانہ میں تازہ کیا تھا اور سب منہاج نبوت اور کتاب وسنت کی روشنی میں ہو، جو لوگ آنکھ بند کر کے بے احتیاطی کے ساتھ تمام گروہ صوفیاء کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور خود کو ان سے بلند تر سمجھتے ہیں، مولانا ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اقلّوا علیهم لا اباً لابیکم
من اللوم او سدوا المکان الذی سدوا

یعنی ان بزرگوں نے جو عظیم الشان کام انجام دیا وہ کر کے دکھاؤ اور اگر نہیں کر سکتے ہو تو زبان درازی اور حرف گیری بند کرو۔

راقم الحروف مضمون نگار ان حضرات کے لئے جو اپنے حال زار پر نظر نہیں ڈالتے اور تعلق مع اللہ اور تبتل الی اللہ سے متصف برگزیدہ شخصیتوں کو ضرب کاری اور چاند ماری کا نشانہ بناتے ہیں اُردو کا یہ شعر پیش کرتا ہے، جو عربی کے مذکورہ شعر کی ترجمانی ہے:

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

تصوف و سلوک ایک الہامی نظام

حضرت مولانا ابوالحسن علیؒ کی مجتہدانہ نظر تصوف وسلوک کو ایک الہامی نظام قرار دیتی ہے، ان کا کہنا ہے کہ جب اسلام اور مسلمانوں کے سامنے کوئی نازک اور اہم مسئلہ آتا ہے اور اس کے

بارے میں فیصلہ کرنا اور کسی نتیجہ تک پہنچنا مشکل ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ علماء اور مخلصین کے ایک معتد بہ گروہ کے دل میں جو نفس زکی اور ارادۂ قوی کے مالک ہوتے ہیں اس ضرورت کی تکمیل کا شدت سے خیال پیدا کردیتا ہے اور ہمہ تن ان کو اس کی طرف متوجہ کرادیتا ہے۔ ان کو اس کام کی تکمیل میں کھلے طور پر تائید الٰہی اور نصرت غیبی نظر آتی ہے اور وہ دل کی گہرائی سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اس کی طرف کشاں کشاں لے جائے جارہے ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کو اجتماعی الہام یا جماعتی ہدایت سے تعبیر کیا جاتا ہے، کبھی یہ الہام معدودے چند افراد کو ہوتا ہے، جیسے اذان کے واقعہ میں ہی عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا کہ دونوں کے جواب ایک ہی نکلے اور کبھی یہ الہام مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اور جم غفیر کو دیا جاتا ہے اور ان کی کوششوں سے اسلام اور مسلمانوں کو نفع عظیم پہنچتا ہے اجتماعی الہام کی مثال حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں قرآن کو مصاحف میں جمع کرانا اور قرن اول وثانی اور اس کے بعد کی ابتدائی صدیوں میں حدیث کے جمع و تدوین کا کام اور بعد کی صدیوں میں علوم کی تدوین اور مدارس کی تعمیر اور کتابوں کی نشر واشاعت وغیرہ کا کام، یہ سب اجتماعی الہام کی بہترین مثالیں ہیں، جس کے ذریعہ دین اور اُمت کی بہترین ضرورتیں پوری کی گئیں اور آنے والے خطرات کا سد باب کیا گیا۔

اسی طرح تصوف وسلوک بھی ایسا ہی نظام ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی اخلاقی بیماریوں کے علاج کا انتظام کیا ان کے اندر نسبت باطنی اور تعلق مع اللہ کے حصول کا شوق پیدا کیا۔ رفتہ رفتہ اس مشن کو اس کے ماہرین نے اجتہاد کے درجہ تک پہنچادیا اور اس کو دین کی بڑی قوت اور وقت کا جہاد قرار دیا اس کے ذریعہ اللہ نے دلوں کی مردہ کھیتوں کو تروتازہ کیا اور روح کے مریضوں کو شفا دی اور تاریخ اسلام میں ایسے صادقین اور مخلصین پیدا ہوئے جن میں سے ایک ایک آدمی اپنے عہد کا گل سرسبد، منارۂ نور اور نوع انسانی کے لئے شرف وعزت کا باعث ہے۔

علامہ ابن تیمیہ کی سیرت روح تصوف کی آئینہ دار

تصوف کو شرک کا مترادف قرار دینے والے کچھ لوگ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے بعض معتقدین شیخ الاسلام کو تصوف کا شدید مخالف قرار دیتے ہیں؛ لیکن حقیقت حال یہ نہیں ہے، بلا شبہ ابن تیمیہؒ نے بہت سے صوفیہ پر سخت تنقید کی ہے اور سخت زبان استعمال کی ہے؛ لیکن یہ زیادتی ہوگی اگر ان کو صوفیہ کا مخالف قرار دیا جائے۔ مجموعی طور پر ان کا رویہ تصوف کی مخالفت کا نہیں؛ بلکہ اس

کے ساتھ ہمدردی کا ہے، انھوں نے کہیں تصوف کو خارج از اسلام قرار نہیں دیا؛ بلکہ انھوں نے اسلامی تصوف کے خدو خال متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ تصوف کا جو خاص مقصد ہے، یعنی رضائے الٰہی اور تعلق مع اللہ، اس میں ان کو خاص امتیاز حاصل تھا اور اسی بنا پر مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے ان کو عارفین باللہ میں شمار کیا ہے، مجموعہ فتاویٰ میں علامہ ابن تیمیہ کا یہ قول ان کے موقف کے سلسلہ میں سند کا درجہ رکھتا ہے:

> کچھ لوگ تصوف کی ہر بات کو تسلیم کر لیتے ہیں خواہ صحیح ہو یا غلط اور کچھ لوگ اس کی کلیتاً نفی کرتے ہیں، خواہ اس کا کچھ حصہ صحیح ہی کیوں نہیں ہو۔ علماء فقہ وکلام کا بالعموم یہی رویہ رہا ہے، جب کہ تصوف یا کسی اور نظریہ کے بارے میں صحیح رویہ یہ ہے کہ جو بات قرآن وسنت کے مطابق ہو اسے تسلیم کیا جائے اور جو متصادم ہو اسے رد کر دیا جائے۔

علامہ ابن تیمیہ نے بہت سے صوفیہ کے لئے مشائخ اسلام، مشائخ کتاب وسنت اور امام الہدیٰ جیسے بلند الفاظ استعمال کئے ہیں، وہ فضیل بن عیاض، ابراہیم بن ادہم، شفیق بلخی، ابوسلیمان دارانی، معروف کرخی، سری سقطی، جنید بغدادی، عمر بن عثمان مکی اور شیخ عبد القادر جیلانی رحمہم اللہ کے لئے بہت عظمت واحترام کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ ان صوفیہ کو جنھوں نے حالت سکر میں بعض باتیں غیر متوازن کہی ہیں معذور سمجھتے ہیں اور ان کی مذمت کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ الرسائل والمسائل میں اور فتاویٰ میں ان کی اس طرح کی تحریریں موجود ہیں، وہ ابن عربی کے فلسفہ وحدۃ الوجود کے سخت ناقد ہیں؛ لیکن وہ ان کی زندگی اور کردار پر کوئی تنقید نہیں کرتے، تصوف کے سلسلہ میں ان کے تاثر اور متوازن موقف کی اس سے بڑھ کر مثال کیا ہوگی کہ انھوں نے شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی فتوح الغیب کے ایک جزء کی شرح لکھی ہے، انھوں نے تصوف کی اصطلاحوں میں بھی گفتگو کی ہے اور کہا ہے کہ صوفی کو فنا شہودی سے آگے بڑھ کر فرق ثانی کی منزل میں قدم رکھنا چاہئے جو فرق بعد الجمع سے آگے کی منزل ہے اور عبدیت کے از سر نو اثبات کے ساتھ اپنی خواہشوں اور ارادوں کو اللہ کی مرضی کا تابع کر دینا چاہئے۔ انھوں نے کہا کہ یہی وہ مقام فنا ہے جس کی تعلیم کتاب وسنت میں دی گئی ہے، ان کا کہنا ہے کہ مستقیم الاحوال صوفیہ کا یہی طریقہ ہے، وہ وحی کے علاوہ ہدایت کے دوسرے طریقوں کا بھی انکار نہیں کرتے۔ قرآن کی سورہ شوریٰ کی آیت نمبر:۵۱ کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدا بندوں سے تین طریقہ سے گفتگو کرتا ہے ان میں ایک

طریقہ ایحا اور القاء کا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ طریقہ اولیاء اللہ کو بھی حاصل ہوتا ہے۔صفاء قلب کے ذریعہ معرفت کا جو طریقہ صوفیہ کے یہاں رائج ہے ابن تیمیہ اس کا بھی انکار نہیں کرتے ہیں وہ طرق صوفیہ کے خلاف نہیں اور نہ نئے طریقوں کے اختیار کرنے کی مخالفت کرتے ہیں وہ صرف ان طریقوں کی مخالفت کرتے ہیں جو شرعاً ناجائز ہیں، فتاویٰ ابن تیمیہ جلد اول میں بھی ان باتوں کی تفصیل موجود ہے۔

اگر چہ اس کتاب میں جس کے تعارف کے سلسلہ میں راقم الحروف کا یہ مضمون ہے، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے علامہ ابن تیمیہ کے نظریات سے بحث نہیں کی ہے، صرف ان کی متصوفانہ اور عارفانہ زندگی کو پیش کرنے پر اکتفاء کیا ہے، تاریخ دعوت وعزیمت کے دوسرے حصہ میں جو علامہ ابن تیمیہ کے کارنامہ تجدید پر مشتمل ہے اس پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے میدان تصوف میں فکر و اجتہاد سے کام لیتے ہوئے کسی مخصوص طریقہ کی پابندی کو مضر قرار دیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ طریقوں کی حیثیت وسائل کی ہے، مقصد تک پہنچنے کے لئے اگر کوئی دوسرا وسیلہ ممکن ہے تو اس کو اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا بہت سی ایسی شخصیتوں کو بھی روح تصوف کا حامل سمجھتے ہیں، جنھیں عام طور پر لوگ مخالف تصوف قرار دیتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی زندگیوں میں وہ صفات پائی جاتی تھیں، جن کے لئے تصوف نے اذکار و اشغال کے مختلف طریقے اختیار کئے تھے۔ مولانا نے علامہ ابن تیمیہؒ کی پوری سیرت لکھی ہے اور ان کو عارفین باللہ میں شمار کیا ہے، شیخ عبد القادر جیلانیؒ، جنید بغدادیؒ، مولانا رومیؒ اور خواجہ معین الدین چشتیؒ جیسی بے شمار شخصیتیں ہیں جن کا نام مشاہیر تصوف میں آتا ہے، مولانا نے اپنے اجتہاد سے علامہ ابن تیمیہ کو بھی اس زمرہ میں داخل کیا ہے اور غالباً عام حلقہ تصوف کے لئے یہ بات حیرت انگیز اور تعجب خیز ہوگی، چنانچہ مولانا فرماتے ہیں:

> اہل نظر اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ذوق و معرفت ایمان حقیقی اور یقین، اخلاص و استقامت، تزکیہ باطن اور تہذیب اخلاق، کامل اتباع سنت اور فنافی الشریعت وہ حقیقی مقاصد ہیں جن کے لئے مختلف وسائل اختیار کئے جاتے ہیں؛ بلکہ کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے اور کچھ غلط نہیں کہا ہے ’’ **طرق الحصول الی اللہ بعدد انفاس الخلائق** ‘‘ ابتداء میں ان مقاصد کے حصول کے لئے سب سے مؤثر

اور طاقتور ذریعہ صحبت نبوی تھی جس کی کیمیا اثری عالم آشکارا ہے۔ اس نعمت سے محرومی کے بعد اطبائے اُمت اور خلفائے نبوت نے اپنے اپنے زمانہ میں مختلف بدل تجویز کئے آخر مختلف اسباب کی بناء پر ''صحبت'' اور ''کثرت ذکر'' پر زور دیا گیا جس کا منقح اور مدون طریقہ وہ نظام ہے جو تصوف وسلوک کے نام سے مشہور ہوگیا ہے؛ لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں کہ ان مقاصد کا حصول ان وسائل پر منحصر نہیں۔ ''اجتہاد'' و ''موہبت'' کے علاوہ ایمان واحتساب، محاسبہ نفس، سنتوں کا تتبع، کتب حدیث وشمائل سے محبت وعظمت کے ساتھ اشتغال، کثرت نوافل ودعاء، کثرتِ درود، نیت و احتساب کے ساتھ خدمت خلق، جہاد، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، دعوت وتبلیغ، ان میں سے کوئی چیز بھی استحضار و اہتمام کے ساتھ تقرب کا ذریعہ اور حصول نسبت کا سبب بن سکتی ہے۔ وسائل مختلف ہوسکتے ہیں؛ لیکن مقصود ایک ہے، شیخ الاسلام کے حالات کے مجموعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ مقصود حاصل تھا۔

اس کے بعد مولانا نے علامہ ابن تیمیہ کی زندگی کے بے شمار واقعات پیش کئے ہیں جن کو تاریخ دعوت وعزیمت کی دوسری جلد میں دیکھا جاسکتا ہے، جس کا عنوان ہے ''شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ عارف باللہ کی حیثیت سے'' اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تصوف وسلوک کا جو مقصود حقیقی ہے وہ ان کو حاصل تھا اور ان کو اس دولت بیدار میں سے وافر حصہ نصیب ہوا تھا اور ذوق عبودیت اور انابت ان کے قلب کی غذا اور روح کی دوا بن گئی تھی، زہد وتجرید وتحقیر دنیا اور سخاوت وایثار فروتنی و بے نفسی، سکینت وسرور اور کمالِ اتباع سنت کے مقامات انھیں حاصل تھے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ:

مایصنع اعدائی فان جنتی وبستانی فی صدری اُینما رحت فہی معی لاتفارقنی۔

میرے دشمن مجھے کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں، میری جنت میرے سینہ کے اندر ہے، میں جہاں بھی جاؤں وہ میرے ساتھ ہے۔

دورِ جدید وقدیم میں اسلام کی حفاظت وخدمت میں اہل تصوف کا حصہ

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ''ربانیة لا رہبانیة'' اور دوسری کتابوں میں یہ تذکرہ کیا ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں اسلام کی حفاظت کے لئے اور دین کی قلعہ بندی کے لئے جو اشخاص سامنے آتے رہے ان میں اہل قلوب اور عارفین باللہ کی بڑی تعداد رہی ہے۔ تاتاریوں کا قبول اسلام ان ہی حضرات کے فیض اور ان کی کوششوں کی بدولت ہوا، ظاہری اسباب کو سامنے رکھا جائے تو اس کی کوئی توقع نہیں تھی کہ یہ خونخوار اور درندہ صفت قوم اسلام قبول کرلے گی اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی تاتاریوں کے دل ودماغ میں رچ بس گئی تھی۔ بودھ مذہب اور عیسائی مذہب دونوں تاتاریوں کو اپنے حلقہ میں لانے کے لئے کوشاں تھے، تاتاری لیوک خاقان کے عہد میں کل انتظام سلطنت دو عیسائی وزیروں کے سپرد تھا، باوجود ان مشکلات کے ان وحشی قوموں نے مسلمانوں کا مذہب قبول کرلیا، پریچنگ آف اسلام میں پروفیسر آرنلڈ نے اس کی تفصیلات پیش کی ہیں کہ کس طرح چند اصحابِ دل بزرگوں کی بدولت یہ قوم داخل اسلام ہوئی، تاتاریوں کے قبول اسلام کا سہرا اہل تصوف کے سر پر بندھتا ہے۔

دور جدید کی اسلامی تحریکوں میں سنوسی تحریک کے روح رواں سیدی احمد الشریف میدانِ تصوف کے آدمی تھے، امیر شکیب ارسلان نے بلاغت کے ساتھ ان کا حال لکھا ہے:

وقد لحظت فیه صبرا قل ان یوجد فی غیرہ من الرجال وعزما شدیدا تلوح سیماءہ علی وجهه بینما هو فی تقواہ من الابدال اذا هو فی شجاعته من الابطال۔

میں نے ان کے اندر وہ صبر کی کیفیت دیکھی جو دوسروں میں نہیں پائی جاتی ہے، وہ آہنی عزم دیکھا جس کا مشاہدہ ان کے چہرہ سے کیا جاسکتا ہے، خشیتِ الٰہی اور تقویٰ میں ان کا شمار ابدال میں ہے اور شجاعت وہمت میں ان کا شمار ابطال (ہیروز) میں ہے۔

انیسویں صدی عیسوی میں جب عالم اسلام پر فرنگی تاتاریوں یا مجاہدین صلیب کی یورش ہوئی تو ان کے مقابلہ کے لئے عالم اسلام کے ہر گوشہ سے جو مردانِ کار سر سے کفن باندھ کر میدان میں آئے ان میں الجزائر کے شیخ امیر عبد القادر الجزائری تھے، ان کا حال حاضر العالم الاسلامی میں اس طرح لکھا ہے:

کان المرحوم الامیر عبد القادر متضلعا فی العلم والادب سامی الفکر راسخ القدم فی التصوف ......ولہ فی التصوف کتاب ''المواقف''۔

امیر عبد القادر مرحوم علم وادب میں دستگاہ رکھتے تھے، تصوف کے موضوع پر ان کی کتاب کا نام ''المواقف'' ہے۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

وکان یتہجد اللیل ویمارس فی رمضان الریاضۃ علی طریقۃ الصوفیۃ وما زال مثالاً للبر والتقوی والاخلاق الفاضلۃ الی ان توفی رحمہ اللہ۔

رات کو تہجد پڑھتے، رمضان کے دنوں میں صوفیاء کے طریقے کے مطابق ریاضت ومجاہدہ میں مشغول رہتے، نیکی تقویٰ اور اخلاق عالیہ میں ممتاز اور نمونہ تھے اور وفات تک ان کی یہی کیفیت رہی۔

۱۸۱۳ء میں جب طاغستان پر روسیوں کا قبضہ اور تسلط ہوا تو ان کا مقابلہ کرنے والے نقش بندی شیوخ تھے، جنھوں نے علم جہاد بلند کیا اور مطالبہ کیا کہ مقدمات شریعت کے مطابق فیصل ہوں اور قوم کی جاہلی عادات کو ترک کر دیا جائے۔

عالم اسلام پر سید جمال الدین افغانی کی شخصیت نے جو اثر ڈالا ہے وہ کسی صاحب نظر پر مخفی نہیں، ان کی اس جدو جہد اور جہاد میں ان کے ذکر قلبی اور باطنی بیداری کو بھی بہت کچھ دخل ہے، ان کے شاگرد رشید اور دست راست شیخ محمد عبدہ تھے جو تصوف کے لذت آشنا اور اس کوچہ سے واقف تھے۔ (تصوف وسلوک:۱۲۱)

معاصر دینی تحریکوں میں الاخوان المسلمون کی تحریک سب سے زیادہ طاقتور اور منظم تحریک ہے اور عالم عربی کے لئے تو وہ احیاءِ دین اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی واحد تحریک ہے۔ اس کے بانی شیخ حسن البناء کی شخصیت بڑی مؤثر، دلآویز اور ہمہ گیر شخصیت ہے، انھوں نے خودنوشت سوانح میں اس کی تصریح کی ہے کہ وہ طریقہ حصافیہ شاذلیہ میں بیعت تھے اور باقاعدہ اس کے اذکار و

اشغال کی مشق کی تھی ، (مذکرات لدعوۃ الداعیہ) انھوں نے اخوان المسلمین کی دعوت کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی تعریف حسب ذیل جملے میں کی ہے:

دعوۃ سلفیۃ وطریقۃ سنیۃ وحقیقۃ صوفیۃ وہیئۃ سیاسیۃ وجماعۃ ریاضیۃ رابطۃ قلمیۃ ثقافیۃ وشرکۃ اقتصادیۃ وفکرۃ اجتماعیۃ۔

اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک سلفی دعوت ، سنی طریقت ، تصوف کی حقیقت ، سیاسی تنظیم ، ورزش وریاضت کی جماعت ، ثقافتی قلمی گروہ ، اقتصادی ادارہ اور سماجی فکر ہے۔

ہندوستان میں تصوف وجہاد کا ایسا عجیب امتزاج واجتماع ملتا ہے جس کی نظیر دور دور ملنی مشکل ہے۔ حضرت سید احمد شہید کی تحریک جہاد سے کون واقف نہیں اور کون یہ نہیں جانتا کہ سید صاحب کی شخصیت تصوف کی ممتاز ومعروف شخصیت ہے، مولانا نے کتاب میں تذکرہ تو نہیں کیا ہے ؛ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کے نامی گرامی علماء اہل تصوف کی صحبت کے قائل اور معترف رہے ہیں اور انھوں نے اپنی اصلاح وتربیت کے لئے ان سے اپنا تعلق قائم بھی کیا۔ نواب صدیق حسن خان کی شخصیت نہ صرف ہندوستان ؛ بلکہ عالم اسلام کی معروف علمی شخصیت ہے ، انھوں نے اپنے وقت کے مشہور عارف باللہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور ان سے اصلاح کا تعلق رکھتے تھے ، مولانا اسماعیل شہید خود ایک جید اور ممتاز عالم اور مصلح تھے ؛ لیکن انھوں نے اہل دل کی صحبت کو ضروری سمجھا اور سید احمد شہید کے ہاتھ پر بیعت کی اور انھوں نے یہ بیعت سفر جہاد سے بہت پہلے کی تھی۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے علم وفضل اور ان کی تاریخ دانی میں کس کو کلام ہوسکتا ہے ؛ لیکن انھوں نے مولانا اشرف علی تھانوی سے استفادہ کیا اور باقاعدہ ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ مولانا داؤد غزنوی ممتاز اہل حدیث عالم تھے ، انھوں نے بھی اپنے لئے نواب صدیق حسن خاں صاحب کی طرح صحبت شیخ کو اور دست گرفتہ ہونے کو ضروری سمجھا اور مولانا عبید اللہ سندھی کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ اہل حدیث علماء میں مولانا عبد الحق بنارسی ، مولانا عبد الوہاب آروی ، میاں جی نذیر حسین محدث دہلوی بھی بیعت تھے ، اس کی اور بھی متعدد مثالیں ہیں۔

حضرت مولانا علی میاں کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ کیفیت احسان کا پیدا کرنا اپنی اصلاح کے لئے اور دعوتِ اسلامی کے کام کے لئے ضروری ہے ؛ لیکن اس کیفیت احسان کے مقصد کے حصول کے لئے متعدد طریقے ہوسکتے ہیں ، دورِ آخر میں طب نبوی اور تزکیہ نفس کے ماہرین نے

صحبت شیخ اور ذکر کو اہم ترین وسیلہ قرار دیا ہے. جن لوگوں نے اس وسیلہ کو بھی بدعت قرار دینا شروع کیا ہے، وہ بہت بڑی بھول اور غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اسی طرح سے وہ لوگ بھی غلط فہمی میں مبتلا ہیں جو علاج کے کسی ایک ہی طریقہ کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں اور وسیلہ اور مقصد کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ تاریخ اسلام میں بہت سی شخصیتیں ملیں گی، جن کو معرفت الٰہی کی دولت حاصل تھی اور احسان کی کیفیات ان کو نصیب تھیں؛ لیکن تصوف کے کسی مروجہ طریقہ پر انھوں نے عمل نہیں کیا تھا، اس کے اسباب میں مولانا کے نزدیک اجتہاد و موہبت کے علاوہ قرآن وسنت وسیرت کے ساتھ ان کے غیر معمولی تعلق و اشتغال کو دخل ہوتا ہے، عبادت و ذکر کے ساتھ یہ شدت اشتغال کبھی کبھی صحبت شیخ کی قائم مقامی کرتی ہے اور باطنی کیفیات حاصل ہو جاتی ہیں۔

تصوف وسلوک کے میدان میں بھی مولانا علی میاںؒ کی شخصیت مجدد اور مبصر کی ہے، انھوں نے ایک طرف تصوف وسلوک سے وحشت کو دور کرنے کی کوشش کی، دوسری طرف انھوں نے لفظ تصوف اور طریق تصوف پر حد سے زیادہ اصرار کو بھی نامناسب قرار دیا۔ فکر کا یہی توازن ہے جو حضرت مولانا کا امتیاز ہے، وہ وادیٔ سلوک کے نہ صرف رہرو ہیں؛ بلکہ راہبر اور مربی بھی، وقت کے بڑے بڑے مشائخ طریقت نے ان پر پورا اعتماد کیا ہے۔ ان سب کے ساتھ تصوف وسلوک کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر میں جو توازن ہے وہ ہر جگہ نہیں پایا جاتا ہے، پورا عالم اسلام جس کی جولانگاہ ہو، دین کے ہر شعبہ کو برومند بنانے کے لئے جو فکر مند ہو، مختلف قوموں اور مختلف مزاجوں سے رات دن جس کو واسطہ پڑتا ہو، جو کسی خانقاہ میں گوشہ نشیں نہ ہو، جو مصافِ زندگی میں صبح وشام جاں فشانی کرتا ہو اس کے مسلک میں بھی توازن واعتدال نہ ہو گا تو اور کہاں ہو گا؟

تصوف اور سلوک کے سلسلہ میں مولانا کے متوازن نقطۂ نظر کو جاننے کے لئے مولانا کی تحریر جو فاسد العقیدہ صوفیوں کے بارے میں ہے پیش نظر رہنی چاہئے:

> وہ پیشہ ور اور جاہ طلب وحقیقت فروش اور الحاد شعار اور فاسد العقیدہ نام نہاد صوفی ہیں، جنھوں نے دین میں تحریف کرنے مسلمانوں کو گمراہ کرنے، معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے، آزادی اور بے اعتدالی کی تبلیغ کرنے کے لئے تصوف کو آلہ کار بنایا اور اس کے محافظ وعلمبردار بن کر لوگوں کے سامنے آئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہل غیرت واہل حمیت مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ان سے بدظن ہو گئی، کچھ غیر حقیقی صوفی ایسے تھے جو اس شعبہ کی روح اور اس کے حقیقی مقاصد سے ناآشنا تھے، وہ

مقصد اور وسیلہ میں تمیز نہ کر سکے بعض اوقات انھوں نے وسائل پر تو بہت اصرار کیا اور مقاصد کو نظر انداز کر دیا اور اس تعلیم یا اس فن میں ایسی چیزیں داخل کیں جن کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا اور اس کو فن کی روح اور اس کا کمال قرار دیا؛ بلکہ مقصود مطلوب سمجھ بیٹھے۔ (سیرت سید احمد شہید: ۲۶۸)

☆☆☆☆
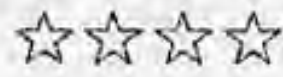
ملفوظات کے لٹریچر کی ایک کتاب
صحبت با اہل دل

اقبال کا شعر ہے:

نمی روید تخم دل از آب و گل
بے نگاہے از خداوندانِ دل

یعنی جس طرح نباتات کی روئیدگی اور سرسبزی کے لئے پانی اور زرخیز مٹی کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح دل کو پتھر کی سل کے بجائے معرفت محبت سے لبریز دل بنانے کے لئے اہل دل اور اللہ والوں کی صحبت ضروری ہوتی ہے۔ ایسے کاملین اور صادقین کی صحبت کیمیا اثر ہوتی ہے، سینہ معرفت الٰہی سے روشن ہو جاتا ہے، دل کی انگیٹھی گرم ہو جاتی ہے، قلب مہبط انوار اور تجلی زار بن جاتا ہے، بزرگوں کی صحبت میسر نہ ہو تو بزرگوں کی مجلسوں کا حال پڑھنا اور ان کے ملفوظات یا مکتوبات کا مطالعہ کرنا بھی ایک درجہ میں صحبت کا قائم مقام بن جاتا ہے۔ چنانچہ بزرگوں کے ملفوظات قلم بند کرنے کی روایت صوفیہ کے حلقہ میں بہت زمانہ سے چلی آ رہی ہے، ہر دور میں اہل دل اور اہل ذوق ان ملفوظات کو حرز جاں بناتے ہیں اور ان کے نقوش الفاظ کو نقوش سلیمانی کا درجہ دیتے ہیں، حضرت نظام الدین اولیا کی ''فوائد الفواد'' آج بھی تصوف کے حلقوں میں مقبول ہے۔

ملفوظات کے لٹریچر میں ایک اہم اضافہ کتاب ''صحبت با اہل دل'' بھی ہے۔ یہ ملفوظات بھوپال کی ایک معروف صاحب دل شخصیت مولانا محمد یعقوب صاحب مجددی کے ملفوظات ہیں

جن کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مرتب کیا ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی خود ایک صاحب دل عالم دین اور مفکر تھے، انھوں نے ملفوظات اس انداز میں مرتب کئے ہیں کہ ان کی تاثیر میں شمشیر کی تیزی پیدا ہوگئی ہے، اور ہر ملفوظ از دل خیزد بر دل ریزد کا مصداق ہوگیا ہے، بزرگوں کی مجلس ہو اور مولانا علی میاں کا قلم، نکہت باد بہاری سے فضا معطر ہو جاتی ہے۔

مولانا یعقوب صاحب مجددی، عہد حاضر کے بزرگوں میں تھے ۱۹۷۰ء میں ۸۷ سال کی عمر میں بھوپال میں ان کا انتقال ہوا، یہ حضرت مجدد الف ثانی کے سلسلہ کے بزرگوں میں تھے، نقشبندیہ سلسلہ تھا۔ حیدرآباد میں طویل عرصہ تک مسکین شاہ صاحب کی خانقاہ میں ان کا قیام رہا، ان کے علاوہ حیدرآبادی مولوی عبدالعزیز صاحب کے پاس ملک پیٹ میں بھی قیام کیا، پھر شاہ محی الدین صاحب قادری کے یہاں منتقل ہوگئے۔ گلبرگہ میں حضرت سید محمد گیسودراز کی خانقاہ میں بھی دو سال فروکش ہوئے۔ حیدرآباد کے قیام کا زمانہ بہت مجاہدہ اور جفاکشی کا زمانہ تھا، زیادہ تر جوار کی روٹی پر گذر بسر ہوتی تھی، بھوپال میں ان کے والد کی خانقاہ مرجع خاص و عام تھی اور فتوحات کا دروازہ کھلا ہوا تھا؛ لیکن مولانا یعقوب صاحب وہاں کی خوش حال زندگی کو چھوڑ کر نان جویں پر گذارہ کر رہے تھے اور فراخ دستی پر فاقہ مستی کو ترجیح دے رہے تھے، عیش و تنعم کی زندگی کے مقابلہ میں انھوں نے فقیرانہ اور درویشانہ زندگی کو ترجیح دی تھی اور اس زمانہ میں یہ شعر اکثر ان کی زبان پر ہوتا:

بڑے مزے میں گذرتی ہے بے خودی میں امیر
خدا وہ دن نہ دکھائے کہ ہوشیار ہوں ہم

انھوں نے عربی، فارسی کی تعلیم حیدرآباد میں حاصل کی، مشائخ حیدرآباد سے سلوک کی منزلیں طے کیں، آپ کے والد حضرت پیر ابواحمد کا سن ۷۵ سے تجاوز کر چکا تھا، مولانا یعقوب صاحب کے بھائی راہی ملک بقا ہو چکے تھے، خاندان اور خانقاہ کے چشم و چراغ اب صرف مولانا یعقوب صاحب تھے، ان کے والد کا تقاضہ تھا کہ مولانا یعقوب بھوپال واپس آجائیں اور بوڑھے باپ کی قوت بازو بنیں اور یہ خانقاہ بے چراغ نہ ہونے پائے؛ کیوں کہ مجدد الف ثانی کے وقت سے یہاں چراغ سے چراغ جلتا آرہا تھا اور طوفانوں کے باوجود یہ سفینہ تہہ نشین نہیں ہوا تھا۔ آپ حیدرآباد اور گلبرگہ کی سرزمین کو چھوڑ کر بھوپال واپس ہوئے، کچھ عرصہ کے بعد خلافت سے سرفراز ہوئے، آپ کی تربیت اور تکمیل آخر میں اپنے والد کے ہاتھ سے ہوئی، آپ نے اس خانقاہ کی خصوصیات کو جن میں توکل اور استغناء اور اتباع سنت و شریعت کا رنگ بہت نمایاں تھا، قائم رکھا؛

بلکہ اس میں اضافہ کیا۔ سالکین اور طالبین کی تعداد بڑھتی گئی، صرف عوام نہیں؛ بلکہ خواص بلکہ امراء کا طبقہ اس خانقاہ کا نیاز مند اور عقیدت مند تھا۔ خانقاہ کے معمولات میں قرآن مجید کی تلاوت، نوافل کا اہتمام اوراذکار و اوراد خاص طور پر قابل ذکر ہیں؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ حصول علم کا شوق اور کتابوں کا مطالعہ جاری رہتا اگر کوئی عالم دین مل جاتا جس کو کسی خاص فن میں اختصاص ہوتا تو اس کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے سے بھی گریز نہ ہوتا۔

مولانا یعقوب صاحب کی خانقاہ میں وہ رسوم اور پابندیاں نہیں تھیں جو خانقاہوں کا لازمہ زندگی اور ان کی علامت سمجھی جاتی ہیں، نہ لنگر کا انتظام نہ مہمانوں کی دھوم دھام نہ عرس و فاتحہ کا اہتمام۔ یہ خانقاہ بے تکلف سادہ دینی تربیت کا مرکز تھی، جس میں قرآن وحدیث کا درس و مذاکرہ ہوتا تھا، معاشرت کی اصلاح کی باتیں کی جاتی تھیں، مجلس میں ہر طبقہ کی نفسیات کے مطابق موثر اصلاحی گفتگو کا سلسلہ روزانہ جاری رہتا۔ انھیں مجالس میں سے بہت سی مجلسوں میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے شرکت کی تھی اور پھر ان قیمتی ملفوظات کو قلم بند فرمایا تھا، یہ ملفوظات اتنے مؤثر اور فکر انگیز اور بصیرت افروز ہیں کہ جس شخص نے بھی ان کا مطالعہ کیا وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ کتاب کا نام ''صحبت با اہل دل'' ہے اور جتنی دیر تک ایک قاری اس کتاب کا مطالعہ کرتا رہتا ہے اسے اس مجلس کا فیضان محسوس ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو اپنے حالات کی وجہ سے بزرگوں کی صحبت میسر نہیں ان کو خاص طور پر بزرگوں کے حالات اور ملفوظات کا مطالعہ کرنا چاہئے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ملفوظات کے لٹریچر میں ''صحبت با اہل دل'' ایک بہت قیمتی اضافہ ہے، ایک صاحب دل اور درد مند شخصیت کے ملفوظات اور اور پھر وہ بھی مولانا ابوالحسن علی ندوی کے مرتب کئے ہوئے، گویا کتاب ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا کا مصداق بن گئی ہے، یہاں بیان ایک پری وش کا ہے اور مولانا علی میاں کا مرتب کردہ ہے۔ مولانا یعقوب صاحب مجددی نے ان ملفوظات کے ذریعہ تصوف اور اصلاح باطن کی ضرورت کو بہت عام فہم؛ لیکن موثر پیرایہ بیان میں واضح کیا ہے، روزمرہ کی زندگی میں دین کی حقیقتوں کا بیان مولانا یعقوب صاحب مجددی کی خاص خصوصیت ہے، مثال کے طور پر ایک مجلس کا ایک ملفوظ ملاحظہ ہو:

> فرائض دینی کو عادت کے طور پر نہیں عبادت کے طور پر کرنا چاہئے اور عبادت جب ہوگی جب اس کا افزوں فائدہ اور نقصان سامنے ہو۔ آپ دو پہر کو میٹھی نیند سو رہے ہوں، نیند کا غلبہ ہو اور باہر ڈاکیہ آواز دے کہ منی آرڈر لے لیجیے آپ کو

معلوم ہے کہ آپ نے ذرا بھی سستی کی تو ڈاکیہ چلا جائے گا اور منی آرڈر واپس ہو جائے گا یا کل ملے گا، آپ نیند قربان کر کے اٹھتے ہیں اور منی آرڈر وصول کر لیتے ہیں۔ یہی حال نماز کا ہے کہ کیسی ہی میٹھی نیند سو رہے ہوں، سردی میں لحاف اوڑھے ہوئے ہوں منہ نکالنے کا جی نہ چاہتا ہو؛ لیکن فجر کی اذاں ہو، نماز کے فائدہ پر یقین اور نہ پڑھنے پر جو سزا ہو اس پر اعتقاد ہے، آپ نیند قربان کرتے ہیں اور سردی میں وضو کرتے ہیں، بس یہی عبادت کی روح ہے، نماز اس وقت عبادت بنے گی جب اس کا منی آرڈر وصول کرنے سے زیادہ شوق ہوگا۔

کتاب اتنی اہم ہے کہ جب ہاتھ میں آئے تو ختم کیے بغیر چھوڑنے کا دل نہیں چاہتا ہے، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ سے یہ کتاب حاصل کی جاسکتی ہے۔

☆☆☆☆
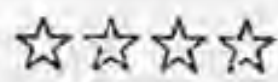
ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی شخصیت پر ایک اہم کتاب

پروفیسر عبد الرحمٰن مومن خوش نصیب ہیں کہ ان کو اس شخصیت کی سوانح نگاری کا شرف حاصل ہوا، جس نے بزبان اقبال مشرق ومغرب کے میخانے دیکھے تھے، جو مشرقی علوم کے میخوانوں سے بھی سرشار تھا اور مغرب کے میکدہ حکمت کا بھی بادہ گسار تھا، جس نے ہندوستان کی دانش گاہوں سے بھی فیض اُٹھایا اور جرمنی اور فرانس کی جامعات سے بھی ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ ڈاکٹر حمید اللہ اس ستارہ علم وتحقیق کا نام ہے جو مشرق ومغرب دونوں جگہ یکساں ضیاء بار تھا جس کی نگارشات کی زبان اُردو بھی تھی، عربی بھی تھی، ترکی بھی تھی، انگریزی بھی تھی اور فرانسیسی بھی تھی۔ جس کے فضل و کمال کا اعتراف پورے عالم اسلام نے کیا؛ لیکن یہ فضل وکمال یوں ہی کسی کو حاصل نہیں ہو جاتا ہے، ڈاکٹر حمید اللہ کی محققانہ عالمانہ اور مجتہدانہ شخصیت کے تخلیقی عناصر میں ایک اہم عنصر ان کا خانوادہ رہا ہے۔ جسے ہمیشہ نادر کتابوں سے اور مخطوطات سے شغف رہا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کے بزرگوں نے نادر مخطوطے دنیا کے مختلف ملکوں سے اس طرح جمع کیے تھے جس طرح چونٹی ہر طرف

سے شکر کے دانے جمع کرتی ہے؛ بلکہ اس راہ میں ان کی سعی اور جاں فشانی کو دیکھا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے چونٹیوں کے منھ سے شکر کے دانے جمع کئے تھے، ورنہ ہزاروں کی تعداد میں مخطوطات کا جمع کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ کتب خانہ سعیدیہ ڈاکٹر حمید اللہ کے بزرگوں کا کارنامہ ہے اور یہ کتب خانہ نادر اور بیش قیمت مخطوطات سے مزین ہے، اس کتب خانہ کی کئی مخطوطہ کتابیں دائرۃ المعارف نے شائع کی ہیں، ڈاکٹر حمید اللہ کا پورا خاندان اپنے علم وفضل تدریس وتحقیق اور تصنیف وتالیف میں ممتاز رہا ہے، ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اسی علمی اور قلمی ماحول میں تربیت پائی اور چندے آفتاب اور چندے ماہتاب بن کر نکلے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی والدہ بچپن میں انھیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے واقعات سنایا کرتی تھیں، یہی وہ بیج تھا جو سیرت پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کتابوں کی شکل میں پھل بن کر بعد میں ظاہر ہوا۔

ڈاکٹر حمید اللہ کی شخصیت کے تخلیقی عناصر میں دوسرا اہم عنصر ان کے فاضل اساتذہ کرام ہیں، جامعہ نظامیہ میں ابوالوفاء افغانی سے اور جامعہ عثمانیہ میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی سے انھوں نے استفادہ کیا۔ مولانا گیلانی جامعہ عثمانیہ میں شعبہ دینیات میں استاد اور صدر شعبہ تھے، ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب ''امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی'' کے مقدمہ میں مولانا کو خراج تحسین اس طرح پیش کیا ہے کہ ''برصغیر کی جامعات میں بہت کم دہریت اگر کسی جگہ پھیل سکی تو وہ جامعہ عثمانیہ ہی ہے اور اس کا سہرا بڑی حد تک مولانا مناظر احسن گیلانی کے سر رہا ہے''۔

ڈاکٹر حمید اللہ کی شخصیت کی تشکیل میں ان کی ذاتی خصوصیات کو بڑا دخل ہے، ان کے مزاج میں استغنا تھا، طبیعت میں قناعت تھی اور دل میں مقصد زندگی سے بے پایاں عشق تھا، کوئی ترغیب اور کوئی تحریص ان کو مقصد زندگی کے راستہ سے نہیں ہٹا سکتی تھی، وہ منفرد سیرت وکردار کے انسان تھے۔ مشرقی زبانوں کے علاوہ یورپ کی متعدد زبانیں وہ جانتے تھے اور ان میں اظہار مدعا پر قدرت رکھتے تھے، ان ہی منفرد خصوصیات کی وجہ سے ان کو آیۃ من آیات اللہ کہا گیا ہے۔ ان کا حافظہ بھی غضب کا تھا، ڈاکٹر حمید اللہ حافظ قرآن نہ تھے؛ لیکن جب وہ اپنے محلّہ کی مسجد میں اپنی نوجوانی کے زمانہ میں تراویح سنے جاتے تو ہر روز ایک پارہ یاد کر کے جاتے اور بھولنے والے امام کو لقمہ دے کر مدد کرتے۔ ڈاکٹر حمید اللہ محقق عصر تھے، ان کی کاوش تحقیق کے نمونے پروفیسر عبدالرحمٰن مومن نے تفصیل کے ساتھ پیش کر دیئے ہیں، انھوں نے بے شمار نادر اور نایاب کتابوں کو خزینوں اور سفینوں سے ڈھونڈھ کر نکالا۔ مذاہب کا تقابلی مطالعہ ڈاکٹر صاحب کا خاص موضوع تھا اس کا بھی

سیر حاصل جائزہ کتاب میں موجود ہے، اسی کے ساتھ اللہ نے ان کو فکری توازن عطا کیا تھا، بہت سے مسائل میں وہ بہت متوازن رائے رکھتے تھے، کسی شخصیت میں توازن کا پایا جانا موہبت آسمانی ہے اور یہ اس وقت ممکن ہوتا ہے جب مبدا فیاض کی طرف سے عطیہ کمالات میں توازن ہوتا ہے، یہ اگر نہ ہو تو نہ صرف افراد میں؛ بلکہ جماعتوں میں بھی عدم توازن پایا جاتا ہے۔ مثلاً ممکن ہے کہ ہم یہ تجربہ کریں کہ دین کی خدمت کرنے والی ایک جماعت کو ایمان کی مقدار بہت زیادہ دے دی گئی؛ لیکن عقل کم کردی گئی ہے، دوسری جماعت کو عقل زیادہ دے دی گئی اور ایمان میں کمی کردی گئی، کسی محقق کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہ ہمیشہ بنے بنائے فکری ڈھانچہ میں خود کو مقید رکھے گا بہت بڑی بھول ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں بھی اجتہادی نقطۂ نظر کثرت سے پایا جاتا تھا، اس کو تعبیر کرنے والے شذوذ سے تعبیر کرسکتے ہیں؛ لیکن یہ ایک محقق اور مجتہد کی مجبوری ہوتی ہے کہ وہ اپنی ذاتی تحقیق کے ذریعہ جس نتیجہ تک پہنچتا ہے اس پر اس کا ایقان ہوتا ہے؛ لیکن وہ اپنے نتائج تحقیق دوسروں پر مسلط کرنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے تھے۔ اس کتاب میں استشراق کی بحث بہت جامع ہے، پاکستان کے پروفیسر خورشید احمد، ڈاکٹر حمید اللہ کو مسلمانوں کا پہلا اور آخری مستشرق قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ انھوں نے مستشرقین کے منہاج تحقیق پر ایسی قدرت حاصل کی تھی جیسے امام غزالی نے یونانی فلسفہ پر حاصل کرلی تھی، وہ تحقیق کے اعتبار سے مستشرق تھے اس فرق کے ساتھ کہ مستشرقین کا قبلہ درست نہ تھا اور ان کا قبلہ درست تھا۔ وہ مقام تحقیق کی اس منزل پر تھے کہ مستشرقین کی غلطیوں پر استدراک کرتے تھے اور ان کے اعتراضات کا جواب دے سکتے تھے، کتاب میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، اس مختصر سے مضمون میں تمام مثالوں کو دہرایا نہیں جاسکتا۔ پروفیسر عبدالرحمٰن مومن کی کتاب وہ آئینہ ہے جس میں ڈاکٹر حمید اللہ کی شخصیت ان کی سیرت ان کے کمالات اور افادات کی سیر حاصل جھلکیاں ملیں گی، ڈاکٹر حمید اللہ مغرب میں اسلام کے سفیر تھے، ظلمت یورپ میں قبائے اسلام کا تکمہ زریں تھے، ان کے دست حق پرست پر ہزاروں انسان مشرف بہ اسلام ہوئے، ان کی متاعِ دین وتقویٰ لوگوں کے دلوں کو لبھاتی، ان کا بے داغ کردار اسلام کی صحیح تصویر پیش کرتا تھا وہ اپنے گفتار اور کردار سے اللہ کی برہان تھے، وہ اُمیدیں قلیل اور مقاصد جلیل رکھنے والے برگزیدہ وجود تھے۔ یورپ اور امریکہ میں ایسی ہی قدسی صفت انسانوں کے ذریعہ اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے اور آئندہ جدید دور کے تاتاریوں کو یعنی مغربی اقوام کو مشرف بہ اسلام کرنے کا یہی طریقہ ہے، چنانچہ ڈاکٹر حمید اللہ کہتے ہیں:

ہر روز کثرت سے فرنگی مسلمان ہو رہے ہیں، انگلستان فرانس، جرمنی، سوئزرلینڈ، ہالینڈ، بلجیم، ڈنمارک، شمالی اور جنوبی امریکہ کوئی ملک اس سے مستثنیٰ نہیں۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی جب میں نے یہ پتہ چلایا کہ ان کا ننانوے فیصد حصہ تصوف اور صوفیاء کی تعلیم کے باعث اسلام قبول کر رہا ہے، عقل پرستوں کی لایعنی تفسیروں اور تحریروں کے باعث نہیں صوفیاء کی چیزیں اب آہستہ آہستہ فرنگی زبانوں میں ترجمہ یا تالیف ہو رہی ہیں۔ میں خود عقلیت کا دلدادہ تھا، یہاں آ کر ہار ماننی پڑی، اسلام دل کے راستہ ہی سے پھیل سکتا ہے، دل کی زبان میں جو تاثیر ہے جو سحر ہے وہ کسی اور چیز میں نہیں ہم جس کی (یعنی مغرب کی) نقالی کرنا چاہتے ہیں وہ خود اپنے سے بیزار ہو گیا ہے۔ (ڈاکٹر حمید اللہ: ۱۷۸)

یہ واقعہ ہے کہ مغرب کے ریگستان کو مرغزار بنانے کے لئے ایسے فرہاد کی ضرورت ہے جو اپنے تیشہ سے ویرانہ دل کھود سکے۔ جو ساز دل کے اس تار کو چھیڑے جس سے فطرت کا نغمہ پھوٹتا ہے، جو اپنی ادائے دلبری اور نوائے عاشقانہ سے دلوں کو فتح کر لے، جو نالہ نیم شبی سے دل کے آتش دان کو گرم کرے اور اس کی حرارت دوسروں تک پہنچائے۔ یورپ میں اسلام کی اشاعت کے لئے عقلی دلیلوں سے کہیں زیادہ عالم روحانیت کی نرگس مستانہ اور عشوہ ترکانہ کی ضرورت ہے، اس بربط نواز کی ضرورت ہے جو ساز کے صحیح تاروں پر انگلی رکھ سکے۔

ڈاکٹر حمید اللہ بڑے محقق تھے، صحیفہ ہمام بن منبہ اور سیرت ابن اسحٰق کی دریافت ان کا وہ عظیم تحقیقی کارنامہ ہے جسے علم و تحقیق کی دنیا ہمیشہ یاد رکھے گی "الوثائق السیاسیۃ" ان کی وہ کتاب ہے جسے بین الاقوامی شہرت حاصل ہو چکی ہے، ان ہی میں وہ مکتوبات نبوی بھی ہیں جو اپنے زمانہ کے ملوک و سلاطین کو لکھے گئے تھے اور بھیجے گئے تھے۔ آپ کے فرانسیسی ترجمہ قرآن کے بیسیوں ایڈیشن نکل چکے ہیں، عہد نبوی کے میدان جنگ ان کی مشہور زمانہ کتاب ہے، سیرت پر ان کی کتاب کئی زبانوں میں شائع ہو چکی ہے، خطبات بھاولپور ایک الگ سیرت پر کتاب ہے جو ان کے لکچرس کا مجموعہ ہے۔

پروفیسر عبد الرحمٰن مومن نے جب ڈاکٹر حمید اللہ کی تصنیفات کا باب شروع کیا تو یہ بھی دکھایا ہے کہ اسلامی تاریخ میں علماء نے کیسا عظیم الشان کتب خانہ تیار کیا ہے اور ایک ایک آدمی نے اپنے موضوع پر پوری پوری انسائیکلو پیڈیا تیار کر دی، کام کے اعتبار سے ہمارا "ایک آدمی" یورپ کی

''اکیڈمی'' کے برابر ہوتا ہے؛ لیکن یہ تذکرہ ہمارا نہیں بلکہ ہمارے اسلاف کا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ اسلاف کا جیتا جاگتا نمونہ تھے اور بقول شخصے، آیۃ من آیات اللہ تھے، انھوں نے سات زبانوں میں سو کتابیں لکھیں اور ایک ہزار سے زیادہ مقالات۔ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی کو دیکھنے کے لئے علم کے بے کراں سمندر کا نظارہ کرنے کے لئے انسان صرف ڈیڑھ سو روپے نہ خرچ کرے اور ۴۴۰ صفحہ کی کتاب فرید بک ڈپو دہلی سے نہ منگائے تو یہ بڑے غم کی بات ہوگی اور بڑی بے سوادی اور بے توفیقی کی پہچان ہوگی۔ جب بے ذوقی کا یہ عالم ہو جائے کہ گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہو مگر کتابیں نہ ہوں تو اس قوم کے تنزل کی رفتار کو کوئی بریک نہیں لگا سکتا ہے، ڈاکٹر حمید اللہ پر ہر زبان میں کتاب آنی چاہئے یہ اُردو زبان کی خوش قسمتی ہے کہ اس میں پہلے ایک وقیع کتاب سامنے آگئی ہے، پروفیسر عبد الرحمٰن مومن جو اُردو اور انگریزی میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں اہل اُردو کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔

راقم حروف کی یہ کمزوری ہے کہ کوئی بھی کتاب پڑھے اس کی نظر کتاب کی زبان و بیان پر پہلے پڑتی ہے، ایک بہت چھوٹا سا استدراک ہے، مقطع میں آپڑی ہے، سخن گسترانہ بات۔ کتاب کی زبان صاف اور شگفتہ اور عالمانہ ہے، البتہ ایک مقام پر ''معرکۃ الاراء'' کی ترکیب کھٹکتی ہے، کسی تقریر یا تحریر یا کام کے بارے میں اس کو بہت ممتاز اور شاندار قرار دینے کے لئے یہ کہنا کہ وہ معرکۃ الآراء ہے ایک بے معنی ترکیب کا استعمال کرنا ہے؛ کیوں کہ عربی ترکیب معرکۃ الآراء کا مطلب ہے آراء و افکار کا معرکہ یا جنگ۔ عظیم الشان کے مفہوم میں اس کا استعمال اہل زبان کے لئے ایک سوالیہ نشان پیدا کر دیتا ہے، میرا خیال ہے کہ یہ ایک فارسی ترکیب ہے جسے غلط طریقہ سے عربی ترکیب کی شکل دے دی گئی ہے اور اس سے غلط مفہوم اخذ کر لیا گیا ہے، فارسی ترکیب معرکہ آراء کا مطلب ہے معرکہ کو آراستہ کرنے والا یا کامیابی کے ساتھ معرکہ سر کرنے والا، اقبال نے یہی ترکیب استعمال کی ہے:

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں

دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

کسی ایسی لغت میں ''معرکۃ الآراء'' کا لفظ مل جائے جسے مستند سمجھا جاتا ہو اور اہل ادب جس کے حوالہ دیتے ہوں تب تو اس کا استعمال صحیح ہوگا ورنہ نہیں، یا سرسید، حالی، شبلی، محمد حسین آزاد، ابوالکلام آزاد، غالب اور مومن انیس و دبیر اور ان کے ہم رتبہ اہل ادب کے کلام سے سند دینی پڑے گی، عوام کی زبان حجت نہیں ہے۔

☆☆☆☆

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ
اور ان کی چند اہم تصنیفات

ہندوستان میں بیسویں صدی کے قرن سے جب خورشید تازہ نمودار ہوا تو یہ مسلمانوں کے زوال اور انگریزوں کے اقبال کا وقت تھا۔ حکومت ختم ہو چکی تھی، دولت بھی منھ پھیر چکی تھی، زبان اور تہذیب گرتی ہوئی دیوار تھی، مذہب جارحیت کا نشانہ تھا، ملت اسلامیہ خستگی اور درماندگی میں پچھلے پہر کسی سانس لیتے ہوئے چراغ کا منظر پیش کر رہی تھی، یہ اس گروہ کا حال تھا، جس نے تہذیب وتمدن کی ترقی میں، ناقابل فراموش کردار ادا کیا تھا۔

اس ناتواں اور نیم جاں ملت کی مسیحائی کے لئے بہت سے اہل اخلاص پہلے سے سرگرم عمل تھے، ایک جماعت نے علوم دینیہ کو درد کا درماں سمجھ کر قدیم طرز کے مدرسے قائم کر لئے تھے، دوسرے طبقے نے انگریزی زبان اور دنیوی علوم کو زخم کا مرہم سمجھ کر جدید تعلیم گاہیں بنائی تھیں۔ دونوں طبقے مفید کام انجام دے رہے تھے؛ لیکن دونوں ایک دوسرے سے اجنبی اور بیگانہ تھے، ایک طبقے کے پاس دین تھا؛ لیکن تفہیم وترسیل کے لئے زبان نہیں تھی، دوسرا طبقہ اساس دین سے ناآشنا تھا، ''اسے کشتی نہیں ملتی اسے ساحل نہیں ملتا'' دونوں طبقوں میں اعتدال وتوازن مفقود تھا، دین ودنیا کی جامعیت کمیاب تھی۔ مسلمانوں کے مختلف مسلکی گروہوں کے درمیان باہمی جدال، مناظرے بازی سب وشتم، دشنام والزام کا بازار گرم تھا، مسلمانوں کے قدیم اور جدید طبقے کے درمیان خلیج کو پاٹنے کے لئے توازن پیدا کرنے کے لئے اور معاشرے کو باہمی جدال سے بچانے کے لئے ایک

اور ادارے کی ضرورت تھی۔ آخر کار اہل نظر اور دانشوروں نے اس ادارے کو قائم کرڈالا اور اس کا نام ندوۃ العلماء رکھا تھا، تحریک ندوۃ العلماء کی تاریخ میں ایک ذمہ دار شخصیت مولانا سید عبدالحئی کی ہوئی جو عربی زبان میں نزہۃ الخواطر جیسی انسائیکلو پیڈیا اور اُردو میں ''گلِ رعنا'' جیسی کتاب کے مصنف تھے۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، جو اس مضمون کا عنوان ہیں، ان ہی مولانا عبدالحئی کے نسبی اور معنوی فرزند تھے۔

ندوۃ العلماء کی اس تحریک نے متعدد ایسے عالم دین اور ادیب پیدا کئے، جنھوں نے علم کی جامعیت، وسعت نظری اور انشاء پردازانہ اُسلوب کے ذریعہ علم دین کو فروغ دیا اور ملک کے اندر بھی امثال واقران میں ممتاز ہوئے۔ اس سلسلۃ الذھب کی ایک کڑی مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی شخصیت تھی، جن کی مقبولیت ہندوستان سے لے کر عالم اسلام تک پھیلی ہوئی ہے، جتنا عام اور ہمہ گیر اعتماد ان کو ملا ہے وہ پہلے کسی اور کو نہیں مل سکا، مولانا کی شخصیت جامع کمالات تھی اور دنیا کے ملکوں میں ان پر تحقیقی کاموں اور مذاکروں کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی اپنی شخصیت بھی خود ان کے اُسلوب کی طرح مختلف پھولوں کا عطر مجموعہ تھی۔ اہل دل کے دلوں کی تپش اور شبوں کا گداز، شعر وادب کے قلم کا ساز، اہل فکر وعلم کا ذوق جستجو اور مجاہدین کی روح عمل یہ سب کچھ ان کی ذات میں اس طرح جمع ہوگیا کہ ان کی اپنی شخصیت سب سے منفرد اور سب سے ممتاز ہوگئی، اس میں جامعیت بھی ہے اور اعتدال بھی ہے، جمال بھی ہے اور کمال بھی ہے وہ بے ہمہ بھی ہے اور باہمہ بھی ہے۔

مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں
شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

یہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت تھی جس نے گلشن دین وعلم وادب کے بہت سارے پھولوں کا عطر کشید کرلیا تھا، ان کی ذات میں مدرسہ بھی تھا اور خانقاہ بھی، علم وادب کا سکون بھی تھا اور تحریک واجتماعیت کی گرمی محفل بھی، فکر کی تابانی بھی تھی اور انشاء کی درخشانی بھی اور حسن اخلاق کی دلبری بھی۔ وہ ان سے بھی مخاطب ہوتے تھے، جو اورنگ نشین سلطنت ہیں اور ان کو بھی پیغام انسانیت دیتے تھے جو برادرانِ وطن ہیں یہی جامعیت کا کمال ہے، جو ان کی شخصیت کا امتیاز خاص تھا۔

مولانا کی عالمی مقبولیت اور شہرت کا راز صرف علم کی وسعت، تصانیف کی کثرت، عربی

اور اُردو دونوں زبانوں پر قدرت اور اُسلوب کے جمال میں پوشیدہ نہیں، وہ ندوۃ العلماء، مدارس عربیہ، دینی تعلیمی تحریک، مسلم پرسنل لا بورڈ، رابطہ ادب اسلامی اور بہت سے علمی اداروں کے روح رواں اور نفس ناطقہ تھے۔ ان کے کاموں اور کارناموں کا دائرہ آفاق گیر ہے، تصنیف و تالیف کا مشغلہ، پیرانہ سالی، عبادت، وریاضت ان سب کا تقاضہ سکون وخلوت نشینی ہے؛ لیکن یہ روح جہاد ہے جوان کو خلوت سے نکال کر جلوت میں لاتی اور سرگرم سفر رکھتی تھی۔ قرطاس وقلم کی بساط سے لے کر کارزار عمل تک خدا اور خلق خدا دونوں کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے شب و روز ہمہ وقت مشغول رہنا اور پوری دنیا کو اپنی جولا نگاہ بنالینا اور اپنی مثالی زندگی اور اعلیٰ کردار سے انسانوں سے بلا اختلاف مسلک ومذہب محبت کا باج اور عقیدت کا خراج وصول کرنا معمولی درجے کی بات نہیں ''یہ انھیں کا کام ہے، جن کے حوصلے ہیں زیادہ''۔

مولانا ایک مفکر تھے اور اہل نظر نے بجا طور پر ان کو مفکر اسلام کا خطاب عطا کیا ہے؛ لیکن مولانا کی عظمت کا راز اس میں ہے کہ انھوں نے فکر اسلامی کے ساتھ مزاج ابراہیمی دونوں کو بہم کرلیا ہے۔ مزاج ابراہیمی دراصل ذکر وابتہال اور تبتل سوز دروں اور آہ سحر گاہی کا نام ہے، ایسے شخص کو عربی میں ''اواہ'' کہتے ہیں: ''ان ابراهيم لأواه حليم'' (سورہ ابراہیم) ''ان ابراهيم لحليم اواه منيب'' (سورۂ ہود) فکر کے ساتھ ذکر نہ ہو اور فکر اسلامی کے ساتھ مزاج ابراہیمی نہ ہو تو ایک الاری شخصیت بن جاتی ہے اور جامعیت اور توازن میں کمی رہ جاتی ہے۔ بہت سے ذاکرین ہیں، جو مفکر نہیں اور بہت سے مفکر ملیں گے جن کے یہاں ذکر وعبادت وابتہال اور تعلق مع اللہ میں کمی نظر آئے گی۔ مولانا علی میاں کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے ساغر وسندان دونوں کو جمع کرکے دکھایا، تصنیف وتالیف وزبان وادب فکر اسلامی کی بلندی، عالم اسلام کے مسائل پر گہری نظر، دینی مدارس اور عالم اسلام کی دینی تحریکات کی سرپرستی اور باطل رجحانات پر نکیر، اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جدوجہد، مشرق ومغرب ہر جگہ دین کی دعوت، اسلامی تشخص کا دفاع، حکومتوں کو جھکا دینے کی روحانی طاقت، عبادت اور ریاضت اور دولت دنیا سے بے نیازی اور فقر واستغناء اور نرم دلی و دلبری ان تمام خصوصیات کو اگر ایک شخص میں ڈھونڈھا جائے تو پوری ایک صدی میں بھی اس مرتبہ کے انسان کا ملنا مشکل ہے۔ مولانا نے اپنی شخصیت اور اپنے کردار سے دعوت وعزیمت کی تاریخ کا ایک جلی عنوان قائم کردیا ہے، یہ جامعیت مزاج نبوی سے قرب کی دین ہے۔

مولانا کی شخصیت ہشت پہل ہیرا تھی انھوں نے بہت سی خصوصیات اور کمالات کو اپنے

اندر جمع کرلیا تھا؛ لیکن ہمارا موضوع صرف مولانا کی نگارشات اور ان کا ادبی اُسلوب ہے۔ یہ ہمارے فکر ونظر کی تہی مائیگی ہے کہ ادیب اس کو سمجھ لیا جائے جو ادیب کی وردی پہن کر یا ادب کا سائن بورڈ لگا کر سامنے آئے ادب کی ایک تعریف جاحظ کی زبان میں ''أخذ کل شئ بطرفه'' بھی ہے۔ ایک شخص اگر وسیع المطالعہ ہو اور اپنی بات کو مؤثر اور پرکشش انداز میں پیش کرے تو وہ ادیب ہے چاہے اس کا موضوع کچھ بھی ہو۔ بہت سے لوگ ادب کو زلف خمدار سے لے کر مستی رفتار تک چند موضوعات کے اندر محدود کر دیتے ہیں اور پھر اپنے لکنت زدہ قلم سے خطوط خمدار اور مریز وکجدار کی نمائش میں مصروف رہتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ادب کی دستار عظمت ان پر زیب نہیں دیتی ہے، آج ادب کی زرکار کرسیوں پر چند ایسے لوگ براجمان نظر آسکتے ہیں جن کی فکر مستعار اور جن کی زبان ادھار ہے، جن کے لفظوں کی زبان ہکلاتی ہے اور جن کے قلم کا اُسلوب توتلاتا ہے اور جن کے فکر کا پائے چوبیں سخت بے تمکین ہے اور لڑکھڑاتا ہوا چلتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں، جنھوں نے گنتی کی چند کتابیں، گنتی کے چند موضوعات پر پڑھ لی ہیں اور ہجے کرکر کے گنتی کے چند مضامین بھی لکھ ڈالے ہیں اور بزعم خود یہ سمجھ لیا ہے کہ انھوں نے ادب کا ہفت خوان طے کرلیا ہے۔ اگر یہ معزز حضرات صرف تاریخ دعوت وعزیمت کی پانچ ضخیم جلدیں پڑھ لیں تو ان کو اپنی تہی دامنی اور علمی بے بضاعتی اور غربت مآبی وافلاس فکر ونظر کا پورا اندازہ ہو جائے گا اور یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ تاریخ دعوت وعزیمت مولانا ابوالحسن علی کے سرمایہ علم وادب کے خرمن کی محض ایک چھوٹی سی اکائی ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تصنیفات کا مطالعہ متنوع سمتوں میں ہماری رہنمائی کرتا ہے، نگارشات کے گلدستے میں قرآنی موضوعات بھی ملتے ہیں، سیرت نبوی کے موضوع پر کتابیں بھی نظر آتی ہیں، حدیث، تاریخ، علم کلام، سوانح وخاکہ نگاری اور اصلاحیات کے علاوہ خالص فکری موضوعات پر بھی مستقل تصنیفیں ملتی ہیں۔ انھوں نے عربی اور اُردو دونوں زبانوں کا دامن ادب سے مالامال کیا ہے، سیرت سید احمد شہید ابتدائی عہد کی تصنیف ہے، اس کے بعد عربی زبان میں ان کی کتاب ''ماذا خسر العالم'' سامنے آئی، جس نے مقبولیت کا ریکارڈ قائم کیا، انھوں نے اقبال کے کلام کا بہت خوبصورت عربی نثر میں ترجمہ کیا، پھر تاریخ دعوت وعزیمت کی جلدیں اور کئی دوسری وقیع کتابیں مولانا کے قلم سے نکلیں۔ ان کے قلم کے جوئے بار اور رود بار کو دیکھ کر کسی خوش خرام پہاڑی ندی کا تصور سامنے آتا ہے، جو گاتی ہوئی گنگناتی ہوئی عراق دل نشیں کے ساز کو چھیڑتی ہوئی

سنگ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی نخلستانوں کو شاداب اور کشت زاروں کو سیراب کرتی ہوئی چلتی ہے۔

مولانا کی علمی و تصنیفی کاموں میں تاریخ اور سوانح نگاری کا پلڑا زیادہ بھاری ہے، یہ کتابیں بے حد مؤثر ہیں اور پڑھنے کے بعد مدتوں کتاب کی خوشبو مشام جہاں کو معطر کرتی رہتی ہے، وہ سوانح نگاری کے فن سے واقف ہیں؛ لیکن اس میدان میں وہ مغربی نظریے کے معترف اور مقلد نہیں۔ مغرب میں سوانح نگاری کا مطلب مثالب اور معائب کے دفتر کو محاسن کے پہلو بہ پہلو بلا جھجک طشت از بام کرنا ہے؛ لیکن اسلام کی تعلیم اس بارے میں بہت واضح ہے'' اذکروا موتاکم بالخیر '' کے حکم نے اُصول متعین کردیا ہے، یہاں نہ تو تعریف و توصیف میں مبالغہ آرائی کی گنجائش ہے اور نہ بے ضرورت عیب چینی کی۔ کسی شخص کے بارے میں یہ دونوں باتیں معیوب ہیں، اس کی زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی؛ البتہ خالص علمی تنقید جائز و درست ہے، اخلاقی عیوب کا بیان ناپسندیدہ ہے، مگر یہ کہ جہاں شرعی ضرورت درپیش ہو۔ اسماء الرجال کے فن میں عیب چینی نظر آئے گی؛ وہاں معاملہ گلستان نبوت کی شمیم آرائیوں کی پرکھ اور ردوقبول کا ہے۔ مولانا کے قلم سے نکلی ہوئی سوانحی کتابوں پر مدلل مداحی کا الزام درست نہ ہوگا، ان میں غزالی کا تذکرہ ہو یا ابن تیمیہ کا دونوں جگہ محاسن و کمالات کے پیش کرنے کے ساتھ قابل مؤاخذہ پہلوؤں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

زبان رسالت نے علماء حق کو ورثۃ الانبیاء قرار دیا ہے، اسلام کی تاریخ دراصل ان ہی نفوس قدسیہ کی عالمانہ اور مصلحانہ کوششوں کے تسلسل کا نام ہے، اسلام کو دربار سرکار سے وابستہ کردینا اور اس کا نام تاریخ اسلام رکھ دینا اور پھر تاریخ کی ان کتابوں میں اصلاح و دعوت کی تحریکات کو یکسر نظر انداز کردینا ایسا نظر فریب تخیل ہے، جس میں عوام و خواص دونوں گرفتار ہو چکے ہیں، اگر یہ بات سمجھ میں آجائے گی تو'' تاریخ دعوت وعزیمت'' کی اہمیت بھی دوچند ہو جائے گی۔ پھر مولانا نے جس شخصیت پر بھی قلم اٹھایا ہے، مواد اور معلومات کا اس کے بارے میں پورا ذخیرہ جمع کرلیا ہے، صرف مطبوعات سے نہیں مخطوطات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے، تحلیل و تجزیہ اور مقابلہ و محاکمہ بھی پایا جاتا ہے۔

بعض افکار و نظریات پر مولانا کی تنقیدی کتابوں میں'' الدین النصیحۃ'' کا اچھوتا اُسلوب ہے یہ حریر و پرنیاں کا خیرخواہانہ اُسلوب بیان ہے اور شائستگی قلم کی معراج۔ اخلاق و شرافت کے بھی درجات اور مقامات ہوتے ہیں اور اس میدان میں بلندترین مقام تک پہنچے بغیر ایسا اُسلوب

اختیار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

مولانا کی سوانحی تصنیفات کو، جو چیز کہ ممیّز اور ممتاز کرتی ہے، وہ توازن اور اعتدال کا پہلو ہے "حیات عبدالحیٔ" کا وہ باب، جس میں مولانا شبلی اور مولانا عبدالحیٔ کی آویزش اور اختلاف کا تذکرہ ہے، یا "المرتضیٰ" کا وہ حصہ جہاں مشاجرات صحابہ زیر بحث آتے ہیں، اعتدال اور توازن کے پہلو کا آئینہ دار ہے، ان کا قلم ایسے پل صراط سے بڑی خوش اُسلوبی سے گزرتا ہے اور ان کے دامن پر کہیں بے احتیاطی کا داغ نہیں لگتا ہے۔

مولانا کے قلم سے نکلے ہوئے سوانحی لٹریچر میں زیر تذکرہ شخصیت کے عہد و ماحول کا بیان عموماً بہت مفصل نظر آتا ہے اور یہ اس لئے کہ شخصیت ماحول آفریں بھی ہوتی ہے اور ماحول کی آفریدہ بھی ہوتی ہے، یا صرف توفیق الٰہی کی آفریدہ اور پروردہ ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر نبی رحمت میں بعثت سے پہلے دنیا کا حال جتنا مفصل ملتا ہے سیرت کی کم کتابوں میں نظر آتا ہے، یا مجدد الف ثانی کے زمانہ میں ہندوستان اور عالم اسلام کیا تھا، اس کی تفصیلات اور معلومات سے کتاب کے ابواب ثمردار درخت کی طرح زیر بار نظر آتے ہیں اور اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ شاخ پر میوہ کی طرح کہیں سطریں خود خمیدہ اور مضامین کے بوجھ سے کشیدہ نہ ہو جائیں۔

مولانا اپنی نگارشات میں بیک وقت عالم دین، مفکر اسلام، محقق، مصلح ادیب اور انشاء پرداز نظر آتے ہیں، وہ کسی موضوع پر اظہار خیال کریں ان کا قلم جابجا انشاء کے پھول کھلاتا ہے اور ادب کے موتی لٹاتا چلتا ہے۔ تاریخ میں مصلحین نے ادب کو ہمیشہ وسیلہ اظہار بنایا ہے، جو لوگ ادب سے مستغنی رہ گئے ان کی تحریریں طاق نسیاں کا گلدستہ بن گئیں، اس میں بہت کم استثناء پایا جاتا ہے۔ آسمانی کتابیں ادب کا شاہکار ہوئی ہیں، احادیث رسول جوامع الکلم کا نمونہ ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کلام بلاغت کا معیار ہے، حسن بصری، امام غزالی، شیخ عبدالقادر جیلانی اور ابن جوزی کی تحریریں اور تقریریں ادب کے جوہر سے آراستہ نظر آتی ہیں۔ ان کا قلم اتنا جاندار اور ان کی زبان اتنی روح پرور ہے کہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی ان میں زندگی اور تازگی محسوس ہوتی ہے اور ان میں بجلی کی سی تاثیر پائی جاتی ہے، انھوں نے اپنے اپنے زمانہ میں اپنے سوز دروں سے اور اُسلوب کے جمال و کمال سے دلوں کی دنیا کو زیر و زبر کر دیا تھا۔ حسن کلام ایک خداداد نعمت ایک قابلیت اور ایک ہتھیار ہے اور اصلاح و تجدید کا کام انجام دینے والے اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتے ہیں۔ افکار و کردار کی اصلاح کا کام ایک طرح کا آپریشن ہے، دل اور دماغ کا آپریشن، اس کے لئے پہلے طرز

تحریر اور اُسلوب و ادا کی گلابی کو شیشہ دل میں اتارا جاتا ہے، تب کہیں جا کر عنان اپنے ہاتھ میں لی جاتی ہے اور توسن دل کا قبلہ درست کیا جاتا ہے۔

مولانا کی تحریر و تقریر میں ادب کی جلالت اور آبشار کی روانی پائی جاتی ہے، جا بجا انشاء پردازی کے موتی چمکتے اور جھملاتے نظر آتے ہیں؛ لیکن انشاء کی گل کاریاں بذات خود ان کے یہاں مقصود نہیں۔ چوں کہ وہ داعی اور مصلح اور مجدد بھی تھے، اس لئے ادب کو انھوں نے ذریعہ اور وسیلہ بنایا تھا، ان کی شخصیت کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ''کاروانِ زندگی'' ان کی ''دعوت وعزیمت'' کا جلی عنوان ہے۔ ان کی شمع کی جلوہ فگنی ''پرانے چراغوں'' کی ضیاپاشیوں کا مجموعہ ہے، ان کی حیات، شش جہات میں ''ارکانِ اربعہ'' کی اقامت کا پیغام ہے، ان کی صحبت ''صحبت با اہل دل'' ہے، ''اسلام اور مغربیت کی کشمکش'' میں وہ سپہ سالار اور تنہا لشکر جرار ہیں، ان کے اخلاق میں ''نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم'' کے اخلاق کا پرتو ہے اور عالمی مقبولیت کے باوجود ان کی فقیرانہ زندگی میں ''سیرت المرتضیٰ'' کا عکس ہے، ان کے مفکرانہ قلم سے دنیا کو معلوم ہوا کہ ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال'' نے کیا اثر ڈالا ہے۔

مولانا کا اُسلوب تحریر عالمانہ بھی ہے اور مورخانہ بھی داعیانہ بھی اور مصلحانہ بھی۔ ان کے اُسلوب کے اجزاء ترکیبی، میں ''گل رعنا'' کی رعنائی، بالاکوٹ کا لہو ترنگ، اساطین ندوۃ العلماء کا مورخانہ رنگ، معاصر مولانا مودودیؒ کے افکار کا آہنگ اور مولانا الیاسؒ کے دل کی درمندی، اہل تصوف کا سوز دروں اور اقبال کی ضرب کلیمی شامل ہے۔ پھر ان اجزاء پر گل ہائے سیرت کے عطر اور چشمہ قرآن کے پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا ہے اور اس مجموعہ نے نام پایا ہے، مولانا موصوف ابوالحسن علی کی تصنیفات اور نگارشات کا۔

اُردو زبان کی طرح مولانا عربی زبان کے بھی ادیب اور خطیب اور سحر طراز انشاء پرداز تھے، ان دونوں زبانوں پر اس درجہ کی قدرت مولانا مسعود عالم ندوی کے سوا برصغیر میں شاید ہی کسی کو حاصل ہوئی ہو۔ جہاں تک عربی تصنیفات کی کثرت کا معاملہ ہے تو برصغیر تو کیا عرب ملکوں میں بھی کم لوگ ان کے ہم پایہ ملیں گے، دردمندی سوز دروں اور اخلاص نے ان کے اُسلوب میں ایک خاص رنگ اور ایک خاص آہنگ پیدا کر دیا تھا اور ان کی کتابوں کے مطالعہ کرنے والے کو فکر کی بلندی کے ساتھ روحانی بالیدگی کا احساس ہوتا تھا۔ فکر ارجمند کے ساتھ دل دردمند اور زبان ہوشمند کے حسین امتزاج کی نظیر مشکل سے ملے گی اور اس بات کا اعتراف عربی زبان وادب کے ماہرین

نے کیا ہے، جن میں سید قطب بھی ہیں اور انور الجندی بھی علی طنطاوی بھی۔ شیخ یوسف القرضاوی مولانا کی عربی تحریروں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تعبر عن حس رقیق وفکر عمیق وبیان انیق وعن رہافۃ الحاسۃ الادبیۃ وعمق الحاسۃ الروحیۃ عند الشیخ۔(قیمة الامة الاسلامیة بین الامم:۳۶)

یعنی مولانا کی تحریروں میں احساس اور جذبہ کی رقت ودلکشی اُسلوب فکر کی گہرائی اورادب کا اعلیٰ ذوق اور بے پناہ روحانی کیفیت پائی جاتی ہے۔

شیخ محمد غزالی اس عہد کے بلند پایہ عالم اور مصنف ہیں وہ بھی مولانا کے اُسلوب اور زبان سے متاثر ہیں لکھتے ہیں:

لقد وجدنا فی رسائل الشیخ لغۃ جدیدۃ وروحا جدیدۃ والتفاتا الی اشیاء لم نکن نلتفت الیہا۔

یعنی ہم نے مولانا کی تحریروں میں ایک بالکل نئی زبان اور ایک نئی روح کا احساس کیا مولانا کی اخاذ نظر ان چیزوں پر پڑتی ہے جن پر ہماری نہیں پڑتی۔

مولانا کی کتاب ''ماذا خسر العالم'' کے پہلے ایڈیشن پر مقدمہ احمد امین نے بغیر پڑھے ہوئے لکھ دیا تھا، جس میں یہ بھی لکھ دیا کہ شیخ ابوالحسن علی ہندوستانی نژاد ہیں اس وجہ سے تعبیرات میں سقم کا بھی امکان ہے، عربی زبان وادب کے فیکلٹی کے ڈین الدکتور محمد رجب البیومی عمید کلیۃ اللغۃ العربیہ نے اپنی کتاب میں لکھا کہ:

الکتاب فی المنزلۃ العلیا من الاسلوب البیانی، المشرق وتعبیرہ الساحر لایبلغہ باحث کبیر کالدکتور احمد امین۔

حقیقت یہ ہے کہ کتاب روشن بیانیہ اُسلوب اور سحر انگیزی میں اس درجہ پر فائق ہے کہ ڈاکٹر احمد امین جو ایک محقق اور مؤرخ ہیں اُسلوب کی اس طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔

وزیر الاعلام السعودی ڈاکٹر محمد عبدہ یمانی نے عربی زبان وادب میں مولانا کے مقام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

فاتقنہا اتقان اہلہا المتخصصین فیہا بل فاق فی اتقانہ لہا اتقان اہلہا فکان فصیحا بلیغا ولہ اسلوب عذب وعبارات بلیغۃ۔

یعنی مولانا عربی کے عرب ادباء اور متخصصین کی طرح زبان پر قدرت رکھتے تھے؛

بلکہ ان پر فائق ان کے یہاں فصاحت اور اُسلوب کی دلآویزی اور کلام کی بلاغت پائی جاتی تھی۔

یہاں بہت زیادہ حوالوں اور اقتباسات کی ضرورت نہیں ہے مولانا کے سر پر عظمت کا تاج عرب ادباء اور شعراء اسی وقت رکھ چکے تھے جب ادب اسلامی کی عالمی تحریک (رابطہ ادب اسلامی) کی صدارت کے لئے متفقہ طور پر ان کا نام انھوں نے پیش کیا تھا، ہندوستان اپنے اس اعزاز پر جتنا ناز کرے کم ہے۔ انگریزی زبان میں لکھنے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے؛ لیکن کیا کسی ہندوستانی رائٹر کو برطانیہ کے اہل ادب کے درمیان یہ مقام بھی حاصل ہوسکا ہے؟ اور کیا کسی ہندوستانی مصنف کی کوئی کتاب یورپ کے ادبی نصاب میں داخل ہوسکی ہے؟

مولانا نور عالم خلیل امینی عربی میں کئی کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں اور ماہنامہ الداعی کے مدیر ہیں وہ لکھتے ہیں:

> میں نے صرف اُردو میں نہیں عربی میں بھی تحریر کے بادشاہوں کو پڑھا ہے، تقریر کے جادوگروں کو سنا ہے الفاظ کے شہنشاہوں کو برتا ہے، فصاحت اور بلاغت کا دریا بہانے والوں کا تجربہ کیا ہے، مطالعہ اور معلومات کی گمنام اور تاریک سرنگوں میں بے خطر بہت دور تک چلے جانے والے بہت سے لوگوں کا علم ہے؛ لیکن خدا اور رسول کو گواہ بنا کر کہنے دیجئے کہ تحریر وتقریر کے لفظ لفظ نہیں حرف حرف پر اور ہر زیر وبم پر خلوص کا جو حسن ایمان ویقین کی جو مہرتابی درد دل کی جو لذت انسانوں سے محبت کا جو جمال کلمۃ اللہ کا جو جلال صدائے حق کی جو دلنوازی اور سوز دروں کی جو تمازت اور فقر غیور اور زہد پرنور کی جو جاذبیت وحرارت میں نے مولانا علی میاں کے یہاں محسوس کی وہ میرے محدود علم ومطالعہ میں کسی کے یہاں نہیں ملتی۔
>
> (ماہنامہ دارالعلوم، فروری ۲۰۰۰ء)

ترجمان القرآن (پاکستان) کے ایڈیٹر پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں:

> مولانا علی میاں ایک نامور عالم دین ایک بلند پایہ مصنف ودانشور اور ایک صاحبِ طرز ادیب ایک سحر انگیز خطیب ایک منفرد مؤرخ اور سیرت نگار تھے؛ لیکن سب سے بڑھ کر وہ ایک داعی ایک مصلح اور ایک صاحب دل مزکی اور مربی تھے۔ ان تمام اوصاف کے اجتماع نے ان کو بیسویں صدی کے اسلامی احیاء کے

معماروں میں ایک درخشاں مقام پر متمکن کیا، ان کے یہاں علامہ اقبال کا سوز و گداز مولانا مودودی کی عقلیت اور تصور دین کی جامعیت علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کا ذوق تاریخ اور مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا الیاس، مولانا عبد القادر رائے پوری اور مولانا محمد زکریا کی روحانیت کا امتزاج نظر آتا ہے۔ علی میاں کے یہاں یہ سب ایک دوسرے کے نقیض نہیں، ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں اور یہی وہ نکتہ ہے جسے ناقدین علم وفن نے نظرانداز کردیا ہے۔ مولانا علی میاں کا اصل میدان تاریخ اور دعوت ہے، سیرت اور انسان سازی ہے، روح کی بیداری اور اُمت کی ترقی کے لئے اسلاف کے نمونہ کا احیاء ہے، ان کے یہاں خانقاہ اور جہاد، تزکیہ اور انقلاب دونوں دھارے ساتھ ساتھ رواں نظر آتے ہیں۔

آگے پروفیسر خورشید احمد نے مولانا مودودیؒ اور مولانا علی میاں کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے لکھتے ہیں:

میں نے مولانا مودودیؒ اور مولانا علی میاں دونوں کے افکار اور کارناموں سے خوشہ چینی کی ہے؛ لیکن دونوں کے مزاج اور اُسلوب میں جوفرق تھا اسے میں کبھی کبھی اس طرح بیان کرتا ہوں کہ مولانا مودودی انسان کے دماغ کے ذریعہ اس کے دل میں اترتے ہیں اور قلب ونظر پر چھا جاتے ہیں جب کہ مولانا علی میاں دل کے راستہ فکر ونظر کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں اور روح کو تازگی فراہم کرتے ہیں۔ (ترجمان القرآن، فروری ۲۰۰۰ء)

مولانا کی نگارشات کے ادبی حسن کی داد غلام رسول مہر، مولانا عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی اور ماہر القادری اور متعدد اہل قلم نے دی ہے؛ لیکن یہ سارے اہل قلم وہ ہیں جن پر بعض ستم ظریفوں نے وعظ کہنے کا یا اسلامیت کا ''الزام'' لگایا ہے، اس لئے اقتباس صرف ایک ناول نگار اور یونیورسٹی کے استاد قاضی عبدالستار کی تحریر سے پیش کیا جارہا ہے، جن کا نام شعروادب کی دنیا میں ایسے ''الزام'' سے اور ''تہمت بے نام'' سے محفوظ ہے۔

''ہمارے طاق بے نیازی پر سجے ہوئے کچھ نگار جیسے سید سلیمان ندوی، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایسے مشاہیر روزگار ہیں ان کے نقش ہائے رنگ رنگ اتنے

جلی اور اتنے روشن ہیں کہ معمولی تفہیم و تحسین کے لئے بھی جلدیں درکار ہیں'' ایک عالم دین کے قلم کی داد میخانۂ ادب کے رند کی زبان سے بہت سے لوگوں کے لئے سند کا درجہ رکھتی ہے، بقول شاعر:

حوروں کی ثنا رند جو کردیں تو سند ہے
یہ بات بری لگتی ہے واعظ کی زباں سے

(مزید مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو کتاب'' مطالعہ تصنیفات مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی'' شائع کردہ مکتبہ فیض عام، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی)۔

☆☆☆☆
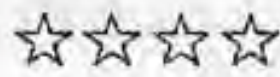
مولانا علی میاںؒ کے'' خطبات''

مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے خطبات کی اور ان کی تحریروں اور تقریروں کی خاص الخاص خصوصیت وہی ہے جو حضرت مولانا کی شخصیت کی خاص الخاص خصوصیت ہے۔ مولانا ندویؒ کو اللہ تعالیٰ نے مجموعہ خوبی اور جامع کمالات بنایا تھا، ان کی شخصیت ہمہ گیر اور ہمہ جہت اور ہمہ صفت تھی، اور ہشت پہلو ہیرے کی مانند تھی۔ ایسی کسی شخصیت کے بارے میں یہ معلوم کرلینا آسان نہیں ہوتا کہ ان تمام صفات میں کونسی صفت ایسی ہے جسے کلیدی صفت کہا جائے اور جس صفت سے اس کی مجموعی شخصیت کو سمجھ لینا آسان ہوجائے اور جسے شخصیت کی عمارت کا بنیادی پتھر کہا جاسکے اور جس صفت کا رنگ ہر تحریر میں جھلکتا ہو اور جس کا آہنگ ہر تقریر میں سنائی دیتا ہو۔

مولانا علی میاں ایک ممتاز عالم دین تھے، مولانا علی میاں ممتاز مصنف اور ادیب تھے، مولانا علی میاں ممتاز مقرر اور خطیب تھے، مولانا علی میاں متقی متوکل، خدا رسیدہ، پرہیزگار اور شب زندہ دار بزرگ تھے، مولانا علی میاں بہت متواضع اور منکسر مزاج انسان تھے، مولانا میں اعتدال کا وصف تھا، مولانا میں بے مثال استغنا تھا اور دولت دنیا سے بے نیازی کی صفت تھی، مولانا حکمت اور دانائی کا مجسمہ تھے، مولانا علی میاں پیکر شرافت و اخلاق تھے۔ مذکورہ بالا صفات اور کمالات میں ہر صفت اعلیٰ درجہ کی صفت ہے اور ان میں سے کوئی ایک صفت بھی کسی انسان میں پائی جائے تو وہ

انسان لائق عزت اور قابل قدر ہوتا ہے۔ جہاں مولانا علی میاں کے صحبت یافتہ اور مزاج آشنا لوگ آج بڑی تعداد میں موجود ہیں، ادب و احترام کے ساتھ میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ مذکورہ صفتوں میں ہر صفت اگر چہ گراں مایہ اور کمیاب ہے؛ لیکن ان میں کوئی صفت بھی وہ کلیدی صفت نہیں ہے جو مولانا کی مکمل شخصیت کی کلید، رمز اور شرح بن جائے اور جسے مولانا کے خطبات کا اور ان کے اسوہ و عمل کا نمایاں ترین وصف قرار دیا جائے۔

مولانا کی زندگی میں جو وصف تمام اوصاف میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے، اور جس کا عکس تمام ملفوظات اور تصنیفات میں نظر آتا ہے اور جو رنگ ہر آہنگ میں پایا جاتا ہے، وہ دینی حمیت، ملی غیرت اور اقبال کے الفاظ میں خودی اور خودداری کا رنگ ہے، مولانا کی پوری شخصیت اقبال کے اس شعر کی آئینہ دار ہے:

خودی سے مردِ خود آگاہ کا جلال و جمال
یہ اک کتاب ہے باقی تمام تفسیریں

میں اپنی بات کے ثبوت کے لئے پہلی دلیل یہ دوں گا کہ اسلامی تاریخ میں اسلامی غیرت وحمیت سے لبریز جو جملہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زبان سے نکلا تھا اور جس نے تاریخ کے دھارے کو بدل دیا تھا وہ یہ جملہ تھا'' اینقص الدین و انا حی ''یعنی کیا میرے جیتے جی کوئی دین میں کتر و بیونت کر سکتا ہے اور دین میں کاٹ چھانٹ کر سکتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ جملہ جس کا حرف حرف غیرت وحمیت میں ڈوبا ہوا تھا، مولانا علی میاں کی شخصیت پر اس طرح چھا گیا تھا کہ مولانا اس غیرت وحمیت کا عنوان اور ترجمان بن گئے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس جملہ کے حوالے مولانا علی میاں کے خطبات میں جس کثرت سے ملیں گے عصر حاضر کی کسی شخصیت کی تحریر و تقریر میں نہیں ملیں گے، وہ اس جملہ کا سہارا لے کر عرب و عجم میں دینی غیرت اور حمیت کی باز آفرینی کی کوشش کرتے رہے، وہ اس حمیت کو واپس لانے کی سعی مسلسل کرتے رہے جو شومئی قسمت سے ''تیمور کے گھر'' سے رخصت ہو چکی تھی۔

حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

مولانا کا یہی غیرت وحمیت کا مزاج تھا، جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وصیت ''لا تموتن الا و انتم مسلمون'' کو طبیعتِ ثانیہ اپنا موٹو اور اپنی تمام کوششوں کا عنوان بنالیا تھا پھر اسی وصیت ابراہیمی کو مولانا ادبی اُسلوب میں خطیبانہ آہنگ میں، نئے رنگ اور نئے انداز میں

عالم اسلام کے چپے چپے میں شہر بشہر، قریہ بقریہ، کو بہ کو سناتے رہے، پھیلاتے رہے اور اس کو پھیلانے میں انھوں نے زمین و آسمان کے قلابے ایک کر دیئے، زمین کی طنابیں لپیٹ دیں، بحر و بر کے اتنے اسفار کئے جو ابن بطوطہ نے بھی نہ کئے ہوں گے، اس مسلسل سفر کا مشن ایک ہی تھا اور وہ تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وصیت ''لا تموتن الا و انتم مسلمون''۔

اس دینی حمیت و غیرت کی جلوہ گری کی شہادت مولانا کی کتاب زندگی کے ورق ورق سے ملتی ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے، یو پی کی حکومت نے سرکاری اسکولوں میں تمام طلبہ کے لئے وندے ماترم کا گیت پڑھنا ضروری قرار دے دیا تھا، پھر معاملہ محض وندے ماترم ہی تک محدود نہ تھا، ہر اسکول کے لئے یہ بھی لازمی قرار دے دیا تھا کہ 18×30 سائز کی سرسوتی کی تصویر اور ہندوستان کا نقشہ آویزاں کریں۔ طلبہ جب اسکول کے لئے آئیں اور تعلیم کے لئے جمع ہوں اور پھر جب اسکول سے رخصت ہونے لگیں تو دونوں وقت یہ دونوں تصویریں ان کے سامنے رکھی جائیں، سرسوتی وندنا کے بعد طلبہ قومی گیت گائیں، طلبہ اسکول چھوڑنے سے پہلے بھارت ماتا کی جئے پکاریں۔ (تکبیر مسلسل، مرتبہ ڈاکٹر مسعود عثمانی: ۱۲۱)

مولانا علی میاں کی دینی غیرت اس مشرکانہ، حاکمانہ آمرانہ حکم کو برداشت نہ کر سکی، مولانا نے اخبارات کے نمائندوں کے سامنے بیان دیا کہ حکومت کی تعلیمی پالیسی پورے ملک کے لئے نقصان دہ ہے، اگر حکومت نے اپنا فیصلہ نہ بدلا تو ہم مسلمانوں سے کہیں گے کہ وہ اپنے بچوں کو اسکولوں سے اُٹھالیں، مولانا نے واضح طور پر کہا:

> مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ اہمیت عقیدہ توحید کی ہے اور وہ اس کی حفاظت ایمان کی شرط سمجھتے ہیں اور وندے ماترم کا لازمی قرار دیا جانا مداخلت فی الدین ہے۔

ہندوستان کے اخبارات میں مولانا کا بیان شائع ہوا اور اس بیان سے غیر مسلم اکثریت کے سامنے مسلمانوں کا عقیدہ توحید اور اس کے بارے میں ان کی غیرت و حساسیت سامنے آئی اور انھیں معلوم ہوا کہ مسلمان خدا کے سوا چاہے کوئی کتنا ہی بڑا دینی پیشوا ہو نہ اس کے سامنے سر جھکا سکتا ہے نہ کسی طرح کی بندگی کا اظہار کر سکتا ہے۔

مولانا کے اس بیان کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں وندے ماترم اور سرسوتی وندنا کے خلاف احتجاج شروع ہوا، اس وقت کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی اور وزیر داخلہ لال کرشن

اڈوانی کو بیان دینا پڑا کہ سرسوتی وندنا اور وندے ماترم سب کے لئے لازمی نہیں ہے، شروع میں حکومت کے بعض حلقوں میں اس قسم کے آرڈر کا انکار بھی کر دیا گیا تھا؛ لیکن یہ ثابت کر دیا گیا کہ وزیر برائے تعلیم رویندر شکھلا نے ایسا آرڈر بھیجا تھا۔ حکومت کو اس آرڈر کے بارے میں اعتراف کرنا پڑا اور پھر ۳ر دسمبر ۱۹۹۸ء کو حکومت یوپی نے اس آرڈر کو کینسل کر دیا؛ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وزیر اعلیٰ نے وزیر برائے پرائمری تعلیم رویندر شکھلا کو ان کے عہدے سے برطرف کر دیا۔

مولانا کی خطابت میں دینی غیرت وحمیت کی چنگاریاں چمکتی نظر آتی ہیں، مولانا کی تقریروں میں جہاں کسی خطیبانہ آہنگ اور جلال کا رنگ نظر آئے گا وہاں جملوں کا تجزیہ کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ یہ دراصل دینی غیرت وحمیت کا سرجوش ہے جو قدح الفاظ وعبارت پر چھایا ہوا نظر آرہا ہے، مولانا کے اسوۂ عمل میں بھی اس کے مظاہرے ملتے ہیں۔ جب بازار مصر کے چوراہوں پر فرعون کے مجسمے لگائے جارہے تھے اور جب زبانیں فخر سے ’’ نحن من ابناء الفراعنة‘‘ کا اعلان کررہی تھیں، اس وقت عالم اسلام کی جس شخصیت نے سب سے پہلے قلم سے تلوار کا کام لیا اور عرب قومیت کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا وہ مولانا علی میاں کی شخصیت تھی۔ اس وقت ہندوستان کے بہت سے دینی حلقوں میں بھی یہ شعور پیدا نہیں ہوسکا تھا کہ عرب قومیت کی تحریک خطرناک کیوں ہے؟ بلکہ ایک صاحب نے تو مولانا کے خلاف ایک کتابچہ بھی لکھ ڈالا تھا، جس کا عنوان تھا’’ مصر جدید کا دینی پہلو‘‘۔ بعض دینی حلقوں کی یہی بے شعوری رہی ہے جس کی وجہ سے وہ کبھی ترکی کے مصطفیٰ کمال کی حمایت کرتے رہے اور کبھی مصر کے جمال عبدالناصر کی، ان اداروں سے جہاں قال اللہ قال الرسول کا زمزمہ سنائی دیتا تھا وہ صحیح دینی شعور رکھنے والے علماء نہیں پیدا ہوسکے جو ایک ہادیٔ دین اور ایک خادم دین کے درمیان فرق کرسکیں اور دین کی سربزیری اور سرافرازی میں امتیاز قائم کرسکیں۔

مولانا علی میاں کی شخصیت وہ ہے جنھوں نے بنی نوع انسان کے ہر زمرے اور ہر طبقہ کے لوگوں کو اپنا مخاطب بنانے کی کوشش کی، انھوں نے بادشاہوں اور فرماں روایان حکومت کو بھی خطاب کیا، انھوں نے عرب حکومتوں کے ریڈیو اسٹیشن سے عوام وخواص کو خطاب کیا، انھوں نے اہل قلم اور تاجداران سخن کی فکری رہنمائی کے لئے ادب اسلامی کی تحریک کا آغاز کیا، انھوں نے برادرانِ وطن کے سامنے پیام انسانیت کی تقریریں کی، مدرسوں اور دانش گاہوں کے اسٹیج سے اور مسجدوں کے محراب ومنبر سے انھوں نے لوگوں کو خطاب کیا۔ یہ تمام خطبات جو عربی اور اُردو میں کتابوں کی شکل میں شائع ہوچکے ہیں، مولانا کی حمیت وغیرت کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ مولانا کی

سوانح پڑھئے، کبھی مولانا کی زبان ابر گوہر بار ہوتی ہے، کبھی مولانا کا قلم تیغ جوہر دار ہوتا ہے، کبھی مولانا کے قدم دشت نوردی اور آبلہ پائی میں مشغول ہوتے ہیں، ہر جگہ جو چیز مولانا کے قلم اور قدم کو متحرک کرتی اور زبان کو گویائی کی طاقت بخشتی ہے وہ مولانا کی یہی صفت ''دینی حمیت وغیرت'' تھی۔ کبھی وہ مسلمانوں کا حوصلہ بلند کرنے کے لئے یوں مخاطب ہوتے'' انسان کی ساری کمزوریوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر عزم وفیصلہ کی وہ طاقت رکھی ہے کہ پہاڑ اور دریا اس کا راستہ روک نہیں سکتے'' مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کے لئے مسلمانوں سے یوں مخاطب ہوتے'' اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طاقت کے بعد جو اصل طاقت ہے اور جو دنیاوی لحاظ سے سب سے بڑی طاقت ہے جو زندگی کے پہیوں کو رواں دواں رکھتی ہے جو مختلف وقتوں میں دنیا میں تبدیلیاں لاتی ہے، پہاڑوں کو اپنی جگہ سے کھسکا سکتی ہے، دریاؤں کی موجوں کو موڑ سکتی ہے، سلطنتوں کے چراغ گل کر سکتی ہے، ایسے واقعات وجود میں لاتی ہے جن کا تصور بھی مشکل ہوتا ہے، وہ انسانی فیصلہ ہے، اس فیصلے نے بارہا افراد اور خاندانوں کی نہیں قوموں اور انسانوں کی تقدیر بدل دی ہے''۔

مولانا علی میاں کو کئی بار اپنی کوشش اور مشن میں حیرت انگیز کامیابی ملی، مسلم پرسنل لا تحریک میں شاہ بانو کیس کا حوالہ اس ضمن میں دیا جا سکتا ہے، اس وقت برادرانِ وطن، میڈیا، حکومت کا حلقہ، سیاسی پارٹیاں، کوئی بھی مسلمانوں کے مطالبہ کی تائید میں نہ تھے، سب کے سب مسلمانوں کے خلاف تھے۔ اس وقت حیرت انگیز طور پر مولانا علی میاں کی قیادت میں مسلمانوں کو کامیابی حاصل ہوئی، کامیابی کے راز پر بہت سے لوگوں کے لئے پردہ پڑا ہوا ہے، ایسے وقت میں جب مخالفت کی تیز وتند آندھیاں چل رہی ہوں کامیابی اس وقت ملتی ہے، جب دین کے بارے میں غیرت وحمیت رکھنے والا غیرت کے پردہ کو ہٹا کر بارگاہ بے نیاز تک پہنچ جاتا ہے اور لذتِ آشنائی سے ہمکنار ہو جاتا ہے، جب سینہ میں وہ دل ہوتا ہے جو عرض و نیاز عشق کے قابل ہو جاتا ہے، جو دست و بازوئے قاتل کی شکایت اس سے کرتا ہے جو طاقت وقوت کا سرچشمہ ہے، پھر اس کے ساتھ وہ اپنی کوشش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا ہے۔

ہمارے معاشرہ میں ملی کوششوں کی یہ بدقسمتی رہی ہے کہ جو لوگ دوا کرنا بہتر جانتے ہیں وہ دُعاء کرنا نہیں جانتے اور جو دُعاء کرنا جانتے ہیں وہ دوا کرنا اور اسباب اختیار کرنا نہیں جانتے ہیں اور اس کا کوئی تجربہ نہیں رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کی تمام سوختہ سامانیاں حرماں نصیبیاں ختم ہو سکتی ہیں، اگر کامیابی کے دونوں پہیئے مضبوط ہو جائیں۔ مولانا علی میاں کی شخصیت کا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ ترک

اسباب پر نہیں؛ بلکہ اختیار اسباب پر زور دیتے ہیں، وہ صرف ایمان وعبادت کی تلقین نہیں کرتے ہیں؛ بلکہ مسلمانوں کو عالم ایجاد میں صاحب ایجاد بن کر رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ دنوں کی تپش اور شبوں کے گداز کے ساتھ جب سعی وعمل ہم آمیز ہو جاتے ہیں تو کامیابی قدم چومتی ہے، یہی قرآن کا سبق ہے، یہی سیرت نبوی ﷺ کا درس ہے، یہی صحابہ ؓ کا نمونہ ہے، جن کے بارے میں آتا ہے" رھبان باللیل و فرسان بالنھار "یعنی راتوں کے عبادت گزار اور دن کے شہسوار۔

مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے خطبات "تکبیر مسلسل" کے نام سے "اصلاحیات" اور "خطبات" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" اور "تاریخ دعوت وعزیمت" کا مطالعہ بھی مسلمانوں کی نئی نسل کو کرنا چاہئے، ان کتابوں کے بغیر اسلامیات کا مطالعہ ناقص اور نامکمل رہ جائے گا۔ نبی رحمت ﷺ، مولانا کی سیرت پر عمدہ کتاب ہے، مولانا آہنگ خطابت میں مسلمانوں کو سیرت پیغمبر ﷺ سے وابستہ رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور یقین کے لہجہ میں کہتے ہیں کہ اس اُمت کا شیرازہ اور گلدستہ اسی محبت اور عقیدت کے دھاگے سے بندھا ہوا ہے۔ مولانا کے مزاج میں یاس وقنوطیت بھی نہیں ہے، وہ اپنی تقریروں میں اعتماد اور حوصلہ کی شمع کو روشن کرتے ہیں اور روشن رکھنے کی تلقین کرتے ہیں، مولانا کے خطبات جو کئی جلدوں میں ہیں، مسلمانوں کی نئی نسل کے لئے لائق مطالعہ ہیں، ندوی بک ڈپو، ندوۃ العلماء لکھنؤ سے یہ کتاب منگائی جاسکتی ہے۔

☆☆☆☆

"دینی وعصری تعلیم"

یہ مولانا احمد ومیض ندوی کی نئی اور تازہ کتاب کا نام ہے، احمد ومیض اُردو زبان اور اسلامیات اور ملی مسائل اور تعلیم کے موضوع پر بہت اہم لکھنے والوں میں شمار کئے جانے لگے ہیں۔ جو کچھ لکھتے ہیں مدلل لکھتے ہیں اور اُسلوب کی شائستگی اور خوبصورتی کی رعایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں، اگرچہ ان کو دیکھنے سے نہیں لگتا ہے کہ ادب اور انشا پردازی سے ان کا تعلق ہوگا؛ بلکہ یہ گمان ہوتا ہے کہ اس سے ایک گونہ بیر ہوگا اور شعر وشاعری سے عداوت ہوگی، شعر سن کر غصہ آجاتا

ہوگا۔لیکن کتاب ان کے حسن ذوق اور فکر ارجمند کے ساتھ زبان ہوشمند کی آئینہ دار ہے، زبان میں شعریت ہے، ان کی فکر رسا ہے اور انھیں ادب کا ذوق جمال وافر ملا ہے، وہ عالم بھی ہیں اور معلم بھی ہیں اور دار العلوم حیدر آباد سے وابستہ بھی ہیں اس لئے تعلیم کے مسئلے پر انھوں نے جو کچھ لکھا وہ فاضلانہ لکھا ہے، نہ صرف فاضلانہ لکھا ہے؛ بلکہ انشا پردازانہ لکھا ہے۔ ندوۃ العلماء کے ذریعہ شبلی کا فیض قلم جاری ہے، ندوۃ العلماء کے فرزند ادب کا ذوق رکھتے ہیں اور عربی اُردو انشاء پر قدرت رکھتے ہیں، دار العلوم حیدر آباد کے ایک استاذ احمد ومیض ہیں جو اسلامیات پر بہت سلیقہ سے ادب وانشاء کی خوشبو میں جامہ الفاظ کو معطر کرتے ہوئے اُردو میں مضامین لکھتے ہیں۔ اسی دار العلوم کے دوسرے استاذ مولانا نعمان الدین ندوی ہیں، ''الصحوۃ الاسلامیۃ'' کے ایڈیٹر عربی زبان کے ادیب اور انشا پرداز، میں اساتذہ سخن کی بات نہیں کرتا، نعمان الدین صاحب کے ہم عمر لوگوں میں مشکل سے کوئی نام لیا جاسکتا ہے جو ان سے زیادہ دلکش اور سلیس عربی لکھتا ہو۔ زبان غیر میں شرح آرزو کرنا اور اہل ادب کے روبرو کرنا کوئی معمولی درجہ کی بات نہیں، ہندوستان سے باہر صف اول کے عربی رسالوں میں بھی ان کے مضامین چھپتے ہیں عربی ہو یا اُردو ندوہ کے فضلاء نے مضامین اور بلند پایہ تصنیفات کے ذریعہ علم وادب کی دنیا میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ جو لوگ تخلیقی اور علمی کاموں میں دلچسپی نہیں رکھتے ہیں وہ انتظامی منصب کی لذت کے شیدائی ہو جاتے ہیں اور اخبار میں خبروں کے ذریعہ اپنے منصب کی تشہیر کرتے رہتے ہیں، حالاں کہ بڑے سے بڑے منصب میں وہ لذت نہیں جو ایک اچھی تحریر میں ہے اور الفاظ اور جملوں کے تاج محل کی تعمیر میں ہے۔ اہل علم کے لئے روح کی شادابی اور طمانینت کتابوں کے مطالعہ اور تفکر وتدبر میں پوشیدہ ہے، لفظوں کو سیمیں بدن، جملوں کو گل پیرہن اور مضمون کو رنگین اور طبلۂ عطار کر دینا کوئی معمولی درجہ کی بات نہیں، یہ تناسب ہم آہنگی اور لفظ ومعنی کی جمالیات کا فن ہے، یہ وہ انمول چیز ہے جس سے احساسات کی دنیا میں ہلچل پیدا ہو جاتی ہے، مال ودولت اور عہدہ ومنصب اس کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے، ایک اسکالر اور ادیب کی شان قلندرانہ پر ہزار گورنری سروری اور پیشہ زرگری قربان۔

کتاب ''دینی وعصری تعلیم'' کے تمام مضامین سرمۂ چشم نظر ہیں، فکر انگیز ہیں بصیرت افروز ہیں، علم کی ناقدردانی کے اس دور میں نئی نسل کو ماضی پرست اور حال مست بنانے کے بجائے مستقبل بدست بنانے کے لئے تعلیم کے موضوع پر اس مفید کتاب کو عام کرنے اور پھیلانے کی ضرورت ہے، یہ وہ کتاب ہے جس پر عمل کیا گیا تو مستقبل روشن اور تابناک ہوگا۔ مصنف کو ماضی

کے ورثہ کا علم ہے اور حال کی بے بضاعتی اور تنگ دامانی کا بھی اور اس بات کا شعور بھی ہے کہ عظمت رفتہ کی باز آفرینی کے لئے تعلیم میں امتیاز حاصل کرنا ضروری ہے۔ دنیا میں کامیابی اور کامرانی کے لئے اور سیاسی سماجی اعتبار سے قوت وشوکت حاصل کرنے کے لئے نئی نسل کا زیور علم سے آراستہ ہونا اتنا ہی ضروری ہے، جتنا علاج ومعالجہ کا پیشہ اختیار کرنے کے لئے علم طب کا حصول یا منزل تک پہنچنے کے لئے سواری کا انتظام۔ اس کتاب کے تمام مضامین اس لائق ہیں کہ ان کا مطالعہ کیا جائے اور علم وفکر کے ان موتیوں کو مسلم معاشرہ میں اور اُردو پڑھنے والوں کے حلقہ میں عام کیا جائے، اُردو اکیڈمی نے تعلیم کے موضوع پر ایک کتاب شائع کی تھی یہ کتاب بھی تعلیم کے موضوع پر ہے اور اس کتاب کو بھی عام کرنے اور پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اس کتاب کے ایک ہزار نسخے خرید کر تمام کتب خانوں تک پہنچا دینا بھی مسلمانوں کی تعلیمی خدمت ہوگی، کتاب اور صاحبِ کتاب کو اگر ایوارڈ دیا جاسکتا ہے تو کتاب یقیناً ایوارڈ کی مستحق ہے کہ موضوع کے تمام پہلوؤں کا اس کتاب میں احاطہ کیا گیا ہے۔ ابتداء میں تعلیم کی اہمیت اُجاگر کی گئی ہے، دینی تعلیم ہو یا عصری تعلیم کوئی موضوع ایسا نہیں ہے جو تشنہ رہ گیا ہو، دینی اور اخلاقی تربیت کے موضوع پر بھی سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے، یہ اس لئے کہ مدارس کو صرف ایک تعلیم گاہ نہیں؛ بلکہ آدم گری اور مردم سازی کا مرکز بھی ہونا چاہئے، اقبال نے اس پہلو پر زور دیا ہے:

وہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

ہندوستان میں دینی مدارس کے نصابِ تعلیم کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اس کتاب میں بھی جو کچھ لکھا گیا ہے، اعتدال کے ساتھ لکھا گیا ہے؛ لیکن بہت سے مدارس بالکل آمادہ اصلاح نہیں، کون سنتا ہے فغان درویش، نصاب تعلیم کو بھی مقدس چیز سمجھ لیا گیا ہے، نئی نسل کی ذہنی فکری ترقی کا انحصار اچھے اساتذہ اور اچھے نصاب پر ہے اور مدرسہ کا اچھا نصاب وہ ہے جو زمانہ کی ضرورتیں پوری کرتا ہو جو ایک فارغ التحصیل کو غیر مسلموں کو بھی خطاب کرنے کا اہل بناتا ہو۔

اس بات سے مشکل سے کوئی شخص انکار کرسکتا ہے کہ دینی مدارس کا نظام اور نصاب اصلاح اور تبدیلی کا متقاضی ہے؛ لیکن دینی مدارس کے سلسلہ میں یہ بات کہ وہ ملک میں اسلام کی چھاونی کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ دین کے قلعے ہیں ہر اس شخص کو سمجھ میں آئے گی، جسے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کا احساس ہے، اسی لئے دشمنوں کے اتہام ودشنام کا

نشانہ مسلمانوں کی جدید تعلیم گاہیں نہیں بنتی ہیں ؛ بلکہ دینی مدارس بنتے ہیں۔ اسلام دشمن جماعتیں دینی مدارس کو قومی سلامتی کے لئے خطرہ سمجھتی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ دینی مدارس سے دینی تحریکات کو قیادت ملتی رہتی ہے اور برابر کمک پہنچتی رہتی ہے، اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کرنی ہے تو ہر مسجد کے ساتھ اگر جگہ کی گنجائش ہو تو ایک دینی مکتب اور جدید انداز کے مدرسہ کو لازم ملزوم ہونا چاہئے۔ مدرسوں کے پروگراموں میں محلّہ کے غیر مسلموں کو بھی دعوت دینی چاہئے تاکہ ان کے شبہات دور ہوں اور وہ اسلام سے واقف ہوں اور مسلمانوں کے اداروں کو قریب سے دیکھنے کا انھیں موقعہ ملے حیدرآباد شہر میں مسجد عالیہ اور مسجد عزیزیہ میں جس طرح لکچر ہال موجود ہیں اس طرح مسجد کے ساتھ لکچر ہال کی تعمیر بھی بشرط گنجائش ہونی چاہئے۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ بعض فتنہ پرور قسم کے مسلمان اس طرح کے تعمیری کاموں میں رکاوٹ بنتے ہیں اور مسلکی عصبیت کو پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں، شعور کی یہ کمی تعمیر و ترقی کے کام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ عصری جامعات سے کہیں زیادہ دینی مدارس نے انجام دیا ہے، اگر یہ مدارس نہ ہوتے تو اُردو زبان کا بھی خاتمہ ہو جاتا۔ پورے ملک میں دینی مدارس کا جال بچھا ہوا ہے اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہر سال اُردو پڑھنے اور لکھنے والے ایک لاکھ افراد ان مدارس کے ذریعہ قوم کو ملتے ہیں صرف اُردو کے علاقوں میں نہیں ؛ بلکہ اس سے باہر بھی یہ مدرسے اُردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ٹامل ناڈو میں عمرآباد جانے کا موقع ملا جہاں جامعہ دارالسلام کے نام سے عظیم الشان درسگاہ قائم ہے، اس درسگاہ سے اُردو میں بہترین تقریریں کرنے والے اور اُردو میں مضامین لکھنے والے مسلسل سامنے آتے رہتے ہیں، اسی طرح کرناٹک میں بھٹکل میں عظیم الشان دینی ادارے قائم ہیں جو اُردو کی خدمت کر رہے ہیں، خود بنگلور میں حیدرآباد کی طرح اعلیٰ معیار کے دینی ادارے قائم ہیں، شمالی ہندوستان میں بعض خطوں میں شہر بشہر قریہ بقریہ دینی مدارس کا نظام قائم اور موجود ہے۔ ان دینی مدارس پر خندہ زن ہونے والے وہ لوگ ہیں جو بصیرت سے محروم ہیں، انھیں علامہ اقبال کا قول یاد رکھنا چاہئے، علامہ اقبال بہت بڑے شاعر ہی نہیں ؛ بلکہ بڑے مفکر اور فلسفی بھی تھے، ان پر ان غریب دینی مدارس کی اہمیت آشکارا تھی وہ کہتے ہیں:

> ان مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو غریب مسلمانوں کے بچوں کو ان ہی مکتبوں میں پڑھنے دو اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا ؟ جو کچھ ہوگا میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں۔ اگر ہندوستان کے مسلمان ان مکتبوں کے

اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اسی طرح جس طرح اسپانیہ میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر اور الحمراء اور باب الاخوتین کے سوا اسلام کے پیرووں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج اور دلی کے لال قلعہ کے سوا مسلمانوں کے آٹھ سو برس کی حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔

آخر میں ایک مسئلہ اور جس کا ذکر تعلیم کے موضوع پر کسی کتاب میں نہیں آتا ہے، حکومت کے بعض حلقے چاہتے ہیں کہ جنسی تعلیم کو ایک سبجکٹ کے طور پر اسکولوں میں پڑھایا جائے۔ مغربی ثقافت کے زیر اثر اس طرح کی تجویزیں قابل فہم ہیں اور مسلمانوں کی طرف سے اس تجویز کی مخالفت بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اسکولوں میں جنسی تعلیم دینا مشرقی ثقافت اور شرافت کے خلاف ہے۔ لیکن بائلوجی اور قانون اور فقہ اسلامی کے اعتبار سے اگر ضروری معلومات اسکول میں نہ سہی گھروں میں لڑکوں اور لڑکیوں کو والدین اور سرپرستوں کی طرف سے نہ دی جائیں گی تو غلط اور مضر ستوں سے وہ معلومات حاصل کریں گے، اخلاق سوز کتابیں پڑھیں گے یا انٹرنٹ میں تصویریں دیکھیں گے اور پریکٹکل لائف میں اس کے تجربے کریں گے۔ جنسی مسائل کا تعلق حیات انسانی اور نظام جسمانی سے ہے، اسی سے یہ سرزمین انسانی قافلوں کی گذرگاہ بنتی رہی ہے، اس لئے شرم وحیا کا بہانہ کرکے اس کی تعلیم سے اعراض مناسب نہیں، یہ نظام اگر تعلیمات اسلامی کا پابند نہیں ہوتا ہے تو سماج میں جنسی جرائم پروان چڑھتے ہیں، پھر مجرم کو اگر پکڑا جائے تو جیل خانے میں اور نہ پکڑا جائے تو شفا خانے میں داخل کیا جاتا ہے۔ اس لئے ایسی تعلیمی اور معلوماتی کتابوں کی ضرورت ہے، جو ایک طرف جنس کے سلسلہ میں علم حیات وظائف الاعضاء اور بائلوجی کی جدید معلومات فراہم کرتی ہوں دوسری طرف اس میں فقہی مسائل کا ذکر ہو، تیسری طرف خدا اور اس کے رسول کے احکام اور ہدایات کا بیان ہو اور پردہ کی اہمیت اور اختلاط مرد وزن کے نقصانات کو دل نشیں کرنے کی کوشش کی جائے۔ جنس کے موضوع پر ایسی جامع کتاب موجود نہیں ہے، جس میں تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہو، ندوۃ العلماء کے عربی ترجمان ''البعث الاسلامی'' کے تازہ شمارہ (جولائی ۲۰۰۸ء) میں جنسی تعلیم کے موضوع پر ایک اچھا مضمون شائع ہوا ہے، اہل علم اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

☆☆☆☆

اتحادِ اُمت اور آدابِ اختلاف

ڈاکٹر سید عبدالباری صاحب کا شمار زود نویس اہل قلم میں ہوتا ہے، وہ ایک اچھے ادیب اور انشاء پرداز ہیں اور ملت اسلامیہ کے معاملات اور مسائل کا شعور و ادراک رکھتے ہیں، انھوں نے اپنے شعور و ادراک کی لو چراغ مصطفوی ﷺ سے روشن کی ہے اور اسی لئے اس لو کی تنویر سے ان کی تحریریں چمک اٹھی ہیں۔ ادب کے علاوہ مختلف موضوعات پر انھوں نے خامہ فرسائی کی ہے اور اُردو زبان وادب کے کتاب خانہ میں اہم اضافے کئے ہیں، اب ان کا شمار ممتاز مصنفین میں ہوتا ہے، وہ ماہنامہ ''پیش رفت'' اور ماہنامہ ''ملی اتحاد'' کے ایڈیٹر بھی ہیں۔ یہ کتاب جو پیش نظر ہے، ان کی طبع رواں کی تازہ ترین پیشکش ہے اور موضوع بھی بے حد اہم ہے اور وہ موضوع ہے ''ملت کی شیرازہ بندی اور اختلاف کے حدود و آداب''۔ قرآن وحدیث جو دین اسلام کا منبع و سرچشمہ ہیں، اتفاق و اتحاد سے متعلق واضح احکام دیتے ہیں، باہمی مخاصمت کے اسباب پر روک لگاتے ہیں، باہمی موانست اور مواخاۃ پر زور دیتے ہیں، عیب جوئی، پردہ دری، غیبت اور الزام تراشی کی ممانعت کرتے ہیں، استہزاء و تمسخر سے منع کرتے ہیں۔ یہ اخلاقی ہدایات اس قدر واضح ہیں کہ ان کے بارے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، اسلام نے خاندانی شرف وافتخار کو اور آب وگل کی فضیلت کو معدوم کیا تھا، عجیب بات ہے کہ اسلام کے مثالی معاشرہ پر ایک صدی بھی نہ گذرنے پائی تھی کہ ان سارے عیوب کو جن کو اسلام نے مٹانے کی کوشش تھی، سماج میں سر اٹھانے اور شر پھیلانے کا موقع مل گیا۔ قبائلی عصبیتیں پھر سے سر اُٹھانے لگیں اور دوسروں کی تضحیک وتشہیر کی برائیاں سوسائٹی میں پھیلنے لگیں، قرآن میں حکم تھا'' لا یسخر قوم من قوم '' (یعنی کوئی قوم دوسری قوم کا مذاق نہ اڑائے) لیکن ہم قوم پرستی اور نسل پرستی میں مبتلا ہوکر دوسروں کے ساتھ طنز واستہزاء کا معاملہ کرنے لگے، چنانچہ ایک عربی شاعر نے ایک خاص قوم اور قبیلہ کی تحقیر کرتے ہوئے کہا تھا:

وغض الطرف انک من نمیر
فلا کعباً بلغت ولا کلابا

تیرا تعلق بنی نمیر سے ہے، اس لئے تو اپنی نظروں کو جھکالے، تو نہ تو بنی کعب کے

برابر ہو سکا اور نہ بنی کلاب کے ہمسر۔

یہ پوری ہجو یہ شاعری جو بنوامیہ کے عہد میں برگ و بار لا رہی تھی روح اسلام کے مخالف تھی۔ ہمارے نامۂ اعمال میں بہت سے گناہ لکھ دیئے جاتے ہیں اور ہمیں گناہ کا احساس نہیں ہوتا، کسی کو ازروئے تحقیر "بہاری" کہنا یا مصر میں "صعیدی" کے رہنے والوں کو بے وقوفی میں مبتلا سمجھنا یا حقارت سے کسی کو جُلاہا کہنا، یہ سب باتیں انسان کو گناہ گار کرنے اور اختلاف کا بیج بونے کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں اور قرآنی ہدایات کے خلاف ہیں۔ دوسروں سے بدگمانی بھی بہت عام ہوگئی ہے اور رگ رگ میں سرایت کر چکی ہے، حالت یہ ہوگئی ہے کہ کسی آدمی کے قول و فعل میں اچھائی کا پہلو تلاش کر لینا مشکل ہو گیا ہے، خواہ اس کے قرائن کتنے ہی واضح ہوں اور برائی کا پہلو ڈھونڈ لینا آسان ہو گیا ہے، خواہ اس کے قرائن کتنے ہی ضعیف ہوں۔ اسلام اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ حتی الامکان نیک گمان رکھا جائے، یہاں تک کہ کسی کو شراب پیتے ہوئے دیکھے تو یہ خیال کرنا چاہئے کہ ممکن ہے یہ کوئی اور مشروب ہو، اگر سو میں سے دو فیصدی قرینہ تاویل کا موجود ہے تو تاویل کرنا چاہئے اور بدگمانی سے کام نہیں لینا چاہئے؛ کیوں کہ قرآن میں حکم ہے "**یا ایھا الذین آمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن، ان بعض الظن اثم**" (یعنی اے مومنو! بہت سی بدگمانیوں سے بچو؛ کیوں کہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں)۔ بدگمانی اس حد تک پھیل چکی ہے کہ مسلمانوں کی کوئی تنظیم ایسی نہیں جس پر مالی خرد برد کا الزام نہ لگ چکا ہو اور حال یہ ہو گیا ہے کہ دوسروں کی برائیوں کی تشہیر کے لئے لوگ اپنی خدمات کو وقف کر دیتے ہیں اور رسالے اور رسالوں کے خاص نمبر نکالے جاتے ہیں اور پھر جواب در جواب کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کی برائیاں سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر بھی کرتے ہیں، حالاں کہ ہر سنی ہوئی بات کو دہرانا بذات خود گناہ ہے، حدیث میں آتا ہے "**کفی بالمرأ کذبا أن یحدث بکل ما سمع**" (آدمی کو گناہ گار کرنے اور اس کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو دہرائے) اسی طرح غیبت ہمارے معاشرہ کا ایک مزمن مرض ہے، ہم سامنے تو ایک شخص کی تعریف کرتے ہیں اور جیسے ہی وہ اٹھ کر جاتا ہے، ہماری زبان اس کے عیوب کا فی البدیہہ قصیدہ پڑھنے لگتی ہے۔

جب معاشرہ میں حسد، جلن، بدگمانی اور غیبت عام ہوگی، جب تنقید اور تنقیص کا مرض پھیل جائے گا تو پھر اتفاق و اتحاد کا ظہور کیسے ہوگا؟ اس وقت لوگوں سے ملاقاتیں کیجئے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ہمارے درمیان کا ہر شخص باہر کی دنیا میں جیتا ہے، دوسروں کے بارے میں اس کی معلومات

بہت مکمل و مفصل ہوتی ہیں، وہ چلتا پھرتا اخبار ہوتا ہے اور دوسروں کی کمزوریوں کی انسائیکلو پیڈیا، وہ ہروقت یہ بتانے کے لئے تیار رہتا ہے کہ کون کتنا کرپٹ اور خراب ہے اور کس کس میں کیا کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ قرآن میں حکم ہے" **ولا تلمزوا انفسکم و لا تنابزوا بالالقاب** "(یعنی آپس میں ایک دوسرے پر عیب نہ لگاؤ اور ایک دوسرے کو برے لقبوں سے نہ پکارو) چنانچہ اس آیت کریمہ کی روشنی میں استہزاء اور توہین کے طور پر کسی کو جُلاہا یا چمار کہنا، کسی کو بدعتی اور کسی کو وہابی کہنا، یا کسی شہر یا علاقہ یا ریاست کے رہنے والوں کو حقیر سمجھنا عیب ہیں اور گناہ میں داخل ہیں۔ یہ تمام باتیں جن سے باہمی منافرت راہ پاتی ہے، مسلم سوسائٹی میں اس طرح رچ بس گئی ہیں کہ بہت سے عبادت گزار اور زاہد مرتاض قسم کے اشخاص کے دامن بھی ان عیوب سے پاک نہیں ہوتے؛ حالاں کہ چاہے بہت زیادہ عبادت گذاریوں کی توفیق انسان کو نہ ملے؛ لیکن ان سیاہ کاریوں اور اخلاقی عیوب سے انسان بچ جائے تو وہ بہت خوش نصیب انسان ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن ایسے انسان کو لایا جائے گا جس نے بہت نمازیں پڑھی ہوں گی، بہت روزے رکھے ہوں گے؛ لیکن اس نے کسی کی حق تلفی کی ہوگی، کسی کا دل دکھایا ہوگا، کسی کا مذاق اُڑایا ہوگا، تو اس شخص کے نامۂ اعمال کی عبادتیں اس شخص کو دے دی جائیں گی جس کے ساتھ حق تلفی یا دل آزاری کی گئی ہوگی اور پھر اس مظلوم انسان کے نامۂ اعمال کا گناہ حق تلفی کرنے والے، غیبت کرنے والے اور مذاق اڑانے والے شخص کے نامۂ اعمال میں ڈال دیا جائے گا اور پھر ان عیوب میں گرفتار شخص کو جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔ مسلم معاشرہ میں اگر اتحاد و اتفاق پیدا کرنا ہے تو سیر چشمی، حسن سلوک، بڑوں کی عزت، چھوٹوں پر شفقت، خطا پوشی، جرم بخشی، عفو و درگذر، مودت و محبت، ایفائے عہد، امانت و دیانت کی عطر بیز خوشبو سے معاشرہ کو معطر کرنا ہوگا اور منفی صفات و عادات، لعن و طعن، الزام و دشنام، آبرو شکنی اور بدزبانی، تذلیل، تمسخر و استہزاء اور غیبت سے گریز اور مکمل پرہیز کرنا ہوگا، ورنہ دنیا کا نقصان اور آخرت کا بھی خسران، اگر ہم نے زبان و قلم کے تقدس کی حفاظت نہیں کی تو بعد میں پچھتانا ہوگا۔

تہمتیں چند اپنے ذمہ دھر چلے
کس لئے آئے تھے اور کیا کر چلے

یہ کتاب اُخوت کی جہاں گیری اور محبت کی فراوانی کا درس دیتی ہے اور اختلافات کے حدود و آداب پر بھی بہت اچھی روشنی ڈالتی ہے۔ اس ٹوٹی پھوٹی اُمت کو جوڑنے اور اس میں اتحاد

پیدا کرنے کے لئے یہ کتاب بہت اچھی تصنیف ہے، اسے عام کرنے، پھیلانے کا کام ثواب کا کام ہے، اس کتاب کا شائع ہونا فال نیک ہے۔

کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے

(مقدمہ کتاب شائع کردہ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، دہلی)

☆☆☆☆

''مولانا ابوالحسن علی ندوی ایک عہد ساز شخصیت''

(ایک نئی کتاب)

ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء، صدر مسلم پرسنل لا بورڈ حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی عربی اور اُردو دونوں زبانوں میں بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، عربی زبان میں ان کی تازہ ترین تصنیف اُردو شاعری بالخصوص غزل کے بارے میں ہے۔ اُردو زبان میں ان کی تازہ ترین تصنیف ''مولانا ابوالحسن علی ندوی —— ایک عہد ساز شخصیت'' ہے، مولانا علی میاں کی شخصیت پر گذشتہ چند برسوں میں عربی اور اُردو دونوں زبانوں میں دو درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں؛ لیکن یہ کتاب جس کا اس وقت تذکرہ ہے وہ مولانا علی میاں کی ہم راز اور دم ساز شخصیت کے قلم سے ہے، جو سفر اور حضر کی رفیق رہی ہے اور جسے مولانا کے دنوں کی تپش اور شبوں کے گداز کا علم رہا ہے۔ اس لئے مولانا علی میاں کی عالمی شخصیت کی تشکیل میں جو کارفرما عناصر رہے ہیں اس کا تفصیلی علم جتنا ان کو حاصل رہا ہے، دوسروں کو حاصل نہیں رہا ہے، مولانا علی میاں کی سیرت وسوانح کی تمام کتابوں میں اس کتاب کی حیثیت گل سر سبد کی ہے۔ اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا علی میاں نے کن خصوصیات کو اپنے اندر جمع کر لیا تھا اور ان کی بے مثال شہرت اور مقبولیت اور ان کی دلآویزی اور ہر دل عزیزی کا راز کیا ہے۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر نشین بھی ہیں اور مولانا کے انتقال کے بعد ان کے جانشین بھی ہیں۔ انھوں نے اپنی نرم مرنجان مرنج مقناطیسی شخصیت کی وجہ

سے ملت کو ٹوٹنے اور بکھرنے سے روک رکھا ہے، پرسنل لا بورڈ کو سیاست اور سازش کے متعدد خارزار سے گذرنا پڑا، بابری مسجد کے سلسلہ میں کبھی حکومت کی ریشہ دوانیاں، کبھی شنکر آچاریہ کی حیلہ پردازیاں، کبھی اپنوں کی افتراق انگیزیاں سامنے آئیں؛ لیکن مولانا کی قیادت کے پرچم تلے ملت کا کارواں عزم و یقین کے ساتھ جادہ مستقیم پر رواں دواں ہے۔

بحیثیت مصنف مولانا محمد رابع حسنی ندوی نے اپنی اس کتاب میں مولانا علی میاں کی شخصیت کے خدوخال اور اسی کے ساتھ ملی قیادت کے احوال پر روشنی ڈالی ہے۔ بابری مسجد مسمار کردی گئی، بابری مسجد ایکشن کمیٹی کا کوئی ایکشن کام نہ آیا، اس کی ہر کوشش ناکام، اس کا ہر کام بے نیل و مرام ثابت ہوا۔ اس کتاب سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بابری مسجد کے تحفظ کے سلسلہ میں مولانا علی میاں کا نقطۂ نظر عام مسلم قائدین کے نقطۂ نظر سے مختلف تھا، مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب نے مولانا علی میاں کے خطوط کا جو مجموعہ شائع کیا ہے اس سے بھی اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے اور خود مولانا علی میاںؒ کی کتاب ''کاروانِ زندگی'' سے بھی ان حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔ بابری مسجد کے سلسلہ میں مولانا علی میاں، مولانا عبدالکریم پاریکھ اور گورنر بہار یونس سلیم اور گورنر آندھرا پردیش کرشن کانت جی کئی بار چنئی کے شنکر آچاریہ سے ملے تھے اور یہ بات طے ہوئی تھی کہ شنکر آچاریہ کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل دی جائے گی جو بابری مسجد کو مسلمانوں کے حوالہ کرے گی اور وہاں سے مورتیاں ہٹادی جائیں گی؛ لیکن بابری مسجد کی مسلم قیادت اس کمیٹی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئی۔ مولانا علی میاں نے ایک اور کوشش کی تھی اور وزیر اعظم وی پی سنگھ کو کہا تھا کہ بابری مسجد کی زمین کو مرکزی حکومت اپنی تولیت اور نگرانی میں لے لے، تاکہ مندر کے پرجوش قائدین اس زمین پر تعمیر کا کوئی کام نہ کرسکیں۔ چنانچہ مولانا کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے وی پی سنگھ نے آرڈیننس جاری کردیا؛ لیکن مسلم قیادت نے اسے تسلیم نہیں کیا اور اسے غلط اقدام قرار دیا، چنانچہ مولانا نے وی پی سنگھ سے کہہ کر آرڈیننس ختم کرادیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے استحکام اور بقا کے لئے مولانا علی میاں کا نقطۂ نظر عام قائدین سے مختلف تھا، مسلم قیادت سنگھرش، کشمکش اور کشاکش کی زیادہ قائل رہی ہے، مولانا علی میاں صلح و آشتی، خیرسگالی اور باہمی احترام کی فضا قائم کرنے کو ضروری سمجھتے تھے: کیوں کہ اس ملک میں اسلامی اور ملی کام اس کے بغیر انجام نہیں دیا جاسکتا ہے اور اسی لئے انھوں نے پیام انسانیت کی تحریک شروع کی تھی۔ مولانا علی میاں کے یہاں شاخ گل کا لوچ تھا، دوسرے قائدین کے یہاں

تلوار کی تیزی تھی؛ لیکن اسی کے ساتھ دین توحید کے بارے میں غیرت وحمیت کا حال یہ تھا کہ "وندے ماترم" کو قبول کرنے سے انھوں نے انکار کردیا اور حکومت وقت کو ان کے سامنے جھکنا پڑا۔

شاہ بانو کیس میں بھی مسلم پرسنل لا بورڈ کو جو غیر معمولی اور تاریخی کامیابی حاصل ہوئی تھی اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ مولانا علی میاں اپنی قوی الاثر شخصیت کی وجہ سے وقت کے وزیر اعظم راجیو گاندھی کے ذہن کو بدلنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ صورتِ حال یہ تھی کہ اکثریتی فرقہ مسلمانوں کے مطالبہ کے خلاف تھا، حکومت مخالف تھی، اخبارات مخالف تھے؛ لیکن یہاں سپہ کی تیغ بازی اور نگہ کی تیغ بازی کا مقابلہ ہوگیا اور نگاہ فتح یاب ہوگئی، ایک وزیر اعظم کے ذہن اور دل اور دماغ کا تبدیل ہوجانا سیاست کے تبدیل ہوجانے کا ذریعہ بن گیا۔

مولانا علی میاں سے ملنے کے لئے وزیر اعظم اور تمام وزراء اعلیٰ آتے رہتے تھے، مولانا نے اقتدار وقت سے کبھی ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا اور نہ اپنے خاندان والوں کو اٹھانے دیا۔ مولانا اپنے اخلاص وللہیت میں بہت ممتاز تھے، مولانا نے زہد، قناعت اور استغناء کے وہ نمونے پیش کئے جو صرف اسلاف کی تاریخ میں مل سکتے ہیں، اخلاق عالیہ کا نمونہ ان کی زندگی میں ملتا ہے، انھوں نے کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی، کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا، کبھی کسی کی عیب جوئی نہیں کی، کبھی ان کی تہجد کی نماز قضا نہیں ہوئی، اذکار و اوراد اور تلاوت قرآن کی پابندی سفر وحضر ہر جگہ رہتی، بزرگوں اور محسنین کے لئے ایصال ثواب کا اہتمام بہت زیادہ تھا، روزانہ کم از کم دس بار سورہ یٰسین کی تلاوت کے بعد ایصالِ ثواب کرتے۔

مولانا محمد رابع حسنی ندوی کی یہ تصنیف مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر بہت اچھی روشنی ڈالتی ہے۔ مولانا علی میاں کی خدمات کا دائرہ ہندوستان سے لے کر پورے عالم اسلام تک محیط تھا، تمام عالمی دینی اسلامی تحریکات سے ان کا قریبی رابطہ تھا، ان کی مؤثر عربی تحریروں سے ان تحریکات کو کمک پہنچتی تھی، وہ ہندوستان میں بیٹھ کر پوری ملت اسلامیہ کی پاس داری اور سرمایہ ملت کی نگہبانی کا کام انجام دیتے تھے۔ وہ عوام کو بھی خطاب کرتے تھے، تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے کتابیں تصنیف کرتے تھے، سربراہان مملکت اور اربابِ حکومت کو خطوط لکھتے تھے، انھوں نے اصلاح وعزیمت اور دعوت کی تاریخ کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا اور جس طرح سے شہد کی مکھی بے شمار پھولوں کا رس نچوڑ لیتی ہے، مولانا نے تاریخ کی شخصیتوں سے استفادہ کر کے شہد تیار کرلیا تھا۔ چنانچہ ان کے کاموں میں بہت سے مصلحین کے کاموں کی جھلکیاں ملتی ہیں اور پھر ان

سب کے ساتھ عبادت واذ کار کی پابندی اور فقر و درویشی کا نمونہ اور اخلاق عالیہ کی جھلکیاں ، ایسی ہشت پہل شخصیت کا نمونہ جدید تاریخ میں بہت مشکل سے ملتا ہے۔ بے شمار اوصاف وخصوصیات کے ہجوم میں مولانا علی میاں صاحب کی شخصیت کا جو سب سے نمایاں وصف نظر آتا ہے وہ مولانا کی دینی غیرت وحمیت ہے، دینی حمیت اور غیرت وہ وصف ہے جس کو ختم کر دینے کی سب سے زیادہ فکر ابلیس کو رہتی ہے، بقول اقبال:

افغانیوں کی غیرت دینی کا ہے علاج
ملّا کو اس کے کوہ و دمن سے نکال دو

مولانا محمد رابع ندوی کی اس کتاب سے اس پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ مولانا علی میاں کو دنیا کے بے شمار ملکوں میں اعزاز بخشا گیا، بہت سے ایوارڈ دیئے گئے، ایوارڈ کی رقم اتنی ہوتی تھی کہ ایک فرد کو بہت دولت مند اور صاحب ثروت بنا دینے کے لے کافی تھی ؛ لیکن مولانا علی میاں نے اس دولت کو محتاجوں اور دینی اداروں میں تقسیم کر دیا اور کبھی اپنی ذات کے لئے اس کا استعمال نہیں کیا، بقول جگر:

بیٹھے ہم ہر بزم میں لیکن
جھاڑ کے اٹھے اپنا دامن

اُمید ہے کہ مولانا محمد رابع حسنی صاحب کی کتاب کا زبردست استقبال کیا جائے گا اور اس کتاب کو مولانا علی میاں کی شخصیت کی خصوصیات کو سمجھنے اور ان کو اپنے اندر جذب کرنے کا ذریعہ بھی بنایا جائے گا۔

(کتاب نشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ نے شائع کی ہے)

☆☆☆☆

عظمتِ رفتہ

ہندوستان اپنی سرزمین کی وسعت، موسم کے تنوع، تہذیب اور زبان کی رنگارنگی اور بو قلمونی کے اعتبار سے برصغیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ شمال کے اہل قلم جنوب کے تمام اہل قلم سے ناواقف اور جنوب کے اہل علم شمال کے تمام اہل ادب سے ناواقف رہ جاتے ہیں۔ معدودے چند خوش نصیب اہل علم وادب پورے ملک میں شمال وجنوب ہر جگہ شہرت اور نیک نامی کا امتیاز حاصل کر لیتے ہیں۔ اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش کے ایک کل ہند وایوارڈ کے سلسلہ میں جب نام ڈاکٹر ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کا کچھ لوگوں نے لیا تھا تو بہت سے اراکین نے ان سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تھا اگرچہ جس نام کا انتخاب کیا گیا وہ بھی بہت موزوں تھا؛ لیکن معارف کے ایڈیٹر اور دارالمصنفین کے ناظم اور بلند پایہ مصنف ضیاء الدین اصلاحی کے نام اور کام سے ناواقفیت حیرت انگیز تھی۔ اسی طرح شمال کے بہت سے لوگ بھی جنوب کے بلند مرتبت اور بلند قامت شخصیتوں سے ناواقف رہ جاتے ہیں؛ لیکن کچھ نام ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وقیع علمی کاموں کے باوجود شہرت اور عزت کا مقام ان کو نہ شمال میں پورے طور پر ملتا ہے نہ جنوب میں۔ ایک نام ڈاکٹر الیاس اعظمی کا بھی ایسا ہی ہے، اہل علم کا ایک محدود طبقہ ان کا مرتبت شناس ہے؛ لیکن علم ودانش کے ہرے بھرے چمن میں ان کی حیثیت ابھی تک اس شاخ گل کی ہے کہ:

خزاں نے جس کو تھاما نہ بہار نے سنبھالا

عمومی شہرت نہ سہی؛ لیکن ڈاکٹر الیاس اعظمی نے محنت اور مطالعہ سے اور مضامین نو بہ نو کے ذریعہ اقلیم علم وادب میں اور اہل قلم کی صف میں اپنی جگہ بنائی ہے اور نامور مصنفین سے خراجِ تحسین حاصل کیا ہے۔ ان کا تعلق اس سرزمین سے ہے، جہاں شبلی سپہر علم وادب پر نیر اعظم بن کر چمکے تھے اور ان کی کتاب عظمتِ رفتہ کا تعلق بھی زیادہ تر دبستانِ شبلی ہی سے ہے، انھوں نے اسی چراغ سے اپنا چراغ جلایا ہے؛ لیکن اس میں ڈاکٹر حمید اللہ، ضیاء الدین ڈیسائی، نجیب محفوظ، شکیل بدایونی، مجنون گورکھپوری وغیرہ پر بھی فاضلانہ اور محققانہ مضامین موجود ہیں۔ جن شخصیتوں پر اس

کتاب میں مضامین ہیں وہ سب کے سب آسمان علم وادب کے آفتاب و ماہتاب ہیں، سرسید، علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا عبد السلام ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد ،مولانا ابوظفر ندوی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا امین احسن اصلاحی وغیرہ کی شخصیتوں پر مرقعے اس کتاب میں موجود ہیں۔ اس لئے اس کتاب کا نام عظمتِ رفتہ بہت مناسب ہے، ان ناموں میں ہر نام ایسا ہے جس کی علمی اور ادبی عظمت تعریف اور توصیف سے بالاتر ہے؛ لیکن ہماری نئی نسل ان ناموں سے اور ان کے کاموں سے واقف نہیں، اگر نئی نسل اپنے اسلاف کے کارناموں سے ناواقف رہے گی تو عظمتِ رفتہ کی بازآفرینی کا امکان بھی باقی نہیں رہے گا، اسی لئے اقبال نے کہا ہے کہ:

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر لائق میراث پدر کیونکر ہو

اب نئی نسل نہ تو شبلی سے واقف ہے، جنھوں نے سیرۃ النبی لکھی اور ناموران تاریخ اسلام پر محققانہ کتابیں لکھیں، نہ مولانا آزاد سے واقف ہے اور نہ ان کے نثری شاہکاروں سے، نئی نسل کے بہت سے لوگ اُردو زبان سے واقف نہیں ہیں۔ کاش کہ ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی کی کتاب کی رسائی ہر مسلمان گھر تک ہوجاتی؛ تاکہ نئی نسل اپنے اسلاف کی علمی ادبی عظمت سے آشنا ہوسکتی تاکہ دینی اور علمی عظمت رفتہ کی بازآفرینی کا کم ازکم خواب دیکھ سکتی۔ اب تو قحط الرجال کا دور ہے، اب جو لوگ ہیں ان عبقری شخصیتوں کے مقابلہ میں بالشتیوں کی حیثیت رکھتے ہیں، پچیس سال پہلے جو لوگ تھے وہ عصر حاضر کے لوگوں سے فائق تھے اور پچاس سال پہلے جو بزرگانِ علم وادب تھے، وہ فائق تر تھے اور ان سے پہلے کے لوگ فائق ترین، یہ قاعدہ کلیہ تو نہیں کہ ”ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں“ لیکن بحیثیت مجموعی ایسا ہی ہے۔

اُردو زبان اور اسلامی علوم کی گاڑی تیزی کے ساتھ نشیب کی طرف جارہی ہے، اگر کوئی علمی کارگزار اور کارپرداز قیادت سامنے نہیں آئی اور سرسید اور شبلی کی طرح کوئی انقلاب آفرین شخصیت منظر عام پرنہیں آئی تو قعر مذلت میں گرنے سے مستقبل کی نسل کو کوئی نہیں بچاسکتا ہے۔ محمد الیاس اعظمی نے عظیم اور نامور اور عہد ساز شخصیتوں پر کتاب لکھ کر زبان اور تہذیب کی حالیہ تاریخ کو کتاب کے صفحات پر زندہ کردینے کا کارنامہ انجام دیا ہے، علم وادب کی بہت بڑی خدمت ہے، جو انھوں نے انجام دی ہے۔ انھوں نے ہر شخصیت کی تمام تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے اور اس شخصیت پر

جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا بھی، اس لئے یہ کتاب بہت جامع کتاب بن گئی ہے۔ عربی زبان کے ایک ادیب نے ایک ادبی تعبیر ''کتاب ینوب عن کتائب'' استعمال کی تھی، یعنی ایک کتاب جو ''کتائب''، یعنی کئی لشکر جرار کے برابر ہے۔ الیاس اعظمی کی کتاب بھی ایسی کتاب ہے جو بہت سی کتابوں کا نچوڑ ہے اور ایک پورے کتاب خانے کا ماحصل اور دارالمصنفین کی لائبریری میں بیٹھ کر مسلسل مطالعہ کا حاصل ہے، انھوں نے دریا کو کوزہ میں بند کردینے کا کارنامہ انجام دیا ہے، اچھی کتابیں پڑھنا اور مسلسل پڑھنا علمی اور تحقیقی مضامین لکھنا اور مسلسل لکھنا اس بے سوادی کے دور میں معمولی درجہ کی بات نہیں ہے۔ بلا شبہ یہ بہت اچھی کتاب ہے اور بقائے دوام کی خلعت سے نوازے جانے کے لائق، مشکل یہ ہے کہ اچھی کتابیں کم سامنے آتی ہیں اور سامنے آتی ہیں تو بازار مصر میں یوسف کا کوئی خریدار نہیں ملتا ہے، عروس تحریر کے جامہ حریر کے لئے نگاہ شوق مفقود ہے، اچھی کتابیں خریدار کو ترستی ہیں۔ نشہ علم وادب سے سرشار ہونے کا ذوق ختم ہوتا جارہا ہے، بے ذوقی عام ہے، لذت کتاب خوانی سے کم لوگ واقف ہیں اور لذت کباب خوردنی سے ہر شخص واقف ہے، آرائش اور آسائش کے سامان سے گھر بھرے رہتے ہیں، ٹیلی ویژن کے سامنے گھنٹوں بیٹھے رہنے کا مزمن مرض لاعلاج بنتا جارہا ہے، علم وادب کے مستقبل کے لئے سوالیہ نشان ہے:

کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں

(کتاب دارالمصنفین اعظم گڑھ سے حاصل کی جاسکتی ہے)

☆☆☆☆

دعوتِ دین کے موضوع پر
مولانا کلیم صدیقی کی ایک اہم کتاب

''اُمت کے آخر کی اصلاح صرف اسی طریقہ سے ہوگی جس سے اول کی اصلاح ہوچکی ہے'' اس خبر ماثور کی روشنی میں ہمیں مشکلات کا حل ماضی کی تاریخ میں تلاش کرنا ہوگا جب تاریخ کا سفر شروع ہوا تھا اور عظمت و اقبال اور جاہ وجلال کے آفتاب کے طلوع ہونے میں ماہ وسال کی گردشیں درکار تھیں اور اس آفتاب کے نصف النہار تک پہنچنے میں ایک صدی سے زیادہ کی مدت باقی تھی، اس زمانے کو خیر القرون کہا جاتا ہے۔ علوم وفنون کی تدوین کے سارے کام بعد کی صدیوں میں ہوئے، اس وقت کا سارا ارتکاز دعوت اسلام پر تھا اور اس کے نتیجہ میں ایک دور ابتلا سے مسلمانوں کو گزرنا پڑ رہا تھا۔ دعوت کا وہ کام جو تمام پیغمبروں نے اپنے اپنے زمانے میں انجام دیا تھا، صفا کی پہاڑی پر، مکہ کے بازاروں میں، طائف کی وادی میں، دار ارقم کے صحن میں اور آبادی کے دوسرے مراکز میں انجام دیا جار ہا تھا۔ یہ دعوت باران رحمت بن گئی، آبی اور خاکی کوئی اس سے محروم نہیں رہے اور پھر ایک سو سال کے بعد اسلام کا علم تین براعظموں پر لہرانے لگا۔ دعوتی کوششوں کے نتیجہ میں جب تمام قبیلے اسلام کے دامن رحمت میں آگئے اور جب قوموں نے اپنا آبائی دین چھوڑ کر دین اسلام قبول کرلیا، جب ملکوں کی غالب اکثریت نے شرک اور بت پرستی سے رشتہ توڑ کر توحید خالص کو اپنا عقیدہ بنالیا تو پھر اسلامی علوم کی تدوین کا دور شروع ہوا؛ کیوں کہ نئی قوموں کے داخل اسلام ہونے کی وجہ سے قرآن وسنت کے علوم کو مدون کرلینے اور نئے اجتہاد کی ضرورت پیش آنے لگی تھی۔ قرآن وسنت اور علم کلام کے موضوعات پر مکاتبِ فکر وجود میں آگئے اور سینکڑوں کتابیں تصنیف کی گئیں، سیکولر علوم میں بھی دنیا کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھوں میں آگئی ایسا اس لئے ہوا کہ خلافت ارضی کی نص ''إني جاعل في الأرض خليفة'' کا یہ اقتضاء اور مطالبہ تھا۔ دوسرے یہ کہ جو قومیں ان علوم میں دستگاہ رکھتی تھیں انھوں نے اسلام کو بحیثیت دین کے قبول کرلیا تھا، اب ان کی علمی اور پیشہ ورانہ مہارت نئے ایمان اور نئے عقیدہ سے ہم رشتہ ہوچکی تھی اور اس طرح سے

اسلامی تہذیب اور تمدن کو دنیا میں عزت اور غلبہ کا مقام حاصل ہو گیا۔ یہی وہ تاریخ ہے جسے اقبال نے "سیل رواں" سے تعبیر کیا ہے جو کسی کے روکنے سے رکتا نہ تھا اور کسی کے تھامنے سے تھمتا نہ تھا، اصلا یہ دعوت کا کام تھا جس نے دنیا کے ملکوں اور باصلاحیت باشندوں کو مسخر کر دیا تھا اور جس نے اسلام کو عالمی طاقت عطا کر دی تھی۔ پھر کتاب تاریخ کا ایک ورق الٹتا ہے اور ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ تاتاریوں کے حملے کے وقت یہ عالمی طاقت اندر سے کرم خوردہ ہو چکی تھی اور شکست کھا رہی تھی؛ لیکن ایک مرتبہ پھر دعوت کا کام سامنے آیا جس نے پانسہ پلٹ دیا اور جو مسلمانوں کے فاتح تھے وہ اسلام کے مفتوح بن گئے اور عزت وحکمرانی کا قرعہ فال پھر سے مسلمانوں کے نام پڑا۔ اب تاریخ نے پھر ایک اور ورق الٹا ہے اور اکیسویں صدی کی سال نو کی پہلی گردش مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ایک مسلمان ملک پر جس نے اپنے یہاں اسلامی نظام بھی قائم کر رکھا تھا کارپٹ بمباری شروع ہو گئی۔ کھلے آسمان سے نہتھے باشندوں پر انتہائی طاقتور بم برسائے گئے، گیارہ ستمبر کے واقعہ کا کوئی ثبوت امریکہ افغانستان کے خلاف فراہم نہ کر سکا، جرم بے گناہی کا انتقام ایک مسلمان ملک سے لیا گیا اور تمام مسلم حکومتیں اس کے رقص بسمل کا تماشہ دیکھتی رہیں اور امریکی موقف کی حمایت کرتی رہیں۔

ایران کی تاریخ میں ایک بادشاہ ہوا کرتا تھا، جس کا نام آریہ مہر تھا اس کے خوف سے رعایا کانپتی تھی، وہ ایک مرتبہ اپنے تیروں سے نشانہ لگانے کی مشق کر رہا تھا، اس نے ایک معصوم خوبصورت بچہ کو اپنے تیر کا نشانہ بنا دیا، بچہ تیر کھا کر گرا اور کچھ دیر خاک وخون میں تڑپتا رہا اور بالآخر مر گیا، بچہ کے باپ نے دربار میں حاضر ہو کر اس ظالم بادشاہ کو بہترین نشانہ بازی اور تیر اندازی پر مبارکباد پیش کی۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے، آریہ مہر کی جگہ پر اب گویا جارج بش جلوہ افروز ہے اور وہ خوبصورت بچہ جسے تیر اندازی کا نشانہ بنایا گیا افغانستان کا ملک ہے اور تمام اسلامی ملک اس بچہ کے باپ بھائی اور رشتے دار ہیں، جو ظالم جارج بش کے اب حلیف ہم نوا اور ہم آواز ہو چکے ہیں۔ بش کی زبان پر صلیبی جنگ کا لفظ آچکا ہے اور جو مسلمانوں کے مقابلے میں اسرائیل کا مکمل طور پر طرفدار ہے اور جس نے افغانستان پر حملہ کر کے عدل وانصاف کے مسلمہ اُصولوں کی خلاف ورزی کی ہے۔ یہ معلوم ہے کہ ان مسلم ملکوں نے جنھوں نے پہلے افغانستان کو قبول کر لیا تھا، امریکہ کے اشارہ پر اس کشتہ ستم ملک سے اپنے تعلقات منقطع کر لئے، گویا مسلمان مسکنت ضعف اور زبونی میں تقریباً اسی حالت میں پہنچ گئے ہیں جس میں وہ تاتاریوں کے حملے کے وقت تھے، عالم اسلام بیچارہ عالمی طاقتوں کے لئے نرم چارہ ہے۔

تاریخ کے اس نئے موڑ پر نئے سرے سے دعوت کے لئے کھڑا ہونا اسلام کے علمبرداروں کا وظیفہ حیات ہونا چاہئے، ماضی میں اسی دعوت کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے عزت عطا کی تھی، خدا کا دین دعوت کو مستلزم ہے، خدا کے بندوں تک خدا کی ہدایت کو پہنچانا خدا کی طرف سے اُمتِ مسلمہ پر فرض ہو چکا ہے، اسی لئے اسے خدا کی طرف سے خیر اُمت کا لقب عطا کیا گیا ہے۔ اس فریضہ کے ادا کرنے میں جب بھی کوتاہی ہوئی ہے اس کوتاہی (Negligence of Duty) کی سزا اُمتِ مسلمہ کو ضرور ملی ہے اور آج بھی یہ سزا مسجد کو مسمار کرنے والی پارٹی کے عروج کی شکل میں، عالم اسلام میں مقامات مقدسہ کے ہاتھ سے نکل جانے کی صورت میں اور افغانستان کی تباہی اور بربادی کے پس منظر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ گزشتہ ایک صدی میں امریکا اور یورپ میں مسلمان اگر دعوت کے لئے کھڑے ہوتے اور وہاں کے تمام باشندوں کو اپنی دعوت کا نشانہ بناتے اور پھر اس دعوت کا حق ادا کر دیتے تو کیا صورت حال آج یہی ہوتی جو اس وقت ہے۔ زیادہ قرین قیاس بات یہ ہے کہ ان ملکوں میں مسلمانوں کی اتنی بڑی عددی قوت ہوتی کہ ان سے صرف نظر کرنا وہاں کی حکومتوں کے لئے ممکن نہ ہوتا، وہاں خارجہ پالیسی بنانے والوں کو مسلمانوں کے چشم وابرو کو دیکھنا پڑتا اور پھر فلسطین اور افغانستان کی تاریخ وہ نہ ہوتی جو آج ہے۔

امریکہ اور یورپ کے ملکوں میں دعوت کے کام میں وہ دشواریاں بھی نہیں ہیں، جو ہندوستان میں نظر آتی ہیں، وہاں دعوت کے لئے فضا جتنی ساز گار ہے شاید اور کہیں نہ ہو، صرف ایک ہی دشواری ہے اور وہ ہر جگہ ہے، دعوتی جذبہ کا فقدان۔ اب اس وقت مسلمانوں کی عزت نفس کے بحران سے نکالنے کے لئے اور دنیا کو اخلاقی بلندی کی تہذیب سے ہمکنار کرنے کے لئے اور خیر اُمت کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہر جگہ مسلمانوں کی تنظیموں، جماعتوں اور اشخاص کو دعوت کا کام انجام دینا ہوگا کہ یہی کام درد کا درماں زخم کا مرہم اور داروئے شفاء ہے۔ مسلمانوں نے دعوت کے کام کو چھوڑ کر کے اخروی نقصان کے علاوہ دنیوی نکبت اور ناسازگاری کو بھی دعوت دی ہے، ہمیں اگر انسانیت کی عاقبت بخیر ہونے کی فکر نہ ہو جس کا ہمیں مکلّف بنایا گیا تھا تو پھر خدائے بزرگ و برتر ہم پر کیوں مہربان ہو، اور ہم کیوں یہ اُمید کریں کہ ہمیں کسی منظر خوش رنگ کا دیکھنا اور نغمہ خوش آہنگ کا سننا نصیب ہوگا۔ ہم کیوں اپنی دُعاؤں کے بے اثر اور مناجاتوں کے غیر معتبر ہونے کی شکایت کریں، حقیقت یہ ہے کہ ہم خود پوری انسانیت پر بیداد کرتے ہیں، ستم ایجاد کرتے ہیں اور جب سزا ملتی ہے تو نالہ وفریاد کرتے ہیں۔

ہم الزام ان کو دیتے ہیں قصور اپنا نکل آیا

دین ودعوت سے ہمارے سررشتہ فکر کے انقطاع پر اتنا عرصہ گذر چکا ہے کہ حادثات عالم کی مذکورہ توجیہ پر لوگ تصویر حیرت بنے منہ دیکھتے ہیں اور ان پر ایک عالم تحیر طاری ہو جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں آج بھی لوگ اسلام قبول کرتے ہیں ۱۱ ر ستمبر کے واقعہ کے بعد بھی لوگوں نے بڑی تعداد میں امریکہ میں اسلام قبول کیا ہے؛ لیکن یہ امریکی باشندوں کا اپنا جستجو اور شوق تجسس ہے جو ان کو اسلام کے آغوش رحمت میں پہنچاتا ہے، اس میں دعوت کے کام کا دخل بہت کم ہے۔ ابھی حال میں امریکہ میں ایک اسلامی سنٹر کے رہنما ایک ندوی عالم نے جارج بش سے مل کر ان کو قرآن کریم کا ترجمہ پیش کیا ہے، عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان شکوک وشبہات کو دور کرنے کی جو کوششیں اس وقت شروع ہوئی ہیں وہ صحیح اور اُمید افزا ہیں۔

عالمی حادثات کے اسباب کا اسلامی نقطۂ نظر سے اگر تجزیہ کیا جائے تو دو سبب سب سے زیادہ اہم نظر آئیں گے، ایک اُمت مسلمہ کا دعوت سے روگرداں ہونا، دوسرے مسلمانوں کی اجتماعی طاقتوں کا اس قوت مرہبہ کے حصول میں سہل انگاری برتنا، جس کا قرآن میں صراحت کے ساتھ حکم دیا گیا ہے۔

عرب ملکوں کو اللہ نے پٹرول کی دولت بخشی تھی، اس کا مصرف یہ نہیں تھا کہ سامان تعیش کو باہر سے درآمد کیا جائے؛ بلکہ اس کا مصرف یہ تھا کہ خارجی محاذ پر دعوت کے کام کو مضبوط کیا جائے اور داخلی محاذ پر قوت مرہبہ (ترهبون به عدو الله وعدوكم) کے حصول کے لئے ٹکنالوجی حاصل کی جائے۔ دنیا کے نقشہ پر بے شمار اسلامی حکومتیں ہیں، ان حکومتوں میں ہر طرح کی وزارتیں ہیں، ڈاک وتار، پٹرول، زراعت وغیرہ، نہیں ہے تو دعوت کے کام کے لئے کوئی وزارت۔ چوں کہ عالم اسلام میں دعوت اور حصولِ قوت دونوں اعتبار سے قرآن کے حکم کی خلاف ورزی کی گئی، اس لئے اس کی سرزنش ہے جو اس وقت مسلمانوں کو کی گئی ہے؛ تاکہ ان کو ہوش آئے اور وہ غفلت سے بیدار ہوں۔ جمال الدین افغانی مغرب کی سیاسی اور مادی طاقت کو عالم اسلام کی غلامی کا پیش خیمہ سمجھتے تھے اور عالم اسلام کی سیاسی اور مادی کمزوری کی وجہ ان کے نزدیک جدید علوم میں اس کی پس ماندگی ہے، جمال الدین افغانی کی رائے صائب ہے، اس رائے میں دعوت کے مشن کا اضافہ کر لیجئے تو بات قرآنی تعلیمات کے زیادہ مطابق بن جائے گی، گویا اللہ کے دین کی طرف دعوت اور سائنس، صنعت اور ٹکنالوجی کا حصول (جو آیت خلافت کے مضمرات میں ہے) یہ دو پہیے ہیں جن کے ذریعہ

شاہ راہ ترقی پر مسلمان اپنا سفر شروع کر سکتے ہیں۔ اول الذکر مسلمانوں کا خارجی محاذ ہے اور مؤخر الذکر عالم اسلام کا داخلی محاذ۔ گویا اس دور میں نئے سرے سے علمی اور دعوتی نشاۃ ثانیہ کی ضرورت ہے اگر ایسا نہ ہوسکا تو افغانستان کا المیہ آخری المیہ نہ ہوگا۔ جدید علوم کو مدرسی علوم کا حریف سمجھنا مہلک غلطی ہے، دینی علوم کو اگر صدارت کا مقام حاصل ہے تو جدید علوم صدر یا بادشاہ کے لئے وزیر کا یا دست و بازو کا حکم رکھتے ہیں، دینی علوم کو اگر روح کی حیثیت حاصل ہے تو جدید علوم کو جسم کی حیثیت حاصل ہے، دونوں میں کوئی رقابت نہیں اور عظمت اسلام کو ان دونوں کی ضرورت ہے۔ تاریخ میں مسلمانوں کی صدیوں تک سیاسی سلطنت ان کی عقلی اور علمی سلطنت کے دوش پر قائم رہی تھی، دین کا علم مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا، مسلمانوں نے دنیا کے علوم سے استفادہ کیا اور پھر اس کی قیادت کی۔

دعوت کا کام بھی کوئی مصنوعی انداز کا کام نہیں ہے یہ انسانیت کی نجات کا غم ہے جو انبیاء کرام کی میراث ہے، اس آتش غم کی حرارتیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں نظر آتی ہیں ایک واقعہ مثال کے طور پر یہ ہے:

روی أن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ لما قدم الشام اتاہ راہب شیخ کبیر علیہ سواد فلما رآہ عمر بکی فقیل لہ ما یبکیک یا امیر المومنین انہ نصرانی فقال ذکرت قول اللہ عز وجل: ''عاملۃ ناصبۃ تصلی ناراً حامیۃ'' فبکیت رحمۃ علیہ۔

> بیان کیا گیا کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام تشریف لائے، ان سے ملاقات کے لئے بوڑھا عیسائی راہب آیا جس پر سیاہی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بوڑھے راہب کو دیکھا تو رونے لگے، ان سے پوچھا گیا یہ عیسائی ہے، آپ اسے دیکھ کر کیوں روئے، آپ نے فرمایا کہ مجھے قرآن میں اللہ کی بات یاد آگئی ''قیامت میں بعض چہرے درماندہ پریشان حال ہوں گے، آتش جہنم کی لپٹ پہنچ رہی ہوگی'' شفقت و غم کی شدت سے میں آنسو ضبط نہیں کر سکا۔

ہندوستان کی سطح پر دعوت اسلام کا کام کس طرح ممکن ہے اور اس کے لئے کون سے طریقے اختیار کئے جائیں اور یہاں کے باشندوں کو دعوت توحید کا مخاطب کس طرح بنایا جائے اس کے لئے مذاکرہ کی ضرورت ہے، شاید اس کام کو روشن خیالی اور دانشوری کے مغایر سمجھا گیا ہے۔ اس

لئے اعلیٰ سطح پر کبھی کسی سیمینار کی ضرورت نہیں سمجھی گئی یا اسے خلاف مصلحت سمجھا گیا۔ سوال یہ ہے کہ اس موضوع پر اگر سکوت اختیار کیا جائے تو اُمت کی رہبری کیسے ہو سکے گی؟ دعوت کا ایک طریقہ تو لٹریچر کا ہے اور اقامت دین کے داعیوں کو غالباً اس میدان میں اولیت کا مقام حاصل ہے، ظاہر ہے یہ علم وفن کا عہد ہے اور جدید ذہن کے لئے دلیل کی قوت بڑی اہمیت رکھتی ہے، اس لئے مختلف زبانوں میں عقلی طور پر مطمئن کرنے والے لٹریچر کی ضرورت ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ دعوت کا کام کرنے والوں کو یہ حقیقت بھی مدنظر رکھنی چاہئے کہ اس ملک کی غالب اکثریت ناخواندہ ہے اور وہ روایت پرستی اور توہم پرستی کا شکار ہے، پڑھنا لکھنا جاننے والے بھی بہت کم کوئی کتاب پڑھتے ہیں، سماج اخلاقی گراوٹ کی آخری منزل تک پہنچ گیا ہے، دولت کی حرص دنیا کی طلب اور ناانصافی پھیل چکی ہے۔ ایسے سماج میں صرف عقل وخرد اور کتاب کے دوش ناتواں پر دعوت کا بار نہیں ڈالا جاسکتا ہے، یہاں ہر علاقہ میں ایسے رجال کار کی ضرورت ہے جو روحانیت کی روشنی، قوت باطنی اور خدمت واخلاق کی خصوصیات میں مقامی باشندوں سے ہزار گنا ممتاز ہوں اور اپنے امتیاز کی وجہ سے مرجع خاص وعام بن چکے ہوں، ان کی شخصیت میں مقناطیس کی کشش ہو۔ ایسے افراد کا دعوتی ذہن ملک میں انقلاب لاسکتا ہے، یہاں بڑے پیمانہ پر دعوتی کام کے لئے نقوش سے زیادہ نفوس کی ضرورت ہوگی اور نقوش قلم سے زیادہ قدم کی جولانی درکار ہوگی، دعوت کا ہمہ گیر اور عوامی کام صرف نوشتہ قرطاس سے نہ پہلے کبھی یہاں ہوا اور نہ آئندہ ہوگا؛ کیوں کہ روحانی شخصیتوں سے اثر پذیری یہاں کے خمیر میں داخل ہے۔

اس ملک میں دعوت کا کام کرنے والوں کو خود اس ملک کی تاریخ سے سبق لینے کی ضرورت ہے، اس بات پر غور کرنا چاہئے، اس میدان میں جن شخصیتوں کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی وہ کن خصوصیات کے لوگ تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب جہانگیر نے شیخ احمد سرہندی کو گوالیار کی قید میں ڈال دیا تو ان کے روحانی فیوض اور صحبت کی تاثیر سے غیر مسلموں نے اسلام قبول کرلیا تھا، اس یوسف زندانی نے اپنی اسیری کے زمانہ میں عبادت اور ریاضت اور زاہدانہ سیرت کا کیسا زبردست اثر ڈالا۔ سید احمد شہید بریلویؒ کے ہاتھ پر بیعت تو لاکھوں مسلمانوں کی تھی؛ لیکن جن لوگوں نے اسلام قبول کرلیا تھا، ان کی تعداد چالیس ہزار ہے۔ اسی طرح سے بہت سے صوفیائے کرام نے یہاں اقلیم دل کو فتح کیا۔ دعوت کے بے شمار طریقے ہوں گے؛ لیکن ان طریقوں کو بھی دہرانے کی ضرورت ہے، جن کا ماضی میں کامیاب تجربہ کیا جاچکا ہے؛ لیکن اس کے لئے پہلے توبہ اور تیاری اور

روحانی بیداری کی ضرورت ہے، اس خاص پہلو پر زور دینے سے یہ غرض نہیں کہ دوسرے میدانوں میں دعوت کا جو کام انجام دیا گیا یا دیا جارہا ہے وہ غیر اہم ہے۔ خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ حصول علم کے ساتھ دعوت کا کام ہی وہ کام ہے جو کلمۃ اللہ کو بلند کرسکتا ہے اور آج کے محتاج کو کل کا صاحب تاج بنا سکتا ہے، تہذیب کی عالمی کشمکش میں ہر صاحب شعور مسلمان کو اپنا دعوتی رول ادا کرنا ہے، اصل قوت وقدرت وعزت اللہ کو حاصل ہے۔

مولانا محمد کلیم صدیقی (کثر اللہ امثالہ) کو اللہ تعالیٰ نے دعوت کا درد شعور اور جذبہ عطا کیا ہے اور اس کام کے لئے اللہ نے انھیں شرح صدر عطا فرمایا ہے۔ پھر انھوں نے صرف لٹریچر پر اعتماد نہیں کیا، وہ ہر غیر مسلم سے دعوتی گفتگو کے لئے تیار رہتے ہیں، وہ تعلیم یافتہ ہو یا غیر تعلیم یافتہ، وہ انفرادی ملاقاتیں کرتے ہیں اور دردمندی کے ساتھ دین کی دعوت دیتے ہیں، ایک بڑی تعداد نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے۔ انھیں برصغیر کی مہتم بالشان برگزیدہ شخصیتوں کا مکمل اعتماد بھی حاصل رہا ہے، رائے بریلی میں تکیہ شاہ علم اللہ کی مسجد میں نماز جمعہ کے بعد مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ان کے لئے باآواز دُعاء فرماتے ''اے اللہ کلیم صدیقی کے مشن کو کامیاب فرما'' مہاجر مدینہ مولانا عاشق الٰہی بلند شہریؒ ان پر اعتماد کرتے اور ان کے لئے بلند الفاظ فرماتے اور ان کے لئے دُعا گو رہتے، ایسی اہم شخصیتوں کا جسے اعتماد حاصل ہو اور جو بلند نسبت کا حامل ہو اور بقول حسرت موہانی:

نگاہ ناز جسے آشنائے راز کرے
وہ کیوں نہ خوبیٔ قسمت پہ اپنی ناز کرے

مولانا کلیم صدیقی کا کلام عشق کے دردمند کا طرز کلام ہے، یہ نالۂ طائر بام ہے اور طائر زیر دام کے نالوں سے مختلف ہے اسے سننے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہے کہ یہی زخم کا مرہم اور زہر کا تریاق ہے۔

(مقدمہ کتاب شائع کردہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی، پھلت، میرٹھ)

☆☆☆☆

’’فقہی اختلاف اور شاہ ولی اللہ دہلوی کا موقف‘‘

اس دور میں آلام و مصائب بے شمار ہیں؛ لیکن ام المصائب یہ ہے کہ مسلمانوں کی وحدت کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے، حرم کی پاسبانی کے لئے ہند کے ساحل سے لے کرتا بخاک کاشغر جنھیں متحد ہونا چاہئے تھا وہ باہم دست بگریباں ہیں۔ بعض اہل دین اور بعض مفتیان شرع متین بھی اپنی کم فہمی اور بے بصیرتی کی وجہ سے باہم برسر پیکار ہیں، فروعی مسائل میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ اسی لئے اقبال کو کہنا پڑا، ’’دین ملافی سبیل اللہ فساد‘‘ حالاں کہ اتحاد کا حکم منصوص ہے اور قرآن وسنت سے براہ راست ماخوذ ہے؛ لیکن یہی وہ حکم ہے جو سب سے زیادہ پامال ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر طرف زوال کے سائے ہیں، غنچہ اُمید کہیں شگفتہ نہیں، سر کہیں سلامت نہیں، دنیا میں کہیں آبرومندی نہیں ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت تاریخ اسلام کے ان برگزیدہ مصلحین اور مجددین کے زریں سلسلے میں ایک امتیاز خاص رکھتی ہے کہ انھوں نے اس اُمت میں افتراق اور انتشار کو دور کرنے کی عالمانہ کوشش کی۔ فقہی اختلافات کے اسباب پر دروں بینی اور ژرف نگاہی کے ساتھ نظر ڈالی اور بصیرت کے موتی چنے، حکمت کے لعل و گہر کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کردیا؛ تاکہ آئندہ آنے والی نسلیں انھیں حرز جاں بنائیں اور ملت اسلامیہ باہم ایک دوسرے سے وابستہ پیوستہ ایک دوسرے کی غم خوار اور غمگسار بن جائے، سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ناقابل شکست، ناقابل عبور، ناقابل انہدام۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ان تعلیمات کو عام کرنے کی جتنی ضرورت اب ہے، اتنی شاید کبھی نہ تھی تاکہ مسلمانوں کے درمیان باہمی اعتماد واتحاد باہمی اکرام واحترام اور باہمی رواداری اور خیر سگالی کی فضا پیدا ہو۔ بریلویت دیوبندیت، تقلید اور عدم تقلید کے جھگڑے ختم ہوں اور اُمت کلمۂ واحدہ کی بنیاد پر متحد ہو جائے، بحر حالات کی موج اس قدر تند و تیز ہے اور عالمی سطح پر وہ شور رست دخیز ہے کہ مسلمانوں کے وجود کا سفینہ گرداب ہلاکت میں پھنسا ہوا ہے۔ اس وقت نہ صرف

ائمہ اربعہ کے متبعین کی صفوں میں اتحاد کی ضرورت ہے ؛ بلکہ شیعہ سنی اختلافات کو بھی لپیٹ دینے کی ضرورت ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی نیست و نابود کرنا ناممکن ہے۔ اقبال کا پیغام تھا" اے گرفتار ابوبکر و علی ہوشیار باش"، اہل سنت کو فقہ جعفری کا احترام کرنا چاہئے اور شیعہ حضرات کو صحابہ کے خلاف تبرا سے دست کش ہو جانا چاہئے کہ یہ دنیا اور آخرت دونوں کے لئے نقصان کا سودا ہے۔ بہت سے اہل سنت کو نہیں معلوم شیعہ حضرات میں ایک تعداد ایسے معقول و معتدل حضرات کی بھی ہے جو تبرا کو غیر شریفانہ کام سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک صحابہ کرام ﷺ کو مذموم قرار دینے کا مطلب ایک کامیاب ترین پیغمبر کو ناکام ترین پیغمبر ثابت کرنا ہے۔ اس طرح ذم صحابہ ذم پیغمبر بن جاتا ہے۔ یمن کے زیدی شیعہ حضرات صرف تفضیل علی کے قائل ہیں، ظاہر ہے کہ کسی کو بھی اس بات پر جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں۔

اس کتاب کی تصنیف کا مقصد مصنف کتاب ڈاکٹر فہیم اختر ندوی کی ذیل کی اس تحریر سے واضح ہے:

> فقہی اختلاف کا موضوع اُمت کی صفوں میں اتحاد یا انتشار کے تعلق سے ایک اہم موضوع ہے اور اس کی اہمیت موجودہ وقت میں اور بڑھ گئی ہے۔ دوسری جانب حضرت شاہ صاحبؒ کی شخصیت تمام اہالیان ہند کے لئے قابل احترام ہی نہیں ؛ بلکہ مرکز اتحاد بھی ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے فقہی اختلاف کے تعلق سے جو معتدل موقف پیش کیا ہے اور اختلاف آراء کے بارے میں صحابہ کرام ﷺ اور اسلاف عظام کی روادارانہ روش پیش کر کے صحیح اسلامی تصور کو نمایاں کیا ہے۔ اگر وہ مکمل طور پر اور صحیح انداز سے سامنے آئے تو فقہی اختلاف وجہ انتشار نہیں باعث رحمت بن جائے۔ میں نے اسی احساس کے تحت شاہ صاحب کی مختلف تحریروں سے پھول چن کر یہ گلستان سجایا ہے کہ اس کی بھینی خوشبو اُمت کے مشام جان کو معطر کر کے انھیں صحیح اسلامی راہ پر چلائے۔

مصنف کتاب اس ادارہ کے تعلیم یافتہ ہیں، جس نے اصلاح نصاب اور عربی زبان کو زندہ زبان کی حیثیت سے پڑھانے کے ساتھ ساتھ اُمت کے اتحاد کی تحریک شروع کی تھی اور باہمی افتراق و انتشار اور مناظرہ بازی کی مخالفت کی تھی، خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کے مدارس نے

بتدریج ندوۃ العلماء کے پیغام کو بحیثیت مجموعی قبول کرلیا ہے۔ اتحاد ملت کے موضوع پر حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کے حوالہ سے یہ کتاب اسی قابل احترام ادارہ کے ایک نوجوان فاضل کے قلم سے نکلی ہے۔ میدان تصنیف میں نووارد ہونے کے باوجود قلم میں پختگی اور شگفتگی ہے، وہ اُردو کے ساتھ عربی میں بھی مضامین لکھتے ہیں، اُمید ہے کہ ان کے قلم سے اور بھی مفید مؤثر کتابیں منظر عام پر آئیں گی، ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے۔ کتاب پر مقدمہ اور پیش لفظ مولانا محمد رابع حسنی، مولانا عتیق احمد بستوی اور مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کا ہے، جس نے کتاب کے وزن ووقار میں اضافہ کیا ہے۔

علمی سطح پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے مسلمانوں کو باہمی اتحاد کا جو پیغام دیا اس کے بڑے پیمانہ پر اشاعت کی ضرورت ہے۔ اسی کے ساتھ اصلاحِ معاشرہ کی تحریک چلانے والوں کو بھی چاہئے کہ عوامی سطح پر باہمی اتحاد واتفاق پر زور دیں اور فروعی مسائل میں اُلجھنے سے روکیں۔ مسلمان خواہ کہیں ہوں اور کسی مسلک کے پیرو ہوں ان کی یہ آرزو ضرور ہوتی ہے کہ مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو؛ لیکن وصال یار فقط آرزو کی بات نہیں، اس کے لئے کچھ اسلامی اخلاق وآداب اور صفات سے متصف ہونا پڑتا ہے اور ان کے بغیر پوری ملت اسلامیہ میں تو درکنار کسی خاندان اور جماعت اور ادارے میں بھی اتحاد پیدا نہیں ہوسکتا ہے اور وہ صفات یہ ہیں:

۱- ہر مسلمان کے ساتھ عفو ودرگذر اور رواداری اور تحمل کا معاملہ کرنا۔

۲- ہر مسلمان کے ساتھ ایثار وقربانی کا معاملہ کرنا اور اس کے فائدہ کو اپنے فائدہ پر ترجیح دینا۔

۳- اکرام مسلم۔

۴- مردہ گوشت کھانے یعنی غیبت کرنے سے اور شخصی تنقید سے مکمل پرہیز۔

اتحاد دراصل ان ہی خصوصیات اور خوبیوں کے مجموعے یا حاصل ضرب کا نام ہے، ان صفات کے بغیر اتحاد نہیں پیدا ہوتا ہے، ان خوبیوں کو اور ان کی روشنی اور خوشبو کو پھیلانے اور معاشرے کو ان سے منور اور معطر کرنے کی ضرورت ہے۔ بعض اشخاص کا یہ مزاج بن جاتا ہے کہ جس مجلس میں وہ بیٹھ جاتے ہیں دو چار کی غیبت کرکے ہی اُٹھتے ہیں، ان کی زبان جب بھی کھلتی ہے ذاتی اور شخصی تنقید ہی پر کھلتی ہے اور وہ بھی سامنے نہیں؛ بلکہ پیٹھ کے پیچھے، مردہ بھائی کے گوشت کا ذائقہ انھیں اس قدر پسند ہے کہ بریانی، کباب اور پراٹھے کی لذت اس کے سامنے ہیچ ہے۔ ایسے

بگڑے ہوئے ناتربیت یافتہ لوگوں کو سمجھانے کی ضرورت ہے اور اگر سمجھانے بجھانے سے بھی وہ باز نہ آئیں تو پھر ان کا مقاطعہ کرنا چاہیئے، ''الحب فی اللہ'' کے ساتھ ''البغض فی اللہ'' کی بھی اہمیت ہے اور اس صفت سے متصف لوگ قیامت کے دن عرش کے سایہ میں ہوں گے جب کہ کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا۔

کاش مسلمان جزوی فروعی اختلافات کو بالائے طاق رکھ دیں اور ایک دوسرے کے حامی اور مددگار بن جائیں، ابھی ان کے بال و پر غبار آلودۂ اختلافات ہیں، انھیں چاہئے کہ مرغ حرم بن کر پرفشاں ہوجائیں، مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کرلیں، حلقہ یاراں میں یعنی مسلمانوں کے درمیان بریشم کی طرح نرم ہوں، شبستان محبت میں حریرو پرنیاں بن جائیں اور گلستان راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں بن جائیں۔

☆☆☆☆
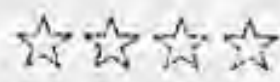
عربی اور اسلامی علوم وفنون کے گلاب عجم کے لالہ زاروں میں

خاور مشرق جب طلوع ہوتا ہے تو اس کی ابتدائی کرنیں آس پاس کے مطلع کو روشن کرتی ہیں؛ لیکن جب وہ نصف النہار کو پہنچتا ہے تو عالم کے شش جہات کو منور کردیتا ہے۔ اسلام کا سورج فاران کی پہاڑیوں سے نمودار ہوا اور ایران کے دشت ودریا وکوہ وبیابان اس سے چمک اٹھے، عربی اور اسلامی علوم وفنون کے خوش رنگ وخوشبودار پھول جب خیابان ایران میں کھلے تو پورا عالم اسلام اس سے مہک اُٹھا، علوم اسلامیہ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس میں بلاد فارس کے علماء نے اپنی برتری، بلند نظری اور دیدہ وری نہ ثابت کردی ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ''لو کان العلم عند الثریاء لتناوله علماء من الفرس'' تاریخ سے آپ کی اس پیشین گوئی کی پورے طور پر تصدیق اور توثیق ہوتی ہے۔ اسلام کے اس سیل سبک سیر وزمین گیر نے ایران کے کشت زاروں کو

زرخیز وگل ریز بنادیا اور پھر وسط ایشیاء اور ایران سے جو اسلامی علوم وثقافت اور تمدن کا بادل اٹھا اس نے ہندوستان کو یعنی پورے برصغیر کو صحیح معنوں میں جنت نشاں بنادیا۔ اسلامی علوم کے پھیلاؤ کی یہ داستان لذیز تر بھی ہے اور دراز تر بھی ہے، جرس غنچہ کی صدا پر نسیم چلتی ہے اور قافلہ نو بہار ہے کہ ٹھہرنے کا نام نہیں لیتا ہے، وہ حدود وثغور سے مستغنیٰ ہے اور زبان ومکان کی قید سے آزاد ہے، اسلامی تہذیب وثقافت کا قلم پہلے صحرائے عرب کے متصل علاقوں میں لگایا گیا، پھر قلم سے قلم لگائے جاتے رہے، اس طرح سے وسط ایشیاء ایران ماوراء النہر وخراسان، افریقہ، یورپ اور برصغیر کے ملکوں میں اسلامی علوم کے بہت سے چمنستان آباد ہوگئے، عرب دنیا سے باہر عربی واسلامی علوم کی بے پایاں اور بے حساب تصنیفات کا ذخیرہ جو تیار ہوا اس کی گراں مائیگی اور اس کی بیش قیمتی سب کے لئے حیرت افزا اور تعجب انگیز ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام کا ابر کرم دنیا کے چپے چپے پر برسا اور بقدر استعداد ہر خطہ نے اس سے فیض پایا اور یہ ابر کرم برستا رہے گا اور جہاں میں اہل ایمان صورت خورشید جیتے رہیں گے اور کسی نہ کسی دیار سے یہ خورشید طلوع ہوتا رہے گا۔ اسلامی علوم کا دھارا ہمیشہ بہتا رہے گا، کبھی یہ دھارا بہت نمایاں ہوگا اور کبھی زیر آب، کتاب وسنت کی شمع روشن رہے گی اور پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا۔

فکر اسلامی ایک تسلسل کا نام ہے، عربی واسلامی علوم وفنون اور ادبیات کی روایات جب وسط ایشیاء ماوراء النہر اور ایران میں برومند ہوئیں تو پھر اس روایت سے روایت کا سلسلہ چل پڑا اور اس کے اثرات دنیا کی دوسری زبانوں پر پڑے۔ ہندوستان میں فارسی پھر اُردو زبان اس گل ریزی سے بار آور ہوئی اور اسلامی علوم وادبیات کا ایسا شاندار کتب خانہ وجود میں آیا کہ اس کی مثال عربی اور فارسی زبان کے علاوہ کہیں نہیں ملتی ہے۔

ہمایوں کی، ایران میں ۱۵ سالہ جلاوطنی کے بعد، ہندوستان میں فاتحانہ واپسی نے ہندوستان اور ایران کے درمیان گہرے علمی وثقافتی وتمدنی روابط پیدا کردیئے، اس ثقافتی رابطے نے ہندوستان کی علمی فضا کو خوش حال، خوش جمال اور مالا مال کردیا۔ ایران کا عظیم الشان اسلامی علوم کا ذخیرہ استفادہ کے لئے موجود نہ ہوتا تو ہندوستان میں اُردو زبان کا یہ عظیم الشان لٹریچر بھی وجود میں نہ آتا اور نہ یہاں اتنے جلیل القدر اور نادرہ روزگار علماء وادباء پیدا ہوتے اور نہ قرآنی علوم، حدیث و فقہ، لغت ومعجم، تصوف وتاریخ پر قابل فخر اور گراں قدر کتابیں تصنیف کی جاتیں۔ گویا ایران کی سرزمین پر اسلامی علوم کا جو چمن زار کھلا اس کا براہ راست فائدہ ہندوستان کو حاصل ہوا اور بعد میں

ہندوستان کے علماء نے حجاز ویمن کے اساتذہ سے براہ راست بھی استفادہ کیا۔ لیکن اس بیان میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ہندوستان میں علوم اسلامیہ کا سرچشمہ فیض وہ علمی روایت رہی ہے جو بلاد فارس کی زمین میں پروان چڑھی اور اُردو زبان کی ہمہ گیر علمی خدمات اس روایت کی مرہون منت ہیں۔ ہندوستان کے علماء کو ایرانی علماء اور مصنفین سے براہ راست استفادہ کا موقع اس لئے بھی زیادہ ملا کہ جب منگولوں نے ایران، خراساں اور وسط ایشیاء کی سرزمینوں کو خون مسلم سے رنگین کرڈالا تو وہاں سے اہل علم کے قافلے دہلی سلطنت کے زمانے میں ہجرت کرکے ہندوستان آنے لگے، کیوں کہ یہاں ان کے ہم مذہب لوگوں کی حکومت تھی، بعد میں مغلیہ دور میں ہندوستان اور ایران کے روابط میں مزید اضافے ہوئے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے ۲۱ سال بعد مشہور جنگ پیش آئی، جسے فتح الفتوح کا نام دیا جاتا ہے اور جو نہاوند کے مقام پر پیش آئی تھی، ایرانیوں کے آخری بادشاہ یزدگرد سوم نے اس جنگ میں شکست کھائی تھی اور ایرانی شہنشاہیت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا تھا۔ پھر عربی زبان ایران میں پھیل گئی، ایرانی مسلمان ہوگئے، عربوں کا ایران پر سیاسی غلبہ دینی غلبہ سے بدل گیا، پھر وہاں عربی علوم وفنون کو اتنا فروغ ہوا کہ فارسی زبان پس پشت چلی گئی۔ عربی زبان تصنیف و تالیف اور ادب وشاعری کی زبان بن گئی، قدیم فارسی میں عربی واسلامی اصطلاحات اس کثرت سے داخل ہوگئیں گویا کہ پوری زبان مشرف بہ اسلام ہوگئی؛ لیکن اسی کے ساتھ ایرانیوں نے اپنے تمدن اور افکار سے عربوں کو متاثر کیا اور اس طرح عربی زبان ایرانی تہذیب وافکار کی آئینہ دار بھی بن گئی۔ بلاد عجم میں عربی زبان وادب کے ایسے ایسے اسکالر پیدا ہوئے کہ وہ خالص عرب فضلاء سے آنکھیں ملاتے؛ بلکہ ان پر فوقیت لے جاتے، ان کے اسی فضل وکمال کی وجہ سے عباسی دور حکومت کے زمانہ میں ان کو وزارت کی کرسیاں دی گئیں اور وہ حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز ہوتے تھے اور علوم وحکمت کی زمام ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔

ایرانیوں کی وسیع اور عمیق خدمات کا تقاضا تھا کہ ان کے بارے میں ایک مستقل سیمینار منعقد کیا جاتا، راقم السطور جب شعبہ مطالعات عربی، انگلش اینڈ فارن لنگویجز یونیورسٹی میں صدر تھا تو اس نے یہ سیمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اس سیمینار میں ملک کی جامعات سے اور بیرون ہند سے مندوبین آئے تھے۔ زیادہ تر مقالات میں کسی ایک شخصیت کی خدمات کا جائزہ ہوتا جس نے تاریخ میں اسلامی علوم کے چراغ روشن کئے تھے، تاہم چند مقالات ایسے تھے جن میں ایران کی

مجموعی خدمات کا جائزہ تھا، ان مقالوں میں سے تین منتخب مقالے اصحاب علم و دانش کی خدمت میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ ایک مقالہ پروفیسر محمد اجتباء ندوی صاحب کا ہے، جو ہندوستان کی معروف اور موقر شخصیت ہیں، دوسرا مقالہ جناب علی قلی قرائی کا ہے، ان کے مقالے سے ان کی علمی کاوش و محنت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، تیسرا مقالہ ڈاکٹر مظفر عالم کا ہے جو اسی یونیورسٹی میں لکچرار ہیں اور ہندوستان کے موقر علمی مجلّات میں ان کے مضامین عربی اُردو اور انگریزی میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ یہ مقالے ایران کی مجموعی خدمات پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہیں اور ان سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ اسلامی علوم کی ترقی میں ایران کا کتنا بڑا حصہ ہے اور اس سے یہ اندازہ بھی بخوبی ہوتا ہے کہ ملت اسلامیہ کے جسم کو ہمیشہ نئی قوموں سے تازہ خون ملتا رہتا ہے اور اس کے شجر میں ہمیشہ نئی پتیاں اور نئی کونپلیں نکلتی رہتی ہیں اور یہ بات بھی غور طلب بن جاتی ہے کہ اس سلسلہ کو باقی رکھنے کے لئے اہل اسلام پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اس طرح سیمینار کا فائدہ صرف علمی و نظری نہیں رہ جاتا ہے؛ بلکہ وہ اہل فکر و اہل درد کو لائحہ عمل تیار کرنے اور میدان عمل میں آنے کی بھی دعوت دیتا ہے۔

(مقدمہ کتاب شائع کردہ اسلامک بک فاؤنڈیشن، دہلی)

☆☆☆☆
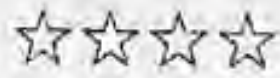
نواب سید صدیق حسن خاں کی ایک اہم اور نایاب تصنیف

والا جاہ امیر نواب سید صدیق حسن خان کا شمار عبقری شخصیتوں میں ہے وہ معروف عالم دین ہیں اور ۲۲۲ کتابوں کے مصنف ہیں، کثرت تصنیفات میں ان کی نظیر آسانی کے ساتھ نہیں ملے گی۔ ۱۴ /اکتوبر ۱۸۳۲ء کو پیدا ہوئے انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۰ سال سے بھی کم تھی، نواب شاہ جہاں بیگم سے ان کی شادی ہوئی تو ریاست کے انصرام اور انتظام کا بار بھی سر پر آیا؛ لیکن تصنیف اور تالیف کی رفتار میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ وہ صرف ایک عظیم عالم اور مصنف ہی نہیں تھے؛ بلکہ حسن

اخلاق اور مروت کا پیکر بھی تھے، مخالفین کے ساتھ بھی خوش دلی اور کرم گستری کے ساتھ پیش آتے۔
نواب صدیق حسن خان کی ایک تصنیف ہے ''تشریف البشر بذکر الائمة الاثنی عشر''
کتاب نایاب تھی اس کا ایک نسخہ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر مسعود انور علوی کاکوروی کے ذاتی کتب خانہ میں موجود تھا انھوں نے کتاب کا ایک نسخہ مسلم یونیورسٹی کے ایک استاد خسرو قاسم صاحب کو دیا اور انھوں نے حال میں کتاب کی ترتیب اور تسہیل کی اور اس کے بعد اس کی اشاعت کا اہتمام کیا اور اسے وقف خاص و عام کیا۔

کتاب کا موضوع ہے اہل بیت اور ائمہ اہل بیت اور ان کے مناقب۔ اس کتاب کا تعارف اس لئے ضروری ہے کہ ہماری اُمت اسلامیہ جو ہند کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر پھیلی ہوئی ہے افراط وتفریط کا شکار ہے، ایک گروہ کا نا سمجھ طبقہ ہے جو نبی کے تربیت یافتہ صحابہ کرام اور خلفاء راشدین کی شان میں سوء ادب سے کام لیتا ہے، جن کی شان میں ''رضی اللہ عنهم ورضوا عنه'' کے صریح الفاظ قرآن میں آئے ہیں، ان کے بارے میں زبان درازی سے بھی گریز نہیں کرتا ہے اور دوسرا گروہ ہے جو ائمہ بیت کے فضائل اور شمائل اور خصائل کا دل کی گہرائیوں سے قائل نہیں، وہ زبان سے انکار کی جرأت بھی نہیں کرتا ہے؛ لیکن ایسا بھی نہیں کہ دل کے اندر ان کی محبت اور عقیدت جاگزیں ہو۔ صحیح مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں دو بھاری چیزیں تمہارے درمیان میں چھوڑ کر جارہا ہوں پہلی چیز اللہ کی کتاب ہے جس میں ہدایت اور نور ہے اور دوسری چیز میرے اہل بیت، میں تمہیں اہل بیت سے متعلق اللہ کا واسطہ دیتا ہوں، میں تمہیں اہل بیت سے متعلق اللہ کی یاد دلاتا ہوں۔ اہل بیت کے مناقب کا انکار کرنے والوں کو اس مفہوم کی کئی حدیثیں یاد دلانے کا دل چاہتا ہے؛ لیکن جو بیمار اور ناصبیت کے مزمن مرض کا شکار ہیں وہ آسانی سے صحیح احادیث کو بھی موضوع قرار دیتے ہیں اور ''حضرت مروان'' اور ''حضرت یزید'' کی محبت کا کلمہ پڑھتے رہتے ہیں اور اہل بیت سے دل میں کدورت رکھتے ہیں، خدا سب کو اصلاح کی توفیق عطا کرے۔

صراط مستقیم اور جادہ اعتدال یہ ہے کہ صحابہ کرام اور ائمہ اہل بیت دونوں کے ساتھ ان کے شایانِ شان اکرام اور احترام کا معاملہ کیا جائے، دونوں کی نسبت ذات رسالت سے ہے، وہ تربیت نبوی کے باوجود انسان بھی تھے اور آپس میں معاصر بھی تھے، ان کے درمیان اختلافات بھی ہوسکتے ہیں، ہمیں کوئی حق نہیں کہ کسی کے حلیف اور فریق بن کر دوسروں پر سب وشتم کریں اور دشنام

طرازی کریں، یہی مفہوم ہے اس آیت کا:

ربنا لا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا ربنا إنک رؤف رحیم۔

یعنی اے ہمارے رب جو لوگ ایمان لے آئے ان کے لئے ہمارے دل میں کدورت نہ پیدا کر، اے ہمارے رب تو بہت مہربان رحم کرنے والا ہے۔

ناصبیت کے مرض کا شکار لوگوں کے لئے نواب صدیق حسن خاں صاحب کی یہ کتاب مرض کی دوا اور نسخہ شفا کی حیثیت رکھتی ہے، ائمہ بیت کے فضائل کتاب میں تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ ہم اہل بیت کی ایک دو فضیلتیں کتاب سے نقل کرتے ہیں کتاب مسلم یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے پروفیسر مسعود انور علوی کو خط لکھ کر منگائی جاسکتی ہے۔ بخاری و مسلم کی روایت ہے براء بن عازب ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ حسن بن علی آپ کی دوش مبارک پر ہیں اور آپ فرمارہے ہیں: ''اے اللہ میں اس کو محبوب رکھتا ہوں تو بھی اسے محبوب رکھ'' ابو ہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں میں اس شخص یعنی حسن بن علی کو اس وقت سے ہمیشہ دوست رکھتا ہوں جب سے میں نے دیکھا کہ حسن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں ہیں، اپنی انگلیاں آپ کے ریش میں ڈالتے ہیں آپ اپنی زبان ان کے منھ میں دیتے ہیں اور کہتے ہیں ''اللھم انی احبہ فاحببہ'' (اے اللہ میں اس کو محبوب رکھتا ہوں تو بھی اس کو محبوب رکھ) بخاری کی حدیث میں ہے کہ میرا یہ بیٹا سردار ہے اُمید ہے اللہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت امام حسن نے حضرت معاویہ سے صلح کرلی تھی اور اس طرح مسلمان ایک بہت بڑی باہمی خون ریزی سے بچ گئے تھے اور اس طرح انھوں نے مسلمانوں کے لئے یہ نمونہ پیش کیا کہ اگر مقابلہ میں کاتب وحی حضرت معاویہ جیسی شخصیت ہو اور مقابلہ کفر و اسلام کا نہ ہو اور پورے طور پر حق و باطل کا نہ ہو تو اپنے کو حقدار اور حق پر سمجھتے ہوئے بھی خود کو پیچھے ہٹا لینا اور مسلمانوں کو تفرقہ سے بچانا اور اتحاد کو ہر قیمت پر باقی رکھنا زیادہ پسندیدہ بات ہے۔ جہاں حضرت امام حسین ؓ کا اقدام باطل کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لئے حق کے لئے جان کی قربانی اور سرفروشی کا نمونہ ہے۔ وہاں حضرت امام حسن ؓ کا اقدام اپنے جائز حق پر ملت کے مجموعی مفاد کو مقدم رکھنے کا نمونہ ہے، حالیہ عرصہ میں ہمارے ملک میں جمعیت علماء ہند کے آپسی اختلافات مسلمانوں کی بدنامی کا باعث بن چکے ہیں، اس سے پہلے دیوبند کے علماء باہم دست و گریباں ہو چکے ہیں، یہاں ضرورت تھی کہ امام حسن ؓ کو نمونہ بنایا جاتا اور کوئی ایک فریق اپنے کو حق پر سمجھتے

ہوئے بھی خود کو پیچھے ہٹا لیتا۔ غم اور افسوس ہے کہ جہاں جہاں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے اقدام کو نمونہ بنانے کی ضرورت ہوتی ہے، وہاں کوئی بھی اس نمونہ پر عمل نہیں کرتا ہے؛ حالاں کہ اجتماعی زندگی میں اکثر ایسے حالات پیش آتے ہیں، جہاں امام حسن رضی اللہ عنہ کا نمونہ مسلمانوں کو بکھرنے اور ٹوٹنے سے بچا سکتا ہے؛ لیکن اس کے لئے وسیع النظری کشادہ قلبی اور سیر چشمی درکار ہوتی ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عزت اور مرتبت کے لئے یہ کیا کم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دہن مبارک سے ان کی تحسین کی تھی، دہن میں اپنا دہن ڈالا تھا اور دُعاء کی تھی، آپ نے حضرت حسن اور حضرت حسین دونوں کو ''سیدا شباب أهل الجنة'' یعنی جوانانِ جنت کا سردار قرار دیا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسین کا لعاب چوستے تھے جیسے کوئی کھجور کا دانہ چوستا ہے، ان کے رونے کی آواز سن کر آپ نے فرمایا کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس کے رونے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے، آپ نے حسن اور حسین کو ''هما ريحانتاى فى الدنيا'' یعنی دنیا میں دونوں کو اپنی خوشبو قرار دیا، یہ بخاری اور مسلم کی روایت ہے۔ اسی لئے اسلاف اُمت کا متفقہ طریقہ حضرات حسنین سے محبت اور عقیدت کا طریقہ رہا ہے، یزید کو اپنی پسند بنانا اور اسے حق بجانب قرار دینا وہ ناصبیت ہے جس کی ابتداء محمود عباسی نے شروع کی اور جس کے لگائے ہوئے زہریلے اور کڑوے برگ وبار لکھنؤ، دہلی، علی گڑھ، حیدرآباد ہر جگہ نظر آتے ہیں، اسلاف کرام ہمیشہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو برسرِ حق سمجھتے آئے ہیں۔

نواب صدیق حسن خان نے اپنی کتاب میں حضرت حسین کے حجاز سے جانب کوفہ کوچ کرنے اور پھر کربلا کی دلخراش اور خونچکاں داستان غم اور الم رقم کی ہے، تقدیر کے قاضی نے اپنا غم انگیز فیصلہ لکھ دیا تھا، امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے تقدیر کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تھا اور یہ بھی تقدیر ہے کہ اُمت سر خاک شہیداں، برگ ہائے لالہ ہمیشہ سے ڈالتی رہی ہے اور ڈالتی رہے گی ان کو محبت کا باج اور عقیدت کا خراج پیش کرتی رہی ہے اور پیش کرتی رہے گی، ان کو یاد کرتی رہی ہے اور یاد کرتی رہے گی، گلشن تاریخ کی یہ وہ شاخ نہال غم ہے جو شروع سے ہری تھی اور ہمیشہ ہری رہے گی، اب یہ غم زندگی کی انگوٹھی میں نگینہ کی طرح جڑا ہوا ہے۔

ائمہ اہل بیت میں امام حسین رضی اللہ عنہ کے بعد علی بن حسین ملقب بہ زید العابدین کا مقام ہے، یہ روزانہ ایک ہزار رکعت نماز نفل ادا کرتے تھے، کثرت عبادت کی وجہ سے آپ کا لقب زین العابدین رکھ دیا گیا تھا، خاموشی سے صدقات کرنے والا آپ سے بڑھ کر کوئی نہ تھا، ان کی مشہور

کنیت ابوالحسن ہے، آپ کے پاس عراق سے کچھ لوگ آئے، انھوں نے خلفاء راشدین میں اول خلفاء ثلاثہ کے بارے میں نازیبا گفتگو کی آپ برہم ہوئے اوران کومجلس سے نکال دیا۔ ہشام بن عبدالملک نے طواف کے وقت بہت کوشش کی کہ حجر اسود کا استلام کرے؛ لیکن اژدحام کی وجہ سے نہیں کرسکا اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان کے داخل ہوتے ہی بھیڑ چھٹ گئی اوراس نے آسانی کے ساتھ استلام کیا، ہشام نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے پوچھا کون ہے یہ نوجوان؟ فرزدق شاعر نے فوراً جواب دیا کہ خانہ کعبہ وادی بطحاء حل وحرم سب آپ سے واقف ہے۔

هذا الذی تعرف البطحاء وطأته

والبیت یعرفه والحل والحرم

فرزدق نے حضرت زین العابدین کی منقبت میں اٹھائیس شعر کا قصیدہ لکھا ہے جسے سن کر ہشام بن عبدالملک نے شاعر کو جیل میں بند کردیا۔ اس طرح کے واقعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ ائمہ اہل بیت اپنے ورع ووقار اور تقویٰ وطہارت اور مہابت اور جلالت، عوامی مقبولیت اور ہردلعزیزی میں دوسروں سے بلند اور ممتاز تھے، عوام کے دل ان کے ساتھ تھے؛ لیکن ان کی گردنیں خلفاء وقت کے قبضہ میں تھیں۔ صاحب شوکت وحشمت سریرآرائے سلطنت خلیفہ عباسی مامون رشید کو اس حقیقت کا پورا اندازہ تھا چنانچہ اس نے امام علی رضا بن موسیٰ کاظم بن جعفر صادق بن محمد الباقر بن علی بن حسین زین العابدین بن حسین بن علی کو اپنا ولی عہد قرار دیا تھا اور اس پر اتنا اصرار کیا تھا کہ حضرت علی رضا کو قبول کرنا پڑا تھا اور مامون نے اپنے سامنے اپنے بیٹے عباس اور اعیان شہر کو حکم دیا کہ امام علی رضا کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ یہ الگ بات ہے کہ قدرت کو منظور کچھ اور تھا اور آپ کا انتقال مامون سے پہلے ہوگیا، امام علی رضا کی قبر ہارون رشید کی قبر کے سامنے مقام طوس میں ہے، مامون رشید کے دل میں اس دودمانِ عالی مقام کی اتنی عزت تھی کہ محمد بن علی رضا سے اپنی بیٹی اُم الفضل بیاہ دی۔

اہل بیت اطہار کے پانچویں امام جناب محمد باقر ہیں، جو علی بن حسین زین العابدین کے صاحب زادہ ہیں، عبادت وریاضت، خشیتِ الٰہی اور قلب کی رقت میں بہت ممتاز، علوم دین اور زبان وادب دونوں کے ماہر تھے، احادیث کی روایت کرنے والے تھے۔ نواب صدیق حسن خان نے ان کے بہت سے واقعات نقل کیے ہیں، ان میں سے ایک واقعہ ہے جسے ابن جوزی نے ''الصفوۃ'' میں نقل کیا ہے اور وہ یہ کہ کسی نے تلوار کو زیور سے آراستہ کرنے کا مسئلہ امام باقر سے

پوچھا آپ نے جواب دیا کہ ہاں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا تھا، پوچھنے والے نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ صدیق پر اعتراض کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا:

نعم الصدیق نعم الصدیق فمن لم یقل الصدیق فلا صدق اللہ له قولا فی الدنیا و الآخرة۔

یعنی سب سے اچھے صدیق وہی ہیں، سب سے اچھے صدیق وہی ہیں اور جو کوئی ان کو صدیق نہیں کہتا ہے تو اللہ دنیا اور آخرت دونوں جگہوں پر اس کی کسی بات کی تصدیق نہ کرے۔

حضرت باقر کے بہت سے کشف و کرامات کا تذکرہ بھی نواب صدیق حسن خان نے کیا ہے، ان میں سے ایک مدینہ منورہ پر فوج کے حملہ آور ہونے اور اس کے حلال کئے جانے کی پیشین گوئی ہے اور دوسری پیشین گوئی ان کے بھائی زید بن علی کے خروج اور پھر شہادت سے متعلق ہے۔

ششم امام حضرت جعفر صادق بن امام باقر ہیں، ان کی والدہ حضرت ابوبکر کے پوتے قاسم کی بیٹی ہیں، یہ بہت مستجاب الدعوات اور صاحب کرامات بزرگ تھے۔ آپ کے بعد سید موسیٰ کاظم بن جعفر صادق امام ہفتم ہوئے جو بڑے عالم، عابد اور سخی تھے، فقرائے اہل مدینہ کے پاس درہم و دینار بھیجتے، اکثر ان کی زبان پر یہ دُعاء ہوتی ''اللهم انی اسألک الراحة عند الموت والعفو عند الحساب''۔

نواب صدیق حسن خان نے حضرت جعفر صادق کے صاحب زادے امام ہشتم سید موسیٰ کاظم اور امام سید کاظم کے بیٹے امام نہم علی رضا اور امام علی رضا کے صاحب زادے امام دہم محمد جواد اور پھر امام جواد کے صاحب زادے امام سیدنا امام علی الہادی پھر امام حسن خالص کا اور پھر بارہویں امام محمد بن حسن الخالص کا تذکرہ کیا ہے اور سب کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے، آخری امام کے بارے میں امامیہ مذہب کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ سرداب میں غائب ہو گئے اور یہ امام منتظر اور امام غائب ہیں۔

بہر حال امیر نواب حضرت صدیق حسن خاں صاحب کی یہ تالیف لطیف لائق مطالعہ ہے، ایک سنی اور وہ بھی اہل حدیث عالم کے قلم سے اہل بیت اطہار کا تذکرہ خوب ہے اور بہت اہمیت رکھتا ہے:

حوروں کی ثناء رند جو کردیں تو سند ہے
یہ بات بری لگتی ہے واعظ کی زباں سے

☆☆☆☆

اسلام مشرق و مغرب میں

دنیا انقلاب کا گہوارہ ہے، اس میں ہمیشہ قومیں بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں اور گرتی ہیں، کبھی عروج سے ہمکنار ہوتی ہیں اور کبھی زوال سے دوچار ہوتی ہیں، کبھی شمشیر و سناں بن کر مصاف زندگی میں کامرانی کے جھنڈے گاڑتی ہیں کبھی طاؤس و رباب کی لذتوں میں کھو کر اپنے سفینہ حیات کو کرم خوردہ بناتی ہیں۔ قرآن میں ہے "تلک الأیام نداولها بین الناس" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم زمانے کو لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں، محاورہ ہے کہ کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔ قوموں کا بھی ایک حال نہیں ہوتا ہے ان کی زندگی میں کبھی تندرستی، صحت اور توانائی کا زمانہ ہوتا ہے اور کبھی ضعف، ناتوانی اور بیماری کا۔ مسلمان بھی بحیثیت ایک قوم کے کبھی زوال اور اضمحلال سے دوچار ہو سکتے ہیں؛ لیکن وہ فنا نہیں ہو سکتے؛ کیوں کہ ان کے بقا کی ضمانت قرآن مجید میں دی گئی ہے "إنا نحن نزلنا الذکر وإنا له لحافظون" اس آیت میں بظاہر قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ ہے؛ لیکن جب قرآن کی حفاظت ہوگی تو اسی نسبت سے قرآن کے حاملین کی بھی حفاظت ہوگی یہ ممکن نہیں کہ قرآن تو باقی رہے؛ لیکن اس کے پڑھنے والے دنیا سے مٹ جائیں۔ وہ سزا کے طور پر ادبار اور تنزل کا شکار ہو سکتے ہیں؛ لیکن جب بھی ادبار کا تازیانہ ان کو دین کے مطالعہ اور اس پر عمل کے لئے مہمیز کا کام دے گا ان کے عروق مردہ میں پھر سے زندگی کے لہر دوڑ جائے گی اسی لئے اقبال نے کہا ہے:

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

قدرت نے دنیا کی قوموں میں بقائے دوام کے لئے صرف مسلمانوں کا انتخاب کیا ہے اور تنہا ان کو انسانیت کی قیادت اور ہدایت کے لئے منتخب کیا ہے، اس لئے کہ آسمانی صحیفہ ہدایت بغیر کسی تحریف کے صرف قرآن ہے اور یہ صحیفہ مسلمانوں کے پاس ہے۔ اس کے سوا جتنے فلسفے اور جتنے نظریات ہیں وہ سب ناقص انسانی ذہن کی پیداوار ہیں اور انسانیت ان پر چل کر کبھی روحانی اخلاقی بلندی تک رسائی نہیں حاصل کر سکتی ہے اور برق و بخارات کی حد سے اوپر نہیں اُٹھ سکتی ہے۔ ان کی

فتوحات بیکاری ومیخواری وعریانی وافلاس کی شکل میں ظاہر ہوں گی ،ان کی علمی پیش قدمیوں سے مادی ترقیاں حاصل ہوسکتی ہیں ،سورج کی شعاعوں کو مسخر کیا جاسکتا ہے ستاروں کی گذرگاہوں پر کمند پھینکی جاسکتی ہے؛ لیکن انسانی سماج کو عدل گستری انصاف پروری حیااور عفت وطہارت ، پاکدامنی اورسچائی ،غریب نوازی ،رحم وہمدردی ،قناعت واستغناء ،ایثار وعفوودرگذر جیسے صفات سے اخلا ق کے ساتھ آراستہ نہیں کیا جاسکتا ،عبداور معبود کا رشتہ بھی صحیح شکل میں برقرار نہیں رہ سکتا۔ دنیا کے مذاہب میں توحید اپنی بے آمیز شکل میں کہیں موجود ہے تو صرف دین اسلام میں موجود ہے ،خود مسلمانوں کی اصلاح کے لئے اور دنیا کی اصلاح کے لئے بھی داروئے شفا صرف طبیب اسلام کے پاس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی قومیں مفاسد کے طوفاں سے پریشان ہوکر کشاں کشاں اسلام کے ساحل نجات کی طرف آرہی ہیں ، امریکہ جہاں اسلام دشمنی کی تازہ لہر آئی ہوئی ہے ہر روز لوگ اسلام قبول کررہے ہیں اور اسلام کے بارے میں جاننے کا شوق روز افزوں ہے ،مسلمانوں کی آبادی وہاں عنقریب ایک کڑور تک پہنچنے والی ہے اور مسلمانوں کی آبادی کا تناسب چار فیصد تک ہوگیا ہے۔ وہاں منظم طریقہ سے دعوت کا کام بھی جاری ہے ،مسلمان داعی جیلوں میں بھی کام کررہے ہیں ،مسجدوں کی تعداد ۲۰۰ سے بڑھ کر ایک ہزار تک پہنچ گئی ہے۔

امریکہ میں دعوت کی کامیابی اس وجہ سے ہورہی ہے کہ وہاں گورے کالوں کے ساتھ امتیازی سلوک کرتے ہیں اسی لئے اسلام قبول کرنے والوں میں کالوں کی تعداد زیادہ ہے ، امریکہ میں ہر ہفتہ قرآن مجید کے تیس ہزار نسخے ہدیہ ہورہے ہیں ۔ برطانیہ ،فرانس ، جرمنی ہر جگہ اسلامی دعوت کا کام جاری ہے ،فرانس میں گذشتہ چند سالوں میں تین لاکھ لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے پیرس میں حیدرآباد کے ڈاکٹر حمید اللہ رہتے تھے ، جو آیۃ من آیات اللہ تھے ، انھوں نے قرآن مجید کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا تھا اور اب تک اس کے تیس ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں ان کے ہاتھ پر بھی بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ ان ملکوں میں جو مسلمان پہلے سے آباد ہیں وہ اگر اسلام پر عامل ہوجائیں اور کان نمک میں مل کر نمک نہ بن جائیں تو قلیل عرصہ میں ان ملکوں میں انقلاب آسکتا ہے ، دنیا میں مسلمان ایک ارب پچاس کروڑ کی تعداد میں ہیں یہ دنیا کی کل آبادی کا ایک چوتھائی ہے وہ دعوت کے ذریعہ پوری دنیا پر بادل بن کر برس سکتے ہیں ، دنیا کو امن وسلامتی کا گہوارا بناسکتے ہیں۔ یورپ کے پاس دنیا کو دینے کے لئے کوئی انقلاب آفریں نظریہ نہیں ہے ، جمہوری اقدار لبرلزم اور سیکولرزم کی اصطلاحات کا نام لے کر وہ رائے عامہ کو اپنا ہمنوا بناسکتا ہے؛ لیکن اگر

مسلم ممالک اسلامی جمہوریت اور شورائیت پر عمل کریں اور عوام کو اظہار خیال کی مناسب آزادی دیں تو ان اصطلاحات کا کوئی وزن باقی نہیں رہے گا۔ اسلام دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو بھی مناسب حقوق عطا کرتا ہے اور اپنے مذہب پر عمل کی پوری آزادی بخشتا ہے، تاریخ میں مسلمانوں کے دور حکومت میں غیر مسلموں کے ساتھ عام طور پر بے انصافی نہیں ہوئی، اب مسلمانوں کے ساتھ بے انصافی ان ملکوں میں ہورہی ہے، جو سیکولرزم کا نام لیتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اسلام کی تمام تعلیمات کو عملی جامہ پہنایا جائے اور مسلم حکومتوں کو غیر مسلم حکومتوں کے لئے نمونہ بنایا جائے اور اسی کے ساتھ ساتھ سائنس اور ٹکنالوجی میں بھی برتری حاصل کرنے کی کوشش کی جائے یہ وہ میدان ہے جس میں مسلمانوں نے پسپائی اختیار کررکھی ہے، میر کارواں ہونا تو بڑی بات ہے وہ گرد کارواں بھی نہیں ہیں؛ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ مسلمانوں میں شعور بیدار ہورہا ہے۔

مصنف کتاب کی تحریر رجائیت سے معمور ہے حالات گرچہ جاں گسل ہیں ہر طرف اداسی کے پھیلے ہوئے سائے ہیں، کابل سے لے کر فلسطین اور کوفہ و بغداد تک بس ایک خزاں کی بے برگ وبار شاخ بریدہ ہے، ظلم وکرب کی ایک ہی داستان ہے جو گونج رہی ہے، روح زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہی ہے، ہر گھر میں رات بھر درد کی شمع جلتی رہتی ہے غم کی لَو تھر تھراتی رہتی ہے، ہر مسلمان کے چہرہ پر اضطراب ہے وہ گویا سراپا جنازہ بردوش اور کفن در آغوش ہے۔ ایسی تیرہ وتار فضا میں مصنف کتاب نے خورشید کا سامان سفر تازہ کرنے کی دعوت دی ہے، نور سحر کی باز آفرینی کی بشارت دی ہے، اسلام کے مزاج میں رجائیت ہے قرآن ''لا تقنطوا من رحمة الله'' کا درس دیتا ہے، یعنی مسلمان اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، اگر وہ اسلام پر عمل پیرا ہوجائیں تو لوح بھی قلم بھی سب ان کے لئے ہے وہ تقدیر ساز بھی ہوں گے تاریخ ساز بھی ہوں گے اور عالم کی قیادت ان کے ہاتھ میں آئے گی:

سبق پھر پڑھ صداقت کا شجاعت کا عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

مولانا محمد الیاس بھٹکلی ندوی کی یہ کتاب اس وقت زخم کا مرہم ہے درد کا درماں ہے، انھوں نے خواب کی باتیں نہیں کی ہیں؛ بلکہ حقائق بیان کئے ہیں وہ حقائق جو اگر سامنے رہیں تو حلقہ فکر وخیال پر آشوب زمانہ کا زیادہ اثر نہیں ہوتا اور شعور کی تابنا کی اور توانائی باقی رہتی ہے۔ جواں سال جواں ہمت اور جواں قلم مصنف خود رجائیت سے سرشار ہیں اور دوسروں کو سرشار کرنے کا

جذبہ رکھتے ہیں، وہ قنوطیت سے دور ہیں اور قنوطیت ان سے دور ہے۔ ان کی کئی کتابیں اہل علم کی بزم میں داد و تحسین کی مستحق قرار پائی ہیں، بالخصوص سلطان ٹیپو پر ان کی کتاب اعلیٰ درجہ کی علمی اور تاریخی کتاب ہے۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اور پروفیسر خلیق احمد نظامی نے مصنف کے شگفتہ اور عالمانہ قلم کو سراہا ہے، مایوسی کی تاریکیوں میں یہ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے اُمید کی شمع جلاتی ہے، یقین کو مستحکم کرتی ہے اور آگے بڑھنے کا شعور بخشتی ہے، مجھے اُمید ہے کہ علمی ادبی اور فکری حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوگی، اللہ تعالیٰ مصنف کو اجر جزیل عطا فرمائے آمین۔ (مقدمہ کتاب)

☆☆☆☆

علم جدید کا چیلنج

اسلام اور سائنس کے موضوع پر اُردو زبان میں جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں دو کتابیں بہت اہم ہیں، ایک کتاب "علم جدید کا چیلنج" ہے، جب عربی زبان میں اس کا ترجمہ شائع ہوا تو عرب دنیا کے ہر مکتبہ میں یہ کتاب پہنچ گئی، اہل ذوق نے اس کتاب کا والہانہ استقبال کیا، کتاب کے مصنف مولانا وحیدالدین خاں عالمی شہرت کے مالک بن گئے۔ وحیدالدین خاں کے بہت سے نظریات سے اہل علم کو اختلاف ہے؛ لیکن علم جدید کا چیلنج وہ کتاب ہے جس کی افادیت اور اہمیت پر سب کا اتفاق ہے۔ دوسری کتاب "مذہب اور سائنس" مولانا عبدالباری ندوی کی بے حد وقیع تصنیف ہے، اُردو زبان کے دامن میں اسلامیات کے جتنے ہیرے ہیں اور اُردو میں "اسلام اور سائنس" کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں ہیں ان میں یہ دونوں کتابیں لعل شب چراغ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس کا میدان اختصاص اسلامک اسٹڈیز ہے اور اس نے یہ دونوں کتابیں نہیں پڑھی ہیں تو گویا اس کا دعویٰ غلط اور اس کا مطالعہ ناقص اور نامکمل ہے۔ یہ سائنس کا عہد ہے سائنس کے کرشمات نے اس دور میں تمدن وتہذیب کو جتنا متاثر کیا اور کسی چیز نے نہیں کیا ہے۔ زندگی کا ہر گوشہ اس کی فسوں کاری کے زیر اثر ہے، خلوت گھر اور بازار سفر اور حضر ہر جگہ اس کا دخل ہے اس لئے قدرتی طور پر یہ سوال ذہنوں میں آتا ہے کہ یہ سائنس مذہب کی مخالف

ہے یا اس کی طرفدار، وہ مذہب کی تردید کرتی ہے یا اس کی تائید۔ اگرچہ سائنس کے نظریات ہمیشہ تغیر پذیر ہوتے ہیں اور اس کا کوئی قول ہمیشہ کے لئے قول فیصل نہیں تاہم سائنس کے عہد میں مذہب کا مطالعہ نئے زاویہ نظر سے ضروری ہے اور مذکورہ دونوں کتابوں کی اہمیت یہی ہے کہ دونوں میں سائنسی حقائق کی روشنی میں مذہبی عقیدہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مذہب اور سائنس کے موضوع پر بہت پہلے ڈریپر نے کتاب لکھی تھی جس کا اُردو ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے کیا تھا؛ لیکن وہ پرانی کتاب ہے اس کے مقابلہ میں یہ دونوں کتابیں نئی ہیں اور موضوع کے براہ راست مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ اس موضوع پر ایک کتاب اور ہے جس کی اپنی اہمیت وافادیت ہے اور وہ ہے "قرآن اور علم جدید" یہ کتاب پاکستان سے شائع ہوئی ہے اور کتاب کے مصنف ہیں ڈاکٹر رفیع الدین، یہ کتاب بھی اہل علم کے لئے لائق مطالعہ ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس کتاب کی بہت تعریف کی تھی اور اسی کو پڑھ کر مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی نے جدید فتنہ ارتداد کے موضوع پر عربی زبان میں ایک کتاب "ردة ولا ابا بکر لھا" کے نام سے لکھی تھی۔ جس شخص نے ان تینوں کتابوں کا مطالعہ کرلیا اس نے اسلام اور سائنس کے موضوع پر اُردو میں اہم ترین کتابوں کا مطالعہ کرلیا، یہ تینوں کتابیں بآسانی دستیاب ہوسکتی ہیں، پہلی اور دوسری کتاب نشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ نے شائع کی ہے اور تیسری کتاب پاکستان کے مکتبوں میں اور ہندوستان کے اہم کتب خانوں میں موجود ہے۔ اس موضوع پر کتابیں اور بھی لکھی گئی ہیں؛ لیکن یہ تین کتابیں وہ ہیں جو اپنے موضوع پر صف اول کی کتابیں ہیں اور ان لوگوں کے قلم سے ہیں جنھوں نے انگریزی کتابوں سے براہ راست پورا استفادہ کیا ہے۔

کتاب "علم جدید کا چیلنج" پہلی بار نشریات ندوۃ العلماء لکھنؤ سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی تھی اور تمام اہل علم کے درمیان مقبول ہوئی، مصنف نے کتاب کے مقدمہ میں مولانا ابوالاعلی مودودی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کے لئے اپنے گہرے تاثرات کا اظہار کچھ اس طرح کیا تھا کہ یہی دونوں شخصیتیں برصغیر میں دینی خدمات کا نشان ہیں اول الذکر نے مصنف کو ایک نازک موڑ پر دینی خدمت کے کام پر لگایا اور دوسرے نے کام کو حسن انجام تک پہنچایا۔ جب یہ کتاب علمی دنیا میں مقبول ہوچکی اور مصنف نے جب کتاب کا ایک ایڈیشن مذہب اور جدید چیلنج کے نام سے خود شائع کیا تو دونوں شخصیتوں کے لئے اپنے اس خراج عقیدت کو حذف کردیا۔

کتاب کا نام "علم جدید کا چیلنج" اس لئے رکھا گیا کہ یہ جواب ہے اس چیلنج کا جو علم جدید

یعنی سائنس کی طرف سے مذہب کو دیا گیا ہے، مصنف نے عصر حاضر کے مشہور سائنس داں جولین ہکسلے کا قول نقل کیا ہے:

> جس طرح ایٹم کے ٹوٹنے سے مادہ کے بارے میں انسان کے پچھلے تمام تصورات ختم ہو گئے، اسی طرح پچھلی صدی میں علم کی جو ترقی ہوئی ہے وہ بھی ایک قسم کا علمی دھاکہ (Knowledge Explosion) تھا جس کے بعد خدا اور مذہب کے بارے میں تمام پرانے خیالات بھک سے اڑ گئے۔

جولین ہکسلے کے الفاظ میں مذہب اور خدا کے خلاف یہ علم جدید کا چیلنج ہے، وحید الدین خاں نے اپنی کتاب میں اسی چیلنج کا جواب دیا ہے اگر جولین ہکسلے بقید حیات ہوتا اور اس نے اس کتاب کا انگریزی ترجمہ (God Arises) پڑھ لیا ہوتا تو ممکن ہے اس کی رائے بدل جاتی، ممکن ہے نہ بدلتی؛ لیکن اسے علم ضرور ہوتا کہ چیلنج کا جواب دیا گیا ہے۔ انسانوں کے دل بین اصابع الرحمٰن یعنی رحمٰن کی انگلیوں کے درمیان ہوتے ہیں، ہدایت کی توفیق اسی سے ملتی ہے؛ لیکن آج بھی یہ کتاب ان لوگوں کو دی جاسکتی ہے، جو خدا اور مذہب کے قائل نہیں ہیں۔ انسان صرف کوشش کرنے کا مکلّف ہے، ہدایت کا فیصلہ آسمان سے ہوتا ہے، ایک کاشت کار زمین میں ہل چلاتا ہے، تخم ریزی کرتا ہے زمین کی نگہداشت کرتا ہے، پھر اللہ سمندر سے ابر اُٹھاتا ہے، زمین پر بارش برساتا ہے، سینۂ گیتی کو زرخیز بناتا ہے، بیج کو مٹی کی تاریکی میں پالتا ہے، خوشۂ گندم پیدا کرتا ہے، لہلہاتی ہوئی فصل اُگاتا ہے۔ ایک مصلح اور داعی کو اسی کاشت کار کا رول ادا کرنا ہے اور باقی کام اسے اللہ پر چھوڑ دینا ہے، اس کا کام ذہن کی زمین کے لئے دل سوزی کے ساتھ بیج فراہم کرنا ہے، زمین کو نرم کرنا اس کے لئے چشمۂ ہدایت جاری کرنا اللہ کا کام ہے۔

"کائنات خدا کی گواہی دیتی ہے" کے عنوان سے جو باب اس کتاب میں خدا کے وجود سے متعلق ہے اس کا ایک مختصر اقتباس پیش ہے جس سے کتاب کے علمی اُسلوب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

"پچھلے صفحات میں کائنات کے حیرت انگیز نظم اور اس کے اندر غیر معمولی حکمت اور معنویت کا جو حوالہ دیا گیا ہے مخالفین مذہب اس کو بطور واقعہ تسلیم کرتے ہوئے اس کی دوسری توجیہ کرتے ہیں، اس میں انھیں کسی ناظم اور مدبر کا اشارہ نہیں ملتا؛ بلکہ سب کچھ ان کے نزدیک محض "اتفاق" سے ہو گیا ہے، ٹی ایچ ہکسلے کے الفاظ میں چھ بندر اگر ٹائپ رائٹر پر بیٹھ جائیں اور

کروڑوں سال تک اسے پیٹتے رہیں تو ہوسکتا ہے کہ ان کے سیاہ کئے ہوئے کاغذات کے ڈھیر میں سے آخری کاغذ پر شیکسپئر کی ایک نظم Sonnet نکل آئے، اس طرح اربوں کھربوں سال مادہ کی اندھا دھند گردش کے دوران موجودہ کائنات بن گئی ہے'' (The Mysterious Universe Pag:3-4) یہ بات اگرچہ پورے طور پر لغو ہے؛ کیوں کہ ہمارے آج تک کے تمام علوم ایسے کسی اتفاق سے قطعاً ناواقف ہیں، جس کے نتیجہ میں اتنا عظیم اس قدر منظّم، بامعنی اور مستقل واقعہ وجود میں آجائے'' کتاب کی ابتداء میں مخالفین مذہب کا مقدمہ بیان کیا گیا ہے اور پھر اس کا علمی جائزہ لیا گیا ہے'' کائنات خدا کی گواہی دیتی ہے'' وہ باب ہے جس کا تعلق خدا کے وجود کے اثبات سے ہے، پھر ایک باب دلیل آخرت سے متعلق ہے اور ایک باب میں رسالت کا اثبات ہے، ایک باب کا نام ہے'' قرآن خدا کی آواز'' اس باب میں وحی کا سائنسی ثبوت پیش کیا گیا ہے اور پھر ایک باب تمدنی مسائل سے متعلق ہے جس سے اسلام کی صداقت آشکار ہوتی ہے۔

صداقت کو دریافت کرلینا یا حق کو پالینا صرف کسی علمی کوشش میں کامیاب ہونا نہیں ہے، یہ تباہ کن اور دردانگیز مستقبل سے خود کو بچالینا ہے، صداقت کو نہ پانے اور پھر صداقت پر ایمان نہ لانے کی صورت میں مستقبل کا دردناک اور بھیانک ہونا اتنا ہی یقینی ہے جیسے دن کے وقت آسمان پر سورج کا چمکنا۔ بھیانک مستقبل سے خود کو بچانے کا وقت بس زندگی کے اختتام تک ہے، چوبیس گھنٹے کے اندر روزانہ پندرہ لاکھ سے زیادہ انسان موت کے منھ میں چلے جاتے ہیں کوئی بھی شخص یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اگلے چوبیس گھنٹے کے لئے فرشتہ اجل کے ہاتھ میں انسانوں کی جو فہرست ہے اس میں اس کا نام ہے یا نہیں۔ مذہب کے بارے میں یا خدا کے وجود کے بارے میں جو انکار کا یا شک کا رویہ رکھتے ہیں ان کو کتاب کا مطالعہ اپنی پہلی فرصت میں کرنا چاہئے، کسی بھی انسان کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنے لئے شترمرغ کا انجام پسند کرے اور حقائق سے آنکھیں بند کرلے۔ بہترین عقلمندی یہ ہے کہ جب انسان اس دنیا میں ہے تو وہ اس کے خالق اور مالک کو بھی پہچاننے کی کوشش کرے، جو لوگ خدا کے وجود کے قائل اور مذہب کے معترف ہیں ان کو مزید اطمینان قلب کے لئے اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے، کتاب کا علمی انداز اور اُسلوب خود ایک اچھے قاری سے اچھی کتابوں کی تلاش ہوتی ہے، مطالعہ کی سفارش کرتا ہے۔

اس کتاب کا عربی ترجمہ جب شائع ہوا تو عرب دنیا کے سب سے قدیم اور مشہور اخبار الاہرام میں اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک معروف صاحب قلم نے لکھا کہ:

بہت کم وہ کتابیں ہیں جو اسلام کی دعوت کو علمی انداز میں پیش کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں، ہندوستانی مصنف وحید الدین خاں کی کتاب ان چند کتابوں میں سے ایک ہے۔ اسلام کے ظہور کے وقت سے لے کر اب تک اسلام پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، اگر عمدہ کتابوں کو چھلنی سے چھانا جائے تو یہ کتاب بلاشبہ ان میں سے ایک ہوگی۔

☆☆☆☆
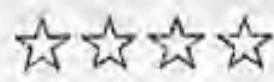
مذہب اور سائنس

مولانا عبد الباری ندوی جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں فلسفہ کے پروفیسر تھے ان کا شمار عقلی علوم اور مغربی فلسفہ کے بڑے اسکالروں میں کیا جاتا ہے، اگرچہ ان کے پاس ہائی اسکول کی ڈگری بھی نہ تھی؛ لیکن ان کی بے پناہ صلاحیت کی بنا پر عثمانیہ یونیورسٹی میں ان کا تقرر ہوا تھا اور وہ بھی فلسفہ کے شعبہ کے صدر کی حیثیت سے۔ ملازمت کے جب مستقل ہونے کا وقت آیا اور کاغذات دستخط کے لئے اعلیٰ حضرت نظام حیدر آباد کے سامنے پیش کئے گئے تو کچھ حسد پیشہ اور کینہ پرور طبیعتوں نے جو ہمیشہ اور ہر جگہ ہوتے ہیں یہ حقیقت گوش گذار کی کہ جن کو فلسفہ کے شعبہ کا صدر بنایا گیا ہے ان کے پاس تو ہائی اسکول کی ڈگری بھی نہیں ہے۔ جب اس کے بارے میں سوال مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی صدر الصدور مملکت آصفیہ سے کیا گیا تو انھوں نے یہ جواب دیا تھا کہ یہ بات صحیح ہے؛ لیکن کیا کیا جائے کہ فلسفہ ان کے ہاتھ پر ایمان لا چکا ہے اور ثبوت کے طور پر انھوں نے مولانا عبد الباری ندوی کی کتاب ''مذہب اور عقلیات'' بھجوائی۔ حقیقت یہ کہ تعلیم یافتہ وہ شخص نہیں ہے جو ایک مرتبہ کسی درسگاہ کی ڈگری حاصل کرلے، تعلیم یافتہ وہ شخص ہے جس کے ہاتھ میں ہمیشہ کتاب ہو اور جس کا مطالعہ غیر منقطع ہو۔ چنانچہ اس دور میں سند یافتہ جاہلوں کی تعداد بڑھ گئی ہے، اب تو حال یہ ہوگیا ہے عالم اور فاضل بھی ہیں استاذ بھی ہیں؛ لیکن دو سطریں اُردو کی نہیں لکھ سکتے جو مادری زبان ہے، مولانا عبد الماجد دریابادی نے مولانا عبد الباری کے بارے میں لکھا ہے کہ:

وہ فلسفی سے ترقی کر کے متکلم اور صوفی بن گئے؛ لیکن عقلیت جیسے ان کی سرشت میں
تھی، باوجود اپنے تقشف اور تصلب کے وہ محض تسبیح اور سجادہ کے صوفی ہو کر نہیں رہے؛
بلکہ بقدر ضرورت مغربی فلسفہ اور اس سے بھی بڑھ کر ماڈرن سائنس خصوصاً شعبہ
طبیعیات سے ان کا ربط اور ان کا مطالعہ قائم رہا، "مذہب اور سائنس" ان کی بے حد
اہم کتاب ہے کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر رضی الدین نے لکھا ہے جو پہلے عثمانیہ یونیورسٹی
میں ریاضی کے استاد اور بعد میں پشاور یونیورسٹی کے اور پھر اسلام آباد یونیورسٹی کے
وائس چانسلر ہوئے اور جن کا نام نوبل پرائز کے لئے بھی پیش کیا گیا تھا۔ انھوں نے
اس کتاب کی بہت تعریف کی ہے "قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری"۔

مولانا عبدالباری ندوی نے تعلیم ندوۃ العلماء میں حاصل کی تھی جہاں علامہ شبلی کی رہنمائی اور سرپرستی نے طلبہ کے اندر علمی کتابوں کے مطالعہ کا شوق اور عربی اور اُردو انشاپردازی کا ذوق پیدا کر دیا تھا اور ندوۃ العلماء کو اس اعتبار خاص سے ہندوستان کی دوسری تمام دینی درسگاہوں پر امتیاز حاصل ہے۔ ندوۃ العلماء وہ دانش گاہ تھی جہاں پڑھ کر اور جہاں کے ماحول میں رہ کر طلبہ وسیع المطالعہ ادیب اور مصنف بن جاتے تھے، فارغین ندوہ سے ادب اور اسلامی علوم کا فلک مطلع انوار بن گیا۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ بحیثیت مجموعی ندوۃ العلماء کے فرزندوں کی علمی یادگار ہے۔ علامہ شبلی ندوہ میں طلبہ پر بہت شفقت کرتے اور ان کی علمی رہنمائی کرتے تھے اور ان کی ضرورتوں کا اولاد سے بڑھ کر خیال رکھتے تھے، ان کی گفتگو کا موضوع ہمیشہ علمی ہوتا تھا اور وہ اسی انداز سے طلبہ کی علمی تربیت کرتے تھے، ان کی شخصیت اس پارس پتھر کی طرح تھی کہ جو اس سے مس کرتا وہ کندن بن جاتا۔ ان کی شخصیت نسیم بہار کی طرح تھی اس کا جھونکا جس کلی کو چھوتا وہ کلی گلِ شگفتہ اور گلِ سرسبد بن جاتی، ان کی شخصیت روشن چراغ کی طرح تھی، جس کی لو سے کئی چراغ جل اُٹھتے ہیں اور پھر شبستان علم میں چراغاں کا منظر سامنے آجاتا ہے، شبلی علم و ادب کی دنیا میں ایک نظام شمسی کا نام ہے جو کئی سیاروں پر مشتمل ہے اور اس کے ایک سیارہ کا نام عبدالباری ندوی ہے۔ علامہ شبلی نے مولانا عبدالباری کے انگریزی اور فلسفہ کے ذوق کو دیکھ کر ان کی اس میدان میں تعلیم کا انتظام کیا اور ان کے لئے علی گڑھ خطوط لکھے، اس طرح مولانا عبدالباری نے انگریزی کی استعداد بہم پہنچائی اور جدید فلسفہ میں ڈی کارٹ سے لے کر ہیوم اور برکلے سب کو پڑھ ڈالا، پھر انھوں نے برکلے کی کتاب (Principles of Human Knowledge) کا اُردو ترجمہ "مبادیٔ علم انسانی" کے نام سے

کیا اور برکلے کی سوانح اور اس کے فلسفہ پر کتاب بھی لکھی یہ دونوں کتابیں علامہ شبلی کے قائم کردہ ادارہ دارالمصنفین سے شائع ہوئیں۔

مولانا عبدالباری ندوی کی یہ کتاب ''مذہب اور سائنس'' کلام اور سائنس کے باہمی تعلق اور اثرات پر ایک نئے نقطہ نظر سے بحث کرتی ہے اور فلسفہ اور سائنس کی جدید تحقیقات کی روشنی میں قرآنی حقائق کا اثبات کرتی ہے۔ کتاب کے بارے میں مشہور سائنٹسٹ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> جب مادیت اور دہریت کے پرستاروں کا وہ طلسم جو انھوں نے سائنس کی بنیادوں پر قائم کیا تھا ٹوٹ گیا تو پھر کائنات کی حقیقت پر غور وفکر کرنے والوں کے لئے بمصداق ''کافر نتوانی شد نا چار مسلمان شو'' خدا کی ہستی پر ایمان لانے کے لئے نئی راہیں کھل گئیں اور کم از کم ایک ہمہ گیر آفاقی ذہن (Universal Mind) کو تسلیم کرنا ناگزیر ہوگیا۔ حضرت مولانا عبد الباری نے اس حقیقت کو اپنی کتاب میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور ان اصحاب کے لئے جو سائنس اور ٹکنالوجی کی حالیہ غیر معمولی ترقی سے مرعوب اور متاثر ہوکر ایمان کی کمزوری کا شکار ہورہے ہیں، یقین محکم حاصل کرنے اور دنیا اور آخرت میں نجات پانے کا سامان مہیا کیا ہے۔

ہم جس کائنات میں رہتے ہیں اس کو سمجھنا بھی آسان نہیں، یہ جہاں عجب جہاں ہے جس کی محیر العقول وسعت، وعظمت، ذہن کو حیران کردیتی ہے اس کے حدود حد ادراک سے ماوراء ہیں مولانا عبدالباری ندوی اپنی اس کتاب میں لکھتے ہیں:

> ایک طرف صرف ایک سورج کے مقابلہ میں ہماری مٹر برابر زمین کا خیال کرو اور دوسری طرف اس ایک سورج جیسے کروڑوں دوسرے سورجوں کا جو اس مجموعہ میں پائے جاتے ہیں، جس کو کہکشانی نظام کہا جاتا ہے خیال کرو، پھر یہ کائنات یا عالم اس کہکشانی نظام پر ختم نہیں ہوجاتا؛ بلکہ اس جیسے لاکھوں لاکھ سحابے خلا میں تیر رہے ہیں اور ہم سے قریب ترین سحابہ بھی چھ کڑوراڑسٹھ ہزار نواسی نوری سال (Light Years) کی دوری پر واقع ہے اندازہ لگایئے دور ترین سحابہ کہاں ہوگا۔

روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ ہے اس کے باوجود جب ہم سورج کو

دیکھتے ہیں تو وہ آٹھ منٹ پہلے کا سورج ہوتا ہے، اسی طرح جس قریب ترین ستارہ کو ہم دیکھتے ہیں وہ چار سال پہلے کا ہوتا ہے۔ پانی کے ایک قطرہ میں لاکھوں بلکہ اربوں کھربوں سالمات پائے جاتے ہیں، پھر اس سالمہ کے اندر اس سے بھی بہت چھوٹے چھوٹے الکٹران یا برقی ذرات پائے جاتے ہیں جن کے مابین ایسے ہی فاصلے پائے جاتے ہیں، جیسے آفتاب اور اس کے سیاروں کے درمیان ہوتے ہیں۔ اس کائنات کی حقیقتیں ذہن کو چکرا دینے والی اور دماغ کو بوکھلا دینے والی ہیں، اس کائنات کے طلسم کے آگے طلسم ہوش ربا بھی ہیچ ہے؛ بلکہ اس سے بڑھ کر کوئی اور طلسم ہوش ربا نہیں، یہ کائنات اسرار کا مجموعہ ہے، انسان اسرار پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے، انسان ذرہ ذرہ کا جگر چاک کرنے اور نامعلوم کو معلوم بنانے کی کوشش کرتا ہے؛ مگر یہ چشم حیراں ہے کہ اس کی حیرانی بڑھتی جاتی ہے۔ اس دنیا میں ترقی یافتہ ملکوں نے نظام شمسی کے صرف ایک چاند تک اپنی کمند پھینکی ہے اور سیارہ مریخ کے بارے میں کچھ قیاسی باتیں حاصل ہوئی ہیں؛ لیکن اس نظام شمسی کے ماوراء ہزاروں لاکھوں نظام شمسی کہکشاں اور سحابے موجود ہیں، اس کائنات پر غیب کے جو پردے پڑے ہوئے ہیں انسان ان کے جاننے کا خواہشمند ہوتا ہے؛ لیکن کائنات کا غیب ہی ابھی تک لامعلوم ہے اور جو اس کائنات سے ماوراء کائنات ہے اور جو دوسری دنیا ہے اس کے جاننے کا اور کوئی ذریعہ نہیں، سوائے اس کے کہ ہم پیغمبر کی بات پر ایمان لائیں۔ وہ جو انسانوں کی اور تمام مخلوقات کی جسمانی پرورش کرتا ہے اس سے بعید تر یہ بات ہے کہ انسانوں کو پیدا کرنے والے سے اور پیدا کرنے کے مقصد سے اور کائنات کے انجام سے بے خبر رکھے اور عقل سے بعید تر یہ بات بھی ہے کہ انسان اپنے مقصد تخلیق کو اور پیدا کرنے والے کو جاننے کی کوشش نہ کرے۔

یہ کائنات ایک کہنہ کتاب ہے، جس کے اول اور آخر کے اوراق ندارد ہیں، اس کتاب کے مصنف (اللہ تعالی) اور زمانہ تصنیف اور مقصد تصنیف اور پیغام تصنیف کو جاننے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان کھوج میں لگا رہے اور ظن وتخمین سے کام لے، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مصنف کتاب یعنی اللہ کی طرف سے ہر زمانہ میں جو رسول بھیجے گئے ہیں اور ان رسولوں پر جو کتاب بھیجی گئی ہے ان پر ایمان لائے۔

☆☆☆☆

مولانا شاہ معین احمد ندوی

حیات وخدمات

دارالمصنفین اور اس کے رجال علم کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لئے ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی کی کتابیں اب حوالہ کی کتابوں کی حیثیت اختیار کرگئی ہیں۔ پہلے ان کی کتاب عظمت رفتہ کے نام سے آئی، جس میں زیادہ تر مشاہیر دارالمصنفین کا تذکرہ تھا، پھر شبلی پران کے مضامین کا مجموعہ متعلقات شبلی کے نام سے شائع ہوا اور اب ان کی کتاب '' شاہ معین الدین احمد ندوی -- حیات وخدمات'' کے نام سے منظر عام پر آئی ہے۔ راہوار قلم اسی رفتار سے چلتا رہا تو جلد ان کا شمار بسیار نویس اور زود نویس مصنفین میں کیا جانے لگے گا۔ ندوۃ العلماء کی طرح دارالمصنفین کا نام بھی شبلی کے نام سے وابستہ ہے، شبلی ایک شخصیت کا نام نہیں؛ بلکہ ایک اسکول اور ایک مدرسہ ادب کا نام ہے، جس کے تلامذہ نے علم وادب اور تاریخ وتحقیق کی دنیا میں نام پیدا کیا ہے اور بزم کمال آراستہ کی ہے، اُردو زبان کو مذہب اور سوانح اور تاریخ کے اعتبار سے سرمایہ دار اور تاج دار اور خوشبودار اور سمن زار بنانے میں اسی اسکول کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ اُردو زبان کا دامن ان موضوعات پر علمی کتابوں سے اتنا مالا مال ہے کہ عربی زبان کے سوا دنیا کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی ہے۔ علمی تصنیفی اداروں میں دارالمصنفین وہ تنہا ادارہ ہے جس کی تمام کتابیں کامل عیار اور ادب وتحقیق کا معیار ہیں اور جن کے مسلسل مطالعہ سے انسان صرف اُردو زبان کے ذریعہ ایک اچھا عالم دین ایک زرف نگاہ مؤرخ ایک نکتہ رس نقاد اور خوش نگار ادیب بن سکتا ہے یہ امتیاز ہندوستان کے کسی تصنیفی ادارہ کو حاصل نہیں ہے۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی بھی دبستانِ شبلی کا ایک گوہر شب چراغ تھے، دارالمصنفین میں رہ کر انھوں نے بہت سی شاہکار کتابیں تصنیف کیں اور انھوں نے مجلّہ معارف کے مدیر شہیر اور خوش تحریر کی حیثیت سے علمی اور تحقیقی صحافت کو وقار اور اعتبار عطا کیا۔ معارف کا وہ علمی مقام تھا کہ ہندوستان کے محققین اور اساطین علم وادب معارف میں اپنے مضمون کی اشاعت کو

ہمیشہ اپنے لئے اعزاز سمجھتے تھے۔ مولانا شاہ معین الدین ندوی کی علمی اور تصنیفی تربیت جس انداز سے ہوئی تھی اسی انداز سے وہ دارالمصنفین میں تازہ واردان بساط کی تربیت کرتے تھے، مراجع اور مصادر کی طرف توجہ دلاتے، استدلال کا اور حوالہ دینے کا طریقہ سکھاتے، اُسلوب میں شگفتگی اور وقار پیدا کرنے کے لئے شعرالعجم اور حیات شبلی کے بار بار مطالعہ کا مشورہ دیتے۔ حلقہ سخن میں جو اشخاص زیرتربیت ہوتے ان کو تربیتی دور میں اخبارات پڑھنے سے منع کرتے تاکہ زبان و بیان میں صحافیانہ سطحیت اور سخافت نہ پیدا ہونے پائے، صحت زبان پر بہت زور دیتے تھے، غلط تعبیرات کے استعمال سے منع کرتے تھے۔ وہ زبان کی صحت وسقم اور الفاظ وتعبیرات کے استعمال کے بارے میں سند کا درجہ رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ ملکہ اُردو کے معروف اور مسلم ادیبوں کی کتابوں کے مطالعہ سے پیدا ہوتا ہے، معروف اور مسلم ادیبوں سے ان کی مراد وہ کلاسیکل یعنی قدیم ادباء اور مصنفین ہیں جو عربی اور فارسی سے آشنا اور مزاج اُردو کے نبض شناس تھے۔ دارالمصنفین کا یہ انداز تربیت تھا اور وہاں مصنف بننے کے لئے نئے رفقاء کو ایک پورا ہفت خواں طے کرنا پڑتا تھا، معتبر صاحب قلم بننے کا یہی صحیح طریقہ ہے، ورنہ اب تو شہرت پسندی کا حال یہ ہو گیا ہے کہ جنھوں نے اپنی زندگی میں کوئی ایک علمی کتاب بھی بالاستیعاب نہیں پڑھی اور کسی معتبر علمی مجلّہ میں جن کا کوئی مضمون کبھی شائع نہیں ہوا جن کی تحریر حک واصلاح کے مرحلہ سے گذری ہی نہیں وہ بھی یہ چاہنے لگے ہیں کہ ان کا شمار اہل علم کی صف میں کیا جائے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی زیرتربیت رہ کر اور دبستانِ شبلی کو نمونہ بنا کر مولانا شاہ معین الدین ندوی نے پرورش لوح وقلم کی تھی اور اسی کا فیض تھا کہ ان کی تحریریں نقوش ادب بن گئیں اور ان کی نثر مرصع نثر بن گئی، سیرالصحابہ جلد ششم کی ایک عبارت ملاحظہ ہو:

> ریاض نبوی میں وہ خوش رنگ ارغوانی پھول کھلا جس کی مہک حق وصداقت، جرأت وبسالت، عزم واستقلال، ایمان وعمل اور ایثار وقربانیوں کی وادیوں کو ابد الآباد تک بساتی اور حسن کی رنگینی عقیق کی سرخی اور شفق کی گلگونی اور لالہ کے داغ کو شرماتی رہے گی، یعنی ۴ھ میں علی رضی اللہ عنہ کا کاشانہ حسینؓ کے تولد سے گل وگلزار بنا۔

تاریخ وسیرت نگاری میں ایک مؤرخ حقیقت نگاری سے کام لیتا ہے، مولانا شاہ معین الدین ندوی نے سیرالصحابہ اور تاریخ اسلام کے نام سے کئی جلدوں میں کتابیں تصنیف کیں اس لئے ان کے قلم میں پرکاری کے ساتھ مورخانہ سادگی پائی جاتی ہے؛ لیکن جہاں کہیں کسی اچھے شاعر کا دیوان سامنے آتا اور انھیں معارف میں تبصرہ کرنا ہوتا تو لفظ لفظ ادب کے میکدہ کا جام بن جاتا، وہ

ریاض خیر آبادی کے مجموعہ کلام ریاض رضوان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

دیوان کیا ہے، میکدہ ہے غزلوں میں شراب کی تاثیر اور ہر شعر چھلکتا ہوا جام ہے، اس لئے جوں جوں آگے بڑھتا گیا افسردہ طبیعت شگفتہ ہوتی گئی اور شاعری سے مدتوں اکھڑی ہوئی طبیعت عارضی طور پر پھر مانوس ہوگئی، یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ اس میکدہ کی سیر کا اتفاق عین توبہ شکن موسم ساون میں ہوا میکدہ ریاض کی شراب اتنی تیز اور رنگین ہے کہ اسے پی کر نہ بہکنا بڑے ظرف کا کام ہے، اس لئے اگر سنجیدہ ناظرین کو کہیں قلم میں لغزش نظر آئے تو وہ میرا قصور نہیں؛ بلکہ بادہ ہوش ربا کا فیض ہے۔

اگر ان کے دور کے معارف کے شذرات کو جمع کر دیا جائے تو ان کے عہد کے ہندوستانی مسلمانوں کی کاوشوں کامرانیوں اور ناکامیوں کی پوری تصویر سامنے آجائے گی، مثال کے طور پر مئی ۱۹۵۲ء کے شمارہ کے شذرات دیکھئے، جامعہ عثمانیہ میں اُردو ذریعہ تعلیم کے موقوف کئے جانے پر وہ لکھتے ہیں:

جامعہ عثمانیہ کے ہندی یونیورسٹی بنائے جانے کی خبر عرصے سے گرم تھی، بالآخر یہ حادثہ ہوکر رہا، اس کا انتظام مرکزی حکومت کے ہاتھوں میں آجائے گا اور اس کا ذریعہ تعلیم ہندی زبان ہوگی، ہندوستان کا پورا نظام ہندیا یا جارہا ہے اور یونیورسٹیوں کی تعلیم زبان ہندی ہوجائے گی، اُردو کی یونیورسٹی صرف ایک جامعہ عثمانیہ تھی اگر حکومت اس کو باقی رہنے دیتی تو اس کا کیا بگڑ جاتا اور اس سے ہندی کو کیا نقصان پہنچتا؛ مگر اُردو دشمنی کو اتنا بھی گوارا نہ ہوا اور اُردو کی اس تنہا یونیورسٹی کو بھی مٹا دیا گیا۔

صبح تک تو نے نہ چھوڑی وہ بھی اے بادِ صبا
یادگار شمع تھی کل تک جو پروانے کی خاک

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے دارالمصنفین جیسے علمی اور تصنیفی ادارہ کی باگ ڈور اس وقت سنبھالی جب ملک میں مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں مایوسی طاری تھی، تقسیم کے بعد مسلمانوں کے ساتھ اور ان کی زبان اور ثقافت کے ساتھ سوتیلا سلوک کیا جارہا تھا۔ انھوں نے مایوس کن حالات کے باوجود ادارہ کو اپنے عزم اور خلوص کے ذریعہ ترقی کے راستہ پر گامزن رکھا۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی ، ناظم دارالمصنفین مولانا شاہ معین الدین ندوی کے بارے میں پرانے چراغ میں لکھتے ہیں:

> ہندوستان کے سر پر سے تقسیم ملک جوئے خوں گذر گئی تھی تصنیفی اور تحقیقی اداروں کے لئے جن کی بنیاد اسلام کے خزانہ عامرہ کی حفاظت و اشاعت پر تھی اور جن کا خمیر سیرت نبوی اور تاریخ اسلام سے اُٹھایا گیا تھا، زندگی کا میدان تنگ اور مستقبل تاریک سے تاریک تر نظر آرہا تھا، سیاسی اور اقتصادی انقلاب نے علمی ذوق، اسلامی کتابوں کی اشاعت اور تحقیقی کام کو بے وقت کی شہنائی قرار دے دیا تھا۔ مسلمانوں کا جذبہ اعانت و ایثار مفلوج سا ہو گیا تھا، علمی و دینی اور خصوصیت کے ساتھ بلند پایہ تحقیقی کتابوں کی خریداری اور ایسے اداروں کی سرپرستی کا جذبہ سرد؛ بلکہ مردہ ہوتا جارہا تھا ، دارالمصنفین کی کتابوں کے دو مارکٹ اور اس کے قدردانوں کے دو اہم فعال حلقے تھے، پنجاب اور حیدرآباد۔ ایک اس ملک سے کٹ چکا تھا، دوسرا انقلاب اور حوادث کا شکار تھا، ایسے حالت میں انھوں نے دارالمصنفین کی بظاہر ڈوبتی ہوئی کشتی سے اپنی قسمت اور سب صلاحیتیں وابستہ کردیں اور قلندر صفت درویش اور ایک سرپھرے ملاح کی طرح بے رحم دریا کے بہاؤ کے خلاف اس کو چلانے اور ساحل مراد تک پہنچانے کا عزم کرلیا۔

ڈاکٹر الیاس اعظمی نے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی پر پوری کتاب لکھ کر اُردو زبان و ادب کی خدمت انجام دی ہے اور تمام علماء اور مصنفین کی جانب سے فرض کفایہ انجام دیا ہے، ان کی حیات اور خدمات کو جو" ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما" کی مصداق ہیں، تفصیل کے ساتھ سوانح کی شکل میں پیش کردیا ہے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کا شمار مشاہیر علم وقلم میں ہوتا ہے، ان کا تعلق ایک صوفی خاندان سے تھا، ان کے جدامجد شیخ عبدالحق ردولوی تھے جو فاروقی تھے اور جلال الدین کبیر الاولیاء عثمانی کے خلیفہ تھے اور جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی حضرت شمس الدین ترک کے تنہا خلیفہ تھے اور شمس الدین ترک حضرت صابر کلیری کے تنہا خلیفہ تھے، حضرت کبیر الاولیاء پانی پتی سے صابری چشتی سلسلہ کو بہت فروغ حاصل ہوا ان کے بہت سے خلفاء تھے؛ لیکن ان کے اصل جانشین اور مسند نشین عبدالحق ردولوی تھے، مولانا شاہ معین الدین ندوی کی پہلی شادی شہر گیا کے رئیس شاہ مصطفیٰ صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی تھی، ڈاکٹر الیاس اعظمی نے تفصیل کے ساتھ ان کے

خاندانی حالات کا تذکرہ کیا ہے، جس سے ان کے ذوق جستجو کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کو شروع سے مطالعہ کا ذوق تھا، ندوۃ العلماء میں تعلیم کے زمانہ میں مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی کی صحبت سمند شوق کے لئے تازیانہ کا کام کرتی رہی اور ان کی صلاحیتوں کو صیقل کرتی رہی، یہ صحبت اس نسیم سحر کی مانند تھی جو غنچہ کو گل شگفتہ اور گل نو دمیدہ بنا دیتی ہے، آج دنیا مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کو نہیں جانتی ہے؛ کیوں کہ ان کی زندگی ''خوش درخشید ولے دولتے مستعجل بود'' کا مصداق تھی، مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کا خاکہ بہت اچھا لکھا ہے اور ان کی عبقریت کی بہت تعریف کی ہے۔

ڈاکٹر الیاس اعظمی اس کتاب کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک عالم جلیل اور ایک عظیم مصنف کی زندگی کو صفحہ قرطاس پر مرتسم کر دیا ہے۔ کتاب کے اخیر میں مکاتیب کے اضافہ نے کتاب کی قیمت کو دو چند کر دیا ہے، کتاب کے اس حصہ میں شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب سے دو طرفہ مراسلت بھی شامل ہے، اس مراسلت سے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے متصوفانہ ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ تصوف و احسان کے بغیر شخصیت میں گداز نہیں پیدا ہوتا ہے، اس اعتبار خاص سے وہ دارالمصنفین میں مولانا سید سلیمان ندوی کے مکمل جانشین؛ بلکہ سجادہ نشین تھے، دارالمصنفین کے موجودہ ذمہ داروں کے لئے بھی سلف کی مکمل جانشینی کے لئے ساغر وسندان کو اسی طرح بہم کرنا ضروری ہے۔

نصیب مدرسہ یارب یہ آبِ آتش ناک

☆☆☆☆
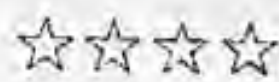
تنقیحات — ایک بصیرت افروز کتاب

عصر حاضر میں عالم اسلام کے ممتاز مفکرین اور علمائے دین میں ایک نام مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا ہے، برصغیر کی کئی شخصیتوں نے اپنی تصنیفات اور خدمات اور اسلامی فکر کے ذریعہ دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے اور دنیا نے ان کی عبقری شخصیت کا اعتراف بھی کیا ہے، ان شخصیتوں میں

ایک ممتاز نام مولانا مودودی کا ہے۔مولانا مودودی کی بیشتر کتابوں کا دنیا کی اہم زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، انھوں نے سو سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ تفہیم القرآن، تفہیمات، خلافت وملوکیت، الجہاد فی الاسلام، سود، پردہ، اسلام اور جدید معاشی نظریے، اسلام کا نظام حیات وغیرہ ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ ان کی مشہور کتابوں میں ایک کتاب ''تنقیحات'' بھی ہے، مولانا مودودی کی جو حیثیت مسلم ہے وہ ان کے متکلم اسلام ہونے کی حیثیت ہے۔ اسلام پر مغرب کے اعتراضات کا مدلل جواب اور اسلام کو دلنشین انداز میں پیش کرنے کا ان کا ملکہ خداداد ہے۔ ان کے زور تحریر طاقتور اُسلوب اور حسن انشاء نے ہزاروں انسانوں کو اپنا گرویدہ بنایا ہے، ہزاروں نوجوان جو الحاد، بے دینی، اشتراکیت یا لامقصدیت کی راہ پر جارہے تھے، مولانا مودودی کے لٹریچر نے ان کو اسلام پسندی کے راستے پر ڈال دیا۔ اسلامی موضوعات پر جدید ادبی اُسلوب میں لکھنے والوں کی ایک جماعت پیدا کردی، قدیم طرز کے علماء کو مولانا کی کئی باتوں سے اختلاف بھی ہے، یہ اختلاف صحیح بھی ہوسکتا ہے؛ لیکن افسوس یہ ہے کہ اختلاف کرنے والوں میں زیادہ تر لوگوں نے زبان اور لہجہ کی شائستگی اختیار نہیں کی۔ مناسب بات یہ تھی کہ مولانا مودودی کی خدمات کا کھل کر اعتراف کیا جاتا اور شائستگی کے ساتھ تنقید کی جاتی اور حدیث ''الدین نصیحۃ'' کا انداز اختیار کیا جاتا کہ یہی صحیح اسلامی طریقہ کار ہے'' ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم'' لیکن'' مودودیت کا فتنہ'' اور'' مودودی کی گمراہ کن باتیں'' کے طرز کی کتابیں منظر عام پر آنے لگیں اور اس ادارہ کے علماء نے لکھیں جسے ہندوستان کا ازہر کہا جاتا ہے۔

تنقیحات مولانا مودودی کے طاقتور فکر انگیز اور بصیرت افروز انداز تحریر کا نمونہ ہے، بہت سے لوگ عالم ہوتے ہیں اور بعض محقق بھی ہوتے ہیں؛ لیکن مولانا مودودی کا امتیازی وصف عالم اور محقق ہونے کے ساتھ ان کا مفکر اور ادیب ہونا ہے۔ ان کا تفکیری وصف ان کی تحریروں سے بہت نمایاں ہے، ان کی فکر میں گہرائی ہے اور پھر وہ اپنی تجدیدی فکر کو دلنشین اُسلوب کے قالب میں پیش کرتے ہیں اور قاری رعنائی افکار سے اور زیبائی گفتار سے متاثر ہوتا ہے اور پھر افکار کو قبول کر لیتا ہے، پورے برصغیر میں ان کی مقبولیت کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔ وہ خود اکیلے اپنے طے شدہ راستہ پر چلے تھے؛ لیکن ان کی نگارشات کی وجہ سے لوگ کارواں در کارواں ان کے ساتھ ہو گئے اور ایک منظم جماعت تیار ہوگئی، عربی ترجمہ کے بعد ان کی کتابیں عرب دنیا میں پڑھی گئیں اور ان کے افکار سے افراد بھی متاثر ہوئے دینی جماعتیں بھی متاثر ہوئیں۔

تنقیحات میں ایک مضمون ہے جس کا عنوان ہے ''دورِ جدید کی بیمار قومیں'' مولانا مودودی کے اُسلوب نگارش کا اندازہ کرنے کے لئے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> یہ وقت ہے کہ مغربی قوموں کے سامنے قرآن اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کو پیش کیا جائے اور انھیں بتایا جائے کہ یہ وہ مطلوب ہے جس کی طلب میں تمہاری روحیں بے قرار ہیں، یہ ہے وہ امرت رس جس کے تم پیاسے ہو یہ ہے وہ شجر طیب جس کی اصل بھی صالح ہے اور شاخیں بھی صالح، جس کے پھول خوشبودار بھی ہیں اور بے خار بھی، جس کے پھل میٹھے بھی ہیں اور جاں بخش بھی، جس کی ہوا لطیف بھی ہے اور روح پرور بھی، یہاں تم کو حکمت عملی ملے گی، یہاں تم کو فکر ونظر کے لئے صحیح نقطہ آغاز ملے گا، یہاں تم کو وہ علم ملے گا، جو انسانی سیرت کی بہترین تشکیل کرتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ کتاب کا یہی اقتباس لائق توجہ ہے واقعہ یہ ہے کہ کتاب کو کہیں سے کھولئے لگتا ہے دبستاں کھل گیا، ادب کے طبلۂ عطار سے خوشبو کا جھونکا آتا ہوا محسوس ہوگا۔ کتاب تنقیحات علماء اور مسلم نوجوانوں کے مطالعہ کے لئے اہم کتاب ہے، کتاب کے مضامین اور عنوانات میں تنوع ہے؛ لیکن تمام مقالات میں ایک اندرونی رابطہ موجود ہے اور وہ رابطہ یہ ہے کہ مسلمان مغربی تہذیب کا مقابلہ کیسے کریں ان کا انحطاط کیسے ختم ہو، جوش نمو کیسے پیدا ہوا، پت جھڑ کا موسم کیسے ختم ہو، چمن میں بہار کیسے آئے، چہرے پر نکھار کیسے آئے، عزت عروج واقبال کی باز آفرینی کیسے ہو اور یہ سب کچھ ادب اور انشاء کی زبان میں ہے۔ ادب کے طلبہ کو بھی اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے، یہ کتاب ادب کی کتاب نہیں؛ لیکن اس میں جو زبان استعمال ہوئی ہے وہ اس دور کے اُردو کے اساتذہ اور مصنفین اور ناقدین نہیں لکھ سکتے ہیں۔ بڑے بڑے ادیب اور ناقد سب طفل مکتب نظر آتے ہیں دانش گاہوں میں جو نثری نمونے پڑھائے جاتے ہیں ان میں مولانا مودودی کی نثر بھی پڑھائی جانی چاہئے۔

تنقیحات میں مختلف النوع مضامین ہیں؛ لیکن ہر مضمون میں مسلمانوں میں اسلامی فکر و نظر پیدا کرنے اور مغرب سے مرعوبیت کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مولانا مودودی کا قلم ایک نشتر ہے جس کا کام فاسد مادہ کا اخراج ہے اور دل ودماغ کی بیماریوں کا علاج ہے اور یہ سب کچھ طاقتور اُسلوب اور زور انشاء کے ساتھ ساتھ ہے۔ گویا قلب اور قالب معنی اور لفظ دونوں اعتبار سے

مولانا مودودی کی یہ کتاب مطالعہ کے لائق ہے، اس کتاب میں ایک مضمون ''تجدد کا پائے چوبیں'' کے عنوان سے ہے، یہ مضمون رسالہ ''نگار'' کے ایڈیٹر نیاز فتح پوری کے جواب میں ہے، مولانا مودودی نے نگار کا پورا مضمون پہلے نقل کردیا ہے، اس کے بعد اس کا جواب دیا ہے۔ نیاز فتح پوری صاحب اُسلوب انشاء پرداز اور اسی کے ساتھ ایک اسکالر اور وسیع المطالعہ انسان تھے، اس وقت ادب کی دنیا میں شاید ہی کوئی شخص ہو جو نیاز فتح پوری کی طرح خوبصورت نثر لکھنے کا سلیقہ رکھتا ہو۔ اس کتاب میں نیاز فتح پوری کی تحریر پڑھ لیجئے اور اس کے جواب میں مولانا مودودی کی تحریر اور فیصلہ کیجئے کہ ادب کی میزان پر کس کی تحریر زیادہ بہتر اور حسین تر ہے اور جہاں تک منطق اور استدلال کا تعلق ہے نیاز فتح پوری چاروں خانے چت نظر آتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ اکھاڑے میں پہلے نیاز فتح پوری آتے ہیں اور چیلنج دیتے ہیں اور ''ہل من مبارز'' کی صدا لگاتے ہیں، مقابلہ کے لئے مولانا مودودی اکھاڑے میں اُتر آتے ہیں اور پھر چند منٹ میں ہار جیت کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ مولانا مودودی نے مضمون کے ختم کرنے کے بعد جو چھوٹا سا نوٹ لکھا ہے وہ چشم کشا ہے، ''یہ امر ناظرین کے لئے دلچسپی کا موجب ہوگا کہ اس مضمون کے جواب میں ''ترجمان القرآن'' کا تبادلہ ''نگار'' سے بند ہو گیا اور آج تک بند ہے، کچھ لوگ ہمارے نیم پختہ نوجوانوں کو چند ظاہر فریب باتوں سے بہکانے کا کام تو خوب لیتے ہیں، مگر علمی طریقہ پر باقاعدہ اور اُصولی بحث کا جب موقع آتا ہے تو ان کا ''پائے چوبیں'' سخت بے تمکین ثابت ہوتا ہے''۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے موجودہ نظام تعلیم کے بارے میں مولانا مودودی کا ایک مضمون ہے، انھوں نے بتایا کہ کچھ لوگ قدیم طرز کے مدرسہ میں بعض جدید مضامین کو شامل کرلینے کو جدید کاری سے تعبیر کرتے ہیں اور کچھ لوگ مغربی طرز کی دانش گاہ میں کچھ قدیم اسلامی کتابیں شامل کرکے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ انھوں نے اسلام کی طرف سے اپنا فرض ادا کرلیا، اس بات کو انھوں نے استعارہ کی زبان میں طنز و مزاح کی چاشنی کے ساتھ پیش کیا ہے، ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> بد قسمتی سے ہم کو دونوں گروہوں میں ایک بھی مجتہد نظر نہیں آتا ہے، انتہائی جرأت کرکے پرانے جہاز والوں میں سے کوئی اجتہاد کرتا ہے تو بس اتنا کہ اپنے اس پرانے جہاز میں چند بجلی کے بلب لگالیتا ہے کچھ نئے طرز کا فرنیچر مہیا کرلیتا ہے اور ایک چھوٹی سی دخانی کل خرید لاتا ہے جس کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ دور سے سیٹی بجا بجا کر لوگوں کو یہ دھوکا دیتی ہے کہ پرانا جہاز اب نیا ہو گیا ہے اس کے

مقابلہ میں نئے جہاز والے اگر چہ کہ دوسروں کے جہاز پر بیٹھے ہیں اور تیزی کے ساتھ سمت مخالف پر بہے چلے جارہے ہیں، مگر وہ چار پرانے بادبان لے کر بیسویں صدی کے اس اپ ٹوڈیٹ جہاز میں لگائے ہوئے ہیں تاکہ اپنے نفس کو اور مسلمانوں کو یہ دھوکا دے سکیں کہ یہ جہاز بھی ''اسلامی جہاز'' ہے اور لندن کے راستے سے حج کعبہ کو جارہا ہے۔

مولانا مودودی کی جن کتابوں کا مطالعہ اہل علم وادب کو کرنا چاہئے یہ کتاب بھی ان میں ایک اہم کتاب ہے، خاص طور پر مغرب اور اس کے طلسم کو توڑنے کے لئے ان کی افادیت مسلم ہے اسے مغربیت کے زہر کا تریاق بھی کہہ سکتے ہیں اور تہذیب جدید کے امراض کے لئے نسخہ شفا بھی۔ اگر لوگوں کو نئی نسل کے ذہنی حفظان صحت کی فکر ہے تو ان کو یہ کتاب ضرور پڑھوائیں، اسے اپنے گھر میں اس طرح رکھیں جس طرح ضروری دوائیں گھر میں رکھی جاتی ہیں، قوم کے اصل طبیب وہ نہیں ہیں جن کے پاس ایم بی بی ایس اور ایم ایس یا ایم ڈی کی ڈگریاں ہوتی ہیں، قلم کے طبیب بلند نظر علماء اور مفکرین ہوتے ہیں اور وہی معاشرہ کی تعمیر کے انجینئر بھی ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆

کتابوں کے درمیاں

ادبیات

علامہ اقبال کے بارے میں عربی زبان میں کتابیں

اقبال کا آفتاب اقبال صرف برصغیر کی سرزمین پر ہی درخشانی نہیں کررہا ہے؛ بلکہ دنیا کے وسیع رقبہ کو منور کررہا ہے۔ بہت سے ملکوں میں بہت سی زبانوں میں اس کے بارے میں کتابیں لکھی جاتی ہیں، مضامین لکھے جاتے ہیں، اس کا اُفق بے حدود اور بے ثغور ہے، اس کے شعروفن اور فکر و فلسفہ پر ایک عظیم کتب خانہ وجود میں آگیا ہے۔ ہندوستان کے کسی شاعر کو اس بارے میں اس کی ہم سری کا دعویٰ نہیں ہوسکتا ہے، اقبال کے سینہ میں اسلام کا جو درد تھا اور عالم اسلام سے جو شغف تھا وہ اس کے کلام سے عیاں ہے۔ آج اقبال سے عرب دنیا کا علمی اور ادبی حلقہ واقف ہے اور وہ اقبال کے پیغام سے بھی آشنا ہے، ہندی نژاد شاعر اقبال کے فکر کی خوشبو دنیائے عرب میں اس طرح پھیل گئی ہے جس طرح شمیم گل چمن سے نکل کر پھیل جاتی ہے اور ہواؤں کو معطر بنا دیتی ہے۔

حیدرآباد کی سرزمین کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ عرب دنیا میں اقبال کے باقاعدہ تعارف کا کام یہیں سے شروع ہوا۔

اقبال کے بارے میں عربی زبان میں پہلی کتاب حیدرآباد میں لکھی گئی، یہ پہلی کتاب فلسفہ الحیاۃ والموت فی شعر اقبال ۱۹۴۶ء میں مرکزی بزم اقبال حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی، یہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کا مقالہ تھا جو عثمانیہ یونیورسٹی میں ریاضی کے پروفیسر تھے۔ کتاب کا ترجمہ حسن اعظمی صاحب نے کیا تھا انھوں نے جامع ازہر میں تعلیم حاصل کی تھی اور جب مصر کی یونیورسٹی میں اُردو کا شعبہ قائم ہوا تھا تو وہ اس کے پروفیسر مقرر ہوئے تھے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ تھی کہ اقبال کے جو اشعار فارسی یا اُردو میں تھے اس کا عربی منظوم ترجمہ مصر کے شاعر صاوی شعلان نے کیا تھا، مصر کے ممتاز ادیب اور شاعر صاوی شعلان اور عبدالوہاب عزام نے ڈاکٹر حسن اعظمی سے اُردو سیکھی تھی، یہ اقبال کا اولین نقش تھا جو عرب دنیا میں قائم ہوا تھا۔ اس کے بعد قاہرہ میں ایک انجمن ''الأخوۃ الإسلامیۃ'' کے نام سے قائم ہوئی جس میں اقبال کے بارے میں مختلف ادیبوں نے اپنے خطبات پیش کئے اور ملک کی مشہور ادبی شخصیتوں کے اقبال کے بارے میں لکچر ہوئے، طٰہٰ حسین اور

عباس محمود عقاد جیسے قادر الکلام ادیب اس بزم میں شریک ہوئے تھے۔ عربی زبان میں یہ پہلی کتاب جو اقبال پر حیدرآباد سے شائع ہوئی وہ نواب حسن یار جنگ بہادر صدر مرکزی بزم اقبال کے پیش لفظ سے مزین ہے، تعارف مدیر رسالہ مخزن سر عبدالقادر کے قلم سے ہے، ابتدائیہ عربی شاعر و ادیب ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے لکھا ہے جو ماہر اقبالیات سمجھے جاتے ہیں اور اقبال پر جن کی متعدد کتابیں ہیں، انھوں نے اپنی تحریر میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کو ''الحائز بجائزۃ نوبول'' یعنی نوبل انعام یافتہ لکھا ہے جو واقعہ کے خلاف ہے اگرچہ وہ اس انعام کے حق دار تھے اور ان کا نام تجویز بھی کیا گیا تھا، یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔

اس پہلی کتاب کے چار سال کے بعد ۱۹۵۰ء میں محمد حسن اعظمی اور صاوی شعلان کے اشتراک سے ایک دوسری کتاب ''فلسفة اقبال و الثقافة الإسلامية فى الهند و باكستان'' کے نام سے زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس کتاب میں برصغیر کی اسلامی ثقافت کا بھی تعارف کرایا گیا ہے، علامہ شبلی، علامہ سید سلیمان ندوی اور دارالمصنفین کا تذکرہ اور تعارف بھی ہے، اقبال کی کئی نظموں کے ترجمے ہیں، شکوہ اور جوابِ شکوہ کا اور ابلیس کی مجلس شوریٰ کا بھی ترجمہ ہے، کتاب کا مقدمہ مشہور ادیب اور جامعہ قاہرہ کے پروفیسر امین الخولی کے قلم سے ہے۔

پھر اقبال کا وسیع پیمانہ پر عربی ترجمہ کا کام ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے کیا، وہ فارسی زبان سے واقف تھے، انھوں نے ۱۹۳۰ء میں پہلی بار لندن میں اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کے ایک لکچر میں اقبال کا نام سنا تھا۔ چند سال کے بعد جب عبدالوہاب عزام ترکی گئے تو وہاں کے مشہور شاعر محمد عاکف نے اقبال کے دیوان پیام مشرق کا نسخہ دکھایا، عبدالوہاب عزام نے عاریۃً پڑھنے کے لئے مانگا اور انھوں نے کئی بار اسے پڑھا۔ ان کا بیان ہے کہ انھیں اس دیوان میں حافظ شیرازی اور فارسی کے دوسرے بڑے شاعروں کی عظمت محسوس ہوئی؛ لیکن جہاں تک فکر اور فلسفہ کا تعلق تھا، اقبال کا کلام برتر اور فائق تر تھا۔

پیام مشرق سے انھیں اقبال کے دوسرے دواوین کے پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا ''راقنى الشعر و شاقنى الى الاستزادة منه'' ان کا بیان ہے کہ چند سال کے بعد مصر میں ایک طالب علم نے انھیں اسرار خودی اور رموز بے خودی کا نسخہ لا کر دیا، انھوں نے ان دونوں دیوان کو اس طرح پڑھا جس طرح پیاسا پانی پیتا ہے، انھوں نے پھر اقبال کے دوسرے دیوان مسافر اور پس چہ باید کرد بھی منگائے، اس کے بعد جب اقبال فلسطین براہ مصر گئے تو انھوں نے اقبال کے اعزاز میں ایک

جلسہ منعقد کیا اور اقبال کے اشعار کا فارسی ترجمہ جلسہ میں سنایا۔ ان کا بیان ہے کہ مشہور مستشرق پروفیسر آرنلڈ جب مصر گئے تو انھوں نے آرنلڈ کو اقبال کا ثنا خواں پایا، پیام مشرق کا پہلا منظوم ترجمہ عبدالوہاب عزام کے قلم سے رسالۃ الشرق کے نام سے شائع ہوا اس کے بعد انھوں نے اسرار خودی کا منظوم ترجمہ (اسرار الذات کے نام سے) رموز بے خودی کا منظوم ترجمہ (اسرار نفی الذات کے نام سے) کیا ہے، جب وہ پاکستان میں مصر کے سفیر مقرر ہوئے تو جاوید نامہ کا منظوم ترجمہ (رسالۃ الخلود کے نام سے) کیا ہے اور جب انھوں نے اُردو سیکھ لی تو بانگ درا کا منظوم ترجمہ (صلصلۃ الجرس کے نام سے) کیا۔ اقبال کے بارے میں انھوں نے کئی مضامین لکھے، مجموعہ مضامین ''حیاۃ اقبال و فلسفتہ و شعرہ'' کے نام سے منظر عام پر آیا، یہ کتاب اسٹیٹ لائبریری کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے، رسالۃ الشرق (پیام مشرق کا ترجمہ) عثمانیہ یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے، اسی طرح ضرب کلیم (عصاء موسیٰ کے نام سے) اور بال جبرئیل (جناح جبرئیل کے نام سے) کے عربی ترجمے بھی ہو چکے ہیں، ارمغان حجاز (ہدیۃ الحجاز) کا منظوم عربی ترجمہ شیخ صاوی شعلان نے کیا ہے، اس کے بعد استاذ سمیر عبدالحمید ابراہیم کی کتاب بھی ''اقبال و دیوانِ ارمغان حجاز'' شائع ہوئی۔

یہ وہ ابتدائی کوششیں ہیں جن سے اقبال کے تعارف اور فکر کی ترسیل میں مدد ملی اور اقبال کی ادبی جہاں گیری اور فکری جہاں داری کی سطوت عرب دنیا کے ادبی حلقہ میں قائم ہوئی، عرب ادباء کے مضامین کا مجموعہ مصر میں پاکستانی سفارت خانہ نے ۱۹۵۶ء میں شائع کیا، ان کتابوں کی مدد سے کلام اقبال کی بازگشت عرب دنیا میں سنائی دینے لگی ۱۹۵۶ء تک نصف درجن سے زیادہ کتابیں اقبال پر عربی زبان میں شائع ہو چکی تھیں۔

عرب دنیا کے مشہور مجلّہ ''المسلمون'' میں معروف شامی ادیب علی طنطاوی کا ایک مضمون ''کتاب مفتوح إلی الأستاذ أبی الحسن علی الندوی'' (مولانا ابوالحسن علی ندوی کے نام کھلا خط) کے عنوان سے شائع ہوا، اس کا ماحصل یہ تھا کہ اب تک کلام اقبال کے منظوم عربی ترجمے ہمارے سامنے آتے رہے ہیں اور منظوم ترجمہ کی اپنی محدودیت ہوتی ہے، جس کی وجہ سے فکر اقبال کا پورا تعارف ہمارے سامنے شاید نہیں آسکا ہے، اس مضمون میں مولانا سے جن سے عرب دنیا بخوبی واقف تھی یہ درخواست کی گئی کہ وہ شعر اقبال کا نثری ترجمہ کریں۔ مولانا نے اقبال کے مشہور نظموں کے ترجمے کا کام شروع کیا، یہ فرمائش مولانا کے خود اپنے دل کی آواز تھی، انھیں محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے ان کے مضراب دل کو چھیڑ دیا ہو اور اس سے خوش آہنگ نغمہ پھوٹ پڑا ہو، مولانا کے یہ

عربی مضامین ان کے طرز نگارش کا بہترین نمونہ ہیں۔ کتاب روائع اقبال کے نام سے شائع ہوئی، اس کی علمی ادبی حلقوں میں زبردست پذیرائی ہوئی، عرب دنیا میں مشکل سے کوئی بڑی کتاب کی دکان ایسی ملے گی جہاں یہ کتاب موجود نہ ہو، کتاب نہ صرف اقبال کے مؤثر ترجمانی ہے؛ بلکہ خود تخلیقی اور انشائی ادب کا نمونہ ہے، کتاب کے بے شمار ایڈیشن نکلے، ہوا کے دوش پر فکر اقبال کی خوشبو پھیلتی چلی گئی، مولانا کو قاہرہ یونیورسٹی اور فواد یونیورسٹی میں اقبال پر لکچر دینے کے لئے بلایا گیا، مولانا نے اس کتاب میں اقبال سے اپنی ملاقات اور گفتگو کا بھی تذکرہ کیا ہے، مولانا ندوی نے اپنی عربی کتاب ''الصراع بين الفكرة الإسلامية والغربية'' (اسلام اور مغربیت کی کشمکش) میں ایک باب اقبال کے لئے خاص کیا اور اقبال کی فکر کی ترسیل میں اس سے بھی مدد ملی۔

۱۹۳۸ء میں علامہ اقبال کا انتقال ہو گیا، انتقال کے بعد عربی کے ادیب اور انشاء پرداز مولانا مسعود عالم ندوی نے مصر کے ادبی اور علمی رسالہ الفتح میں مضمون لکھا جس کا موضوع حیاتِ اقبال اور پیام اقبال تھا، ۱۹۸۹ء میں ڈاکٹر حسین مجیب المصری کی کتاب اقبال والقرآن شائع ہوئی، پھر ان کی دوسری کتاب محمد اقبال شاعر باكستان الاكبر کے نام سے شائع ہوئی، پھر ان کی تیسری کتاب اقبال والعالم العربی ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی جس میں عالم اسلام سے اقبال کے جذباتی تعلق کا اظہار کیا گیا تھا اور اقبال کے اشعار کے ترجمے دیئے گئے تھے، پھر ان کی چوتھی کتاب ''اقبال بين المصلحين الإسلاميين'' کے نام سے شائع ہوئی۔ اب گویا عرب دنیا میں اقبال کے باقاعدہ دور کا آغاز ہو گیا، ہر سال کئی کتابیں منظر عام پر آنے لگیں، ایک اہم کتاب مصر کے ادیب ناقد اور افسانہ نگار نجیب کیلانی کے قلم سے ''اقبال الشاعر الثائر'' کے نام سے شائع ہوئی اس کتاب پر حکومت کی طرف سے مصنف کو انعام سے نوازا گیا، مولانا علی میاںؒ کی کتاب کے بعد یہ کتاب ادبی حلقہ میں بہت مقبول ہوئی۔

ڈاکٹر محمد البہی معروف اسلامی مفکر ہیں، ان کی ایک ضخیم کتاب ہے، ''الفكر الإسلامي الحديث'' اس کتاب میں ایک باب اقبال کے فکر و فلسفہ پر ہے، چنانچہ اسلامی فکر و فلسفہ کے موضوع پر جتنی کتابیں شائع ہوئیں ان میں اقبال کا تذکرہ پایا جاتا ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اقبال کو ایک اسلامی مفکر کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ چنانچہ محمد حمدان کی کتاب ''الفلاسفہ والفکر الاسلامی'' استاذ علی سامی النشار کی کتاب ''نشأة الفكر الفلسفي في الإسلام'' میں تفصیل کے ساتھ اقبال کے فکر پر بحث کی گئی ہے، ادب کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں بھی بطور خاص اقبال

کا تذکرہ پایا جاتا ہے، دکتورہ سہیر قلماوی کی کتاب ''النقد الأدبی'' میں نجیب کیلانی کی کتاب ''الإسلامية و المذاهب الأدبية'' میں اقبال کا بحیثیت شاعر اور مفکر تفصیلی تذکرہ ہے، الدکتور رجب البیومی نے اپنی کتاب ''النهضة الإسلامية و الأعلام المعاصرون'' میں تفصیل کے ساتھ اقبال کا ذکر کیا، اسی طرح سے استاذ عبدہ الشمالی نے ''دراسات فی تاریخ الفلسفة العربية الإسلامية'' میں اقبال کا ذکر مناسب تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ شہرت یافتہ ادیب ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اقبال پر ایک مضمون لکھا اور اس مضمون میں اقبال کو تاریخ اسلام کا سب سے بڑا اسلامی شاعر قرار دیا، اس مضمون میں انھوں نے کئی اعتبار سے اقبال اور ابوالعلاء معری کے درمیان مماثلت اور اختلاف کے پہلو بتائے۔ بعض کتابوں کا موضوع کلام اقبال نہیں؛ لیکن ان کتابوں میں بھی اقبال کا تذکرہ مفصل ہے، جیسے ''تاریخ المسلمين فی شبه القارة الهندية'' اور ''غاندی والحركة الدينية''۔

ہندوستان میں جن شخصیات نے عرب دنیا میں عربی زبان میں اقبالیات کی اشاعت کی اہم خدمت انجام دی ان میں ایک حیدرآبادی سعید اور صالح نوجوان عبدالماجد غوری کا نام بھی ہے۔ انھوں نے کلام اقبال کے مکمل عربی شعری اور نثری ترجمے یکجا کردیئے اور ترجموں اور ضروری مضامین کا ایک پورا سٹ تیار کردیا، کتاب کا نام ہے ''دیوان محمد اقبال — الأعمال الكاملة'' یہ کتاب دمشق اور بیروت سے شائع ہوئی ہے، یہ کتاب تمام کتابوں میں گوہر شاہوار کی حیثیت رکھتی ہے، کتاب کے شروع میں ایک فاضلانہ مقدمہ ہے، اب عرب دنیا میں اقبالیات کا مطالعہ اس کتاب کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا ہے، یہ ضخیم کتاب دو جلدوں میں ہے اور مجموعی صفحات گیارہ سو دس ہیں۔

عربی زبان میں اقبال پر کتابوں کی فہرست طویل ہے، مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ چند مزید نام یہ ہیں:

۱- فلسفۃ محمد اقبال: استاذ حسون علی۔

۲- الأعلام الخمسة للشعر الإسلامی: محمد حسین اعظمی۔

۳- اقبال العرب علی دراسات اقبال: استاذ ظہیر الدین۔

۴- محمد اقبال مفکرا اسلامیا: استاذ محمد الکتانی۔

۵- فلسفۃ اقبال وأساسها: عبدالوہاب عزام۔

۶- العلامہ محمد اقبال: الدکتور عبدالرحمٰن شاہ ولی۔

۷- محمد اقبال وفکرہ الدینی والفلسفی: استاذ محمد العربی بوعزیزی۔

۸- العلامہ محمد اقبال حیاتہ وآثارہ: استاذ احمد معوض۔

۹- محمد اقبال وموقفہ من الحضارۃ الغربیۃ: دکتور خلیل عبدالرحمٰن راز۔

۱۰- نداء اقبال (مجموعہ مقالات)۔

۱۱- تجدید التفکیر الدینی فی الاِسلام ترجمہ:

(Reconstruction of Religious thoughts in Islam)

۱۲- المفکر الاِسلامی الکبیر محمد اقبال: عبداللہ مبشر الطرازی۔

۱۳- مع اقبال: عبداللطیف الجوہری۔

۱۴- حیاۃ اقبال: بروفیسور محمد منور۔

فہرست میں مزید کتابیں بھی ہیں، یہاں استقصاء مقصود نہیں؛ اُردو زبان میں اقبال پر بعض بڑی شاہ کار کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کتابوں کے عربی ترجمے عرب دنیا میں اقبال فہمی اور اقبال شناسی میں معاون ثابت ہوں گے، یہ کام باقی ہے:

گما مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں
ہزار بادہ نا خوردہ در رگ تاکست

☆ ☆ ☆ ☆

کئی چاند تھے سرِ آسماں

شمس الرحمٰن فاروقی کے اس خوبصورت ناول کا خوبصورت نام دراصل ایک خوبصورت شعر کا ٹکڑا ہے، شعر یہ ہے:

کئی چاند تھے سرِ آسماں کہ چمک چمک کے پلٹ گئے
نہ لہو مرے ہی جگر میں تھا نہ تمہاری زلف سیاہ تھی

افسانہ اور ناول کی حمایت میں یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اس میں ہو بہو زندگی کی تصویر کھینچی جاسکتی ہے، زندگی متحرک، جاوداں پیہم رواں، ہر دم جواں ہے، یہ ناول نگار کا موئے قلم ہے جو اسے صفحہ قرطاس پر مرتسم کر دیتا ہے۔ زندگی اپنے تمام نشیب وفراز کوہ وکمر خوشی اور غم خوبی اور خامی نقص وکمال اور قبح و جمال کے ساتھ ناول کے فن میں منعکس ہو جاتی ہے، افسانہ کا کینوس چھوٹا ہے اور ناول کا بڑا؛ لیکن کام دونوں کا ایک ہے اور وہ ہے معاشرہ کی چھوٹی یا بڑی تصویر کھینچنا، اگر افسانہ یا ناول کا پلاٹ عہد قدیم سے تعلق رکھتا ہے تو اس کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ فنکار کا مشاہدہ کتنا تیز ہے اور اس کا ذہن کتنا زرخیز ہے، اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ اس نے کتنی جزرسی اور دقیقہ سنجی سے کیا ہے، اس عہد کی تاریخ، مزاج، شخصیات، ادب شاعری فنون لطیفہ سے کتنا واقف ہے، پیکر تراشی اور منظر نگاری میں وہ کتنا مشاق ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا ناول ''کئی چاند تھے سرآسماں'' فکشن کی دنیا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، ان کے ادبی امتیازات سے کون واقف نہیں، انھوں نے اس ناول میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے سماج اور تاریخ کو زندہ اور متحرک سماج کے طور پر پیش کیا ہے، انھوں نے تہذیب اور ثقافت کے گوشوں کو منور کر دیا ہے، مغلیہ سلطنت کے ڈوبتے ہوئے سورج اور ادب وشاعری کے آسماں پر چمکتے ہوئے کئی چاند کا ایک دلکش منظر پیش کر دیا ہے، بحیثیت مجموعی قاری کو مسرت اور بصیرت کا احساس ہوتا ہے اور یہی فنکار کا کمال ہے اور یہی فن کی خوبی اور اس کا جمال ہے۔

یہ کتاب تاریخ نہیں، تاریخ تو ایک علم ہے سوشل سائنس ہے اور ناول فن ہے، علم سچائی کا نام ہے اور فن حسن کاری کا نام ہے؛ لیکن یہ ایسا ناول ہے جس کی جڑیں تاریخ میں پیوست ہیں پھر اس کے ساتھ تخیل کی گل کاری ہے جو فن کا لازمہ ہے، یہ ناول تاریخ کا دریچہ وا کرتا ہے، یہ وہ روزن ہے جس سے ایک عہد کو دیکھا جاسکتا ہے، ایسے عہد کو جو اب بھولا بسرا عہد ہے اور فعل ناقص ''کان'' کی خبر میں داخل ہو چکا ہے۔ چوں کہ یہ ناول ہے اس لئے عہد رفتہ کے تمام واقعات حقیقی نہیں ہیں؛ بلکہ اس میں تخیل کے رنگ روغن کی آرائش بھی شامل ہے، یہاں حقیقت کے کینوس پر افسانہ کا آب و رنگ ہے جو زیب داستان کے لئے ہے اور فن کی تکمیل کے لئے ہے، یہ تاریخ کی زمین پر تخیل کا محل ہے، یہ نثر کی صنف پر ایک خوبصورت غزل ہے۔ پلاٹ اور کردار سب عہد گزشتہ کے ہیں، اسی لئے کتاب کی زبان کو عہد گزشتہ ورفتہ کی زبان سے قریب رکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور ایسی زبان معرض تحریر میں لائی گئی ہے جس پر فارسی اور عربی کے گہرے اثرات ہیں، اس دور کی ثقافت میں کسی ایسے

شخص کو تعلیم یافتہ نہیں سمجھا جاتا تھا جو عربی اور فارسی سے آشنا نہ ہو؛ چنانچہ فارسی اشعار ناول میں اپنی بہار دکھاتے ہیں اور عربی الفاظ گوہر آب دار کی طرح نظر آتے ہیں، شعراء مشاعروں میں جلوہ گر ہیں، شعر کی نزاکتوں اور محاسن و رموز کی طرف اشارے ہیں، یہ ایک بہترین ادبی ناول ہے۔ اُردو میں جتنے اچھے اور بڑے ناول لکھے گئے ہیں جیسے عبداللہ حسین کا ناول 'اُداس نسلیں' اور شکوت صدیقی کا ناول 'خدا کی بستی' جیلانی بانو کا ناول 'ایوانِ غزل' جمیلہ ہاشمی کا ناول 'تلاشِ بہاراں' حیات اللہ انصاری کا ناول 'لہو کے پھول' قرۃ العین حیدر کا ناول 'آگ کا دریا' وغیرہ ان میں ہر ایک کی حیثیت ایک سنگ میل کی ہے؛ لیکن یہ ناول 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' آسمان ادب پر طلوع ہونے والا ایسا چاند ہے جو تا دیر ضوفگن رہے گا، اس ماہتاب چہاردہم کی درخشانی اس آفتاب کی رہین منت ہے، جسے عربی میں ''شمس'' کہتے ہیں، شمس الرحمٰن فاروقی، فاروقی نے عہد گذشتہ کے ادب اور تہذیب کو زندہ کر دینے کا کارنامہ انجام دیا ہے، اس ناول میں آتش رفتہ کا سراغ بھی ہے اور کھوئے ہوئے کی جستجو بھی ہے۔

ناول کا پلاٹ ایک عہد کی تہذیب اور ثقافت پر مبنی ہے، کردار ناول کے پلاٹ سے مطابقت رکھتے ہیں، ہر کردار ایک طرز زندگی کا نمائندہ ہے، پلاٹ کے تمام کردار فرضی نہیں، مرزا غالب، نواب فخرو ولی عہد سلطنت، مارسٹن بلیک، نواب شمس الدین، مرزا داغ دہلوی، بہادر شاہ ظفر، ولیم فریز اور بے شمار حقیقی کرداروں کی دنیا آباد ہے۔ کرداروں کو اُجاگر کرنے کے لئے ناول نگار نے صورت شکل لباس و انداز ماحول اور اس کے متعلقات اور جزئیات کسی چیز کو نظر انداز نہیں کیا ہے، تہذیب و تمدن کی کوئی فرع ہو اس کی اصطلاحات کی قاموس اسے زبانی یاد ہے۔ جہاں راگ اور موسیقی کا ذکر چھڑ جائے گا اس کی تمام قسموں کا اور ناموں کا بیان ہوگا کہ معلوم ہوگا کہ ناول نگار کی زندگی اسی دشت کی سیاحی میں گزری ہے اور جب پہناوے اور ملبوسات کا کہیں ذکر آجائے گا تو مختلف تراش اور انواع و اقسام کے بیان کا دریا موجزن نظر آئے گا، علیٰ ہذالقیاس انگریزوں کے گھروں کی آرائش، نوابوں کے محلوں کی سجاوٹ عمارت سازی حویلیوں کی بناوٹ، چھت کی نقاشی، جالیوں کا طرز سنگ تراشی، منبت کاری، فرنیچر، لوازمات زینت اور اسلحہ اور سامان جنگ کی اصطلاحوں پر اور ان کے بیان پر فنکار کو عبور حاصل ہے، جہاں حسن کی جلوہ طرازیاں ہیں وہاں حسن کی تصویر کشی میں فنکار نے فن کا کمال دکھایا ہے۔ ناول نگار کا مشاہدہ بہت قوی ہے اور اُردو فارسی اشعار کی خوبصورت ترکیبیں اس کے حافظہ میں محفوظ ہیں، جس سے حسن کی صورت گری میں بہت

مدد ملتی ہے، فنکار کا موئے قلم ہر منظر کو نگاہوں میں مرتسم کر دیتا ہے، خلوت حسن کے معاملات کے لئے جن اشاروں اور استعاروں کا استعمال کیا گیا ہے وہ صرف اعلیٰ درجہ کے فنکار ادیب کے دسترس میں ہوتے ہیں اور ایک عام انسان کے لئے ان کا سمجھنا بھی آسان نہیں ہوتا ہے، یہاں فنکار کا کمال یہ ہے کہ اس نے ناگفتنی کو گفتنی بنا دیا ہے اور عریانی کو مستور کر دیا ہے، مکالمہ نگاری ادب کی بلندیوں پر نظر آتی ہے، اعلیٰ درجہ کے ادبی شعری ذوق کے بغیر ان مکالموں کی تخلیق نہیں ہو سکتی ہے۔ اس ناول کا مطالعہ کرنے والا ایسی مسحور کن طلسماتی دنیا میں کھو جاتا ہے، جس کا وجود کبھی ایک زندہ طلسمات کی حیثیت رکھتا تھا اور جہاں سر آسماں ایک ساتھ کئی چاند ضوافشانی کر رہے تھے اور اب اس ناول کے ذریعہ ان کی بازدید کا موقع مل رہا ہے۔

اُردو میں یہ پہلا ناول ہے جو اس اعتبار سے جدت اور ندرت رکھتا ہے کہ اس کے کردار فرضی نہیں حقیقی ہیں اور اس میں آرکائیوز کے وثیقوں کے حوالے دیئے گئے ہیں، حقیقت اور افسانہ Fact اور Fiction دونوں اس ناول میں بہم ہو گئے ہیں، نہ تو یہ کتاب سو فیصد تاریخ کی دستاویز ہے اور نہ سو فیصد تخیل کی پرواز ہے، پھر بھی یہ ناول ہی ہے؛ کیوں کہ جن باتوں کا تعلق حقیقت سے یا تاریخ سے ہے ان کو بھی ناول کے قالب میں ڈھال دیا گیا ہے، ولیم فریزر کا قتل تاریخ کا واقعہ ہے؛ لیکن اس کی تفصیلات جو کتاب میں بیان کی گئی ہیں، ان کا تعلق تخیل سے ہے۔ تاریخ تو کچھ اہم سنگ میل واقعات کی نشان دہی کر سکتی ہے، حقیقی واقعات کی درمیانی کڑیاں جوڑنے کے لئے راہ افسانہ اختیار کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، ''چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند'' تخیل کی زرخیزی اور داستان کی تحیر انگیزی اور عجوبہ زائی میں کتاب کہیں کہیں فسانہ عجائب ہے اور طلسم ہوش ربا اور داستانِ امیر حمزہ کے قدم چومتی ہے۔ قاری پڑھنے کے دوران جب ایک جگہ نماز جنازہ کے ذکر سے گزرتا ہے تو اس کے حاشیہ خیال میں بھی پہلے سے یہ بات نہیں ہوتی ہے کہ مردہ اچانک کفن سے نکل کر نماز کے امام پر حملہ کر دے گا اور اس طرح وزیر بیگم ایک بار پھر بیوہ ہو جائیں گی، بیوہ کے لئے بیوی بننے کی راہ ایک بار پھر ہموار ہو جائے گی اس طرح کے انقلاب روزگار سے سابقہ وزیر بیگم کو کئی بار پیش آیا، بیوی تھیں بیوہ ہوگئی، بیوہ تھیں بیوی بن گئیں، ٹھگی کا واقعہ نہ پیش آتا تو وزیر بیگم مغلیہ سلطنت کے ولی عہد کی بیوی کیسے بنتیں۔ ناول نگار کے قلم کی چابک دستی اور ہنرمندی ہر جگہ نمایاں ہے، پلاٹ کے تانے بانے بڑی مہارت سے بنے گئے ہیں، لطف اظہار اور حسن گفتار ناول کی اہم ترین خصوصیت ہے، کتاب کیا ہے ایک میخوانہ ہے جس کے جام وسبو پینے کے بعد ہوش وحواس کو

سلامت رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ تو حدیقہ کتاب کی حسن و خوبی اور اس کے محاسن ادبی اور عروس فن کے شیوہ ہائے محبوبی کا تذکرہ تھا اور تذکرہ کا پورا حق ادا کر دینے سے زبان معجز بیان ہو تو وہ بھی عاجز ہے۔ پلاٹ کا مرکزی کردار وزیر بیگم ہیں، پری تمثال، پیکر جمال، حسن میں بے مثال اور شعر و ادب میں باکمال پہلے مارٹن بلیک سے منسوب رہیں (اگر چہ بعض تذکروں میں شمس الدین اور ولی عہد سلطنت فخرو کے بعد مارٹ بلیک سے تعلق کا ذکر آتا ہے) اور پھر بغیر نکاح کے نواب شمس الدین کے آغوش کی زینت بنیں اور اس تعلق کا ثمر نواب مرزا داغ دہلوی تھے۔ اس ناول میں مشہور شاعر داغ دہلوی کے کردار کو شاعر خوش نام؛ لیکن ولد الحرام کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، اس میں بھی شک نہیں کہ ناول نگار نے بعض مؤرخین اور ادباء کے بیانات کی روشنی میں یہ کردار سازی کی ہے؛ لیکن تھوڑے سے مطالعہ اور تحقیق کی روشنی میں جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ یہ بات پایہ ثبوت تک نہیں پہنچی ہے کہ وزیر بیگم نواب شمس الدین کی محض داشتہ تھیں منکوحہ بیوی نہیں تھیں۔ جن لوگوں نے یہ الزام عائد کیا ہے ان کے پاس بھی اس کے سوا قطعاً کوئی ثبوت نہیں ہے کہ نواب شمس الدین کی ریاست کی ضبطی کے خلاف ان کی بیاہتا بیگم نے بیٹیوں کی طرف سے چارہ جوئی کی تھی؛ لیکن داغ کی والدہ وزیر بیگم کی طرف سے کوئی چارہ جوئی نظر نہیں آتی ہے، دوسرے یہ کہ نواب شمس الدین کی پھانسی کے بعد داغ کے دونوں چچا امین الدین اور ضیاء الدین اپنے یتیم ساڑھے چار سالہ بھتیجے داغ کی سرپرستی نہیں کرتے ہیں؛ حالاں کہ یہ خاندانی شرافت کا تقاضہ تھا، یہاں لوگوں نے قیاس کر لیا ہے کہ سرپرستی سے انکار اس لئے تھا کہ داغ نواب شمس الدین کے نطفہ سے تھے؛ لیکن نواب شمس الدین کا نکاح ان کی والدہ سے نہیں ہوا تھا، اسی طرح یہ بات بھی قیاس کر لی گئی ہے داغ کی والدہ وزیر بیگم نواب شمس الدین کی جائداد کی ضبطی کے خلاف اس لئے قانونی چارہ جوئی نہیں کر سکی تھیں کہ وہ منکوحہ بیوی نہیں تھیں۔

یہ دونوں مذکورہ باتیں کسی درجہ میں زیادہ سے زیادہ حیرت انگیز کہی جا سکتی ہیں؛ لیکن انھیں ثبوت کا درجہ حاصل نہیں لیکن یہ حیرت بھی ختم ہو جاتی ہے جب واقعات پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ نواب شمس الدین کی والدہ ایک میواتن تھیں جن سے ان کے والد نواب احمد بخش نے عقد کیا تھا اور بقول بعض مخالفین گھر میں ڈال لیا تھا۔ نواب شمس الدین کے دو بھائی امین الدین اور ضیاء الدین کی والدہ خاندانی وجاہت والی بیوی تھیں یہ عالی نسب اور عالی حسب بیوی اور ان کے صاحب

زادگان امین الدین اور ضیاء الدین، نواب شمس الدین سے خوش نہ تھے؛ کیوں کہ نوابی کا تخت بڑی اولاد ہونے کی وجہ سے ان کے حصہ میں آیا تھا، اس حقیقت کے پیش نظر نواب شمس الدین کے بیٹے داغ اور ان کی والدہ وزیر بیگم سے اہل خاندان کی برہمی اور چشمک اور معاندانہ سلوک قابل فہم ہے۔ وزیر بیگم اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھیں اگر انھوں نے حسد اور جلن کے ماحول سے خود ہی کنارہ کشی اختیار کر لی ہو اور جائداد کی ضبطی کے خلاف خاموش رہی ہوں تو حیرت کی بات نہیں، نواب شمس الدین اور وزیر بیگم کے مخالفین و معاندین کی پھیلائی ہوئی باتوں کی بنیاد پر داغ کے نسب کو مطعون کرنا محققین کو زیب نہیں دیتا ہے۔ محضر قتل پر شمس الرحمٰن فاروقی کے علاوہ بعض دوسرے محققین کی مہر بھی لگی ہوئی ہے اتنے سنگین الزام کے لئے دوسروں کا قول نقل کر دینا کافی نہیں ہے، ثبوت مہیا کرنا ضروری ہے، بعض دوسرے ناقدین ادب نے اس الزام کی صحت کا انکار کیا ہے، دیکھئے انتخاب کلام داغ مرتبہ ڈاکٹر محمود الرحمٰن، مطبوعہ پاکستان، مرزا داغ اور ان کے والد نواب شمس الدین کی روح شمس الرحمٰن فاروقی اور دیگر محققین سے کہہ رہی ہوگی:

سینکڑوں ملتے ہیں الزام کے دینے والے
ایک دو بھی نہیں آرام کے دینے والے

محض قیاسات کی بنیاد پر اور خاندان کے مخالف لوگوں کی پھیلائی ہوئی باتوں پر یقین کر کے ایسا سنگین الزام بغیر ثبوت عائد کر دینا اور اسے پھر ناول کا پلاٹ بنا دینا کوئی مستحسن بات نہیں۔ ناول فن اور ادب کی بلندی پر پہنچا ہے؛ لیکن ایک حقیقی کردار کو موضوع اتہام بنانے کی وجہ سے اخلاقی پستی کے عیب سے بری نہیں، بلندی اور پستی دونوں کتاب کا وصف ہے۔ بات ادب اور فن سے غیر متعلق سہی؛ لیکن ہم زندگی کو خانوں میں تقسیم کرنے کے روادار نہیں، ہمارے لئے یہاں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ خالص مثالی اسلامی معاشرہ میں (جو دنیا میں کہیں نہیں پایا جاتا) کسی انسان کی غلطی، خامی، لغزش کی تشہیر کی اجازت نہیں ہو سکتی ہے۔ اس معاشرہ میں صرف نیکی اور خوبی کے عطر بیز پھول اپنی بہار دکھائیں گے، صرف حسن اخلاق کی خوشبو مشام جاں کو معطر کرے گی۔ صرف اچھی عادتوں کا تذکرہ زبان پر آئے گا، برائی کسی شخص کی طرف منسوب نہیں کی جائے گی، برائی کے تذکرہ کی اجازت ملے گی تو ایوانِ عدالت کے اندر شہادت کے لئے یا صرف متعلقہ شخص کے سامنے اصلاح کی غرض سے، اسلام کا عادلانہ نظام اگر کہیں موجود ہو اور وہاں ایک شخص مرد اور عورت کو ملوث دیکھ لے جب بھی مہر سکوت زبان پر لگا لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں؛ کیوں کہ زبان کھلی

نہیں کہ سچائی کے باوجود حد قذف اس پر جاری ہو جائے گی تا آں کہ وہ مزید تین شخص کو گواہ کے طور پر نہ پیش کر دے، جوش ملیح آبادی نے "یادوں کی برات" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

اسلام میں مرد اور عورت کے ملوث ہونے پر رجم کی یا کوڑوں کی سزا درحقیقت گناہ کی سزا نہیں؛ بلکہ حماقت کی سزا ہے، مرد اور عورت کی اس سے بڑی حماقت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک شخص ان کی خلوت میں داخل ہو جائے تو بھی وہ مشغول رہیں اور پھر دوسرا آدمی داخل ہو جائے تو بھی باز نہ آئیں، یہاں تک کہ چار آدمی انھیں گناہ کا مرتکب ہوتے ہوئے دیکھ لیں۔ جوش ملیح آبادی نے لکھا ہے کہ کوئی شخص اتنا احمق ہو جائے اور گناہ پر بے حیائی کی آخری حد تک ڈھیٹ ہو جائے تو جو سزا اس کے لئے ہو کم ہے۔

ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں کسی پر یہ الزام لگانے اور الزام کو ہوا دینے کی اجازت نہیں ہے، تھوری دیر کے لئے تسلیم کر لیجئے کہ واقعہ وہی ہے جو شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے جو بعض محققین روایت کرتے ہیں تب بھی اسے کسی ناول کا پلاٹ بنالینا اور نواب شمس الدین اور داغ دہلوی کی اولاد و اخلاف کے لئے ایسا مواد فراہم کرنا کہ لوگ ان کے ساتھ طعن واستہزا کا برتاؤ کریں اخلاقی اعتبار سے کوئی اچھی بات نہیں ہے، اسے مرزا رسوا کے امراؤ جان پر بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا؛ کیوں کہ امراؤ جان کا کردار فرضی ہے جب کہ وزیر بیگم کا کردار حقیقی ہے۔

اگر میری تنقید قابل فہم اور لائق ہضم نہیں ہے یا کوئی شخص خندہ استہزا کے ساتھ کہتا ہے کہ "شعر مرا بہ مدرسہ کے برد" تو میری بھی یہ مجبوری ہوگئی کہ میں بہ انداز دیگر اسے ایک مثال سے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ ایک ادیب اور محقق نے زبان اور ادب اور رسم الخط کے بارے میں ایک کتاب لکھی تھی، ایک دوسرے ادیب اور محقق نے کتاب کے مشمولات پر تنقید کی اور یہ تنقید ادب کی دنیا میں بہت مقبول ہوئی اور اس کی بہت تحسین کی گئی، اول الذکر محقق نے ایک ادبی رسالہ میں تنقید کا جواب لکھا؛ لیکن تنقید میں جذبہ انتقام بھی شامل ہو گیا، اس نے ناقد کی خانگی عائلی زندگی کی طرف صحیح یا غلط کچھ اشارے کر دیئے، جن کا قطعاً کوئی محل نہیں تھا، اب اگر کوئی شخص ان اشاروں کو ناول کا پلاٹ بنا لے اور زیب داستاں کے لئے من گھڑت باتیں بڑھا دے اور نمک مرچ لگا کر قصہ کو بیان کرے تو کیا اسے بنظر استحسان دیکھا جائے گا اور کیا مؤخر الذکر محقق کو اس سے تکلیف نہیں پہنچے گی۔ اگر ایک مخالف ادیب اور محقق کی بات کو ناول کا پلاٹ بنالینا درست نہیں تو نواب شمس الدین کے مخالفین کے

پروپیگنڈے کو ناول کا پلاٹ بنالینا کیسے درست ہوسکتا ہے، فکشن کی دنیا میں یہ روایت نہیں قائم ہونی چاہئے کہ طیور کی زبانی اڑتی ہوئی خبروں اور غیر مصدقہ باتوں کی بنیاد پر تاریخ کے حقیقی کرداروں کی کردار کشی کی جائے اور ان کی عیب چینی کی جائے اور انھیں موجب دشنام واتہام بنایا جائے۔ بہت سے ناول نگار ناول کے شروع میں اس طرح کی عبارت لکھ دیتے ہیں کہ ''ناول کے تمام کردار فرضی ہیں اور کسی سے کوئی مشابہت ہے تو اتفاقی ہے جس کی کوئی ذمہ داری ناول نگار پر عائد نہیں ہوتی ہے۔'' چوں کہ اس ناول کے اکثر و بیشتر کردار حقیقی ہیں، اس لئے ایسی کوئی عبارت اس میں درج نہیں ہے، ناول نگار شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی دانست میں پوری ذمہ داری کے ساتھ سب کچھ کہا ہوگا، ممکن ہے فاروقی صاحب اور بہت سے لوگوں کے نزدیک اخلاقی موقف کی مداخلت ادب میں غیر ضروری ہو؛ لیکن بہت سے دوسروں کے نزدیک یہ ضروری بھی ہوسکتی ہے۔

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات، شمس الرحمٰن فاروقی زبان وادب کے رمز شناس ہیں، محقق اور ادیب ہیں، فارسی شعر وادب پر ان کی نظر عالمانہ ہے؛ لیکن یہ بات عربی زبان کے سلسلہ میں نہیں کہی جاسکتی کہ وہ اس کے بھی ماہر ہیں، چوں کہ انھوں نے بہ تکلف عربی کی ترکیبیں بھی مکالمات میں اور ناول کے بیانیہ میں داخل کی ہیں، اس لئے لغزش قلم کی مثالیں بہت مل جائیں گی، رعنائی خیال، لطف اظہار اور حسن بیان اس ناول کی اہم ترین خصوصیت ہے؛ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ زبان منزہ عن الخطا بھی ہے۔

۱- رشتہ نکاح میں منعقد نہ ہوئے تھے، (ص: ۱۷) نکاح منعقد ہوتا ہے نہ کہ انسان نکاح میں منعقد ہوتا ہے۔

۲- یہ لغت ابھی تک تشنہ انطباع ہے، (ص: ۱۷) تشنہ طباعت صحیح ہے، انطباع طباعت کے مفہوم میں درست نہیں۔

۳- ہندوستان کے صوفیا، (ص: ۲۳) صحیح عربی جمع صوفیہ ہے، صوفیاء کا استعمال غلط ہے۔

۴- مکانات یہاں شارع عام بالکل لب سڑک ہوتے ہیں، (ص: ۲۵) لب سڑک دو زبانوں کے درمیان اضافی ترکیب کی وجہ سے غلط ہے، اگر یہ درست ہے تو فوق البھڑک اور کثیر المہک اور چہک بسیار کو بھی درست ماننا پڑے گا۔

۵- وجود کٍ ذنبٍ، (ص: ۳۵) آخری حرف پر کسرہ تنوین یعنی دو زیر ہے جو غلط ہے،

ضمہ تنوین یعنی دو پیش صحیح ہے۔

۶- نورین العینین ، (ص: ۱۲۵) عربی قواعد کے لحاظ سے غلط ہے ،نور کا تثنیہ نارمل حالت میں نوران ہوگا حالت نصبی اور جری میں نورین ہوگا اور تثنیہ جب مضاف ہوگا نوران ہو یا نورین ،تو تثنیہ کا نون گر جائے گا۔

۷- شمس غارب ،(ص: ۱۳۱) شمس غاربہ ہونا چاہئے شمس مونث ہے۔

۸-دار المنافات ،(ص: ۲۶۳) یہ بے معنی لفظ ہے۔

۹-نور القمر مستفید من الشمس ،(ص: ۲۶۹) مستفاد (اسم مفعول) ہونا چاہئے ،یعنی چاند کی روشنی سورج سے فیض یاب ہے۔

۱۰- کل امر مرہون باوقاتہا ،(ص: ۲۸۱) باوقاتہ ہونا چاہئے ؛ کیوں کہ امر مذکر ہے۔

۱۱- عفاء اللہ عنہا ،(ص: ۳۰۳) صرف عفا ہونا چاہئے بعد میں جو ہمزہ لکھا گیا ہے غلط ہے ؛ کیوں کہ فعل عفا یعفو ہے۔

۱۲- من عشق فعف وکتم فمات فہو شہیدا ، کتاب میں عشق کے شین پر زبر دیا گیا ہے ، شین پر زیر ہونا چاہئے فعف میں عین کے نیچے زیر لکھا گیا ہے ، زبر ہونا چاہئے ، شہید فتحہ تنوین کے ساتھ لکھا گیا ہے ، شہید دو پیش کے ساتھ ہونا چاہئے ، اسے بزرگوں کا قول لکھا گیا ہے صحیح یہ بات ہے کہ یہ حدیث ہے اگر چہ موضوع۔

۱۳-اذا حاق القضاء ،(ص: ۴۳۳) صحیح ترجمہ ہوگا جب قضا در پے ہلاکت ہوتی ہے ، ترجمہ کیا گیا ہے جب قضا قریب آجاتی ہے ، یہ ترجمہ اس وقت صحیح ہوتا جب حان القضاء ہوتا۔

۱۴- کواغذ ، (ص: ۴۲۵) کاغذ کی یہ جمع درست نہیں ، جیسے منادر مندر کی جمع درست نہیں۔

۱۵- تمہاری استمداد کو ہمہ وقت مہیا ہیں (ص: ۸۱۸) استمداد صحیح لفظ ہے ؛ لیکن اس کا مفہوم مدد طلب کرنا ہے ؛ لیکن کتاب میں مدد کرنے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے ، ہونا چاہئے تمہاری مدد کو ہمہ وقت تیار ہیں۔

یہ غلطیاں نمونہ کے طور پر پیش کی ہیں ورنہ اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے ، شمس الرحمٰن فاروقی علم وادب کی جس مسند پر فائز ہیں ، وہ ان کے لئے قابل افتخار ہے ، ان کو فارسی بہت اچھی آتی ہے ، عربی تحریریں پہلے کسی عربی کے عالم کی نظر سے گزر جاتیں تو بہتر ہوتا۔

آخر میں اس کا اظہار ضروری محسوس ہوتا ہے کہ نقد و نظر کے یہ سارے پہلو اپنی جگہ پر؛ لیکن بحیثیت مجموعی شمس الرحمٰن فاروقی کا ناول فنی اور ادبی اعتبار سے شاہکار ہے جس نے ادب کی دنیا میں ہلچل پیدا کر دی ہے، ابھی بہت عرصہ تک اس ناول سے ایوان شعر و ادب میں ہنگامہ برپا رہے گا۔

☆ ☆ ☆ ☆
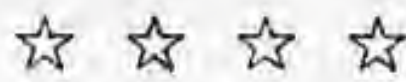
روحِ اقبال — ایک مطالعہ

خوبصورت عمارتیں ہزاروں ہوتی ہیں؛ لیکن ہر خوبصورت عمارت تاج محل نہیں ہوتی ہے۔ اقبال شناسوں نے اقبال کے فکر و فن پر بہترین کتابیں لکھی ہیں؛ لیکن ہر اچھی کتاب روحِ اقبال نہیں ہوتی ہے۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا تھا اور ساتواں ایڈیشن ۱۹۹۸ء (طبع ثانی) اقبال اکیڈمی حیدر آباد کی طرف سے شائع ہوا، تاج محل کی طرح اقبالیات کے سات یا سات سے زیادہ اہم عجائبات میں آج تک اس کتاب کا شمار ہوتا ہے، یعنی اقبال پر مستند معیاری کتابوں کے مطالعہ کا آرزومند اس کتاب سے صرف نظر نہیں کر سکتا ہے۔ کتاب کے مصنف ڈاکٹر یوسف حسین خاں ہیں، حافظ اور اقبال، غالب اور اقبال، فرانسیسی ادب، کاروانِ فکر، یادوں کی دنیا جیسی اہم کتابوں کے مصنف، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر رہے، میرے نزدیک تو وائس چانسلر ہونا بھی عظمت کی علامت نہیں، مفکر مصنف مصلح اور ادیب ہونا عظمت کی علامت ہے۔ کتنے چانسلر اور کتنے وائس چانسلر کتنے گورنر اور منسٹر وقت گریزاں کے طاق کا پھول بن کر مرجھا جاتے ہیں، پھر کوئی ان کا نام بھی نہیں لیتا ہے، اس سلسلہ روز و شب میں جو نقش گر حادثات ہے اگر کسی شئی کو دوام ہے تو اس فکر و فن کو دوام ہے، جس کی نمود خونِ جگر سے ہوتی ہے، روحِ اقبال بھی ایسی ہی کتاب ہے، جس میں مصنف کا خونِ جگر شامل ہے۔

مصنف نے کتاب کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے فن اور شاعری، تمدن اور معاشرت کے بارے میں نظریات اور مذہب اور مابعد الطبیعات سے متعلق افکار۔ اقبال کی شخصیت اور فکر و فن کی

تمام جہتوں کو ان تین ابواب میں سمیٹ لیا گیا ہے، اس طرح کہ کتاب اقبال کی بہترین ترجمان بن جاتی ہے، جو کچھ اقبال نے شعر کی زبان میں کہا تھا یوسف حسین خان نے نثر کی زبان میں اس کی توضیح اس طرح کر دی ہے کہ اقبال کی عظمت اور انفرادیت اُجاگر ہو گئی ہے، گویا روحِ اقبال کو نثر میں اس طرح کشید کر لیا گیا ہے کہ کتاب میں اقبال کا بحیثیت فلسفی اور بحیثیت فنکار اور بحیثیت رہنمائے قوم پورا عکس اُتر آیا ہے۔

بحیثیت فنکار اقبال نے اپنے تصورات اور خیالات کو اتنے فنکارانہ انداز میں اور لفظوں کے موزوں قالب میں پیش کیا ہے کہ وہ پڑھنے والوں کی روح کے اندر پیوست ہو جاتے ہیں، اس عظیم اثر آفرینی کی وجہ وہ بے پایاں خلوص اور سوز ہے جو فنکار کے اندر پایا جاتا ہے، یہ نے نواز کا دل ہے نہ کہ چوب نئے جس کا نغمۂ آتشیں دل کی گہرائی تک پہنچتا ہے۔ صرف لفظوں کا کارخانہ اور تخیل کا پری خانہ اپنے اندر وہ تاثیر نہیں رکھتا جو ایک خود سوز اور آتش فروز جذبہ رکھتا ہے، یہ سوز جگر جب فن کی شیشہ گری سے مل کر شعر کے قالب میں ڈھلتا ہے تو اقبال کی شاعری وجود میں آتی ہے، ایسی شاعری جو ساحری بھی کہلاتی ہے اور اگر وہ پیغام کی حامل ہو تو پیغمبری بھی کہلاتی ہے۔ تاثیر کے لئے صرف پیغام اہم نہیں اہمیت اس بات کی ہے کہ پیغام کو لوازم فن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے یا نہیں۔ فن اگر نہ ہو تو بہت سے پیغام سودائے خام اور کارنا تمام بن جاتے ہیں اور فن کی آرائش اگر موجود ہو تو فکر نا تمام کو بھی قبول عام حاصل ہو جاتا ہے، مقصود اصلی اگر چہ فکر ہے؛ لیکن فکر اکثر نامقبول اور ناکام ہو جاتی ہے اگر اس کے ساتھ فن کا قرینہ شامل نہ ہو۔ تاثیر کے لئے یہ بات کم اہم ہے کہ فکر کیسی ہے موضوع کیا ہے، طرز ادا کی اہمیت زیادہ ہے، اعلیٰ درجہ کے ادب کی تخلیق کے لئے موضوع اور ہیئت دونوں کی بلندی اور خوبصورتی درکار ہے، ایک فنکار زندگی کے حقیقی تجربوں پر اپنی تخیل کی بناء رکھتا ہے وہ کتاب میں پڑھی ہوئی باتوں اور سنی سنائی ہوئی حکایتوں کی زمین پر تخیل کی عمارت نہیں تعمیر کرتا ہے۔ وہ اپنے واردات قلبی کا اظہار فن کے پر تاثیر پیرایہ بیان کے ذریعہ کرتا ہے ، اس کا خلوص اس کے لفظوں میں زندگی کی روح پھونکتا ہے، لفظ میں جان پڑ جاتی ہے، ہر لفظ ایک دل بیتاب کے مانند دھڑکنے لگتا ہے، یہ بھی ایک تخلیقی عمل ہے۔ خالق انس وجن نے خاک کے بے جان پتلے کو ایک پھونک سے جان دار بنا دیا تھا، خالق شعر وفن لفظوں کے سلسلے کو اپنی ترتیب خاص سے اور سوز باطن سے بامعنی اور باحیات بناتا ہے، اقبال کے نزدیک تخلیق دونوں جگہ مشترک ہے، سفال آفریدی ایاغ آفریدم۔ یوسف حسین خاں کہتے ہیں اقبال کے فن کی تخلیق میں مصوری کو بھی

اعلیٰ مقام حاصل ہے مثال کے طور پر نظم ''بزم انجم'' میں مصوری اپنے کمال کو پہنچی ہوئی ہے، بے جان اشیاء کو ذی روح کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، جسے (Personification) کہتے ہیں۔ منظر یہ ہے کہ سورج شام کو رخصت ہو رہا ہے اور شام نے اندھیرے کی قبا زیب تن کر لی ہے، طشت اُفق ایک استعارہ ہے، جس میں بوقت شام لالے کے پھول رکھے ہوئے ہیں اور سورج اس طشت اُفق سے لالے کے پھول لے کر شام سیہ قبا پر بے تکلفی سے ڈال رہا ہے، سورج کی روشنی میں نہائی ہوئی کائنات قدرت اب روشنی سے باہر نکل رہی ہے، گویا قدرت اپنے چاندی کے زیور اُتار رہی ہے اور گل فشاں شفق سونے کے گل رنگ زیور کو ہسار و مرغزار کو، طوبیٰ کی شاخ کو اور کوہ و کاخ کو پہنا رہی ہے، محمل شب میں لیلائے ظلمت داخل ہو رہی ہے، آسمان میں عروس شب کے موتی یعنی ستارے اب جگمگانے لگے ہیں:

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو
طشت اُفق سے لے کر لالے کے پھول مارے

پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور
قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اُتارے

محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی
چمکے عروس شب کے موتی وہ پیارے پیارے

تشبیہیں نادر اور لطیف ہیں ان میں بلاغت ہے حسن ہے اور طرفگی ہے۔ اسی طرح نظم ایک آرزو میں پر سکون زندگی کی خواہش ہے، منظر نگاری اور مرقع سازی غضب کی ہے، ایک ندی بہ رہی ہے دونوں جانب صف باندھے ہوئے بوٹے اور شاداب پیڑ پودے ہیں، نظارہ اتنا دلفریب ہے کہ پانی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کر دیکھنے کی کوشش کرتا ہے، اُبلتی اور اچھلتی ہوئی موجوں کی یہ تشبیہ بہت حیران کن ہے، گل کی ٹہنی پانی کو چھو رہی ہے جیسے کوئی حسین آئینہ دیکھتا ہے، آرزو کی عکاسی میں کمال فنکاری کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ مصوری کا فن اور منظر کشی کا کمال نظم بعنوان کشمیر میں اپنے عروج پر نظر آتا ہے، لفظوں کے طلسم سے فطرت کی تصویر کھینچی گئی ہے۔

رُخت بکا شمر کشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں ببیں لالہ چمن چمن نگر

کتاب میں یوسف حسین خاں نے منظر نگاری کے بہترین نمونے جمع کردیے ہیں، قندھار کی سرزمین کے بارے میں جو اشعار ہیں ان میں ملک قندھار کے سکون اور سناٹے اور چوٹیوں کی بلندی کی تصویر کھینچنے کے لئے مناسب بحر اور ردیف اور قافیہ کا استعمال کیا گیا ہے:

رنگ ہا بو ہا ہوا ہا آب ہا
آب ہا تابندہ چوں سیماب ہا

لالہ ہا در خلوت کہسار ہا
نار ہا یخ بستہ اندر نار ہا

تشبیہات کی طرفگی اور ندرت کا بہترین نمونہ نظم جگنو میں ملتا ہے کبھی اسے شمع سے تشبیہ دی گئی ہے جو پھولوں کی انجمن میں جل رہی ہے، کبھی اسے آسمان سے اڑکر آنے والا استارہ قرار دیا گیا ہے، پھر اسے مہتاب کی کرن سے تشبیہ دی گئی ہے جس میں جان پڑ گئی ہے، اسے شب کی سلطنت میں دن کا سفیر ٹھہرایا گیا ہے اور مہتاب کی قبا کا تکمہ، اسی طرح نظم "شاعر" میں منظر نگاری اپنے عروج پر نظر آتی ہے:

جوئے سرود آفرین آتی ہے کوہسار سے
پی کے شراب لالہ گوں میکدہ بہار سے

پھرتی ہے وادیوں میں کیا دختر خوش خرام ابر
کرتی ہے عشق بازیاں سبزہ بہار سے

یوسف حسین خان صاحب نے منظر نگاری اور مصوری میں اقبال کے فن کی تمام خصوصیات تفصیل کے ساتھ پیش کی ہیں اور اقبال کی عظمت شاعرانہ پورے طور پر سامنے آجاتی ہے صوتی محاکات کے لئے "ایک شام" کے عنوان سے جو نظم ہے پیش کرنے کے بعد اس کی خصوصیات بیان کی ہیں، حرف شین کی تکرار نے خاموشی کے منظر کو آنکھوں کے سامنے مجسم کردیا ہے۔

اقبال کے فن کے تصور میں جمالی اور جلالی دونوں عنصر شامل ہیں اور دونوں ضروری ہیں اور دونوں کے امتزاج سے فن پیغمبری سے قریب ہونے لگتا ہے:

دلبری بے قاہری جادو گری است
دلبری با قاہری پیغمبری است

اقبال کی غزلیں بھی فن کی بلندیوں پر ہیں، صرف عشق ومحبت کی معاملہ بندی نہیں ہے؛ بلکہ اس میں مقصد پسندی اور اجتماعی قوت وتازگی کا اظہار ملتا ہے، اس میں جہان معانی ملتا ہے، یہ وہ چیز ہے جو روایتی غزلوں میں نہیں ملتی ہے۔ اقبال کی غزلوں میں جوش بیان بھی ہے اور رمزیت بھی ہے، وہ حسن ادا کے جادو سے ذہنوں کو مسحور کر دیتے ہیں اور اپنے نفس گرم سے رزم میں جان ڈال دیتے ہیں اور استعاروں کو ستاروں کی بلندی تک پہنچاتے ہیں:

میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی

اقبال نے مسلسل نظم نما غزلیں بھی کہی ہیں جن کی وجہ سے غزل نیم وحشی صنف غزل نہیں رہی، اس میں غزل کی رعنائی موجود ہے اور فکر کی زلف مسلسل بھی جو نظم کا شیوا ہے، مثال کے طور پر:

دریا میں موتی اے موج بے باک
ساحل کی سوغات، خار و خس و خاک

میرے شرر میں بجلی کے جوہر
لیکن نیستاں تیرا ہے نمناک

تیرا زمانہ تاثیر تیری
ناداں نہیں یہ تاثیر افلاک

ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے
جس نے سیے ہیں تقدیر کے چاک

کامل وہی ہے رندی کے فن میں
مستی ہے جس کی بے منت تاک

رکھتا ہے اب تک میخوانہ شرق
وہ مئے کہ جس سے روشن ہو ادراک

اقبال نے غزلوں کو تسلسل کے علاوہ نئے معانی سے روشناس کرایا ہے اور اس کو روایتی

ڈگر سے ہٹایا ہے، یہ غزل دیکھئے:

کیا عشق ایک زندگی مستعار کا
کیا عشق پائیدار سے ناپائیدار کا

وہ عشق جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک
اس میں مزا نہیں تپش و انتظار کا
میری بساط کیا ہے تب و تاب یک نفس
شعلہ سے بے محل ہے اُلجھنا شرار کا

کر پہلے مجھ کو زندگی جاوداں عطا
پھر شوق و ذوق دیکھ دل بے قرار کا

کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو
یارب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

فکر مسلسل اور نئے معانی سے لبریز یہ غزل بھی ہے جس کے چند شعر یہ ہیں:

دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرض کہن کا چارہ

ترا بحر پرسکوں ہے یہ سکوں ہے یا فسوں ہے
نہ نہنگ ہے نہ طوفاں نہ خرابی کنارہ

روحِ اقبال میں اس طرح کی کئی نظمیں جمع کردی گئی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس قدر ان میں جوش بیان ہے، لفظوں کا شگفتہ اور شاداب چمن عنادل کے ساتھ کس قدر موسیقی ریز ہے اور اس پر رفعت فکر و معانی جو پہلے کے غزل گو شعراء کے حاشیہ خیال میں بھی موجود نہ تھے، اقبال نے غزل کی کائنات کو کس قدر وسعت دی اور کس طرح ایک جوئے کم آب کو متلاطم دریا بنا دیا۔ روحِ اقبال میں اقبال کی غزلوں کے فکر انگیز معانی کے لئے متحرک تصورات کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے، چند مزید اشعار غزل کی معنی خیزی اور تاب وتب کی دل سوزی کے ثبوت کے طور پر پیش ہیں:

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

یوسف حسین خاں نے روح اقبال میں صفحات کے صفحات سیاہ کر دیئے ہیں یہ ثابت کرنے میں کہ اقبال فلسفی ضرور ہیں؛ لیکن ان سے غزل کی آبرو بھی قائم ہے انھوں نے غزل کے معانی کو بے کرانی عطا کی ہے، اقبال نے افکار و معانی کی بلندی کو بعض مقامات پر اتنی سادہ زبان عطا کی ہے کہ اس سے سادہ زبان کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

روحِ اقبال کا دوسرا باب "اقبال کے فلسفہ تمدن" سے متعلق ہے اور اقبال کے فکر و فلسفہ کو سمجھنے کے لئے یہ باب بڑی اہمیت رکھتا ہے، روحِ اقبال کا پہلا باب اقبال کی شاعری اور فن کی تفصیلات کے بارے میں تھا اور اسے اولیت اس لئے دی گئی تھی کہ اقبال کے تمام تصورات اور افکار و معانی کے اظہار و ابلاغ کے لئے فن ہی واسطہ اور وسیلہ ہے، افکار کی مقبولیت اور اس کا خیر مقدم فن کا رہین منت ہے۔

اس باب میں یوسف حسین خان نے سب سے پہلے اقبال کے فلسفہ خودی سے بحث کی ہے، اقبال کے نزدیک زندگی کا اصل محرک اثبات خودی کا جذبہ ہے جو انسان میں ودیعت ہے، یہ خود داری بھی ہے، خودشناسی بھی ہے اور خود کشائی بھی۔ یہ عرفان نفس کے ہر پہلو پر حاوی ہے، یہ عرفان نفس جدوجہد کے بغیر حاصل نہیں ہوتا، زندگی ایک مسلسل حرکت ہے جو نت نئی خواہشوں کی تخلیق کرتی اور اس طرح اپنی توسیع اور بقا کا انتظام کرتی ہے وہ پیہم عمل اور کشمکش سے لازوال ہو جاتی ہے:

خودی کیا ہے راز درون حیات
خودی کیا ہے بیداری کائنات

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

زمانے کے دھارے میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر

انسانی خودی مثل سمندر کے ہے جس کا اور چھور نہیں، اس کی وسعتیں اتنی ہیں جتنی انسان کی ہمت، اس خیال کو اس شعر میں پیش کیا گیا ہے:

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آب جو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

پھر اقبال کہتے ہیں کہ ’’خودی از کائنات رنگ و بونیست‘‘ ہمارے ظاہری حواس خودی نہیں دیکھ سکتے، اس کا پتہ صرف وجدان سے چلتا ہے، خودی کے احساس کی ابتداء اس شعور سے ہوتی ہے کہ وہ ہے۔ انسانی خودی حوادث اور اعمال کے نظام سے عبارت ہے، خودی کا ارتقاء خارجی عالم کے توسط سے ہوتا ہے، خودی اقبال کی شاعری اور فکر کا کلیدی لفظ ہے، انسانی خودی میں ابدی زندگی کی تمام ممکنات موجود ہیں، ارتقاء کا دارومدار اسی پر ہے، اسی کو اقبال عشق اور شوق کہتا ہے، اس طرح خودی اور عشق ایک دوسرے سے وابستہ اور پیوستہ ہو جاتے ہیں، خودی کی ارتقائی شکل انسان

کامل میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ نٹشے نے ''سوپر مین'' یعنی فوق البشر کو خودی کا مقصود اور منتہا بتایا ہے، خودی الوہیت کا مظہر ہے، عالم فانی ہے؛ لیکن خودی باقی اور غیر فانی ہے، اقبال نے نٹشے کے فوق البشر کے تصور کو مشرف بہ اسلام کیا، خودی کے وجود و جودت کا انحصار ذات باری پر ہے جو کائنات کا خالق ہے۔ خودی اور بے خودی کے فلسفہ کو توازن کے ساتھ پیش کرنا دونوں مشکلات اقبال میں سمجھے جاتے ہیں، اقبال ایک طرف خودی کے استقلال اور استحکام کے قائل ہیں، دوسری طرف اس میں بے خودی اور شکست خوردگی کی کیفیت پیدا کرنا ضروری سمجھتے ہیں، خودگری خودنگری اور خودشکنی خودی کی واضح منزلیں ہیں:

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور
خود گرے خود شکنے خود نگرے پیدا شد

خودی کے لئے طاقت اور توانائی کے ساتھ ربودگی اور خودشکستگی دونوں ضروری ہے:

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

اقبال نے اپنے ایک خط میں خودی کی توضیح کی ہے، ''حدود خودی کے تعین کا نام شریعت ہے اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے'' (اقبال نامہ: ۲۰۳، بحوالہ روح اقبال: ۱۳۹) اقبال کے نزدیک جو چیز خودی کو قوت بخشتی ہے وہ خیر ہے اور جو اسے کمزور کرتی ہے وہ شر ہے، خودی کا عرفان ضروری ہے اس کے بغیر بشر عظمت حاصل نہیں کرسکتا:

ہر چیز ہے محو خود نمائی
ہر ذرہ شہید کبریائی
بے ذوق نمود زندگی موت
تعمیر خودی میں ہے خدائی
رائی زور خودی سے پربت
پربت ضعف خودی سے رائی

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

ہوئی ہے زیرِ فلک اُمتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

ڈاکٹر یوسف حسین خان نے روحِ اقبال میں اقبال کے فلسفہ اجتماعی پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور یہ حصہ کتاب کے اہم ابواب میں ہے، کوئی مفکر ہو اور کسی زمانہ کا ہو کسی قوم اور نسل کا ہو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی زلف برہم اور اس کے پیچ وخم سے صرف نظر نہیں کر سکتا، انسانی زندگی اس کے سوا ہے بھی کیا۔ جس طرح انسان دنیا میں صبح وشام اور لیل ونہار کا عادی ہوتا ہے، اسی میں وہ کچھ انفرادی زندگی رکھتا ہے اور کچھ اجتماعی، کبھی اس پر انفرادی زندگی غالب رہتی ہے اور کبھی اجتماعی؛ لیکن اس کا واسطہ ان ہی دو پہلوؤں سے رہتا ہے۔ فلسفیوں میں بھی ذہنی رجحانات الگ ہیں ،کانٹ فشٹے اور برگسوں زندگی کے انفرادی پہلو کے زیادہ مؤید ہیں؛ لیکن حیات اجتماعی کا انکار کسی نے نہیں کیا ہے، انسانی زندگی ایک گوہر کے مانند ہے یہ حیات انفرادی ہے؛ لیکن یہ گوہر صدف میں پرورش پاتا ہے، صدف استعارہ ہے گرد وپیش کے ماحول کا، پھر اس صدف کا تعلق سمندر کی پہنائیوں سے ہے، یہ وسیع تر حیات اجتماعی کا عکاس ہے۔ گویا گوہر زندگی کی پرورش ماحول اور معاشرہ میں ہوتی ہے، اسی طرح انسانی زندگی اپنی تمام تر انفرادیت کے باوصف حیات اجتماعی سے دامن کش نہیں، اقبال احساس خودی کا شاعر ہے، یعنی اس کے نزدیک انفرادیت زندگی کا بہت اہم نکتہ ہے یہی وہ نقطہ ہے جس سے اجتماعی زندگی کے تمام زاویئے نکلتے ہیں۔ جس طرح سے روشنی کا ایک منبع ہوتا ہے؛ لیکن روشنی اپنے منبع سے نکل کر چار سو پھیل جاتی ہے اور گرد وپیش کو منور کر دیتی ہے، اسی طرح خودی پوری حیات اجتماعی کو منور اور تابناک کر دیتی ہے، فرد بغیر تمدن کے مکمل نہیں ہوتا ہے ،ذمہ داری اور فرض کا احساس تمدن کی وجہ سے ہوتا ہے، اس بات کو اقبال اپنے شعر میں یوں کہتے ہیں:

وجود افراد کا مجازی ہے ہستیِ قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زن طلسم مجاز ہو جا

اقبال نے فسفہ خودی کی طاقتور ترجمانی کے باوصف ہر جگہ حیاتِ اجتماعی کی اہمیت پر زور

دیا ہے اور فرد کو ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھنے کی تاکید کی ہے، ڈاکٹر یوسف حسین خان نے چن چن کر اشعار نقل کئے ہیں، انھوں نے اقبال کی یہ نظم ثبوت کے طور پر پیش کی ہے:

ڈالی گئی جو فصل خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحاب بہار سے
ہے لازوال عہد خزاں اس کے واسطے
کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ وبار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصل خزاں کا دور
خالی ہے جیب گل زر کامل عیار سے
جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور
رخصت ہوئے ترے شجر سایہ دار سے

شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہوکہ تو
نا آشنا ہے قاعدہ روزگار سے

ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ

ملت اور حیاتِ اجتماعی فرد اور فرد سے مل کر بنتی ہے؛ لیکن حیات اجتماعی کی عمر فرد کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوتی ہے، ملت کی تقویم فرد کی تقویم سے جداگانہ ہے، خم ایام سے روز وشب کے انگنت جام میخوارانِ حیات کو ملتے ہیں؛ لیکن خم کی مئے اس سے کم نہیں ہوتی ہے۔

صبح از مشرق ز مغرب شام رفت
جام صد روزانہ خم ایام رفت

بادہا خوردند وصہبا باقی است
دوش ہا خون گشت وفردا باقی است

یوسف حسین خان نے اقبال کے حیات اجتماعی کے فلسفہ کی تشریح کی ہے وہ لکھتے ہیں:
ہم عالم گیر مقاصد تک جماعتی زندگی کی توسط سے پہنچتے ہیں جن سے ہمارا عمل بامعنی بنتا

ہے ہمارے اعمال اور عزم کے نتائج ہی سے اخلاقی قدریں پیدا ہوتی ہیں، جن سے زندگی کو توازن اور ہم آہنگی نصیب ہوتی ہے۔

یوسف حسین خان نے اقبال کے تصور خودی اور تصور اجتماعیت دونوں کو تعلیم اسلام سے مربوط کر دیا ہے اقبال نے ان رجحانات کو اُجاگر کیا ہے جو اسلامی تہذیب میں پہلے سے موجود رہے ہیں۔

فرد را ربط جماعت رحمت است
جوہر او را کمال از ملت است

یوسف حسین خان نے بڑے توازن سے اقبال کے فلسفہ انفرادیت اور اجتماعیت پر روشنی ڈالی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اسی توازن میں اقبال کی عظمت چھپی ہوئی ہے وہ کہتے ہیں کہ انسان کی تمام تر کامیابیاں اور جدت طرازیاں انفرادی قوت تخلیق اور خودی میں چھپی ہوئی ہیں، اپج اور جدت طرازی خالص انفرادی صلاحیت ہے، جماعت تخلیق نہیں کرسکتی ہے وہ استفادہ کرسکتی ہے؛ لیکن ارسطو کا یہ کہنا اپنی جگہ پر درست ہے کہ انسان سوشل اینمل یعنی سماجی جانور ہے، فرد کی بقا ملت کی بقا پر منحصر ہے:

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

حیاتِ اجتماعی اور اس کے پہلوؤں پر یوسف حسین خان نے عمیق اور دقیق بحث کی ہے، قوموں کا عروج و زوال اسی فلسفہ سے متعلق ہے قوموں کے عروج و اقبال اور انحطاط و زوال کا تعلق انسان کی حیاتِ اجتماعی سے ہے۔ پروفیسر یوسف حسین خان نے کلام اقبال کی روشنی میں عروج و زوال کا جو فلسفہ پیش کیا ہے وہ بہت اہم ہے، پوری کتاب میں کچھ نہیں ہوتا، صرف یہ حصہ ہی موجود ہوتا تو کتاب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ کتابوں کی ہجوم میں چمکتی اور اپنی اہمیت منواتی۔

کتاب کا سب سے اہم اور قابل غور حصہ حیاتِ اجتماعی کے باب اور فلسفہ تمدن سے متعلق ہے، جس کو اس اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہے کہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب کو سمجھنے میں اس سے مدد ملتی ہے اور مستقبل کی حکمت عملی بھی سمجھ میں آتی ہے، استدلال قرآن کی آیتوں سے بھی کیا گیا ہے اور اقبال کے اشعار سے بھی، قرآن میں ایمان اور عمل صالح کی شرط پوری ہونے پر ''تمکین فی الارض'' کا وعدہ کیا گیا ہے، مصنف کے نزدیک ایمان سے مراد ہے مقصد زندگی پر یقین

اور عمل صالح سے مراد ہے طبعی قوتوں کو مسخر کرنا، اگر طبعی طاقتوں کا جن شیشہ میں بند کر دیا جاتا ہے اور نوامیس قدرت کو مسخر کر دیا جاتا ہے تو یہ ایک طاقت کے حصول اور غلبہ کا ذریعہ ہے اور یہی عمل صالح ہے، عمل صالح سے مراد خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات نہیں ہے، اقبال کے فلسفہ عروج و زوال پر بحث کے دوران وہ اقبال کے خطبات کے حوالے دیتے ہیں، مثلاً یہ اقتباس انھوں نے پیش کیا ہے:

جس طرح ایک جسم ذوی الاعضاء مریض ہونے کی حالت میں بعض دفعہ خود بخود بلا علم و ارادہ اپنے اندر ایسی قوتوں کو برانگیختہ کر دیتا ہے جو اس کی تندرستی کا موجب بن جاتی ہے اسی طرح سے ایک قوم جو مخالف قوموں کے اثرات سے سقیم الحال ہوگئی ہو بعض دفعہ خود بخود رد عمل کرنے والی قوتوں کو پیدا کر لیتی ہے۔ مثلاً قوم میں کوئی زبردست دل و دماغ کا انسان پیدا ہو جاتا ہے یا کوئی نئی تخلیق نمودار ہوتی ہے یا ایک ہمہ گیر مذہبی اصلاح کی تحریک بروئے کار آتی ہے، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ قوم کے قوائے ذہنی و روحانی تمام طاغی اور سرکش قوتوں کو اپنا مطیع و منقاد بنانے اور اس مواد کو خارج کر دینے سے جو قوم کی نظام جسمانی کے لئے مضر تھا قوم کو نئے سرے سے زندہ کر دیتے ہیں، اور اس کی اصلی توانائی اس کی اعضا میں عود کر آتی ہے، اگرچہ قوم کی ذہنی و دماغی قابلیت کا دھارا افراد ہی کے دماغ سے ہو کر بہتا ہے؛ لیکن پھر بھی قوم کا اجتماعی نفس ناطقہ جو مدرک کلیات و جزئیات اور خبیر و مرید ہے بجائے خود ضرور موجود رہتا ہے۔

اس ضمن میں اقبال کا یہ بھی خیال ہے کہ جب کسی گروہ میں اجتماعی خودی کا احساس باقی نہیں رہتا تو وہ کسی دوسری جماعت میں جو اس سے زیادہ جاندار اور قوی سیرت کی مالک ہوتی ہے، ضم ہو جاتی ہے یا اس کی غلام بن جاتی ہے۔ چوں کہ تنہا زندگی کے انقلابوں اور کشمکش کا مقابلہ کرنے کی اس میں سکت باقی نہیں رہتی اور اس کے قوائے عملیہ بالکل شل ہو چکے ہوتے ہیں، اس لئے وہ دوسروں کی دست نگر ہو جاتی ہے اور اپنی جماعتی انا کھو دیتی ہے، اپنے آئین ملت کے دامن کو مضبوطی سے پکڑنا اور بے ضرورت دوسروں کی تقلید سے گریز، اپنے تشخصات کی حفاظت قوموں کے لئے ضروری ہے۔ دوسروں کی تقلید صرف مفید علم و حکمت میں ہونی چاہئے نہ کہ تہذیب کے سطحی مظاہر میں بے ضرورت غیر مفید چیزوں کی نقل احساس کمتری کی دلیل ہے اور جو قوم احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہے وہ دوسری قوم میں ضم ہو جاتی ہے یا اس کی غلام بن جاتی ہے۔

اقبال کا فلسفہ عروج و زوال یوسف حسین خان کی نثر میں آ کر زیادہ آسان اور عام انسان

کی دسترس میں آ گیا ہے، یوسف حسین خان لکھتے ہیں:

اقبال نے قوموں کی عروج و زوال کے ضمن میں جو اشارے دیئے ہیں وہ بڑی حد تک قرآنی تعلیمات سے ماخوذ ہیں، قرآن پاک میں مختلف قوموں کے احوال و وقائع اس لئے بیان کئے گئے ہیں؛ تاکہ ان سے عبرت اور بصیرت حاصل ہو۔ بصیرت بتاتی ہے کہ جس طرح فطرت کے قوانین کائنات ہستی کے ہر گوشہ میں جاری اور ساری ہیں اسی طرح انسانی اعمال کے بھی الٰہی قوانین ہیں جو ہر زمانہ میں یکساں طور پر اپنے نتائج و اثرات پیدا کرتے رہتے ہیں۔ جب ان قوانین کے مطابق عمل کیا جاتا ہے تو زندگی کو عروج و سرفرازی نصیب ہوتی ہے اور جب کبھی ان کی خلاف ورزی ہوتی ہے تو قومیں ذلت اور رسوائی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ قوموں کی سرگذشت سے یہ حقیقت بے نقاب ہے کہ جب تک وہ ''عمل صالح'' کرتی رہیں، انھیں غلبہ اور استیلا رہا؛ لیکن جب وہ بے عملی کے ہاتھوں عیش و عشرت میں پڑ گئیں اور حدود فطرت اور حدود الٰہی سے تجاوز کرنے لگیں تو بہت جلد انھیں اپنی عظمت اور شوکت کی گدی کسی دوسری تازہ دم اور سرگرم عمل قوم کے لئے خالی کر دینی پڑی، یہ نئی جماعت پرانے تمدن کے مادی اور ذہنی سرمایہ پر قبضہ کرتی اور زندگی کا نیا ڈول ڈالتی ہے۔

اقبال کا کہنا ہے کہ یہ کائنات انسان کے لئے ہے اور جب انسان اس کائنات کے پوشیدہ اسرار تک پہنچتا ہے تو اس کے دست تصرف میں طاقت کا خزانہ آ جاتا ہے، قرآن میں ہے **''وسخرلکم مافی السمٰوات والأرض جمیعاً''** (جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے وہ سب تمہارے تابع فرمان ہے) چنانچہ روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتے ہوئے کہتی ہے۔

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں

آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے

ناپید ترے بحر تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آنکھوں کے اشارے

تعمیر خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ
خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ

انسان کو دنیا میں خلافت ارضی عطا کی گئی ہے، یوسف حسین خان نے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ دنیا میں نیابت الٰہی ان قوموں کو ملتی ہے جو اپنے فکر و عمل اور جذب و تسخیر کی اہلیت سے اپنے آپ کو اس کا مستحق ثابت کر دیتی ہیں یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی غیر مستحق جماعت کو غلبہ اور استیلا حاصل ہو اور اس کو تمکّن ارضی کی ذمہ داری سپرد کر دی گئی ہو یہ ذمہ داری صرف اس گروہ کو ملتی ہے جو اپنے عمل کا حساب دینے کو تیار ہے:

صورت شمشیر ہے دست قضا میں ہے وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

قرآن میں ''استخلاف فی الارض'' کی شرط عمل صالح ہے ''**ان الأرض یرثها عبادی الصالحون**'' (بے شک زمین صالح بندوں کی میراث ہے) یوسف حسین خان عمل صالح کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

صرف وہی قومیں دوسروں پر تفوق اور اقتدار حاصل کر سکتی ہیں، جنھوں نے اپنے عمل صالح سے اپنے آپ کو نیابت الٰہی کا مستحق ثابت کر دیا ہو، اب سوال یہ کہ عمل صالح سے کیا مراد ہے عمل صالح سے ایسے انسانی اعمال مراد ہیں جو زندگی کو فروغ دینے والے اس کے ممکنات کو اُجاگر کرنے والے اور قافلہ حیات کو آگے بڑھانے والے ہوں۔

مصنف روحِ اقبال کا کہنا ہے کہ تاریخ میں اسلامی مفکروں نے جزئیات کے تجربے اور

مشاہدے کو خاص اہمیت دی تھی اور استقرائی منطق کو علم حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا تھا، اس نئے نظام استدلال سے خود اعتمادی پیدا ہوئی اور کاروان علم کی پیش رفت شروع ہوئی اور جدید سائنس کی بنا ڈال دی گئی۔ ایجاد اور تسخیر فطرت کے لئے صرف تصوراتی اور نظریاتی منطق کافی نہیں، استقراء اور تجربہ اور مشاہدہ کی بدولت مسلمان دورِ سائنس کی قیادت کرنے والے تھے اس کا اعتراف فرانسس بیکن اور دوسرے مغربی دانشوروں نے بھی کیا ہے، اقبال کہتے ہیں:

حکمت اشیاء فرنگی زاد نیست
اصل او جز لذت ایجاد نیست

نیک اگر بینی مسلماں زادہ است
این گہر از دست ما افتادہ است

این پری از شیشہ اسلاف ماست
باز صیدش کن او از قاف ماست

یوسف حسین خان مزید یہ لکھتے ہیں کہ:

اب اگر اسلامی ملک اور دوسری ایشیائی قومیں اپنے علم و عمل کو زندگی کی ترقی کے لئے وقف کر دیں تو ان کی محرومی اور نامرادی دور ہو سکتی ہے، سوائے اس کے دنیا کی قوموں میں عزت اور وقار حاصل کرنے کی اور کوئی تدبیر نہیں، مسلمانوں کی تاریخ بہت سے انقلابات دیکھ اور جھیل چکی ہے، اگر اب بھی وہ عمل صالح کی کسوٹی پر پورے اُترنے کی کوشش کریں تو اپنی گذشتہ عظمت کو حاصل کر سکتے ہیں۔

یوسف حسین خان کی توازن فکر کی بات یہ ہے کہ انھوں نے عمل صالح کی تعریف وتشریح میں روحانی تزکیہ اور اخلاقی قوانین کا انکار نہیں کیا ہے؛ لیکن صرف روحانی تزکیہ ان کے نزدیک عمل صالح کا احاطہ نہیں کرتا، یہی فرق ہے جو خانقاہوں اور مدرسوں اور بعض دینی جماعتوں کے طرز فکر سے روحِ اقبال کے مصنف کو ممیز اور ممتاز کرتا ہے۔ یوسف خان کے نزدیک خلوت و خانقاہ کا عمل صالح سکون آفرینی اور جمود کے مماثل ہے، یوسف حسین خان کہتے ہیں کہ تزکیہ نفس کے ساتھ عمل صالح کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اعمال الٰہی اور فطرت کا علم حاصل کیا جائے کہ بغیر اس کے عمل

غیر مؤثر ہوگا، قرآن پاک میں انسانی شرف کی بنا حقائق اشیاء کے علم کو بالفاظ دیگر سائنس کو ٹھہرایا گیا ہے "وعلم آدم الأسماء کلہا" (اور سکھائے آدم کو نام، خواص، سب چیزوں کے) یوسف حسین خاں کہتے ہیں کہ اس آیت شریفہ میں اسی جانب اشارہ ہے، خدا کو یقیناً ان عبادات اور مذہبی رسوم کی ضرورت نہیں جو بے عملی کا سکون پیدا کریں، اقبال کے عمل صالح کے تصور میں تسخیر فطرت شامل ہے...... تسخیر فطرت کی بدولت انسان حقیقی آزادی کا مزہ چکھ سکتا ہے اور جدت کی صلاحیت کو ظاہر کر سکتا ہے وہ اپنے علم کی قوت سے آسمانوں کے سینے شگاف کرتا اور جہانِ چارسو پر اپنے بے پناہ عمل کا سکہ بٹھاتا ہے۔

اقبال کے نزدیک مغرب نے فطرت کا علم حاصل کیا اور اسی لئے اسے غلبہ حاصل ہوا؛ لیکن مغرب کی غلطی یہ ہے کہ اس نے عقل کو بے لگام اور بے زمام چھوڑ دیا اگر عقل کو وجدان کی صحیح رہبری نہیں ملے تو اس کا توازن باقی نہیں رہتا۔ اقبال کے نزدیک یورپ کی زندگی کا حرکی عنصر اور ان کی سائنٹفک ایجادات جو تسخیر عالم کی ضامن ہیں قابل تعریف ہیں اقبال نے تمدن کے ظاہری طمطراق کی مذمت کی ہے جو حدودِ اعتدال سے متجاوز ہوگئی ہیں، اقبال کے نزدیک جب تک علم اور عقیدہ کا امتزاج نہ ہو صالح تمدن نہیں پیدا ہو سکتا ہے، اقبال نے کہا:

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں ہے نہ ظلمات
بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

اقبال کے فلسفہ تمدن کے ضمن میں اقتدار، حکومت، جمہوریت، وطنیت، دین و سیاست کی علاحدگی، معاہدہ عمرانی اور اسلام کا نظام حکومت و معیشت یہ ساری چیزیں فلسفیانہ اور مفکرانہ انداز میں زیر بحث آگئی ہیں۔ آدمی صرف اقبال کے کلام سے آشنا نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ دور جدید کے اہم ایشوز پر بصیرت مندانہ اور دانشورانہ باتیں پڑھتا اور سیکھتا ہے، اقبال نے فلسفہ تمدن کے کئی پہلوؤں پر اپنے کلام میں روشنی ڈالی ہے۔ یوسف حسین خان نے اپنے قلم کی روشنائی سے اس روشنی کو روشن تر اور اس نور کو نور علی نور بنا دیا ہے، انھوں نے نظام معیشت اور نظام معاشرت پر گفتگو کی ہے سماج میں عورت کی حیثیت زیر بحث آئی ہے، اقبال کا فلسفہ تمدن کتاب کا مطول اور مفصل باب ہے اور بے حد اہم ہے۔

کتاب کا آخری باب اقبال کے فلسفہ مذہب سے متعلق ہے، یہ باب گذشتہ دونوں ابواب سے زیادہ پیچ دار، مغلق، مشکل اور معقد ہے، فلسفہ کے مطالعہ اور فلسفیانہ تحریروں کے ذوق اور مناسبت کے بغیر ''روحِ اقبال'' کو سمجھنا مشکل اور اس کے آخری باب کو سمجھنا مشکل تر ہے، فلسفہ اور تصوف کی عمیق اور دقیق بحثیں یہاں موجود ہیں۔ یوسف حسین خان نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اقبال نہ تو وحدت الوجود کے قائل ہیں اور نہ وحدۃ الشہود کے؛ بلکہ وہ وحدۃ الوجوب کے قائل ہیں۔ توحید سے متعلق اس کتاب کے آخری باب میں جو فلسفیانہ نگارشات ہیں وہ بھی بہت آسانی کے ساتھ قابل فہم نہیں، خلاصہ یہ کہ روحِ اقبال بہت بھاری بھرکم کتاب ہے اور فکر اقبال کی ایسی شرح ہے جو خود ایک شرح کی متقاضی ہے، تاکہ کتاب ہر شخص کے لئے قابل فہم اور لائق ہضم بن سکے، میں اس مقالہ کو فکر اقبال کے مصنف ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے اس اقتباس پر ختم کرتا ہوں:

> اقبال پر درجنوں کتابیں اور ہزاروں مضامین لکھے گئے ہیں اور بے شمار تقریریں اس پر ہو چکی ہیں؛ لیکن یہ سلسلہ نہ ختم ہوا ہے نہ ہوگا۔ اقبال پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں محققانہ تصانیف بہت کم ہیں، میرے نزدیک اقبال پر دو کتابیں نہایت عالمانہ نہایت بلیغ اور نہایت جامع ہیں، ڈاکٹر یوسف حسین خان کی ''روحِ اقبال'' اور مولانا عبدالسلام ندوی کی ''اقبال کامل'' ان دونوں کتابوں کو ملا کر پڑھیں تو اقبال کے کلام اور ان کی تعلیم کا کوئی پہلو ایسا دکھائی نہیں دیتا جو محتاجِ تشریح اور تشنہ تنقید باقی رہ گیا ہو۔ (فکر اقبال: ۱۴، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ)

☆ ☆ ☆ ☆

شہرِ سخن

تخلیقی ادب بھی فنونِ لطیفہ کی طرح تحریر کا ایک فن ہے اس میں فنکار کا خونِ جگر شامل ہوتا ہے اور جب تحریر میں خونِ جگر شامل ہو جاتا ہے تو اس سے معجزۂ فن کی نمود ہوتی ہے۔ شاعری کی طرح کہانی اور ناول کا شمار بھی ادب میں ہے، فکشن کا اپنا ایک فن ہے اور جو اس فن کی رعایت کرتا ہے وہ ادیب اور فنکار ہے۔ نثر میں کسی بھی موضوع پر کوئی مضمون یا مقالہ لکھا جائے اور اس میں بلاغت اور بدیع کی رعایتیں ملحوظ رکھی جائیں تو وہ بھی تخلیقی ادب ہے۔ ابوالکلام آزاد، محمد حسین آزاد اور شبلی اور بہت سے لوگ بہت خوبصورت نثر لکھنے والے تھے اسی لئے وہ ادیب اور انشاء پرداز تھے۔ اصل ادب وہ ادب ہے جس میں فن کی تمام رعایتیں ملحوظ رکھی جائیں، اس ادب میں ایک لفظ کی جگہ دوسرے لفظ کا بدلنا آسان نہیں ہوتا، ہر لفظ تحریر کی انگوٹھی میں نگینہ کی طرح جڑا ہوتا ہے، عبارت مرصع ہوتی ہے۔ لیکن تحریر میں اگر فن کی رعایتیں ملحوظ نہ رکھی جائیں اور تمام ادبی صنعتوں سے معری زبان میں کسی کی شاعری اور کسی کے ادب پر کوئی مقالہ تیار کر دیا جائے تو وہ ادب کی تاریخ ہو سکتا ہے، اسے ادب کی تنقید کہا جا سکتا ہے؛ لیکن بہر حال وہ خالص ادب یعنی تخلیقی ادب نہیں ہے، اسے ادب یا لٹریچر کتابوں کے مفہوم میں کہا جا سکتا ہے جس مفہوم میں ہم مذہبی لٹریچر یا ادبیات کا لفظ استعمال کرتے ہیں، یہ حقیقی ادب نہیں ہوتا۔ اس لئے اس دور کے بہت سے سکہ بند ادیبوں کو ادب نواز کہا جا سکتا ہے وہ ادب کے اچھے مؤرخ اور ناقد بھی ہو سکتے ہیں؛ لیکن وہ اصلی اور حقیقی ادیب نہیں ہیں؛ کیوں کہ انھوں نے فن کی شرطیں پوری نہیں کیں، ان کی تحریروں میں نہ ابداع ہے نہ اختراع ہے، نہ تخییل کا کمال ہے نہ بیان و بدیع کا جمال ہے، نہ جذبہ کا رست و خیز ہے۔ اختراعی ذہن کی ادب میں کارفرمائی کی مثال ایک ادیب کا یہ قول ہے جس میں تشبیہ کا کنوارا پن پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ ''غزل کا اچھا شعر کہنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا چاول کے دانے پر قل ہو اللہ لکھنا۔'' آج کل ادب کے زیادہ تر ناقدین ادب کے بارے میں تو لکھتے ہیں؛ لیکن سلاست، روانی اور شگفتگی کے بغیر، ان کی تحریر میں تو تلاہٹ اور قلم میں لکنت پائی جاتی ہے، تحریر ناہموار ہوتی ہے، فن کی جمالیات سے خالی ہوتی ہے۔

زبان کو حسن و خوبی کے ساتھ استعمال کرنے کا نام ادب ہے، صنائع و بدائع کے ذریعہ زبان میں لطف و تاثیر پیدا کرنے کا نام ادب ہے، نثر کا ادیب ہونے کے لئے اور مقالہ نگاری کو فن کا درجہ دینے کے لئے موضوع کی کوئی قید نہیں ہے، موضوع کچھ بھی ہو نثر کو فن کے معیار پر پورا اُترنا چاہئے اور اگر یہ شرط نہ پوری ہو تو محض ترقی پسندی، شاعری، جدیدیت، ساختیات اور مابعد ساختیات وغیرہ موضوع پر مقالے اور کتابیں لکھ دینے سے کوئی ادیب نہیں ہو جاتا ہے۔ ایسے لکھنے والے ادب کے بارے میں معلومات مہیا کر دیتے ہیں اور قابل قدر کام کرتے ہیں؛ لیکن ان کی تحریروں کو ادب نہیں کہا جاسکتا، ایک عام کمزور اور مدقوق آدمی اگر سپاہی کی یا میدان جنگ کے کسی فوجی کی وردی پہن لے تو وہ سپاہی یا فوجی نہیں بن جائے گا، وہ صرف سپاہی اور فوجی کی شبیہ ہوگا نہ کہ حقیقی سپاہی اور فوجی، نہ وہ رن میں جاسکے گا نہ تلوار یا بندوق اٹھا سکے گا۔ اسی لئے اس دور میں حقیقی ادیبوں کی قلت اور وردی پوش ادیبوں کی کثرت پائی جاتی ہے، حقیقی ادیب تو مصور اور سنگ تراش اور موسیقار کی طرح ایک فنکار ہوتا ہے، حقیقی ادیب کا ادب نوا سنجان گلشن کی زمزمہ سنجیوں کی طرح ایک زمزمہ ہے وہ بلبل کی نوا ہے، وہ پھول کی خوشبو ہے اور چاند ستاروں کی روشنی ہے، رومانی دور کے شاعر (Keats) نے شاعری کے بارے میں کہا تھا:

If Poetry Comes not as Naturally as the Leaves to the tree it had Better not Come at all .

شاعر نے شاعری کے بارے میں جو بات کہی ہے وہی فنی نثر کے بارے میں بھی صحیح ہے، ایک ادیب چاہے وہ شاعر ہو یا نثر نگار وہ شخص ہوتا ہے ادب جس کی فطرت میں قدرت کی طرف سے ودیعت کر دیا جاتا ہے، یہ اکتسابی کم ہوتا ہے اور وہبی زیادہ ہوتا ہے۔ گلاب کا حسن اس کی رنگت اور نکہت سب کچھ قدرت کی دین ہے، مالی اس کا قلم لگاتا ہے، زمین میں کھاد ڈالتا ہے، پودوں کو کیڑوں سے بچاتا ہے یہ فطرت پر انسانی محنت کا اضافہ ہے۔ گلاب کے پھول کی طرح ادب بھی خواہ وہ شعر میں ہو یا نثر میں ہو قدرت کا عطیہ ہے، مطالعہ اور ممارست سے، مشق اور ریاضت سے جو اکتسابی چیز ہے قدرت کا یہ پودا برگ و بار لاتا ہے؛ لیکن اگر قدرت کی طرف سے یہ ہنر ودیعت ہی نہیں کیا گیا ہو تو لاکھ کوشش سے بھی کوئی شخص ادیب نہیں بن سکتا ہے، فطرت اگر لالہ کی حنا بندی نہ کرے تو غریب مالی لاکھ کوشش کرلے وہ زمین سے گل لالہ نہیں اُگا سکتا صرف اپنی محنت اور کوشش سے ایک شخص فاضل یگانہ ماہر علوم اور بڑا اسکالر تو بن سکتا ہے؛ لیکن صرف محنت سے کوئی شخص بڑا

ادیب اور شاعر نہیں بن سکتا؛ لیکن اگر ادب کا جوہر فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے تو ایک شخص اپنی محنت اور مشق سے مطالعہ اور ممارست سے اپنے فن کا زیادہ بہتر اظہار کر سکتا ہے۔ اس لئے فطری ادیب کے لئے بھی محنت اور مطالعہ درکار ہے، جوہر فطرت کے اعتبار سے بھی اور محنت اور مشق کے اعتبار سے بھی اہل ادب میں تفاوت اور فرق مراتب پایا جاتا ہے۔ ایک شخص بہتر جوہر فطرت اور کامل محنت کے ذریعہ مکمل ادیب ہوتا ہے، دوسرا شخص جوہر فطرت کی کمی اور کم تر درجہ کی محنت کی وجہ سے آدھا ادیب ہوسکتا ہے، اس لئے جتنے لوگ ادب کے میدان میں ہیں ان میں سے بعض مکمل ادیب ہیں، بعض آدھے اور بعض پونے اور بعض بالکل ہی ادیب نہیں ہیں ان پر ادب کی تہمت لگادی گئی ہے؛ کیوں کہ انھوں نے ادبی قسم کے موضوعات پر کام کیا ہے، ان کی تحریر فن سے دوری اور مہجوری کے اعتبار سے اتنی ہی سپاٹ ہے جتنا کہ حکیم صاحب کا نسخہ یا پولیس کی رپورٹ یا جج کا فیصلہ یا کھیل کی کمنٹری۔

شاعر نے کہا تھا ''تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی'' یہاں بھی اصل بات کی تمہید طویل ہوگئی ہے اور اصل بات مختصراً یہ کہ ''شہر سخن'' کا مصنف ملک زادہ منظور احمد مکمل ادیب ہے وہ شہر سخن کا شہر یار ہے؛ کیوں کہ اس کی تحریروں میں فن کی جلوہ گری ہے اور ادب کے حسن کی عشوہ گری ہے۔ اس نے گلدستہ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھا ہے اور پھول کے مضمون کو کئی رنگ، سے باندھا ہے، کتاب میں سونے چاندی کے پہاڑ اور لعل و یاقوت کے جھاڑ ہیں۔ زبان کے حسن کا اعتراف نیاز فتح پوری نے اس جملہ میں کیا ہے'' اس کتاب کی ایک اور خصوصیت جو مجھے بہت پسند آئی وہ اس کا انداز بیان ہے'' نیاز فتح پوری خود مسلم ادیب تھے وہ کسی کے اُسلوب نگارش کو پسندیدگی کی سند دے دیں تو وہ بھی ادب کی دنیا میں مسلم اور محترم ہوجاتا ہے۔ شہر سخن میں ان ۲۶ شعراء کا تذکرہ ہے جن سے وہ ملے اور جن کو انھوں نے مشاعروں میں سنا اور جن کو انھوں نے پڑھا۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا، یہ کتاب داستان دید وشنید ہے اور قصہ نغمہ ونشید ہے، شعراء کی بزم آرائیاں ہیں اور مصنف کا شعراء پر محاکمہ ہے، یہ محاکمہ اور شاعری پر یہ تبصرہ بصیرت افروز ہے، ضروری نہیں کہ ہر تبصرہ اور تنقید بالکل بے لاگ ہو۔ بالکل بے لاگ اور بالکل بے مروت، سخت گیر اور برہنہ شمشیر وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی شخصیت کی تشکیل میں شرافت کی تھوڑی سی کمی رہ جاتی ہے، تنقید میں تھوڑی سی کمی رہ جائے تو حرج نہیں، شرافت میں کمی رہ جائے تو اس سے بہت بڑا حرج واقع ہوتا ہے اس سے اخلاقی قدریں زیر وزبر ہوجاتی ہیں۔ شریفانہ قلم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ

وہ بات تو اپنی معرض تنقید میں پوری کہہ دیتا ہے؛ لیکن اس طرح کہتا ہے کہ کسی کے شیشہ دل پر بال نہ آئے، اس کے لئے وہ کبھی لالہ وگل کا استعارہ اختیار کرتا ہے اور کبھی تنقید کو تواضع کے پردے میں چھپالیتا ہے۔ علم وادب کی دنیا میں شریفانہ اور ہمدردانہ تنقید کی مثالوں کو اکٹھا کرنے کا کام ابھی باقی ہے، لکھنؤ کے ایک عالم دین اور ادیب کی ایک معاصر داعی اور اسلامی شخصیت پر تنقید میں بھولتا نہیں، اس شخصیت کا انتقال ہوا تو انھوں نے مضمون لکھا اور اپنے فکری اور علمی اختلاف کو تواضع کے پردہ حریر میں چھپادیا، نظریاتی بحثوں سے ناواقف لوگوں کو یہ محسوس تک نہیں ہوسکا کہ انھوں نے اختلاف کا اظہار کیا ہے، فکر اور طریقہ کار کے اختلاف کو زیر بحث لانے کے بجائے انھوں نے کام سے اپنی دوری اور علاحدگی کا تذکرہ کیا اور پھر انھوں نے خوبصورتی سے میر کا یہ شعر زیب قرطاس کردیا:

ہوگا کسی دیوار کے سایہ کے تلے میر

کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

یہ تو نثر میں اعلیٰ درجہ کی شریفانہ تنقید کی مثال تھی، شعر میں عظیم آباد کے ایک شاعر نے ''قاتل دشمن'' کے لئے مہربان لفظ استعمال کیا ہے اور انتقام اور دشنام کے بجائے صرف اشاروں سے کام لیا ہے۔

اب ان کی بات کہہ دوں اگر سب کے سامنے

سر میرے مہرباں سے اُٹھایا نہ جائے گا

شریفانہ تنقید اور فراخ دلانہ توصیف اور توازن اور ژرف نگاہی ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کی کتاب ''شہرِ سخن'' کی خصوصیت ہے، کتاب میں خاکہ نگاری اور مرقع نگاری کا عنصر بھی شامل ہوگیا ہے؛ لیکن جو چیز کتاب کو دوسری تمام تنقید کی کتابوں سے ممیّز اور ممتاز کرتی ہے وہ اس کا اُسلوب بیان ہے، کتاب اپنے اُسلوب اور انشاء کے اعتبار سے ادب عالیہ کا درجہ رکھتی ہے۔ مرصع نثر اور زرنگار انشاپردازی کے اعتبار سے ادب کے تاریخ نویس اگر قاضی عبد الغفار کے لیلی کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری کا تذکرہ کریں، مہدی افادی کی انشاء لطیف کی داد دیں اور شہرِ سخن کو نظر انداز کردیں تو یہ انصاف سے بعید بات ہوگی۔ محمد حسین آزاد کی آبِ حیات شعراء کا تذکرہ ہے؛ لیکن آبِ حیات کی نثر خود اُردوئے معلّٰی کا نمونہ ہے، ملک زادہ منظور احمد کی کتاب بھی اپنے عصر کے شعراء کا تذکرہ ہے اور اس کتاب کی نثر بھی انشاء پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہے، یہ الگ بات ہے کہ آبِ حیات ایک دریا ہے اور شہرِ سخن ایک ذرا سی آبجو؛ لیکن مصنف نے پہلے ایڈیشن کے مقدمہ میں دوسری، تیسری اور

چوتھی جلد کی جو خوشخبری سنائی ہے اگر اس کی تعمیل اور تکمیل ہو جاتی ہے تو یہ آبجو بھی دریائے بے کراں میں تبدیل ہو جائے گی اور اس طرح سے اکیسویں صدی میں آب حیات کا دوسرا جنم ہو گا۔ زیر تعاف کتاب کا کوئی صفحہ لے لیجئے اس میں قدم قدم پر دامان باغباں اور کف گل فروش کا منظر روح کی بالیدگی کا سامان کرتا ہوا نظر آئے گا، اس میں ادب کے ایسے نقوش مل جائیں گے جو نقوش سلیمانی ہوں گے اور حرز جاں بنائے جانے کے مستحق۔ اس دور میں اُردو زبان کے طلبہ ہی کو نہیں اساتذہ کو بھی اگر یہ نقوش تعویذ بنا کر پہنا دیئے جائیں یا وہ ان کو اپنا وظیفہ صبح گاہی بنالیں تو ان کے بہت سے لسانی امراض کا ازالہ ہو جائے گا اور اللہ نے چاہا تو شفائے کامل و عاجل نصیب ہو گی۔

پوری کتاب میں جو اُسلوب بکھرا اور پھیلا ہوا ہے اس کا ایک نمونہ یہ ہے ''روش صاحب کی شاعری کی عمر میری اصل عمر سے کئی سال زیادہ ہے اور اس طویل عرصے میں انھوں نے ''محرابِ غزل'' کی آرائش صد ہا لالہ و گل اور ہزار ہا ماہ و انجم سے کی ہے، کہیں رنگ الم ہے، کہیں رنگ نشاط، کہیں نالہ نیم شبی ہے، کہیں سکوت ازلی، کہیں ہستی و مرگ کے فرسودہ مسائل ہیں اور کہیں فلسفہ غیب و شہود، کہیں نکہت زلف پریشاں ہے اور کہیں لب لعلین کی توبہ شکن فضائیں مگر انھوں نے ہر ہر مرحلے میں انداز تکلم کے ہزاروں اُسلوب پیدا کئے ہیں، ان کی غزلیں آئینہ ایام میں صد ہا طریقہ سے نکھری اور سنوری ہیں، کبھی صداقت اور حق گوئی کی بات چلی ہے تو ان کی غزل نے دار پر چڑھ کر فسانہ منصور دہرایا ہے اور ظلم و ستم کے مقابلہ میں سینہ سپر ہوئے ہیں تو شاخ گل جیسی نازل غزل قالب شمشیر میں ڈھل کر ان کے ہاتھوں میں لچکی ہے''پوری کتاب ادبی اُسلوب میں ہے اور تخلیقی ادب کا نمونہ ہے، تشبیہ استعارہ کنایہ مجاز مرسل اور فن بدیع کے اقسام سے معمور اور مخمور، ایک اور اقتباس انور صابری پر مضمون سے ملاحظہ ہو:

> میں نہایت دیانت داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ تقسیم ملک سے پہلے اور تقسیم ملک کے بعد پورے ہندوستان میں مولانا کے اتنا زود گو دوسرا شاعر کم از کم میری نظروں سے نہیں گذرا، زہد جس پر رندی رشک کرے، سیاست جس پر شعریت قربان، تر دامنی جس سے فرشتے وضو کریں، منکسر مزاجی جہاں کج کلاہی سر جھکائے طریقت جس پر شریعت نثار ہو، مولانا کی شخصیت اور کردار کے مختلف پہلو ہیں۔

نقد سخن کی بلاغت کے ساتھ ملک زادہ منظور کی تحریروں میں لطیف حس مزاح کا عنصر بھی

پایا جاتا ہے، حفیظ میرٹھی پر مضمون کی ایک عبارت ملاحظہ ہو:

> ان کے یہاں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک اُبھرتے ہوئے غزل گو شاعر کے یہاں ہونی چاہئیں، چاہے وہ موحد ہو یا مشرک، کافر ہو یا دیندار، ترقی پسند ہو یا تعمیر پسند، غزل گوئی بذات خود ایک جامع اور واضح شریعت ہے اور مجھے اُمید ہے کہ حفیظ صاحب اپنے نظریات اور اعتقادات کو غزل کے پیمانہ میں اسی حد تک اور اسی فنکاری کے ساتھ ڈھالنے کی کوشش کریں گے، جس کی متحمل غزل ہو سکتی ہے، ورنہ ذرا بھی اس ''نیم وحشی'' صنف سخن کے مزاج میں برہمی پیدا ہوئی تو شاعر کو ہلاک کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری کی عاقبت بھی خراب کر دے گی۔

چوں کہ کتاب میں شعراء کی شعری خصوصیات کا تذکرہ ہے، نقص اور کمال، خوبیوں اور خامیوں دونوں کا، اس اعتبار سے یہ کتاب تنقید کی کتاب بھی کہی جا سکتی ہے، تنقیدی عبارتوں سے یہ بات آشکارا ہے کہ ادبی تحریکات اور عہد حاضر کے سیاسی نظریات اور تغیرات اور انقلابات پر مصنف کی گہری نظر ہے، ان کا نقد کامل عیار ہے اور شاعری کے لئے ان کا اپنا معیار ہے۔ وہ مشرقی تہذیب کے قدرداں ہیں؛ لیکن وقت کے تقاضوں سے بھی باخبر ہیں؛ لیکن بایں ہمہ اوصاف یہ صرف تنقید کی کتاب نہیں، زبان و بیان کی رنگینی اور شیرینی، دلکشی اور دلربائی، شگفتگی اور نغمگی اور فنکاری اور پرکاری کی وجہ سے یہ کتاب تخلیقی ادب کا بہترین نمونہ بھی ہے، یہ شعر کی تنقید کی ایسی کتاب ہے جو خود مکمل ادب ہے۔ اب تو ادب کے سلسلہ میں نارسائی اور شکستہ پائی کا یہ عالم ہو گیا ہے کہ بعض ناقدین یہ کہنے لگے ہیں کہ ادب کی تنقید کو ادب نہیں ہونا چاہئے، حسن بیان کو وہ عیب کہتے ہیں اور اپنی تحریر کے لنگ کو اور اکھڑے اکھڑے لہجہ کو ہنر:

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

آخر میں حرفے چند ان الفاظ کے بارے میں جو اس وقیع ادبی تصنیف میں در آئے ہیں۔ کتاب کی عمر مصنف کی عمر سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے اور ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی رہتی ہے، کتاب اگر کسی ادیب کا سعی کرم اور رشحہ قلم ہو تو اسے استناد کا درجہ بھی حاصل ہو جاتا ہے اور مصنف کی تحریر حلقہ شام وسحر کی زنجیر سے آزاد ہو جاتی ہے، اس لئے معنی و بیان کی نگہداشت کے ساتھ زبان اور محاورے کی صحت کا خیال بھی ضروری ہے، اس لئے ایک غیر جانبدار مضمون نگار یا

ناقد کا فرض ہوتا ہے کہ جہاں ضرورت محسوس ہو وہاں لفظ کی صحت کے بارے میں اپنا ذہنی تحفظ بھی ریکارڈ کردے، یہاں اس راقم سطور مضمون نگار کا قول نہ تو قول فیصل ہے نہ حرف آخر، الفاظ کی صحت اور عدم صحت کے بارے میں معیار کا اور ذوق کا اور زمانہ کا اختلاف بھی ہوتا ہے، ضروری نہیں کہ مصنف کو یا قاری کو اس سے اتفاق بھی ہو، اس کتاب میں ایک لفظ ''متلاشی'' استعمال ہوا ہے، شمس الرحمٰن فاروقی نے لغات روزمرہ میں لفظ'' رہائش'' کو غلط بتایا ہے؛ کیوں کہ یہ اُردو مصدر رہنا سے فارسی حاصل مصدر کے وزن پر بنالیا گیا ہے، اس لئے متلاشی کا لفظ بھی غلط ہونا چاہئے؛ کیوں کہ اسے اُردو فعل تلاش کرنے سے عربی اسم فاعل کے وزن پر بنالیا گیا ہے۔ کتاب میں ''معرکۃ الآرا'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے لفظی معنیٰ ہیں آراء کی جنگ، نوراللغات نے فارسی ترکیب معرکہ آراء اور عربی ترکیب معرکۃ الآرا دونوں کو درست قرار دے دیا ہے اس سے مصنف کتاب کی تائید ہو جاتی ہے؛ لیکن رشید حسن خان نے عربی ترکیب معرکۃ الآرا کو غلط بتایا ہے، کتاب میں لفظ'' بھرپور'' بھی کئی جگہ آیا ہے، اس دور میں تمام اہل قلم اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں؛ لیکن میرے ذوق سماعت پر یہ لفظ ہمیشہ بوجھ محسوس ہوتا ہے، اگر میں اس لفظ پر تنقید کروں تو مصنف کو یہ کہنے کا حق ہوگا کہ:

کان ان کے وہ نازک کہ گراں میری غزل بھی

اس لفظ کے سلسلہ میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ کلاسیکی ادب میں یہ لفظ نہیں ملتا ہے، محمد حسین آزاد ابوالکلام آزاد اور اس درجہ کے اہل قلم میں سے کسی نے یہ لفظ استعمال نہیں کیا اور اب تک کسی زبان کی ڈکشنری میں داخل نہیں ہوا ہے؛ لیکن یہ حقیقت ہے اور مجھے اس کا اعتراف ہے کہ زندہ زبان ایک نامیاتی اور ارتقاء پذیر جسم ہے اور اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور جس لفظ کو مستند اہل زبان استعمال کرنے لگیں تو وہ درست ہو جاتا ہے، اس لئے کم از کم معرکۃ الآرا اور بھرپور ان دونوں لفظوں پر تنقید میں زیادہ وزن نہیں رہ جاتا ہے، سوال یہ ہے کہ پھر آخر ان دونوں لفظوں کا تذکرہ کیوں کیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ آخر کچھ تو معلومات ان لفظوں کے بارے میں عام قاری کو مل گئیں اور اس سوال کا جواب فراق گورکھپوری کی مشہور غزل کی ردیف ہے'' مگر پھر بھی''، یعنی ان دونوں لفظوں کا جواز ہے، مگر پھر بھی:

یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے سب مگر پھر بھی

☆ ☆ ☆ ☆

تقدیرِ اُمم کا راز داں — مولانا ابوالکلام آزادؒ

ہندوستانی مسلمان ایک ایسی ملت کا نام ہے جس کا ماضی مہرباں اور درخشاں، جس کا حال بے مہر اور ماتم کناں اور جس کا مستقبل سوالیہ نشاں ہے۔ ماضی گذر گیا مستقبل پردہ غیب میں ہے جو کچھ ہمارے بس میں ہے وہ حال ہے اور حال میں صحیح سمت میں اور صحیح انداز میں کوشش کرنے پر روشن مستقبل کا انحصار ہے۔ صحیح سمت میں اور صحیح انداز میں کوشش کس طرح کی جائے اس کا انحصار دو چیزوں پر ہے ایک یہ کہ اپنے حالات سے متعلق مکمل شعور اور آگہی اور دوسرے اپنے مذہب کی روح سے مکمل واقفیت۔ جہاں تک حالات کا تعلق ہے اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہندوؤں کی احیائی تحریکوں نے مسلمانوں کو معاشی اور سیاسی اور تعلیمی اعتبار سے پسماندہ رکھنے کا تہیہ کر رکھا ہے، مسلمانوں کا وجود بھی انھیں برداشت نہیں، مذہب اور تہذیب کو برداشت کرنے کا سوال تو بعد میں آتا ہے۔ ہمارے اس نقطہ نظر کی سب سے بڑی دلیل گجرات کے فسادات ہیں جو حکومت کی نگرانی میں کرائے گئے اور جہاں وہ جماعت حکمراں ہے جس کی تشکیل کا بنیادی عنصر مسلمان دشمنی ہے، اس ملک میں مسلمانوں کے مسائل کا تعلق بڑی حد تک اسی رویہ سے ہے، جو احیائی تحریکوں نے اختیار کر رکھا ہے، چنانچہ مسلمانوں کی تہذیب، ثقافت، زبان، پرسنل لا کو خطرہ اسی طرح کی تحریکوں سے ہے اور وہ ان کی تعلیمی اور اقتصادی ترقی میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں۔

یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ جب ہم ہندوؤں کی احیائی تحریکوں کا نام لیتے ہیں تو اس سے ہماری مراد پوری ہندو قوم نہیں ہوتی ہے، ہندو قوم کی اکثریت احیائی ذہنیت نہیں رکھتی اور تمام ہندو مسلمانوں سے نفرت نہیں کرتے، ہندوؤں کے معتقدات اور سیاسی نظریات میں بہت فرق اور تفاوت پایا جاتا ہے۔ زیادہ تر ہندو اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ ہندوستان کی سرزمین مختلف نسلوں اور تہذیبوں اور مذہبوں کے قافلہ کی منزل رہی ہے، سینکڑوں سال سے ہندوستان اس سانچہ میں ڈھل چکا ہے اور اس سانچہ کو نہ توڑا جا سکتا ہے اور نہ بدلا جا سکتا ہے صدیوں سے ہندوستان کی تقدیر یہی ہے، ہندوؤں کی ایک اقلیت نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا جس طرح سے مسلمانوں کی ایک

اقلیت نے اس صورتِ حال سے خود کو ہم آہنگ نہیں کیا۔ حال کے اس مجمل اور مختصر تجزیہ کے بعد اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کی روح کیا رہنمائی کرتی ہے اور ان حالات میں ہندوستانی مسلمانوں کو کیا پیغام دیتی ہے میرا خیال یہ ہے کہ ان حالات میں ہندوستان کے مخصوص مزاج کو مد نظر رکھتے ہوئے سب سے بہتر مذہبی رہنمائی وہ ہے جو مولانا آزاد نے ایک تقریر میں ہمیں دی ہے، مولانا آزاد کہتے ہیں:

میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں، میں تیار نہیں کہ ان کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب، میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرہ میں ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں، اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے، میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں، جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے، میں اس کی تکوین کا ایک ناگزیر عالم ہوں، میں اس دعویٰ سے کبھی دست بردار نہیں ہوسکتا۔ (خطبات آزاد، مرتبہ: شورش کاشمیری)

کیا مسلمانوں کے لئے یہ صحیح ترین رہنمائی نہیں ہے، جو اسلام کی روح سے واقفیت کے ساتھ حالات کے شعور اور تجزیہ پر مبنی ہے کیا آج کے حالات میں ایک محبّ وطن مسلمان کا بعینہ یہی موقف نہیں ہونا چاہئے؟

اگر مولانا آزاد کی تقریر کا یہ اقتباس اہم ہے، تو اس کی اہمیت کا احساس کتنے لوگوں نے کیا ہے کیا یہ اقتباس اس قابل نہیں ہے کہ خوبصورت طریقہ سے لکھوایا جائے، چھپوایا جائے اور گھروں میں اور ڈرائنگ روم میں دیواروں پر فریم کرواکے اسے آویزاں کیا جائے؛ تاکہ صحیح راستہ کا تصور ذہن اور دماغ میں واضح رہے اور پورے طور پر راسخ ہوجائے۔ مسلمانوں کے لئے یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ غیر مسلم اکثریت کے ساتھ ان کی زندگی نوشتہ تقدیر بن چکی ہے وہ چاہیں یا نہ چاہیں ان کو اس ملک میں اسی حال میں رہنا ہے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کی طرح وہ اس ملک کی آبادی کا ناقابل انکار حصہ ہیں یہی قدرت کا فیصلہ ہے اور میں بحیثیت مسلمان کے اور بحیثیت

اسلامی علوم کے ایک طالب علم کے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ قدرت کا یہ فیصلہ عظیم امکانات کا حامل ہے، بشرطیکہ مسلمان اپنے اندر وہ صفت پیدا کرلیں ان کا مذہب جس سے متصف ہونے کی انھیں دعوت دیتا ہے۔ مسلمانوں کو حیرانی اور سر گشتگی کے عالم سے بلا تاخیر باہر آجانا چاہئے اور ایک محب وطن مسلمان کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا چاہئے، مسلمانوں کے خلاف متعصّبانہ رویہ معلوم؛ لیکن مجھے یہ بات کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ مسلمان اپنے مسلمان ہونے کی ذمہ داریوں کو اس ملک میں ادا نہیں کر رہے ہیں۔ کیا ہمارے اعمال و کردار میں وہ خوبصورتی پیدا ہوگئی ہے، اسلام نے جس کا ہم سے مطالبہ کیا ہے کیا ہمارے اندر وہ اخلاقی خصوصیات موجود ہیں، جن کا تجربہ کر کے برادرانِ وطن یہ محسوس کریں کہ مسلمان ایک شریف انسان اور اچھا شہری ہوتا ہے، اس کا پڑوسی ہونا اطمینان کی بات ہوتی ہے، اس کو اپنے کارخانہ میں اور اپنی کمپنی میں ملازم رکھنا، کارخانہ اور کمپنی کی ترقی کی ضمانت ہوتی ہے؛ کیوں کہ وہ دوسروں سے زیادہ فہیم، مخلص، محنتی کارگذار اور امانت دار ہوتا ہے، کیا ہم مسلمانوں نے خدمت ایثار اور قربانی اور اخلاقی بلندی کا کوئی نقش قائم کیا ہے، ہم مسلمانوں کا حال تو بحیثیت مجموعی اقبال کے اس شعر کے مرادف ہے۔

جس کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن تم ہو

کاش کہ ایسا ہوتا کہ برادرانِ وطن کے سامنے مسلمانوں کی بہت اچھی تصویر ہوتی، وہ سمجھتے کہ مسلمان بے ایمانی اور کام چوری نہیں کرسکتا ہے، انصاف اور سچائی کا راستہ اسے پسند ہے، انسانی اور روحانی اقدار کے اعتبار سے وہ دوسروں سے بلند اور زیادہ ممتاز ہے وہ مسجد میں عبادت بھی کرتا ہے اور ایمان داری کے ساتھ کام کرنے کو بھی عبادت کا درجہ دیتا ہے، وہ کمزوروں کا مددگار اور غریبوں کا غم خوار ہوتا ہے۔ مولانا آزاد کا جو اقتباس اوپر نقل کیا گیا ہے وہ صحیح ترین راستہ ہے، جو اسلام کے مطالعہ پر مبنی ہے اور گرد و پیش کے حالات کے گہرے تجزیہ پر بھی مبنی ہے، اس پیغام کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ مولانا آزاد پر اس کتاب کی اشاعت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد اس پیغام کی اشاعت بھی ہے اور اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش اس کتاب کی اشاعت کے لئے قابل مبارک باد ہے، ہمیں یقین ہے کہ اس ملک میں دیر سویر باہمی رواداری کی فضا عام ہوگی، تلخیوں اور کدورتوں کا خاتمہ ہوگا؛ کیوں کہ اس کے بغیر ہندوستان کی ہمہ جہت ترقی ممکن نہیں ہے، فیض احمد فیض کی طرح ہمیں بھی انتظار ہے۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی مداراتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت پر یہ بیش قیمت کتاب اس لئے شائع کی جارہی ہے کہ وہ مثالی شخصیت جس کے تابندہ نقوش ہمارے لئے رہنما ہیں ہماری نظروں سے اوجھل نہ ہو اسی مقصد کے لئے اُردو اکیڈمی نے ہر سال مولانا آزاد ایوارڈ کا اعلان کیا ہے جو تمام اُردو اکیڈمیوں کے ہر ایوارڈ سے بڑا ایوارڈ ہے، اس کا مقصد بھی یہ ہے کہ مولانا کی شخصیت کی جھلکیاں ملک کے طول وعرض میں جس شخص میں پائی جائیں اس کو اس ایوارڈ کا مستحق قرار دیا جائے، مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کی تشکیل کے عناصر حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) علوم شرقیہ واسلامیہ۔

(۲) اُردو زبان وادب۔

(۳) تعلیم کے میدان میں خدمت۔

(۴) متحدہ قومیت کا تصور اور سیکولر نظریات۔

ایوارڈ کے لئے سال رواں کے لئے جس شخصیت کا انتخاب کیا گیا ہے، ان کا نام ہے جناب سید حامد، چانسلر ہمدرد یونیورسٹی اور سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور تعلیمی کارواں کے قائد، اُمید کی جاتی ہے کہ آئندہ بھی اس عظیم ایوارڈ کے لئے شخصیت کے انتخاب کے وقت مذکورہ بالا خصوصیات کو ہر قیمت پر پیش نظر رکھا جائے گا؛ تا کہ یہ ایوارڈ بامعنی اور مفید رہے۔

(مقدمہ کتاب، شائع کردہ اُردو اکیڈمی، آندھرا پردیش)

☆ ☆ ☆ ☆

دنیا پہ کرے غور جو کوئی تھوڑا
پائے گا ہر ایک شئے کو جوڑا جوڑا

دعویٰ تھا مرے دوست کو یکتائی کا
اللہ نے اب غرور ان کا توڑا

دیارِ شبلی کے باکمال شاعر برق اعظمی پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی باعتبار نقد اور باعتبار انشاء لائق مطالعہ ہے برق اعظمی بھی ایوان شہرت میں وہ جگہ نہیں پا سکے جس کے وہ مستحق تھے، ڈاکٹر تابش مہدی نے ان کے کلام کے جو نمونے پیش کئے ہیں ان سے ان کے باکمال سخن ور ہونے کا یقین ہوتا ہے، برق اعظمی کئی شعراء کے استاد تھے اس مفہوم میں وہ کہتے ہیں:

مثالِ شمس تھے ہم بھی کہ جب غروب ہوئے
تو بے شمار ستاروں کو جگمگا کے چلے

رمز آفاقی اور کلب علی شاہد امروہوی کی غزلوں کا بہت اچھا اور دل نشین تعارف پیش کیا گیا ہے، افسوس ہوا کہ اتنا اچھا کلام اور میں صاحب کلام سے بالکل واقف نہیں تھا اور میری طرح بہت سے لوگ ناواقف ہوں گے؛ لیکن اس میں شک نہیں کہ ان دونوں شاعروں کا کلام ذہن کو متوجہ کرتا اور دل کے اندر پیوست ہوتا ہے۔ حفیظ میرٹھی پر بھی ان کا مضمون بصیرت افروز اور قابل مطالعہ ہے، نئی نسل کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے اس دور کے ناقدین نے ان کے ساتھ بے توجہی برت کر اُردو ادب سے انصاف نہیں کیا ہے۔ عزیز وارثی پر بھی ان کے ناقدانہ اور انشا پردازانہ مضمون کو پڑھ کر طبیعت خوش ہوتی ہے، جدید ناقدین سخن نے کلیم عاجز کو بھی نظر انداز کرنے کی کوشش کی تھی اور تابش مہدی نے غالباً یہ طے کرلیا ہے کہ ایک ایک شاعر کو جسے غیر منصفانہ طور پر حاشیہ پر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے روشنی کے فوکس میں لائیں گے۔ بلاشبہ تابش کی اس کاوش نے ان کی کتاب کو جدید عہد کی ایک اہم کتاب بنادیا ہے اور کتاب اس لائق ہے کہ اُردو ادب کے ہر طالب علم کی نظر سے گذر جائے اور غزل اور غزالان فکر کے بارے میں وہ خود رائے قائم کرے، رفعت سروش عزیز بگھروی ابوالمجاہد زاہد شمیم جے پوری وغیرہ پر بھی تمام مضامین اہم ہیں، بحیثیت مجموعی پوری کتاب قابل مطالعہ ہے، نشور واحدی کو بھی تابش مہدی نے نقد کا موضوع بنایا ہے، نشور اپنے فن اور کمال سخن کے اعتبار سے ان شعراء میں ہیں جن کو آسانی کے ساتھ فراموش نہیں کیا جاسکتا؛ لیکن ہم دیکھتے

ہیں کہ ان کو فراموش کیا جارہا ہے، یہ دنیا بڑی وفا فروش اور عہد فراموش ہے، آج بڑے بڑے استادان فن کا کوئی نام نہیں لیتا ہے، شعروسخن میں جو نامور تھے ان کا نام ونشان مٹ رہا ہے۔ تابش مہدی کی کاوش قلم جو نقدِ غزل کے نام سے سامنے آئی ہے اس اعتبار سے بطور خاص اہم ہے کہ انھوں نے کئی ان شعراء کو اپنا موضوع بنایا ہے، جن کو لوگ بھولتے جارہے ہیں۔ کتاب اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس میں حسن انشاء کے نمونے قدم قدم پر ملتے ہیں، ورنہ اس دور کے بہت سے مشہور اور اپنے رتبہ پہ مغرور ناقدین ایسی ناہموار اور سامعہ خراش قسم کی نثر لکھتے ہیں کہ طبیعت بدخط اور بے مزا ہوجاتی ہے اور اگر کوئی کچھ کہے تو انھیں یہ کہنے میں بھی باک نہیں ہوتا ہے کہ خوبصورت نثر لکھنا ناقد کی ذمہ داری نہیں ہے، ناقد ناقد ہوتا ہے نہ کہ فنکار، بہر حال مصنف نے نشور واحدی کا بہت اچھا تعارف کرایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> نشور واحدی حسن کا بڑا لطیف اور ستھرا ذوق رکھتے ہیں، انھوں نے حسن کو بہت قریب سے دیکھا اور اس کی عشوہ طرازیوں میں کھوگئے ہیں؛ لیکن ان کی شاعری میں ابتذال ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا، جس حسن کا تذکرہ ان کی غزلوں میں ملتا ہے وہ بڑے ہی مہذب ماحول کی پیداوار ہے، بلندی خیال، شوکت الفاظ، حسن تراکیب، شگفتگی بیان اور تموج فن ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں، زبان کی روانی، روزمرہ کی صفائی مصرعوں کی برجستگی، بندش کی چستی شستگی اور شگفتگی بے ساختگی، شیرینی اور فصاحت، بے تکلفی اور لطافت نزاکت تخیل حسن بیان صداقت جذبات اثر آفرینی وجد انگیزی اور جدت طرازی یہ وہ محاسن شعری ہیں، جنھیں نشور واحدی کے کلام کے مطالعہ کے وقت بآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

نشور واحدی کا شعر ہے:

پہنچا دیا ساقی نے پایان حقیقت تک
پیمانہ بہ پیمانہ میخانہ بہ میخانہ

مصنف نے غلطی سے حقیقت کی جگہ پر محبت کا لفظ لکھ دیا ہے، نشور واحدی بڑے شاعر ہیں اور ان کا کلام مترنم اور موسیقی ریز ہے اور ستائش کا مستحق ہے؛ لیکن اقبال سے موازنہ کرنے کی کوشش حد اعتدال سے تجاوز ہے، تابش مہدی کہتے ہیں ’’حسن بیان اور تاثیر کلام اور زبان اور روز مرہ کی جو چاشنی ہمیں نشور واحدی کے یہاں ملتی ہے وہ اقبال کے یہاں ملتی تو ہے؛ لیکن اس کی سطح کی

ادب وانشاء کی ایک جوئے رواں ہے جو سنگ رہ سے گاہ بجتی گاہ ٹکراتی ہوئی اور کوہ وصحراء کو سیراب کرتی ہوئی گزر رہی ہے، رودِ قلم کے ساز اور صریر خامہ کی سامعہ نواز آواز کو سنئے اور سر دُھنئے:

''یہ انگریزی شراب کی بوتلیں راجہ صاحب کو خاص طور پر پسند آئیں، سر شام پانڈ وانہ کے میدان میں سوروں کی کھالیں اترنے لگیں اور رات گئے جب جھمکا جان اور ترنجن بائی کے طائفے اپنا اپنا ساز وسامان سجا کر محفل میں جم گئے تو یکا یک چمکور کے، ہندو مسلمان اور سکھ بڑے بوڑھے اپنے گھروں کے اندر دبک کر بیٹھ گئے، پچھلے ڈیڑھ سو سال میں آج پہلی بار چمکور میں سرعام سور کا گوشت کاٹا گیا تھا، آج تک اس قصبہ کی فضا جھمکا جان کے طبلے کی تھاپ اور ترنجن بائی کے گھنگھروؤں کی جھنکار سے نا آشنا تھی، رات کے بڑھتے سناٹے میں جب ان سازوں کی آواز فضا میں دور دور تک لہرائی تھی تو گاؤں والوں کے دل دھک دھک کرنے لگے تھے، خوش عقیدہ عورتیں جو ہر جمعرات کو بابا صاحب کے مزار پر دیا جلانے جاتی تھیں سہم سہم کر کوٹھوں کی منڈیر سے لگی بیٹھی تھیں، طوفان زدہ اندھیری راتوں میں وہ ان ہی کوٹھوں پر اپنی مرادیں مانگا کرتی تھیں جو بابا صاحب کے فیض سے پانڈ وانہ کے میدان میں روشن ہوا کرتے تھے، آج اسی میدان میں رنگ ونور کا ایک سیلاب آیا ہوا تھا، قندیلوں اور شمعوں کی ضیا تا حد نظر جگمگا رہی تھی؛ لیکن شراب میں بدمست فوجیوں کی ہر نبکار سے گاؤں والیوں کے دل لرزنے لگتے تھے، جیسے زبردستی کوئی ان کی بانہیں پکڑ کر کھینچ رہا ہو۔ بے زبان کنواریاں جو سپنوں کی بارات لے کر بابا صاحب کے مزار پر کچے چاول اور شکر کی مٹھائیاں بھر بھر کر نچھاور کیا کرتی تھیں یوں حیران اور پریشان تھیں، جیسے بھرے چوراہے پر برسر عام ان کا سہاگ لٹ گیا ہو، سارا گاؤں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح انجانی فضا میں ڈگمگا رہا تھا، روایات کی ڈور ٹوٹ گئی تھی ثبات کا پیچ کٹ گیا تھا، سکون کی دولت لٹ گئی تھی، تاریخ کے سانچے بے نور ہو گئے تھے، وقت کا پاسبان سو گیا تھا، صدیوں کے سکوت کو فقط ایک رات کے شور وغل نے نگل لیا تھا۔''

شہاب نامہ کے صفحات دلکش اور حسین تحریروں کے نور سے جگمگا اٹھے ہیں، جادو نگار قلم نے اتنے جادو جگائے ہیں اور خوبصورت تحریروں کی اتنی آتش بازیاں کی ہیں کہ پوری کتاب پڑھ کر دیوالی کی رات کا سماں آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔ قدرت اللہ شہاب کو اس کہکشاں صفت تحریر پر قدرت کیسے حاصل ہوئی اور الفاظ کے جن کو انھوں نے شیشے میں کیسے اُتارا اور تعبیرات کی سرخ وسبز پریوں پر کیسے قابو پایا، اس کے رازہائے سربستہ سے بھی اس کتاب میں پردہ اٹھایا گیا

ہے، جب وہ خالصہ ہائی اسکول میں طالب علم تھے انھوں نے مشہور اہل قلم کے لکھے ہوئے ناول اور داستانیں اور ادب وشعر کی کتابیں اسی طرح پڑھیں کہ ان کی عبارتیں لوحِ دل پر نقش کالحجر ہوگئیں، محمد حسین آزاد کی آبِ حیات اور رتن ناتھ سرشار کے فسانہ آزاد کی چار جلدوں کا پورا ادبی رنگ و روغن اپنے حافظے میں محفوظ کرلیا، ان کے علاوہ ڈپٹی نذیر احمد کی مرآۃ العروس، ایامی اور رویائے صادقہ، عبدالحلیم شرر کی فتح اندلس فلورا فلورنڈا، ملک العزیز ورجینا، حسن انجلینا اور فردوس بریں کے مکالمات اور تعبیرات از بر کئے، محمد علی طیب کی رام پیاری محمد میاں رونق کی حاتم بن طئی، حافظ محمد عبداللہ کی الہ دین، خوش نصیب عرف چراغ عجیب، محشر انبالوی کی آل ذورعینی اور دوسری کئی کتابوں سے استفادہ کیا، تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجمہ کئے ہوئے جاسوسی ناول پڑھے۔ ان ہی کتابوں سے انھوں نے عروسِ ادب کی مشاطلگی سیکھی اور ان ہی سے انھوں نے اپنی گیسوئے انشاء کو تابدار بنایا، کبھی کبھی تو کتابوں کے مطالعے میں انھوں نے علمی اعتکاف کیا، ایک بار تین ہفتے ایسے گزرے کہ اپنے کمرے میں محصور اور نظر بند رہے اور جب وہ ادبی اعتکاف سے باہر نکلے تو زبان میں لکنت کی جگہ آبِ حیات کے پرشکوہ فقرے فراٹے بھرنے لگے تھے، تنہائی میں حدیث نفس بھی عبدالحلیم شرر اور رتن ناتھ سرشار کی عبارت میں ہونے لگی تھی، بے شمار چمن کدوں کے پھول چن چن کر انھوں نے زیب قرطاس کرنا شروع کیا، ایک بار اسکول کے اسٹیج پر تقریر کرنے کا موقع ملا تو لاشعور اور تحت الشعور میں جمع کئے ہوئے پرشکوہ الفاظ کا ذخیرہ تلاطم خیز سمندر میں تبدیل ہوگیا، مجمع پر سکوت حیرت کا عالم طاری تھا، شعر وادب کی کتابوں نے شاعری کا ذوق بھی ابتداء طالب علمی سے پیدا کیا، جب وہ چمکور میں اسکول میں پڑھتے تھے، تو چمکور کے بارے میں انھوں نے ایک نظم لکھی جس کا پہلا شعر یہ ہے:

یہ ایسا عجب شہر چمکور ہے
کہ ثانی نہیں جس کا لاہور ہے

طالب علمی کے زمانے میں کچھ غزلیں کہیں؛ لیکن قدرت اللہ شہاب کے کلام کا شہابی رنگ اس وقت نکھر کر سامنے آیا، جب وہ پرنس آف ویلز کالج کے طالب علم تھے، انھوں نے شیلے کی نظم (Ode to The West Wind) کا منظوم ترجمہ کیا، چند اشعار یہ ہیں:

لائی ہے مغربی گھٹا فصلِ خزاں کا قافلہ
رنج بھی غم بھی خار بھی بادۂ بے خمار بھی

تیرے شرارِ سوز سے پھول چمن میں جل اُٹھے
تیرے ہی نیشِ خار سے سینۂ گل فگار بھی

تیری حیات میں نہاں مانا کہ ہے خزاں کی جاں
تیری ہی گود میں جواں پل کے ہوئی بہار بھی

پیدا ہوئے تھے برگ وگل ایک ہی رات کے لئے
تو نے دبا کے رکھ لئے تازہ حیات کے لئے

نالۂ جوش تھا خموش کس نے کیا ہے پرخروش
بحر کی خفتہ موج کو کس نے جگایا خواب سے

زلفیں عروس باغ کی تو نے صبا بکھیر دیں
سینۂ آب کو نئے داغ دیئے ، حباب سے

تیری نوائے پر الم ، تیری صدائے رنج وغم
تیری ندائے زیر و بم پھیلی ہوئی ہے یم بہ یم

بچپن میں اور طالب علمی کے زمانے میں ادب کی کتابوں سے خوشہ چینی اور الفاظ وتعبیرات کو یاد کر لینے کا پھل یہ ملا کہ قدرت اللہ شہاب کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہوگئی، جس کو انھوں نے بعد میں اپنی شاعری اپنے افسانوں اور اپنے مضامین میں اس طرح استعمال کیا کہ کرداروں کی مرقع آرائی میں ان کا قلم مانی کا موئے قلم بن گیا اور منظر نگاری میں بہزاد کی مصوری کا رنگ پیدا ہوگیا۔ افسانہ نگاری کو انھوں نے اپنا میدان منتخب کیا، ان کے افسانے ادبی دنیا، ادب لطیف رومان، سیارہ ڈائجسٹ، معاصر، دستاویز، نیادور، تخلیقی ادب اور مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہو کر مقبول ہوئے، شہاب نامے کے اُسلوب بیان پر تاریخ وتحقیق کا عالمانہ اور پرجلال رنگ نہیں ہے؛ بلکہ اس میں قوس وقزح کے وہ رنگ ہیں جن سے افسانہ نگار کا موئے قلم سحر کار، رنگین اور رومان انگیز فضا تخلیق کرتا ہے اور اپنی لالہ کاری اور گل کاری سے ادب کے لئے نئے چمن آباد کرتا ہے۔ جب پہلی بار آئی سی ایس کے امتحان میں کامیابی کی خبر نغمۂ بربط بن کر گھر والوں کے سامنے

تک پہنچی تو ان کے والد خاموش انداز میں خوش نظر آئے، ان کے ہونٹوں پر مسرت کا ہلکا ہلکا ارتعاش تھا، چہرے پر اطمینان کی خنک چاندنی بکھری ہوئی تھی، انھوں نے قدرت اللہ شہاب کو دو نصیحتیں کیں، وہ بھی انگریزی زبان میں، ایک یہ کہ اپنے کیرکٹر کی حفاظت کرنا، دوسرے یہ کہ کسی شخص کی پیٹھ پیچھے وہی بات کرنا جو اس کے منہ پر بھی دہرا سکو؛ لیکن خود ان ہی کی زبان میں سنئے:

رات کو سویا تو نیند کے جوار بھاٹے نے دل کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی خواہشات کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر میرے شعور کے ساحل پر ڈال دیا، میری ایک دبی دبی سی آرزو تھی کہ میں فلمی کہانیاں مکالمے اور گیت لکھنے کا دھندا کروں، اس میں فن سے لگاؤ کا عنصر کم اور ایکٹروں اور ایکٹریسوں کے قرب کی اُمنگ زیادہ تھی۔ دوسری خواہش بڑی عجیب تھی، بچپن سے میں نے جگموہن سنگھ ڈاکو کے بے شمار قصے سن رکھے تھے وہ امیروں کو لوٹ کر ان کی دولت غریبوں میں بانٹ دیتا تھا، معصوم اور جوان لڑکیوں کو ہوس کے شکاریوں سے بچاتا تھا، خود ہر قسم کی رنگ رلیاں مناتا تھا اور چار پانچ بہترین گانے اور ناچنے والی خوبصورت عورتوں کو اغوا کر کے ہمیشہ اپنے جلو میں رکھتا تھا، اس طرز حیات میں میرے لئے اتنی شدید کشش اندر ہی اندر کنڈلی مارے بیٹھی تھی کہ صبح سویرے جب میں بیدار ہوا، تو واقعی یہ سوچ رہا تھا کہ آئی سی ایس میں داخل ہو کر کہیں اپنے اصلی نصب العین سے بھٹک تو نہیں گیا؟

قدرت اللہ شہاب کو شروع سے جو ماحول ملا وہ کوئی عالمانہ نہ تھا فکر و عمل کی کسی مخصوص سمت کو اختیار کرنے پر کوئی قدغن نہ تھی وہ اپنے لئے کوئی بھی ادبی مسلک اور سیاسی اور فکری راہ آسانی سے اختیار کر سکتے تھے، انھوں نے ادب کی جو کتابیں حرز جان کی تھیں اور جن نقوشِ ادب کو انھوں نے اپنے دل پر نقش کیا تھا اور جس صنف ادب سے ان کو لگاؤ تھا اور جس سے ان کو عزت و شہرت مل رہی تھی، اس صنف ادب پر جس گروہ کا قبضہ تھا اور جو تحریکیں وقت کا چلن اور زمانے کا فیشن بنی ہوئی تھیں یہ سارے عناصر ان کو بہت آسانی کے ساتھ ایک آزاد رو ترقی پسند ادیب بنا سکتے تھے۔ ان کا شمار بھی ان اہل قلم میں ہو سکتا تھا جو خدا اور مذہب کے ساتھ شوخیاں کرتے ہیں اور اپنے قلم سے اباحیت پھیلاتے ہیں، یا پھر سر صبح مئے شبانہ کے نشے میں مردہ پائے جاتے ہیں یا آتشیں لحاف اوڑھ کر صفحۂ ہستی سے غائب ہو جاتے ہیں۔ قدرت اللہ شہاب کا قلم اس طرح نہیں بہکا کہ وہ گم کردہ راہ ہو جائیں، ان کی کشتی حیات کبھی غرق مئے ناب نہیں ہونے پائی وہ کبھی جادۂ مستقیم سے نہیں ہٹے وہ کبھی فکر سلیم سے منحرف نہیں ہوئے، وہ لکھتے ہیں:

''دین کے بارے میں کبھی شک وشبہ میں یا تذبذب میں گرفتار نہیں ہوا، دین کے بارے میں میرا علم محدود اور عمل محدود تر ہے؛ لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اپنی بے نیازی سے مجھے اسلام کی بعض جھلکیوں کی نعمت سے محروم نہیں رکھا۔''

قدرت اللہ شہاب کو قسام ازل نے توفیق خاص ارزانی فرمائی تھی اور ان کو بھٹکنے بگڑنے گرنے اور پھسلنے سے روکا تھا اور ان کے ساتھ دستگیری کا معاملہ کیا تھا ان کے سر پر ہمیشہ عزت کا تاج رکھا تھا، سوچنے والا سوچ سکتا ہے کہ اس کا سرنہاں کیا تھا۔ شہاب نامہ کو دقت نظر سے پڑھنے والے کو یہ سرنہاں مل جاتا ہے، بشرطیکہ اس کو جستجو ہو اور خود بھی فکر سلیم اور نگاہ مستقیم رکھتا ہو، شہاب نامے میں اس کا تذکرہ ہے کہ ہائی اسکول کا امتحان دینے کے لئے انھیں تقریباً روزانہ چمکور سے گیارہ میل دور جانا پڑتا تھا، اس گیارہ میل کے پیدل سفر میں وہ ایک ''اسم اعظم'' کا ورد کرتے تھے، یہی ورد ان کی زندگی کا وظیفہ بن گیا، اس کی تفصیل خود ان کی زبان سے سنئے:

''ایک ساٹھ ستر برس کے دبلے پتلے منحنی سے برہمن کی یہ شان مردانگی دیکھ کر میرے اسلام کی رگِ حمیت بھی کسی قدر پھڑک گئی، میں چھاتی نکال کر لاٹھی گھماتا بڑے آرام سے مندروں کے پاس سے نکل آیا، جن کی توجہ بہر حال پوریوں پر مرکوز تھی اور ''مکسودھن اپادھیائے'' سے کچھ دور رک کر اس کی رام رام کے جواب میں زور، زور سے درود شریف پڑھنے لگا، مکسودھن اپادھیائے نے پہلے تو ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر آواز کی سمت کا کھوج لگایا اور پھر درود شریف کے الفاظ سن کر اس نے یک لخت دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں، میں درود شریف بند کرتا تھا تو وہ کان کھول دیتا تھا اور جب دوبارہ پڑھنے لگتا تو پھر انگلیاں ٹھونس لیتا، جی تو بہت چاہا کہ ہری اوم ہری اوم اور درود شریف کی آنکھ مچولی کا یہ کھیل جاری رکھوں؛ لیکن میری منزل کھوٹی ہوتی تھی، اس لئے میں باآواز بلند درود شریف کا ورد کرتا آگے بڑھتا گیا۔ درود شریف پڑھتے پڑھتے آہستہ آہستہ میری رگوں میں جمی ہوئی برف پگھلنے لگی، پھر جسم پر ہلکی ہلکی حرارت کی ٹکور ہونے لگی اور اس کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے الیکٹرک بلینکٹ اوڑھا ہوا ہو، تین سوا تین گھنٹے کے بعد جب میں امتحان ہال میں پہنچا تو خاصا پسینہ آیا ہوا تھا، میں نے آرام سے پرچہ کیا اور پھر ہال سے اُٹھ کر درود شریف پڑھتا ہوا خراماں خراماں شام تک گھر پہنچ گیا، امتحان کے باقی آٹھ دن بھی اسی لائحہ عمل پر بڑی پابندی سے کار بند رہا، جب نتیجہ نکلا تو ورنکلر فائنل کا وظیفہ تو مجھے صرف دو برس کے لئے ملا؛ لیکن درود شریف کا وظیفہ میرے نام تاحیات لگ گیا، وہ ایک ایسی نعمت مجھے نصیب ہوئی جس کے سامنے کرم بخش کے

سارے ''ادیبھے'' گرد تھے، اس لئے نہ پرانی باؤلی کے پانی میں رات کو دو، دو پھر ایک ایک ٹانگ پر کھڑا ہونا پڑتا تھا نہ کنویں میں الٹا لٹک کر چلہ معکوس کھینچنے کی ضرورت تھی ''نہ گنگا ماڑی ڈھول'' کی تال پر کئی کئی گھنٹے حال گھسنے کی حاجت تھی نہ مراقبہ کی شدت تھی نہ مجاہدہ کی جدت تھی نہ ترک حیوانات نہ ترک لذات نہ تقلیل طعام نہ تقلیل منام نہ تقلیل کلام نہ تقلیل اختلاط مع الانام نہ رجعت کا ڈر نہ وساوس کی فکر نہ خطرات کا خوف وہ تو بس ایک تخت طاؤس تھا جوان دیکھی لہروں کے دوش پر سوار آگے ہی آگے اوپر ہی اوپر رواں رہتا تھا۔ درود شریف نے میرے وجود کے سارے اُفقوں کو قوس وقزح کی لطیف رداؤں میں لپیٹ لیا، گھپ اندھیروں میں مہین مہین سی شعاعیں رچ گئیں، جنھیں نہ خوف وہراس کی آندھیاں بجھا سکتی تھیں نہ افکار وحوادث کے جھونکے ڈگمگا سکتے تھے تنہائی میں انجمن آرائی ہونے لگی بھری محفل میں حجروں کی خلوت سما گئی دل شاد روح آباد، جسم یوں گویا کشش ثقل سے بھی آزاد، سب سے بڑی بات یہ تھی کہ درود شریف کی برکت سے پردہ خیال پر ایک ایسی بابرکت ذات کے ساتھ قربت کا احساس جاری وساری رہتا تھا، جس کے پاؤں کی خاک اغواث و اقطاب اور اوتار وابدال کی آنکھ کا سرمہ، جس کے قدموں میں دنیا کامران اور عقبیٰ بھی بامراد، جس کے ذکر کے نور سے عرش بھی سربلند اور فرش بھی سرفراز، جس کا ثانی کبھی پہلے پیدا ہوا نہ آگے کبھی ہوگا اور جس کی آفرینش پر رب العالمین البدیع الخالق الباری المصور نے اپنی صناعی کی پوری شان تمام کردی تھی۔

بلغ العلیٰ بکمالہٖ کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ صلوا علیہ وآلہٖ

قدرت اللہ شہاب کا ''اسم اعظم'' یہی درود شریف تھا جس کے تاحیات وظیفہ نے ہمیشہ ان کی حفاظت کی اور ان کو عزت وعظمت عطا کی، جگر مرادآبادی کے الفاظ میں انھیں یہ کہنے کا حق حاصل ہے۔

ترے عشق کی کرامت نہیں ہے تو اور کیا ہے
کبھی بے ادب نہ گذرا مرے پاس سے زمانہ

قدرت اللہ شہاب مذہبی آدمی تھے؛ لیکن اپنی مذہبیت کا پرچار کبھی نہیں کرتے تھے، عبادت میں بھی پوشیدگی برتتے تھے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتابوں کے مطالعہ نے انھیں ایک دوسری پراسرار وادی سے آگاہ کیا اور بہت خاموشی کے ساتھ اس وادئ تصوف میں اپنا قدم

بڑھاتے رہے، محبت رسول خوشبو بن کر ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی، اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرنے والوں کی ایک علامت عجز و انکساری بھی ہے اور ایسے لوگ بالعموم اپنا کام مکمل کر کے دنیا سے جاتے ہیں، انھیں کاموں کی تکمیل کی مہلت دی جاتی ہے، شہاب صاحب نے بھی اپنے لکھنے پڑھنے کا کوئی کام نامکمل اور غیر مرتب نہیں چھوڑا۔

شہاب کا منصب افسرانہ تھا؛ لیکن ان کی طبیعت فقیرانہ تھی، امیری میں فقیری اور شاہی میں گدائی، اونچی حیثیت میں رہنے کے باوجود غریبوں کا ہمدرد بن کر رہنا اور ان کے کام آنا یہ اوصاف تھے جو اللہ کی قدرت سے قدرت اللہ شہاب میں ودیعت کئے گئے تھے، ان کے کاسۂ حیات میں عرش نشینوں کے مقابلہ میں بے نیازی اور خودداری اور ضرورت مندوں کے لئے رحم اور حاجت روائی کی دولت تھی، افسر شاہی کی تاریخ میں آسمان پر اتنا روشن ستارہ اور ایسا شہاب ثاقب کم نظر آیا ہے۔

قدرت اللہ شہاب کی شخصیت سازی میں ان کی والدہ مرحومہ کا کردار بہت اہم رہا ہے، شہاب کا خلوص ان کا درد، ان کی تواضع اور کسر نفسی ان کی مذہبیت والدہ کی رہین منت رہی، وہ اپنی والدہ کا بے حد احترام کرتے تھے، جن کا واحد مشغلہ عبادت اور ذکر الٰہی تھا، جائے نماز و تسبیح اور معمولی کپڑوں کی گٹھری ان کا کل اثاثہ تھا، ان کے پاس صرف دو جوڑے کپڑے ہوتے، ایک وہ پہن لیتی تھیں، دوسرا روز دھو کر اپنے ہاتھ سے سکھا لیتی تھیں۔ ان کی والدہ کی مذہبیت ان کے اندر منتقل ہوگئی اور انھیں یقین تھا کہ ان کی زندگی کی تمام برکتیں والدہ کے دم کرم سے ہیں، کبھی کبھی انسان کو دنیوی وجاہت والدین کی نیکی کے صدقے میں مل جاتی ہے، خضر علیہ السلام کے قصہ میں اس کی طرف اشارہ ہے "وکان ابوھما صالحا"۔

قدرت اللہ شہاب کا مشاہدہ تیز اور ذہن زرخیز ہے، اس صفت نے انھیں کامیاب افسانہ نگار بنایا وہ واقعہ کی اور منظر کی بہت جزوی تفصیلات تک بیان کرتے اور ان کا قلم گوہر رقم جو طاقتور بھی ہے اور جادو اثر بھی موتیوں کا ہار بناتا ہوا چلتا ہے، ان کا سامعہ اور ان کا باصرہ بیدار اور ذاکرہ قوی تھا اور اس پر ارسال و ابلاغ کی غیر معمولی قوت اور اس کے ساتھ نفس کی شرافت، ان کی نثر کی یہی خوبیاں ہیں، جو غیر معمولی کشش رکھتی ہیں اور دل کو گرویدہ بنا لیتی ہیں۔

شہاب نامہ میں کئی باتیں ایسی ہیں جو زیر بحث آسکتی ہیں، آسیب زدہ مکان کا قصہ عجیب و غریب ہے، بہت سے لوگ اس پر یقین نہیں کرتے ہیں؛ لیکن شہاب نامہ پڑھ کر مجموعی طور پر

قدرت اللہ شہاب کی شخصیت کے بارے میں جو تاثر سامنے آتا ہے، اس کے بعد اسے غلط بیانی پر محمول کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے، یہ البتہ ممکن ہے کہ زیب داستاں کے لئے اس میں کچھ بڑھا دیا گیا ہو، شہاب بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں، مؤرخ نہیں؛ البتہ یہ ممکن ہے کہ اس میں کچھ خواب ہو، کچھ اصل ہو، کچھ طرز ادا ہو، ان کے بعض طنزیہ خوبصورت جملے ملاحظہ ہوں:

''نفس جتنا فربہ ہو عقل اتنی ہی کمزور پڑ جاتی ہے اور قوت فیصلہ پر خود فریبی کا غبار چھا جاتا ہے''، ''چیف کورٹ اور اسمبلی ہال کے درمیان مہاتما گاندھی کا بت پہرے پر چوکس کھڑا ہے، کہ انصاف اور سیاست ایک دوسرے کے قریب نہ آنے پائیں''، ''جمہوریت بڑی غیرت مند اور حاسد دلہن ہے، اس پر سوکن کا سایہ بھی پڑ جائے تو یہ گھر بار جلا کر خاکستر کر دیتی ہے''۔

خلاصہ یہ ہے کہ شہاب نامہ آپ بیتی بھی ہے، جگ بیتی بھی ہے، یہ مشاہیر کا تذکرہ بھی ہے، ایک سیاسی دستاویز بھی ہے اور افسانوی ادب کا نہایت دل کش مرقع بھی، ایسا ادب ہے جس میں شگفتگی اور برجستگی ہے اور نادرۂ روزگار تشبیہوں اور استعاروں کی جلوہ نمائی بھی ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

قریبِ رگِ جاں

روزنامہ سیاست حیدرآباد میں بہت سے اچھے اہل قلم کے مضامین شائع ہوتے ہیں، ان اہل قلم میں ایک مضمون نگار فنکار اور افسانہ نگار ہیں نفیسہ خان، جنھوں اپنی نفاست تحریر اور آرائش فن سے ایک عالم کو اپنا گرویدہ بنایا ہے، جب اخبار کے ادبی یا ثقافتی ایڈیشن میں ان کی کوئی تحریر شائع ہوتی تو وہ اس ایڈیشن کا زیور اور ادب کی پیشانی کا جھومر بن جاتی ہے۔ ادب نواز اور ادب آموز اہل ذوق اس تحریر کو اپنی آنکھ کا سرمہ بناتے ہیں اور اپنے باذوق اور ادب نواز دوستوں کو اس کی اطلاع دیتے ہیں، اسے اپنی گفتگو کا موضوع بناتے ہیں اور اس تحریر کو اپنی رگِ جاں کے قریب محسوس کرتے ہیں۔

میں نے جب بھی نفیسہ خان کی کوئی تحریر پڑھی مجھے محسوس ہوا کہ یہ ادب کوئی معمولی درجے کا ادب نہیں ہے، احساسات کو الفاظ کا پیکر عطا کرنے میں انھیں جو مہارت حاصل ہے وہ کم

کسی افسانہ نگار کو حاصل ہوتی ہے۔ وہ کردار کے اندرونی جذبات کو حرفوں کا لباس حریر بخش دیتی ہیں اور اپنے فن سے دل کی داخلی دنیا کی سیر کراتی ہیں اور دل کی دنیا اس دنیا سے بہت زیادہ وسیع وعریض ہے، جس کا ہم اپنی چشم سر سے مشاہدہ کرتے ہیں، اس آب وخاک کی بنی ہوئی پوری دنیا اپنے سات سمندروں کے ساتھ دل کی وسیع کائنات کے صرف ایک گوشہ میں سما جاسکتی ہے۔ نفیسہ خان اس عالم آب وخاک کے بجائے دل کی وسیع تر دنیا میں سانس لیتی ہیں، جہاں احساسات و جذبات کے ہزاروں سمندر اپنی بے نہایت گہرائیوں کے ساتھ متموج اور متلاطم رہتے ہیں، جہاں عشق و مستی ہے، جہاں جذب وشوق ہے، جہاں آنسوؤں کا سیل ہے، جہاں سوز و ساز ہے، جہاں درد و داغ ہے، جہاں کردار کی ہمالیائی بلندیاں ہیں، جہاں حسن عمل کے ستارے ہم دوش ثریا ہیں اور اس کے مقابلہ میں وہ حقیر دنیا جو ہمارے جسموں کا مسکن ہے اور جو تمام تر سود وسودا اور مکر وفن ہے، فقط ایک تنگنائے خاک اور ایک جوئے کم آب کی حیثیت رکھتی ہے۔

نفیسہ خان نے اپنی کہانیوں اور افسانوں کے ذریعہ اتنی خوبصورت آتش بازیاں کی ہیں کہ ادب کی دنیا ان کی بدولت گلنار ہوگئی ہے، ناقدین نے اگر ان کی طرف اب تک توجہ نہیں کی تو غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے افسانے مجموعے کی شکل میں اب تک سامنے نہیں آئے تھے اور اس کے علاوہ ہمارے ناقدین پر کبھی کبھی گہری نیند بھی طاری ہو جاتی ہے اور جب وہ خواب خرگوش سے جاگتے ہیں تو فوراً ادیب یا شاعر کو ادب کی خلعت فاخرہ سے نواز دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے یہاں دیر ضرور ہے؛ لیکن اندھیر نہیں ہے۔ چنانچہ کئی شاعر ایسے ہیں کہ ان کی زندگی میں ان کو کسی ناقد نے نہیں پوچھا؛ لیکن مرنے کے بعد ستائش بھی کی اور صلہ بھی دیا اس طرح کہ ادب کے کورس کی کتابوں میں ان کو جگہ دی گئی، اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ ناقدین کو تنقید کے سوا اور بھی زمانے کے بہت سے غم ہوتے ہیں، وہ ہر وقت ہاتھ میں کسوٹی لے کر نہیں بیٹھے رہتے ہیں کہ فن کے کھرے کھوٹے کا فیصلہ کرتے رہیں۔ جب انھیں غم دوراں سے فرصت ہوگی تو پھر وہ تنقید کی میزان اُٹھائیں گے اور نفیسہ خان کی نفاست فن کی داد دیں گے، بعض غیر منصف مزاج ناقدین داد کی جگہ پر بے داد اور بے داد کی جگہ پر داد سے بھی کام لیتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے آج کے دور کے بیشتر ایکسپرٹ انٹرویو میں باصلاحیت کینڈیٹ کو چھانٹ دیتے ہیں اور اپنے چاہنے والوں اور تعلق رکھنے والوں کا سلیکشن کر لیتے ہیں اور اس طرح اپنی عاقبت خراب کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عاقبت کی خبر خدا جانے۔

بہر حال نفیسہ خان کی نگارشات اب ایک با قاعدہ کتاب کی شکل میں سامنے آ رہی ہیں اور جو بھی ان کا مطالعہ کرے گا وہ یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہے گا کہ یہ تحریریں رگ جاں کے قریب ہیں نغمہ سحر کا ساز اور ضمیر کی آواز ہیں۔

دیکھنا ''تحریر'' کی لذت کہ جو اس نے ''لکھا''

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

لیکن یہ رچاؤ اور یہ گھلاوٹ اور لہجہ کی تاثیر یونہی نہیں پیدا ہو جاتی ہے، اس کے لئے فنکار کو ریاض کرنا پڑتا ہے، اس کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے، وہ محنت جو آرائش خم کاکل میں کی جاتی ہے اور وہ محنت جو جوڑے کے پھول کی سج دھج کے لئے کی جاتی ہے، وہ محنت جو دست نازک اور مخروطی انگلیوں کی حنابندی میں کی جاتی ہے اور وہ محنت جو لباس عروسی کی تزیین میں کی جاتی ہے، اتنی محنت ہوتی ہے، اتنا خون جگر صرف ہوتا ہے، تب کہیں جا کر وہ سجی سجائی نفیس کہانی تیار ہوتی ہے، جس کے سرنامہ پر فنکار کا نام لکھا ہوتا ہے، نفیسہ خان!

نفیسہ خان کے افسانے پڑھئے، افسانہ مختصر ہوتا ہے؛ لیکن ہر افسانہ کے اختتام پر دل پر ایک خاص تاثر طاری ہوتا ہے، یہی وحدت تاثر ہے اور وحدت تاثر کامیاب افسانہ کے لئے ضروری ہے، نفیسہ خان نے نفسیاتی اور سماجی عصری مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے، بہت سے افسانوں میں مسائل کا حل بھی موجود ہے، انھوں نے ایک دیدہ ور مفکر کی طرح معاشرہ کے مسائل پر نظر ڈالی ہے۔ ان کے یہاں روایات کی پاسداری ہے، لطف اظہار ہے؛ لیکن لب ولہجہ کی متانت اور شائستگی کے ساتھ، نہ بے باکی ہے نہ ہوسناکی ہے، اس اعتبار سے ان افسانوں کو اصلاحی افسانے بھی کہا جاسکتا ہے۔ ان افسانوں میں پیچیدہ معاشرتی مسائل بھی ملیں گے، زندگی کی تلخیاں بھی ملیں گی، انسانیت اور شرافت کے چمن میں پھول کھلتے ہوئے نظر آئیں گے، انسانیت کے جسم کے زخم بھی نظر آئیں گے، محبتیں بھی ملیں گی، کدورتیں بھی ملیں گی۔ الغرض زندگی اپنے مختلف رنگ میں نظر آئے گی ان کا تخلیقی کینوس وسیع ہے، ان کے یہاں موضوعات گوناگوں ہیں اور ہر موضوع کو انھوں نے خوبصورت فنی جامہ پہنایا ہے اور افسانہ کے قالب میں ڈھال دیا ہے، نفیسہ خان کی زبان دلکش ہے اور تیر نیم کش کی طرح دل میں اُتر جاتی ہے، ان کا مشاہدہ تیز اور تخیل زرخیز ہے اور اسی کے ساتھ انھیں کردار نگاری کا ہنر آتا ہے، انھوں نے خون جگر سے اُردو ادب کے چمن کی آبیاری کی ہے، یہی وجہ ہے کہ جو شخص بھی ان کی تحریریں پڑھتا ہے انھیں رگِ جاں کے قریب محسوس کرتا ہے اور اپنے

اہل ذوق دوستوں کے درمیان ان کے فن کا تذکرہ کرتا ہے؛ لیکن خود نفیسہ خان کو بحیثیت فنکار اپنی محبوبیت کا احساس شاید نہیں ہوگا، آیئے پوری کشادہ دلی کے ساتھ ہم سب ان کی کتاب کا استقبال کریں جواب زیورِ طبع سے آراستہ ہو رہی ہے۔ (مقدمہ کتاب)

☆ ☆ ☆ ☆
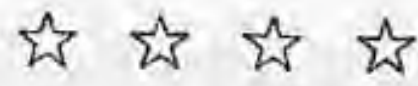
رقصِ شرر

کوئی خودنوشت سوانح عمری اگر کسی ادیب شاعر اور سحر طراز انشاء پرداز اور مشاعروں کے روح رواں کے قلم سے نکلے تو وہ ادبی شہ پارہ ہوتی ہے، زبان و بیان کی شیرینی رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے اور کتاب ختم کیے بغیر ہاتھ سے چھوٹتی نہیں ہے اور کتاب کا قاری پکار اٹھتا ہے:

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانے میں

خودنوشت سوانح میں بالعموم ماحول اور معاشرہ کا اور علمی اور ثقافتی خدمات کا تذکرہ ہوتا ہے، مصنف اس میں اپنے خاندانی حالات بھی بیان کرتا ہے اور اقدار حیات پر روشنی بھی ڈالتا ہے، پھر بھی بہت سے اہل تحقیق کا کہنا ہے کہ کوئی خودنوشت سوانح عمری مکمل سچ نہیں ہوتی ہے؛ کیوں کہ ہر انسان دنیا کے سامنے اپنی اچھی تصویر پیش کرنا چاہتا ہے، وہ کچھ اپنے عیوب چھپا لیتا ہے اور اپنی خوبیوں کو مبالغہ آمیز طریقہ سے پیش کرتا ہے۔ اس فن کی جو محدودیتیں ہیں وہ اپنی جگہ پر ہیں؛ لیکن اس کا سلسلہ نہ رکا ہے نہ رکے گا اور مجھے ذاتی طور پر نقادان مغرب کے اس نظریہ سے اتفاق بھی نہیں کہ ذات ستار و غفار نے جن عیوب کی پردہ پوشی کی انھیں مصنف اپنی خودنوشت میں کھول کھول کر کے بیان کردے۔ انگریزی میں اعتراف گناہ کی سوانح عمریاں بہت ہیں، اردو میں یادوں کی برات کا استثناء ہے ورنہ مشرق میں یہ مزاج نہیں پایا جاتا ہے، عربی میں احمد امین کی ''حیاتی'' اور طٰہ حسین کی ''الایام'' بہت مشہور خودنوشت سوانح عمریاں ہیں اور مؤخر الذکر کا دنیا کی بیشتر اہم زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اُردو میں خودنوشت کی روایت بہت زیادہ قدیم نہیں ہے، مولانا آزاد نے تذکرہ

میں اپنے خاندانی حالات بیان کئے ہیں؛ لیکن اسے خودنوشت سوانح نہیں کہا جاسکتا ہے، واجد علی شاہ نے مثنوی حزن اختر لکھی تھی جس میں اپنے احوال ومصائب بیان کئے تھے؛ لیکن یہ مثنوی ہے نہ کہ سوانح عمری، میر تقی میر نے ذکر میر لکھی؛ لیکن یہ فارسی میں ہے نہ کہ اُردو میں، حالی نے کچھ اپنی آپ بیتی لکھی تھی جو مکاتیب حالی کے ساتھ طبع ہوئی تھی۔ اُردو کی پہلی باقاعدہ آپ بیتی خواجہ حسن نظامی کے قلم سے نکلی تھی، پھر اس کے بعد طویل سلسلہ ہے، کلیم الدین احمد کی ''اپنی تلاش میں'' ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی ''یادوں کی دنیا'' جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی برات'' مسعود حسین خاں صاحب کی ''ورود مسعود'' آلِ احمد سرور کی ''خواب ابھی باقی ہیں''، مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ''کاروانِ زندگی'' مولانا عبدالماجد دریابادی کی ''آپ بیتی'' قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ'' وغیرہ، ملک زادہ منظور احمد کی ''رقص شرر'' خودنوشت سوانح عمریوں میں ایک اہم ایک بہت مفخم اضافہ ہے، صرف ادبی رعنائی اور گلکاری تو یادوں کی برات میں بھی ہے؛ لیکن اس کتاب میں صرف تحریر کی حلاوت اور دلکشی نہیں؛ بلکہ شائستگی اور شرافت اور اقدار کا پاس ولحاظ بھی ہے اور یہ خاندانی نسبتوں کا فیضان ہے، اس کتاب میں شخصیتوں کے مختصر خاکے بھی ہیں، شبلی، مولانا حمید الدین فراہی ، مولانا حسین احمد مدنی، پروفیسر احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، علی جواد زیدی، خلیل الرحمٰن اعظمی، کیفی اعظمی، شمس الرحمٰن فاروقی، دلیپ کمار، سید حامد، یحییٰ اعظمی، کیف بھوپالی، ساغر نظامی، خمار بارہ بنکی، فراق گورکھپوری، مولانا ابوالکلام آزاد، جون ایلیا، گوپی چند نارنگ، قیصر حیدری، موسیٰ رضا، انور ندیم، شمیم جے پوری اور ان کے علاوہ چھوٹی اور بڑی بے شمار شخصیتوں کے خاکے ہیں، شاعروں کے بھی غیر شاعروں کے بھی، بہت مختصر بھی اور طویل بھی۔ شاعری کے ساتھ مرقع نگاری کا فن بھی مصنف کو آتا ہے، کتاب تخلیقی مرقع بھی ہے اور اس میں بحیثیت مجموعی دیانت داری اور تاریخی صداقت بھی پائی جاتی ہے، کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش سے لے کر آزاد ہندوستان میں اُردو کی تحریک تک کی داستان ہے، یہاں تک کہ ملائم سنگھ اور مایاوتی کے دور تک کی کہانی ہے کچھ جگ بیتی ہے کچھ آپ بیتی ہے، کچھ دونوں کا امتزاج ہے۔ ترقی پسند ادب کا بھی تذکرہ ہے اور اسلامی ادب کی تحریک کا بھی، کتاب میں ملّی اور قومی احساسات کا سوز بھی ہے حسن انشاء کا ساز بھی ہے۔ پوری کتاب ایک داستان لطف وتحیر ہے ایک طلسم حسن ادا ہے ایک گنجینہ حسن معانی ہے یہ ایک ایسا سفر نامۂ زندگی ہے۔ جس میں شاعروں کی برات اور مشاعروں کی تاروں بھری رات بھی ہے اور باہمی آویزش اور رنجش سے بھرے ہوئے دنوں کی تلخی بھی ہے، کہیں علم وآگہی کے چراغ جلتے ہیں کہیں

شعروادب کے چمن زار سے سابقہ پیش آتا ہے، ہر جگہ الفاظ کا حسن انتخاب کہیں طاؤس کہیں رباب عشق کی حکایات خوں چکاں بھی ہے کتاب میں بہکنے پھسلنے اور قدم ڈگمگانے کا تذکرہ بھی ہے؛ لیکن فاسقانہ ابتذال نہیں ہے اور کون انسان ان لغزشوں سے بچ سکا ہے، بقول اکبرالہ آبادی:

توڑ سکتی نہیں توبہ کو مرے کوئی صدا
شرط یہ ہے کہ وہ پازیب کی جھنکار نہ ہو

جو بات اکبرالہ آبادی نے کہی ہے اس سے زیادہ باوقار اور بھاری بھرکم انداز میں اقبال نے کہی ہے:

حسن کی تسخیر پر غالب نہ آسکتا تھا علم
اتنی نادانی جہاں کے سارے داناؤں میں تھی

اُردو کے خودنوشت لٹریچر میں یہ کتاب ناقابل فراموش کتاب ثابت ہوگی اور گردش شام وسحر کے درمیان جواں رہے گی، زندگی تو جیسے تیسے گزار لی جاتی ہے مگر زندگی کی حکایات جیسے تیسے نہیں لکھی جاتی ہے، اس کے لئے حافظہ کی تازہ کاری اور قلم کی گلکاری کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لئے سلیقہ مند طبیعت درکار ہے اور اگر یہ نہ ہوتو ناگفتنی گفتنی ہوجاتی ہے اور جو چیز کہ گفتنی ہوتی ہے وہ گم ہوجاتی ہے۔ کتاب کئی برسوں میں مکمل ہوئی ہے کتاب خوداحتسابی اور خودتنقیدی سے بھی خالی نہیں، ذاتی اختلافات میں بہت سے لوگوں کے نام کی صراحت نہیں ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتا، کنایہ اور اشارہ سے بھی کام چل سکتا تھا، کہہ کے کچھ لالہ وگل پردہ رکھ لیا جاتا تو بہتر تھا، ذاتی معاملات میں عفوو درگزر اور عالی ظرفی کا نمونہ پیش کرنا چاہئے تھا، عالی نسبی کا تقاضہ یہی تھا۔ کئی مقامات پر خود ملک زادہ صاحب نے خود اپنی تحریر کو متوازن کرنے کی کوشش کی ہے، کسی کو تنقید کا نشانہ بناتے بناتے اچانک اس کی تعریف شروع کردی ہے، بشیر بدر کے بارے میں ریمارک ہر جگہ سخت ہے، کوئی شخص ملت اور قوم کے ساتھ خیانت کرے تو اس کی آبرو کی حفاظت جرم کی حمایت بن جاتی ہے، بشیر بدر کے بارے میں مختلف مقامات پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اس سے زیادہ کے مستحق ہیں اس کی جتنی فضیحت ہو کم ہے اور جن لوگوں نے اس کو مشاعروں سے نکلوانے کا عزم کر رکھا ہے وہ قابل تعریف ہیں اور اب صورتِ حال یہ ہوگئی ہے کہ ''پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں'' وہ شخص حرف (ر) کے بغیر بدر ہے اور ایسا بشیر ہے جس کی (ب) اور (ی) دونوں ضرورت حرص وطمع کی وجہ سے گرچکی ہے۔ ذاتی زندگی میں خرابی ہو تو اس کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے؛ لیکن پوری ملت کے ساتھ بے وفائی ناقابل معافی جرم ہے، ایک معروف صاحب قلم جب اپنی ریش مقدس کے ساتھ الیکشن کے زمانہ میں

باچپائی حمایت کمیٹی میں شامل ہوئے تو اس وقت سے لوگوں نے ان کا نام ''بی۔جے پی مولانا'' رکھ دیا ہے۔ خود ملک زادہ صاحب کی ایک بار قدرت کی طرف سے حفاظت ہوئی ایک ''عارف'' سے ملاقات ہوگئی ورنہ وہ بھی بابری مسجد کے معاملہ میں ایک صاحب کے فریب میں مبتلا ہوکر بشیر بدر کی طرح رسوا ہوجاتے۔ ملک زادہ صاحب کی ملاقات کبھی عارف سے ہوجاتی ہے اور کبھی خضر سے، اس طرح ہر قدم پر ان کو رہبر مل جاتا ہے، حضرت خضر سے ملاقات کا قصہ بھی کتاب میں موجود ہے، کتاب خوبصورت عبارتوں کی طلسم ہوش ربا ہے، حیرت افروز قصوں کی داستان امیر حمزہ ہے یہ فسانہ عجائب بھی ہے مجموعہ غرائب بھی ہے، اس میں عشق جنوں انگیز بھی ہے اور حسن عالم آشوب بھی ہے۔ مصنف کے جادو نگار قلم سے زبان ومکان کے حجابات اُٹھ گئے ہیں اور پوری زندگی چلتی پھرتی اور متحرک نظر آتی ہے، اس زندگی میں شہر بھی ہیں اور دیہات بھی، گاؤوں کی مسجد ہے اور اس میں بیلے کے پھول ہیں بچوں کا اسکول ہے اور اس میں ہار سنگھار کی خوشبو ہے تمام یادیں صفحہ قرطاس پر مرتسم ہوگئی ہیں، حسن انشاء اور حسن عبارت کا نمونہ مولانا عبدالسلام ندوی اور اقبال سہیل کے ذکر کے موقعہ پر ملاحظہ فرمایئے:

''ایک نے علامہ شبلی کے جمالیاتی رنگ میں اپنی انفرادیت گھول کر نثر لکھی تھی، دوسرے نے شبلی کے حکیمانہ ادراک کو اپنی نظموں اور غزلوں میں سمویا تھا، ایک ہی میخانہ کے میکش ہونے کے علاوہ دونوں میں اور کوئی مشابہت اور مطابقت رہی ہو یا نہ رہی ہو؛ لیکن دونوں عجائبات قدرت میں تھے، وہی کھویا کھویا سا انداز وہی بہکی بہکی سی نگاہیں، طبیعت میں باوجود تبحر علمی کے ایک استغنا آمیز لاابالی پن جو تخلیقی ادب کے معماروں کا طرۂ امتیاز رہا ہے دونوں میں پایا جاتا تھا، اگر جھکے تو شاخ ثمر دار کے مانند، قلم اٹھایا تو شہپر جبرئیل کی تیزی دکھائی، بولے تو بازگشت ایوان حکومت میں سنائی دی خاموش رہے تو صبر ایوبی کی یاد دلائی، مگر دونوں صورتوں میں حبل متین تھامے رہے۔''

ماہر القادری کتابوں پر تبصرے لکھتے وقت زبان و بیان کی غلطیوں کی نشان دہی ضرور کرتے تھے، راقم سطور کی یہ عادت نہیں نہ اسے ماہر کی طرح ایسی کوئی مہارت زبان وادب پر حاصل ہے؛ لیکن یہاں معاملہ ایک ادبی کتاب کا ہے جو ادب کے استاد اور ایک نقاد کے قلم سے نکلی ہے، مقطع میں آپڑنے والی سخن گسترانہ بات کی طرح چند اشارے زبان کی غلطیوں کی طرف ضروری ہیں۔ کیا صحیح ہے اور کیا غلط، تذکیر و تانیث یا لفظ کی صحت کا معیار مستند اور قابل اعتبار لغت کی کتابیں ہیں اور مستند اہل قلم ادباء اور شعراء کا استعمال ہے نہ کہ عمومی اور عوامی استعمال اور اخبارات کی زبان،

غلط العوام فصیح ، کا نظریہ ادب کی دنیا میں نہیں چلتا ہے، نہیں چلنا چاہئے ،اس سے مملکت ادب میں انارکی اور لاقانونیت پھیل جاتی ہے اور زبان کا کوئی معیار باقی نہیں رہتا ہے اور غلط سے غلط زبان بھی درست قرار پاتی ہے ؛ کیوں کہ کچھ لوگ اس کے بولنے والے مل جاتے ہیں ،قواعد وضوابط اور صرف ونحو کی تدوین اسی لئے ہوتی ہے کہ جنگل کا راج نہ ہو اور زبان کے سلسلے میں انضباط باقاعدگی اور ڈسپلن برقرار رہے۔

۱- ''اجنہ'' (ص:۴۴۹) ملک زادہ صاحب نے کئی جگہ نظر نہ آنے والی مخلوق 'جن' کی جمع کے طور پر یہ لفظ استعمال کیا ہے، حالاں کہ اجنہ جنین (پیٹ کا بچہ) کی جمع ہے نہ کہ جن کی ، ایک بار ایک معروف اہل قلم نے یہی غلطی کی تھی ، جس کی وجہ سے انھیں نیاز فتح پوری کی تنقید کا نشانہ بننا پڑا تھا اور لغات کشوری سے بھی اس کی تصدیق کی جاسکتی ہے اس میں یہ تصریح ہے کہ لفظ اجنہ کا استعمال ''جن'' کی جمع کے طور پر غلط ہے۔

۲- ''ان کی اولادیں'' (ص:۳۹۰) اولاد خود ہی ولد کی جمع ہے اس لئے اولادوں یا اولادیں لکھنا صحیح نہیں ہے اور آج تک کسی ثقہ ادیب اور شاعر نے اس جمع الجمع کو استعمال نہیں کیا ہے۔

۳- ''بارات'' یاد رہے کہ صحیح اور فصیح لفظ ''برات'' ہے اقبال نے استعمال کیا ہے ''موت ہے تیری برات موت ہے میری برات'' شمیم کرہانی کا شعر ہے:

جشن حیات ہو چکا جشن ممات اور ہے
ایک برات ہو چکی ایک برات اور ہے

۴- ''لب سڑک'' (ص:۵۱۱) دو زبانوں کے لفظوں کی اضافی ترکیب درست نہیں، لب دریا اور لب بام وغیرہ درست ہے؛ لیکن لب سڑک درست نہیں ہے، اگر لب سڑک درست ہے تو فوق البھڑک کو بھی درست ماننا پڑے گا۔

۵- ''رہائش گاہ'' (ص:۵۱۹) کتاب میں بہت سی جگہوں پر لفظ رہائش اور رہائش گاہ استعمال ہوا ہے، فرمائش اور ستائش اور زیبائش سب فارسی کے حاصل مصدر ہیں اور فارسی کے مصدر سے بنائے گئے ہیں اس لئے درست ہیں؛ لیکن 'رہودن' فارسی کا کوئی مصدر نہیں ہے، رہائش حاصل مصدر کے وزن پر اُردو کے مصدر 'رہنا' سے بنالیا گیا ہے، اس لئے قاعدہ کے اعتبار سے غلط ہے۔ اگر چہ بہت سے غلط الفاظ 'مرغن مجرب اور متلاشی مہلوک' کی طرح رہائش کا استعمال بھی اُردو میں

عام ہوگیا ہے، قدیم مستند شعراء اور ادباء نے لفظ رہائش کا استعمال نہیں کیا ہے اور فرہنگ آصفیہ اور لغات کشوری تک اُردو کے کسی مستند لغت کی کتاب میں اس کا اندراج نہیں ہے، بعد میں عمومی استعمال کی وجہ سے بہت سے آوارہ گرد الفاظ کا جن کا کوئی حسب نسب نہیں تھا فیروز اللغات کے اسکول میں ایڈمیشن کرا دیا گیا ہے، جس طرح کم علم اور کند ذہن طلبہ کو معمولی اسکولوں میں داخل کر لیا جاتا ہے، گنجائش تو اب نکل آئے گی؛ کیوں کہ فیروز اللغات میں اس کا اندراج ہوگیا ہے؛ لیکن یہ لفظ معتبر نہیں ہے۔

۶- ''میرے سے قبل ایک وزیر تقریر کر رہے تھے'' (ص: ۳۶۴) ''مجھ سے قبل'' ہونا چاہئے۔

۷- ''بھرپور'' (ص: ۱۵۲) اس لفظ کا استعمال کتاب میں متعدد مقامات پر ہے، اُردو میں عام لکھنے والے اس کا استعمال بہت کرتے ہیں؛ لیکن شبلی، محمد حسین آزاد، ابوالکلام آزاد، انیس، دبیر، میر و غالب اور کسی مستند شاعر اور ادیب نے اس لفظ کا استعمال کبھی نہیں کیا ہے، کلاسیکل اُردو ادب میں یہ لفظ نہیں ملے گا، لغات کشوری اور فرہنگ آصفیہ میں بھی یہ لفظ نہیں ملے گا، یہ ہندی لفظ ہے اور اب اس کا استعمال اُردو میں عام ہوگیا ہے، چوں کہ زبانوں میں ایک دوسرے کے ساتھ لین دین درست ہے اس لئے گنجائش نکل آتی ہے، ہندی کے اثر سے بہت سے الفاظ اُردو میں غلط طور پر استعمال ہونے لگے ہیں، جیسے لفظ ''شروعات'' (مثال کے طور پر، اب کام یا پروگرام کی شروعات کرتے ہیں) اور 'مارے گئے' کا غلط استعمال (مثال کے طور پر بس کے ایکسیڈنٹ میں بیس آدمی مارے گئے) حالاں کہ ہونا چاہئے تھا 'مر گئے' ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہندی میں کوئی مرتا نہیں ہے سب مارے جاتے ہیں، یعنی دہشت گردی کا شکار ہو جاتے ہیں، 'بھرپور' کا لفظ بھی ہندی کے اثر سے اُردو میں داخل ہوگیا ہے اور جب ملک زادہ جیسے انشاء پرداز اس کا استعمال کرنے لگیں تو اس کا جواز بدرجہ مجبوری مان لینا پڑے گا۔

۸- ''ہمارے ملک خصوصیت کے ساتھ بہار میں جو فرقہ ورانہ فساد ہوئے تھے اس کا کلیم عاجز کی زندگی اور شاعری پر خاطر خواہ اثر پڑا ہے'' (ص: ۳۵۷) یہاں لفظ خاطر خواہ کا استعمال درست نہیں ہے، خواہ اور خواہش قریب الاشتقاق ہیں، خاطر خواہ کا استعمال ان چیزوں کے بارے میں ہوتا ہے جو مرغوب خاطر اور پسندیدہ خاطر ہوں، مصیبت بیماری اور فسادات سے متعلق خاطر خواہ کا استعمال درست نہیں، دوسری جگہ مصنف نے لکھا ہے 'اس نے اُردو ادب کا مطالعہ خاطر خواہ کیا

'یہاں خاطر خواہ کا استعمال درست ہے۔

۹- ''لاحقہ'' مصنف نے بہت سی جگہوں پر یہ لفظ نام کے ساتھ ہر اضافہ کے مفہوم میں استعمال کیا ہے، جیسے ''میں نے ملک زادہ کا لاحقہ لگالیا'' یا ''شہریار نے پروفیسر کا لاحقہ کبھی نہیں لگایا'' حالاں کہ لاحقہ اس اضافہ کو کہتے ہیں جو نام کے بعد یا کسی لفظ کے بعد لگایا جاتا ہے، جیسے نام کے بعد علیگ یا جامعی یا ندوی اور نامہ بر وغیرہ، شروع میں جو اضافہ کیا جاتا ہے اسے سابقہ کہتے ہیں نہ کہ لاحقہ، مزید تصدیق کے لئے انگریزی اُردو لغت میں (Pre Fix-sufix) کا ترجمہ دیکھنا مناسب ہوگا۔

کتاب میں کتابت کی غلطیاں بھی ہیں، مثال کے طور پر مولانا وصی اللہ کو ''مولانا وسیع اللہ لکھا گیا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب ''القول الجلی'' کو ''القول الجلیلی'' یگانہ دہر (ص: ۵۵۷) کو بیگانہ دہر، شاہ محمد عاشق پھلتی کو پھلیتی، ابوالحسن زید فاروقی کو زیدی فاروقی، شغف رکھنے والے کو ''شفقت رکھنے والے'' (ص: ۵۴۳) وغیرہ، لیکن اس طرح کی غلطیوں سے مشکل سے کوئی کتاب پاک ہوتی ہے؛ لیکن کتابوں کو زبان اور انشاء کی غلطی سے ضرور پاک ہونا چاہئے تھا؛ کیوں کہ ملک زادہ صاحب کی پوری زندگی کوچۂ ادب کی راہ نوردی اور اسی صحراء کی آبلہ پائی میں گذری ہے؛ لیکن زبان کی صحت کا معاملہ اس قدر مشکل ہے کہ مشکل سے کوئی ادیب محفوظ و معصوم رہ سکا ہے۔ چنانچہ یہاں زبان کی صحت سے متعلق ایک لطیفہ پیش کردینا مناسب ہوگا، راوی جگن ناتھ آزاد ہیں، وہ ایک بار جوش ملیح آبادی سے ملنے گئے اور پوچھا ''آپ کے مزاج بخیر ہیں؟'' کچھ دیر کے بعد انھوں نے جوش صاحب سے یہ درخواست کی کہ چوں کہ ان کو زبان پر غیر معمولی قدرت اور صحیح اور غلط کی تمیز حاصل ہے، اس لئے جہاں وہ غلطی محسوس کریں ضرور ٹوک دیں، جوش صاحب نے جواب دیا کہ ''بھئی لوگ یہ درخواست تو کردیتے ہیں؛ لیکن ٹوکنے کے بعد برا بھی مانتے ہیں'' جگن ناتھ آزاد نے وعدہ کیا کہ وہ برا نہیں مانیں گے، اس پر جوش نے کہا کہ ابھی آپ نے پوچھا تھا ''آپ کے مزاج اچھے ہیں'' مزاج اگرچہ مختلف چیزوں کا مجموعہ ہے؛ لیکن یہ مفرد ہے جمع نہیں، صحیح یہ ہوگا ''آپ کا مزاج کیسا ہے'' چند روز کے بعد پھر جگن ناتھ آزاد جوش کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آل احمد سرور پہنچے اور انھوں نے پوچھا ''آپ کے مزاج اچھے ہیں؟'' جب وہ چلے گئے تو جگن ناتھ آزاد نے کہا دیکھئے آل احمد سرور صاحب اتنے بڑے پروفیسر ہیں وہ بھی یہی کہتے ہیں ''آپ کے مزاج اچھے ہیں؟'' جوش ملیح آبادی نے ہنس کر جواب دیا ''اُردو کے پروفیسروں کو اردو کہاں

آتی ہے''۔

شہر شعر و سخن کے شہر یار ملک زادہ صاحب کی کتاب ''رقص شرر'' کا مطالعہ ہر باذوق شخص کو کرنا چاہئے، یہ ادب کی اعلیٰ کتاب ہے، اقدار حیات کے پاس ولحاظ کے اعتبار سے یہ کتاب، جوش ملیح آبادی کی یادوں کی برات سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ جن غلطیوں کا تذکرہ اوپر کیا گیا ان کی حیثیت چاند کے داغ کی ہے، اس سے زیادہ نہیں اور ان غلطیوں کا تعلق بھی زبان کے سلسلہ میں اپنے نظریہ سے اپنے معیار سے اور اپنے ذوق سے ہے، ضروری نہیں کہ مصنف کو یا دوسروں کو اس سے اتفاق بھی ہو، راقم سطور نے زبان کے سلسلے میں اوپر جو معیار مقرر کیا ہے اگر اسے تسلیم نہ کیا جائے تو بات ختم ہو جاتی ہے۔ پڑھنے والوں کو ''رقص شرر'' کے بعد دوسرے حصہ کا انتظار رہے گا، جس کا اعلان کیا گیا ہے اور جس کا نام ملک زادہ صاحب چاہیں تو ''رقص شرر'' کے بعد ''شعلہ جوالہ'' بھی ہو سکتا ہے اور ملک زادہ صاحب کی زندگی انشاء اللہ شعلہ مستعجل نہیں ہوگی اور وہ اُردو کی خدمت کے لئے طویل عرصہ تک ہمارے درمیان رہیں گے اور لوگ ان کی طرف اشارہ کر کے کہیں گے کہ:

اس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب

☆ ☆ ☆ ☆
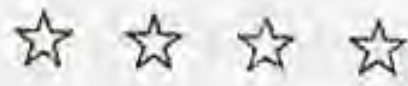
جدید عربی ادب
(شوقی ضیف کی کتاب کی روشنی میں)

اُردو ادب کے کتب خانہ میں پہلے ایک خلا تھا کہ تاریخ ادب عربی پر کوئی کتاب نہ تھی، لوگ حماسہ متنبی اور معلقات کو پڑھتے تھے کہ یہ کتابیں داخل درس تھیں؛ لیکن عربی زبان و ادب کی تاریخ سے ناواقف رہتے تھے، ہندوستان میں بھی عربی زبان و ادب کی تاریخ پر کتاب لکھی گئی ہے؛ لیکن وہ عربی زبان میں ہے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ نے یہ خدمت انجام دی ہے۔ جس طرح اُردو زبان میں انگریزی ادب کی تاریخ اور فرانسیسی ادب کی تاریخ لکھی جا چکی ہے، اسی طرح اہل اُردو کے لئے اُردو زبان میں عربی ادب کی تاریخ کی ضرورت تھی۔ عربی زبان و ادب کی تاریخ پر اب کئی کتابیں اُردو میں شائع ہو چکی ہیں، سب سے پہلے عربی ادب کی تاریخ پر احمد حسن زیات کی عربی کتاب کا ترجمہ منظر عام پر آیا، احمد حسن زیات عربی کے صاحبِ اُسلوب سحر طراز انشا پرداز تھے؛ لیکن عربی ادب کی تاریخ کی حیثیت سے یہ کتاب بہت اونچا معیار نہیں پیش کرتی تھی، کتاب میں مصنف کی انشاء پردازی ان کی تاریخ نویسی پر غالب آگئی تھی، شاعرانہ تخیل اور عبارت آرائی کے اعتبار سے کتاب قابل ستائش ہے؛ لیکن تاریخ کے اعتبار سے نہیں، حسن انشاء حسن زیات کے تیغ قلم کا اصل جوہر ہے؛ لیکن وہ بہت کامیاب مؤرخ نہیں ہیں۔ اس موضوع پر دوسری بہتر کتابوں کی ضرورت باقی تھی، پھر ڈاکٹر زبید احمد کی کتاب عربی ادب کی تاریخ پر سامنے آئی اور پروفیسر عبدالحلیم ندوی اور ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری کی کتابوں نے اس خلاء کو پر کرنے کی کوشش کی، اُردو زبان میں اب تک قدیم تاریخ ادب عربی پر اور اس کے مختلف پہلوؤں پر اور مختلف ادوار پر اور شخصیات پر کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، مثال کے طور پر عہد عباسی کی نثر پر اور عربی تنقید نگاری پر کتابیں موجود ہیں۔ لیکن عربی ادب کی تاریخ میں جو حصہ سب سے دراز ہے اور تفصیل اور دراز نفسی کا متقاضی ہے وہ جدید عربی ادب کی تاریخ ہے جس کی جڑیں ایک طرف خود قدیم عربی ادب میں پیوست ہیں، دوسری طرف انگریزی ادب اور فرانسیسی ادب کے ذخیرہ سے بھی اس نے سیرابی اور

شادابی حاصل کی ہے، کوئی ایسی کتاب اب بھی ایسی نہیں لکھی گئی جو جدید عربی ادب اور معاصر عربی ادب کا پورے طور پر احاطہ کرلے اور وہ نثر اور شاعری کی تمام قسموں کا تمام رجحانات کا اور ان کی نمائندہ شخصیات کا مرقع ہو۔ جو کتابیں جدید عربی ادب کے موضوع پر لکھی گئی ہیں (ان میں پروفیسر عبدالحلیم ندوی کی کتاب کا آخری حصہ بھی شامل ہے) ان کو پڑھ کر تشنگی کا احساس ہوتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک سمندر کو ایک پتلی سی جوئے آب میں تبدیل کردیا گیا، مجری ادب پر اور عربی صحافت پر اور عربی ادب کی بعض شخصیات پر بھی اُردو میں کتابیں آئی ہیں؛ لیکن ان کتابوں سے پوری تصویر سامنے نہیں آتی ہے۔ اُردو تو اُردو ہے، خود عربی زبان میں بھی کوئی ایک جامع کتاب موجود نہیں ہے، جو جدید اور معاصر ادب کا احاطہ اور احتواء کرلے؛ البتہ کئی کتابوں کو ملا کر یہ خلا پر ہوجاتا ہے، جو کتابیں عربی زبان میں تصنیف کی گئی ہیں، ان میں شوقی ضیف کی یہ کتاب ''الادب العربی المعاصر فی مصر'' ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، یہ کتاب اسی کتاب کا ترجمہ ہے؛ لیکن شوقی ضیف نے اپنے دامانِ تصنیف کے لئے ادب کے صرف وہ پھول چنے جو وادی نیل کی زرخیز زمین پر کھلے تھے، انھوں نے وادئ نیل کی کلیوں اور خوشنما پھولوں پر قناعت کرلی، بقول اقبال ''ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے''، یعنی یہ ممکن تھا کہ ان کے قلم گوہر رقم سے ایسی کتاب سامنے آتی، جس میں عہد حاضر میں پورے عالم عرب کے معاصر ادباء اور شعراء کا تذکرہ ہو، شوقی ضیف کی کتاب ''الادب العربی المعاصر فی مصر'' کا اُردو ترجمہ عربی ادب کے طلبہ کے لئے اور باذوق قارئین کے لئے بہت مفید ہے اور بہت بڑی خدمت ہے۔

شوقی ضیف اس عہد کے مایہ ناز محقق، ناقد اور ادیب تھے، مارچ ۲۰۰۵ء میں ان کا انتقال ہوا، نوے سال سے زیادہ عمر پائی، یہ عمر دراز انھوں نے آرزو میں کاٹی نہ انتظار میں؛ بلکہ اس کے ایک ایک لمحہ کو انھوں نے علم وادب کی خدمت کے لئے وقف کردیا اور وقت کے تلوں سے پورا تیل انھوں نے نچوڑلیا، وہ عروس فن کی آراستگی اور زلف ادب کی مشاطگی میں مصروف رہے۔ شوقی ضیف کو اس بات کا استحضار رہا کہ وہ سرائے فانی میں ایک ''ضیف''، یعنی ایک راہ گیر اور مہمان کی حیثیت سے مقیم ہیں اس لئے لازم ہے کہ علم وادب کے چمنستان میں کھلتے ہوئے گلابوں کو نگاہ شوق سے دیکھیں اور ان کے لئے اپنے جان ودل کو نثار کردیں اور پھر ان کے جمال دل افروز کو اہل ذوق کے لئے قید تحریر میں اور الفاظ کی زنجیر میں لے آئیں، ان کا قلم رواں اور ان کی ہمت جواں ہے۔ انھوں نے تنہا اپنے نوک قلم سے عربی ادب کا وہ عظیم کتب خانہ تیار کردیا ہے، جس سے عربی

زبان ادب کا طالب علم کبھی صرف نظر نہیں کر سکے گا اور جس کی تازگی اور بیش مائیگی برقرار رہے گی، اس جہان فانی میں ایک فنا پذیر ہستی کس طرح رنگ ثبات دوام حاصل کر لیتی ہے، اس کا ایک نمونہ شوقی ضیف کی شخصیت ہے اور اس لئے ان کے ادبی اور علمی کارناموں کو پڑھنا چاہئے، یہ وہ طرز حیات ہے جو لائق تقلید ہے، یہ وہ مینارۂ نور ہے جس سے اکتساب نور کی ضرورت ہے۔ ۱۹۳۵ء میں وہ مجمع اللغۃ العربیۃ سے وابستہ رہ چکے تھے، ۱۹۳۶ء سے کلیۃ الأدب سے وابستہ رہے، ۱۹۵۶ء میں اس میں پروفیسر اور ۱۹۶۸ء میں اس کے صدر مقرر ہوئے۔ بیروت یونیورسٹی، اُردن یونیورسٹی، بغداد یونیورسٹی، کویت یونیورسٹی، ریاض یونیورسٹی میں کہیں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے اور کہیں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے رہے اور اپنی دولت علم کی زکوٰۃ تقسیم کرتے رہے، شوقی ضیف نے اپنی علمی ادبی داستانِ حیات سلسلہ اقراء میں ''معی'' کے نام سے لکھی ہے جو دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ ان کے شاگردوں نے ان کی شخصیت پر مضامین کا مجموعہ ''شوقی ضیف'' کے نام سے شائع کیا ہے اور اس طرح سے ان کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

شوقی ضیف کا گھرانہ کاشت کاری کرنے والوں کا گھرانا تھا، اس خاندان میں ان کے والد شیخ عبد السلام ضیف ازہری عالم تھے، روزانہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے اور دلائل الخیرات پڑھتے، مسجد میں دینی مجالس منعقد کرتے اور اپنی زمین زراعت کے کام میں مشغول رکھتے، ان کی والدہ کے ہاتھ میں تسبیح ہوتی اور وہ خانہ داری کے کام انجام دیتیں، ایک سادہ زندگی اور صاف ستھری دینی معاشرت تھی اور بقدر کفاف روزی تھی؛ لیکن شیخ عبد السلام ضیف نے اپنے لڑکے شوقی ضیف کی تعلیم تربیت کی طرف پوری توجہ کی۔

شوقی ضیف ومیاط کے قریب ایک گاؤں میں جس کا نام ''اولاد حمام'' ہے ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے، شہر کے شور وشغب سے دور جمال فطرت کے گہوارے میں ان کی نشو ونما ہوئی، ۳۵ سال کی عمر میں جب وہ خود مدرس تھے، انگریزی ادب کی ایک طالبہ سے ان کی شادی ہوئی، یہ پہلا موقعہ تھا کہ شب وروز زبان وادب اور علم وفن کی زلف گرہ گیر میں اسیر رہنے والا اُلجھے سلجھے کسی کاکل میں گرفتار ہوا، اس شادی سے ایک لڑکا عاصم ہے اور ایک لڑکی رندہ ہے، شوقی ضیف نے اپنی خود نوشت سوانح میں حج کا تذکرہ کرتے ہوئے اُم عاصم کا ذکر بھی کیا ہے۔

بچپن میں ایک حادثہ کے نتیجہ میں ان کی ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی، اپنے گاؤں کے ابتدائی مدرسہ میں ان کا داخلہ ہوا؛ لیکن قدرت کی طرف سے بھی کچھ شوقی ضیف کو حصول علم کا شوق

ملا تھا، وہ اپنے والد کے ذاتی کتب خانہ سے بھی استفادہ کرتے تھے، دینی ادب اور تاریخی کتابوں کا انھوں نے اہتمام کے ساتھ مطالعہ کیا، منفلوطی کی کتابیں، اب الفارض کا دیوان اور واقدی کی فتوح الشام ان کے مطالعہ میں رہتیں، بچپن میں وہ اپنی دادی سے کہانیاں بھی سنا کرتے تھے، قصہ اور کہانی کی کتابیں پڑھتے بھی تھے، والد کے ساتھ مشائخ تصوف کے حلقوں میں شریک بھی ہوئے تھے، انھوں نے قرآن مجید حفظ کیا تھا، طٰہٰ حسین عباس، محمود عقاد، مصطفیٰ صادق الرافعی، محمد حسین ہیکل اور علی عبد الرازق کی کتابیں بچپن میں پڑھ ڈالیں، شوقی اور دوسرے شعراء کا کلام پڑھا، اس سے ان کے ادبی ذوق کی نشو ونما ہوئی۔ کتابوں کے مطالعہ کے ساتھ مطالعہ فطرت کا ذوق بھی انھیں ودیعت کیا گیا تھا، کھیتوں کی ہریالی، زمین سے سر اٹھاتی ہوئی گیہوں کی بالیاں، لہلہاتے ہوئے مرغزار اور کپاس کے پھولوں کی نظر کو خیرہ کردینے والی چمک، رود نیل اور باغ ہائے نخیل ان کے دامان دل کو کھینچتے۔ رات کے وقت زیورات آسمانی کے خوبصورت منظر سے اور شب کی زلف سیاہ کی مانگ میں تاروں کی کہکشاں سے انھیں شعر وادب کا بے حرف وصورت درس ملتا اور سکوت لالہ وگل سے کلام پیدا کرنے کی انھیں اہلیت حاصل ہوتی، دمیاط کے معہد اور مدرسہ سے فراغت کے بعد انھوں نے دار العلوم میں پھر جامعہ قاہرہ میں داخلہ لیا، جس میں اصل مضمون ان کا ادب عربی تھا اور زبانوں میں انگریزی زبان، بعد میں انھوں نے فرانسیسی اور فارسی زبانیں بھی سیکھ لیں۔ فارسی میں انھوں نے شیخ سعدی، حافظ شیرازی، جلال الدین رومی اور محمد اقبال کے کلام کا براہ راست مطالعہ کیا، ان کے اساتذہ میں طٰہٰ حسین، امین الخولی، عبد الوہاب عزام اور احمد امین جیسی شخصیتیں تھیں۔ ایم اے میں ان کے مقالہ کا موضوع کتاب الاغانی کا تنقیدی مطالعہ تھا، پی ایچ ڈی کا مقالہ انھوں نے ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی زیر نگرانی تیار کیا تھا اور عباسی دور کی شاعری اس کا موضوع تھا'' الفن و مذاہبہ فی الشعر العربی'' ان کی وہ معرکۃ آراء کتاب ہے جس کی تعریف ان کے مربی اور نگران ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے کی ہے اور دل کھول کر کتاب کی تعریف کی ہے۔ پھر شوقی ضیف کی کتابیں مسلسل منظر عام پر آتی رہیں ادبی رسالوں میں ان کے مضامین چھپتے رہے ان کے نقوش قلم تحسین وآفرین کی صداؤں کے درمیان ایک کے بعد ایک سامنے آتے رہے، یہاں تک کہ وہ شہرت کے بام عروج تک پہنچ گئے، مختلف اداروں اور انجمنوں کے ایوارڈ ان کو ملتے رہے اور آخر کار ۱۹۸۳ء میں انھیں فیصل ایوارڈ مل گیا، ان کی تصنیفات بہت ہیں:

(۱) النصوص الادبیۃ (۲) مختارات من الشعر الجاہلی

(۳) تاریخ الادب العربی (٦ جلدیں) (۴) الفن ومذاہبہ فی الشعر العربی
(۵) النثر ومذاہبہ فی النثر العربی (٦) شوقی شاعر العصر الحدیث
(۷) دراسات فی الشعر العربی المعاصر (۸) التطور والتجدید فی الشعر العربی
(۹) البحث الادبی (۱۰) ابن زیدون الشاعر الاندلسی
(۱۱) عصر الدول والامارات (۱۲) المغرب
(۱۳) البلاغۃ (۱۴) نقط العروس
(۱۵) مع العقاد (۱٦) البارودی رائد الشعر وطوابعہ الشعبیۃ
(۱۷) فصول فی الشعر ونقدہ (۱۸) الترجمۃ الشخصیۃ
(۱۹) الرثاء المقامہ (۲۰) الرحلات، تجدید النحو
(۲۱) المدارس النحویۃ (۲۲) التفسیر فی القرآن الکریم
(۲۳) البطولہ فی الشعر العربی (۲۴) الفکاہۃ فی مصر
(۲۵) الشعر والغناء فی المدینۃ ومکہ اور معی۔

یہ کتابیں فہرست تصنیفات میں زیادہ مشہور ہیں، ان کا قلم ایک ایسا ابر فیض رساں ہے جس سے نخل ادب نہال اور دامن علم مالا مال ہے۔

شوقی ضیف نے اگرچہ معاصر ادب کے نام سے کتاب لکھی ہے؛ لیکن انھوں نے منظر کے ساتھ پس منظر بھی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس طرح جدید عربی ادب کے ارتقاء کی کہانی بھی اس کتاب میں آ گئی ہے، لفظ معاصر کے مفہوم میں وسعت بھی بہت پیدا کر لی گئی ہے۔

شوقی ضیف ادب کے کامیاب مؤرخ ہیں؛ لیکن ہر مؤرخ جب ادب کی تاریخ لکھنے بیٹھتا ہے تو وہ ادبی بصیرت کا اور ذوق انتخاب کا امتحان بھی دیتا ہے لوگ بغور دیکھتے ہیں کہ وہ کس کس کا انتخاب کرتا ہے اور کس غنچہ کو رشک گل آفتاب کرتا ہے، کس کو قلم انداز کرتا ہے اور کس کو نظر انداز کرتا ہے اور ایک ناقد کو یہ آزادانہ فیصلہ کرنے کا پورا حق ہے کہ اس امتحان میں اسے کتنے نمبر دیئے جائیں، اسے پاس کیا جائے یا فیل کیا جائے۔ شوقی ضیف کی یہ کتاب جس کا اُردو ترجمہ پیش نظر ہے قابل ستائش کتاب ہے اور طلبہ اور اساتذہ کے لئے بہت مفید ہے اس میں ان کی ژرف نگاہی اور ناقدانہ بصیرت بھی آشکار ہے؛ لیکن یہ کہنا کہ یہ تسامحات سے ناہمواریوں سے بالکل خالی ہے مشکل ہے، بعض اہل قلم نے کچھ اشارے بھی کئے ہیں، نشاندہی بھی کی ہے، اس کتاب میں شعراء کے

مفصل تذکرہ کے بعد نثر کے ارتقاء کی داستان بیان کی گئی ہے، شیخ محمد عبدہ، مصطفیٰ لطفی منفلوطی، محمد مویلحی، مصطفیٰ صادق الرافعی، احمد لطفی، سید ابراہیم، عبدالقادر المازنی، محمد حسین ہیکل، طٰہٰ حسین، توفیق الحکیم اور محمود تیمور کا تذکرہ ہے، آنکھیں احمد امین کا نام بھی ڈھونڈھتی ہیں؛ لیکن یہ نام نظر نہیں آتا ہے، غالباً شوقی ضیف ان کو عالم، دانشور اور ایک بڑا اسکالر مانتے ہیں؛ لیکن ادب کی خلعت فاخرہ انھیں نہیں پہنانا چاہتے ہیں، غالباً شوقی ضیف اس بات کے قائل ہیں کہ ادب وشعر نام ہے وجدان کے تموج کا اور گزرگاہ خیال کو موٴجہ گل سے چراغاں کرنے کا، اگر ''دو اور دو چار ہے'' کہا گیا یا لکھا گیا تو یہ ادب نہیں ہے؛ لیکن احمد امین کی تحریروں میں بھی ایسی عبارتیں ملتی ہیں، جن سے ادبی اور شعری حاسہ اپنی غذا پاتا ہے، اسی طرح سے عقاد کا مفصل تذکرہ شعر کے ارتقاء کے باب میں آگیا ہے، اس لئے نثر کے باب میں ان کے ذکر کی چنداں ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

☆ ☆ ☆ ☆
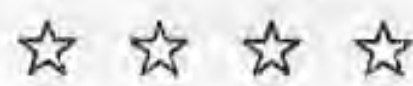
گلِ رعنا

مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کی کتاب ''گلِ رعنا'' کا سلسلہ پدری امام حسن پر منتہی ہوتا ہے۔ ان کا خاندان ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کا مصداق ہے، ان کے بزرگوں میں حضرت سید شاہ علم اللہ، حضرت سید آدم بنوری کے جلیل القدر خلیفہ تھے، آپ کے دادا مولانا سید عبدالعلی ایک مرد درویش اور حضرت سید احمد شہید کے مرید اور مجاز تھے، آپ کے والد مولوی وحکیم سید فخر الدین عالم جلیل اور خوش فکر شاعر تھے، انھوں نے تصنیفات کا ایک دفتر چھوڑا جس کا بڑا حصہ تلف ہوگیا، باقیات الصالحات میں ان کی ضخیم اور قیمتی کتاب ''مہر جہاں تاب'' ہے جو گنجینہ علوم ومعارف ہے اور ان کا ایک دیوان ہے جو ان کی شعری مہارت اور صلاحیت کا ثبوت ہے، صاحبِ گل رعنا نے اپنی کتاب کے آخر میں ان کا مفصل تذکرہ لکھا ہے۔

مولانا سید حکیم عبدالحی حسنی اپنے والد کی خصوصیات کے وارث اور نسبی فرزند ہونے کے ساتھ ان کے معنوی فرزند تھے، ادب وانشاء کا ذوق 'نقد سخن' احساس جمال اور درویشی اور خدا ترسی

کے اوصاف ان کو اپنے خاندان سے وراثت میں ملے تھے، وہ طبیب حاذق بھی تھے اور تصنیف و تالیف کے میدان کے مرد بھی۔ خلوت پسندی اور یکسوئی کے ساتھ ساتھ اجتماعی اور ملی خدمت کے میدان کے بھی شہسوار تھے، ندوۃ العلماء کی علمی اور دینی تحریک کے وہ سپاہی بھی تھے اور سپہ سالار بھی۔ ان کی پیدائش ۲۲ر دسمبر ۱۸۶۵ء کو ہوئی، خاندان کے بزرگ مولانا سید عبدالسلام ہدی اور سید شاہ ضیاء النبی کے زیر سایہ عہد طفلی گزرا، اول الذکر سلسلہ مجددیہ نقش بندیہ کے کمالات کے امین تھے اور مؤخر الذکر کا شمار اولیاء مقبولین میں ہوتا ہے، ان کی مبارک اور پر نور مجلسوں ہی میں بیٹھنے کی وجہ سے دین اور اہل دین کی عظمت لوحِ قلب پہ نقش ہوگئی اور لکھنؤ، بھوپال میں حدیث وادب کے مستند اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔

مولانا عبدالحئیؒ کی طبیعت میں تنوع رنگارنگی، جامعیت اور اعتدال کا وصف پایا جاتا ہے، ہندوستان میں دودمان ولی اللہی کا یہ امتیاز ہے، شریعت وطریقت، تصنیف و تالیف اور رہبری و قیادت یہ اوصاف جو دوسروں کے یہاں الگ الگ پائے جاتے ہیں، اس خاندان کے لوگوں میں اکثر جمع ہوجاتے ہیں۔ یہی وصف مولانا عبدالحئیؒ صاحب کا بھی جوہر امتیاز ہے، وہ محدث بھی ہیں اور فقیہ بھی، سوانح نگار بھی اور مؤرخ بھی اور ادیب اور ناقد سخن شناس بھی، وہ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، تصانیف کی فہرست میں جو کتاب ان کی شہرت تام اور بقائے دوام کا سبب بنی وہ ''نزہۃ الخواطر'' ہے جو ہندوستان میں قرنِ اول سے لے کر آٹھویں صدی ہجری تک مسلمانوں کی علمی اور دینی شخصیتوں کا تذکرہ ہے، یہ آٹھ جلدوں کی انسائیکلو پیڈیا ہے جو عربی زبان میں لکھی گئی ہے اور جس کی شہرت چاردانگ عالم میں پھیل چکی ہے، یہ کتاب ایک پورے کتاب خانے کا حاصل اور نچوڑ ہے، مؤرخانہ دیدہ وری اور حسن انتخاب کا وصف اس کتاب میں نمایاں ہے۔ ''الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند'' اور ''الہند فی العہد الاسلامی'' ان کی دوسری مقبول عربی کتابیں ہیں، ان کی اُردو تصنیفات میں ''یادایام'' اور ''گلِ رعنا'' کو شہرت حاصل ہوئی، یادایام گجرات کی تاریخ ہے جو مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی فرمائش پر لکھی گئی، یہ کتاب نہ صرف تاریخ نویسی کا؛ بلکہ ادب وانشاء کا بھی نمونہ بن گئی ہے۔

''گلِ رعنا'' اُردو زبان کے چمنستان کے خوش بیان شاعروں کا تذکرہ ہے اور اُردو زبان کی تاریخ ہے، یہ دوسری کتاب ہے جو اس ملک میں اُردو شعراء کے تذکروں سے متعلق اُردو زبان میں لکھی گئی ہے، اس کتاب سے پہلے شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے اُردو میں ''آبِ حیات''

کے نام سے شعراء اُردو کا تذکرہ لکھا تھا ورنہ اس سے پہلے تذکرہ اُردو کے شعراء کا ہوتا تھا اور زبان فارسی ہوتی تھی اور اہل علم کے لئے یہی زبان اس زمانہ میں طرہ افتخار تھی اور علم و ادب کے بازار میں اسی کا سکہ رائج تھا۔ گلِ رعنا صرف تذکرۃ الشعراء نہیں ہے؛ بلکہ اس کے لفظ لفظ سے شعورِ سخن اور نقد سخن آشکارا ہے، کتاب میں اس کا ذکر نہیں کہ اس کتاب کا نام ''گلِ رعنا'' کیوں رکھا گیا ''گلِ رعنا'' کے نام سے ۱۱۸۱ء میں ہندوستان کے شعراء فارسی کا ایک تذکرہ لکھا گیا تھا جو بہت کمیاب ہے، یہ نام اس سے مستعار بھی ہوسکتا ہے اور یہ محض توارد بھی ہوسکتا ہے اس فارسی تذکرہ کا قلمی نسخہ سالارِ جنگ کے کتاب خانے میں مخطوطہ کی شکل میں موجود ہے، اس کی کتابت ۱۹ر جمادی الاول ۱۱۸۶ھ میں ہوئی ہے، یعنی اس کتاب کا سن تصنیف مولانا عبدالحئی کی گلِ رعنا سے ڈیڑھ سو سال پہلے کا ہے، فارسی گلِ رعنا کے مصنف کا نام ''رائے لچھمی نارائن کھتری، شفیق اورنگ آبادی ہے جو غلام علی آزاد بلگرامی کے شاگرد تھے، شفیق تخلص بھی انھیں کا عطا کیا ہوا ہے ورنہ اس سے پہلے وہ صاحب تخلص کرتے تھے، ان کے دادا بھگوان داس لاہور کے کھتری کپور خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور پہلی بار اورنگ زیب (۱۰۶۹ - ۱۱۱۸) کے لشکر میں شامل ہوکر دکن کی سمت گئے تھے اور وہیں بود و باش اختیار کی تھی۔ لچھمی نارائن شفیق نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، گلِ رعنا کے علاوہ ان کی کتاب ''چمنستان شعراء'' ہے جو اُردو شاعروں کے تذکرے پر مشتمل ہے ان کی تیسری کتاب ''شام غریباں'' ہے اور ان فارسی گو شعراء کے تذکرہ پر مشتمل ہے جو ایرانی الاصل تھے اور ہندوستان بغرض سیاحت آئے تھے ان کی ایک اور کتاب ''مآثر آصفی'' جو آصف جاہ اول اور آصف جاہ ثانی کے عہد کی تاریخ ہے وہ اور بھی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ لچھمی نارائن کی گلِ رعنا کا پہلا حصہ سخن طرازان اسلامیاں پر مشتمل ہے جس میں ۱۲۶ شعراء کا تذکرہ ہے، دوسرا حصہ نکتہ پردازانِ اصنامیان یعنی ہندو شعراء پر مشتمل ہے جس کی تعداد ۴۴ ہے۔

جب مسلمانوں کے عروج کا زمانہ تھا اور حکومت کی زبان فارسی تھی تو اصنامیان ہند یہ زبان سیکھ رہے تھے اور منصب دار بن رہے تھے، وہ لسانی اور تہذیبی اعتبار سے مسلمان ہوگئے تھے، ایک خلیج اور باقی تھی یہ بھی پاٹی جاسکتی تھی؛ لیکن اس کے لئے جس دردِ محبت کی ضرورت تھی وہ دلوں میں موجود نہ تھا اور جو دعوتِ دین کا مزاج درکار تھا وہ کمیاب تھا۔ فارسی گلِ رعنا کے بعد شاہ محمد کمال نے جو قصبہ کڑا مانک پور کے رہنے والے تھے، فارسی میں تذکرہ شعراء ''مجمع الانتخابات'' لکھا، یہ تذکرہ ۱۲۱۸ھ ۱۸۰۵ء میں لکھا گیا، اس کا قلمی نسخہ حیدرآباد کے سالار جنگ میوزیم میں اور

ایشیاٹیک سوسائٹی کلکتہ اور برٹش میوزیم لندن میں ہے، قدرت اللہ شوق نے ۱۱۸۹ھ میں فارسی میں ''طبقات الشعراء'' کے نام سے کتاب لکھی یہ بھی اُردو شعراء کا تذکرہ ہے اور بہت کمیاب ہے۔ فارسی زبان میں شعراء کے کئی تذکرے لکھے گئے، مثال کے طور پر میر تقی میر کی نکات الشعراء، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا گلشن بے خار، تذکرہ میر حسن، تذکرہ فتح شاہ وغیرہ، اگر شعراء کے تذکرے نہ لکھے گئے ہوتے اور دواوین نہ چھپتے تو بہت سے آوارہ گرد اشعار کے حسب نسب کا پتہ چلانا بھی آج دشوار ہوجاتا۔ شمس العلماء محمد حسین آزاد کی کتاب ''آبِ حیات'' اُردو زبان میں پہلا تذکرہ ہے اور علمی و ادبی کارنامہ ہے، پہلی بار اُردو کی کہانی اُردو زبان میں سنائی گئی، ادب و شاعری کے ماحول میں ان کی تربیت ہوئی تھی اور استاد ذوق کے وہ شاگرد بھی تھے، شعراء و ادباء کے وہ صحبت یافتہ تھے اور ادبی محفلوں کے عینی شاہد تھے، اس لئے زبان کے اداشناس اور خود صاحبِ طرزِ انشاء پرداز تھے، آبِ حیات ان کی انشاء کی گل کاریوں کا مرقع اور ان کے اُسلوبِ جمال کا آئینہ ہے۔

قبولِ خاطر و لطفِ سخن خدا داد ست

بایں ہمہ حسنِ نگارش و حسنِ اُسلوب، آبِ حیات میں صرف ان شعراء کا تذکرہ ہے جن کے بارے میں پہلے سے فارسی کے تذکرہ نویس لکھتے آئے ہیں، آزاد نے اسے اُردو کا دلکش و دیدہ زیب جامہ پہنایا ہے۔ علاوہ ازیں وہ تاریخی غلطیوں سے پاک نہیں ہے، اپنے خاص ذوق اور خاص مسلک کی وجہ سے بہت سے شعراء کے ساتھ انھوں نے انصاف نہیں کیا ہے، آبِ حیات پڑھ کر ان کے اندازِ بیان کی جمالیاتی حسن کا ہر شخص اعتراف کرے گا؛ لیکن جو لوگ اُردو زبان کی تاریخ سے واقف ہوں گے اور خوب ناخوب کی پرکھ رکھتے ہوں گے ان کو آبِ حیات کے مضامین سے اختلاف ہوگا۔ کتاب آبِ حیات ۱۸۸۰ء میں پہلی بار شائع ہوئی اور اس کو جو پذیرائی ملی وہ کم کتابوں کو ملی ہوگی، اس کے ساتھ آبِ حیات کے مبالغہ آمیز اور غیر معتدل خیالات بھی رواج پاگئے اور اس کے بہت سے مبالغہ آمیز قصے نوکِ زباں بن گئے۔ ضرورت ایسی کتاب کی تھی جو زیادہ جامع مکمل اور زیادہ متوازن ہو اور جس میں ''آبِ حیات'' کی ادبی اہمیت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ غلطیوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہو اور مولانا عبدالحی حسنی کی ''گلِ رعنا'' نے اس ضرورت کو پورا کیا۔

☆ ☆ ☆ ☆

نقدِ غزل

لالے کی حنا بندی تو بقول اقبال فطرت خود بخود کر دیتی ہے؛ لیکن مقالے کی حنا بندی کے لئے مقالہ نگار کو عروس زبان کے دست نازک اور ساعد سیمیں پر مہندی لگانے کا فن آنا چاہئے اور یہ فن تابش مہدی صاحب کو آتا ہے اور بہت خوب آتا ہے، مقالہ پر دست حنائی کا گمان ہوتا ہے، لفظ و تعبیر کی تابش سے نثر جگمگا اٹھتی ہے، زبان کی صحت کا اور املا کی صحت کا انھیں غیر معمولی خیال ہے، نام کا اثر کام پر کس قدر پڑتا ہے یہ جاننے کے لئے تابش مہدی صاحب کی کتاب نقدِ غزل کا مطالعہ کرنا چاہئے، ان کی نثر میں تابش افروزی بھی ہے اور حنا بندی بھی۔

تابش مہدی اچھے شاعر ہیں کئی مجموعے ان کے شائع ہو چکے ہیں، اس لئے اچھی شاعری کیا ہے وہ جانتے ہیں، اس لئے اس کتاب کے سارے مضامین جو نقدِ غزل پر مشتمل ہیں لائق مطالعہ ہیں۔ یہ تو پہلے سے معلوم تھا کہ سید سلیمان ندوی صرف مؤرخ اور سیرت نگار نہیں تھے شاعر بھی تھے؛ لیکن میری نظر سے پہلی بار ایسی تنقیدی کتاب نظر سے گذری ہے جس میں مولانا سید سلیمان ندوی کی شاعری کو نقد کا موضوع بنایا گیا ہے اور حاصل نقد سید صاحب کی توصیف اور تحسین۔ بالعموم نقادان سخن ان شاعروں کو نقد کا عنوان بناتے ہیں، جن کی شاعری کی حیثیت سے پہلے سے شہرت ہوتی ہے، مصنف کتاب نے روش عام سے ہٹ کر ایک مؤرخ ادیب سیرت نگار کو جس کی حیثیت عرفی شاعر کی نہیں ہے، شاعر کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور ان کے جو اشعار پیش کئے ہیں ان سے شاعر کے اعلیٰ درجہ کے شعری ذوق کا اندازہ ہوتا ہے، مثال کے طور پر ان کی غزل کا یہ شعر:

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگ گلو میں ہے

معروف ادیب اور مفسر قرآن مولانا عبد الماجد دریابادی سید صاحب کے دوست تھے، دوست کی شادی خانہ آبادی کے موقعہ پر انھوں نے بطور تہنیت جو رباعی لکھی تھی وہ بھی ان کے ملکہ شعری پر دلالت کرتی ہے:

دنیا پہ کرے غور جو کوئی تھوڑا
پائے گا ہر ایک شئے کو جوڑا جوڑا

دعویٰ تھا مرے دوست کو یکتائی کا
اللہ نے اب غرور ان کا توڑا

دیارِ شبلی کے باکمال شاعر برق اعظمی پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی باعتبار نقد اور باعتبار انشاء لائق مطالعہ ہے برق اعظمی بھی ایوان شہرت میں وہ جگہ نہیں پا سکے جس کے وہ مستحق تھے، ڈاکٹر تابش مہدی نے ان کے کلام کے جو نمونے پیش کئے ہیں ان سے ان کے باکمال سخن ور ہونے کا یقین ہوتا ہے، برق اعظمی کئی شعراء کے استاد تھے اس مفہوم میں وہ کہتے ہیں:

مثالِ شمس تھے ہم بھی کہ جب غروب ہوئے
تو بے شمار ستاروں کو جگمگا کے چلے

رمز آفاقی اور کلب علی شاہد امروہوی کی غزلوں کا بہت اچھا اور دل نشین تعارف پیش کیا گیا ہے، افسوس ہوا کہ اتنا اچھا کلام اور میں صاحب کلام سے بالکل واقف نہیں تھا اور میری طرح بہت سے لوگ ناواقف ہوں گے؛ لیکن اس میں شک نہیں کہ ان دونوں شاعروں کا کلام ذہن کو متوجہ کرتا اور دل کے اندر پیوست ہوتا ہے۔ حفیظ میرٹھی پر بھی ان کا مضمون بصیرت افروز اور قابل مطالعہ ہے، نئی نسل کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے اس دور کے ناقدین نے ان کے ساتھ بے توجہی برت کر اُردو ادب سے انصاف نہیں کیا ہے۔ عزیز وارثی پر بھی ان کے ناقدانہ اور انشاپردازانہ مضمون کو پڑھ کر طبیعت خوش ہوتی ہے، جدید ناقدین سخن نے کلیم عاجز کو بھی نظر انداز کرنے کی کوشش کی تھی اور تابش مہدی نے غالباً یہ طے کرلیا ہے کہ ایک ایک شاعر کو جسے غیر منصفانہ طور پر حاشیہ پر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے روشنی کے فوکس میں لائیں گے۔ بلاشبہ تابش کی اس کاوش نے ان کی کتاب کو جدید عہد کی ایک اہم کتاب بنادیا ہے اور کتاب اس لائق ہے کہ اُردو ادب کے ہر طالب علم کی نظر سے گذر جائے اور غزل اور غزالانِ فکر کے بارے میں وہ خود رائے قائم کرے، رفعت سروش عزیز بگھروی ابوالمجاہد زاہد شمیم جے پوری وغیرہ پر بھی تمام مضامین اہم ہیں، بحیثیت مجموعی پوری کتاب قابل مطالعہ ہے، نشور واحدی کو بھی تابش مہدی نے نقد کا موضوع بنایا ہے، نشور اپنے فن اور کمال سخن کے اعتبار سے ان شعراء میں ہیں جن کو آسانی کے ساتھ فراموش نہیں کیا جاسکتا؛ لیکن ہم دیکھتے

ہیں کہ ان کو فراموش کیا جارہا ہے ، یہ دنیا بڑی وفا فروش اور عہد فراموش ہے ، آج بڑے بڑے استادانِ فن کا کوئی نام نہیں لیتا ہے، شعروسخن میں جو نامور تھے ان کا نام ونشان مٹ رہا ہے۔ تابش مہدی کی کاوش قلم جو نقدِ غزل کے نام سے سامنے آئی ہے اس اعتبار سے بطور خاص اہم ہے کہ انھوں نے کئی ان شعراء کو اپنا موضوع بنایا ہے، جن کو لوگ بھولتے جارہے ہیں۔ کتاب اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس میں حسن انشاء کے نمونے قدم قدم پر ملتے ہیں، ورنہ اس دور کے بہت سے مشہور اور اپنے رتبہ پہ مغرور ناقدین ایسی ناہموار اور سامعہ خراش قسم کی نثر لکھتے ہیں کہ طبیعت بدخط اور بے مزا ہوجاتی ہے اور اگر کوئی کچھ کہے تو انھیں یہ کہنے میں بھی باک نہیں ہوتا ہے کہ خوبصورت نثر لکھنا ناقد کی ذمہ داری نہیں ہے، ناقد ناقد ہوتا ہے نہ کہ فنکار، بہر حال مصنف نے نشور واحدی کا بہت اچھا تعارف کرایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> نشور واحدی حسن کا بڑا لطیف اور ستھرا ذوق رکھتے ہیں، انھوں نے حسن کو بہت قریب سے دیکھا اور اس کی عشوہ طرازیوں میں کھوگئے ہیں؛ لیکن ان کی شاعری میں ابتذال ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا، جس حسن کا تذکرہ ان کی غزلوں میں ملتا ہے وہ بڑے ہی مہذب ماحول کی پیداوار ہے، بلندی خیال، شوکت الفاظ، حسن تراکیب، شگفتگی بیان اور تموج فن ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں، زبان کی روانی، روزمرہ کی صفائی مصرعوں کی برجستگی، بندش کی چستی شستگی اور شگفتگی بے ساختگی، شیرینی اور فصاحت، بے تکلفی اور لطافت نزاکت تخیل حسن بیان صداقت جذبات اثر آفرینی وجد انگیزی اور جدت طرازی یہ وہ محاسن شعری ہیں، جنھیں نشور واحدی کے کلام کے مطالعہ کے وقت بآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

نشور واحدی کا شعر ہے:

پہنچا دیا ساقی نے پایان حقیقت تک
پیمانہ بہ پیمانہ میخانہ بہ میخانہ

مصنف نے غلطی سے حقیقت کی جگہ پر محبت کا لفظ لکھ دیا ہے، نشور واحدی بڑے شاعر ہیں اور ان کا کلام مترنم اور موسیقی ریز ہے اور ستائش کا مستحق ہے؛ لیکن اقبال سے موازنہ کرنے کی کوشش حد اعتدال سے تجاوز ہے، تابش مہدی کہتے ہیں ''حسن بیان اور تاثیر کلام اور زبان اور روز مرہ کی جو چاشنی ہمیں نشور واحدی کے یہاں ملتی ہے وہ اقبال کے یہاں ملتی تو ہے؛ لیکن اس کی سطح کی

بلندی کچھ کم ہے، شاید اس لئے بھی کہ اقبال پنجابی تھے اور اس لئے بھی کہ انھوں نے پیام کو زیادہ اہمیت دی ہے اور دینی بھی چاہئے تھی؛ لیکن شعر کی جمالیات کی طرف اتنی توجہ نہیں کی جتنی کی جانی چاہئے تھی۔'' نشور واحدی اسی عہد کے شاعر ہیں اور بہت بڑی تعداد ایسے صاحب نظر لوگوں کی بھی ہے جنھوں نے نشور کو بھی پڑھا ہے اور اقبال کو بھی؛ لیکن کسی ایک شخص کو بھی تابش مہدی کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہوگا، یہ الگ بات ہے کہ اقبال نے خود اپنے بارے میں کہا ہے:

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دل کشا صدا ہو عجمی ہو کہ تازی

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ است
سوئے قطار می کشم ناقہ بے زمام را

انھوں نے کچھ اپنے حوالے سے اور کچھ قاضی سلیمان منصور پوری کے حوالہ سے عشق و محبت کے الفاظ پر جس رائے کا اظہار کیا ہے کہ محبت تو محمود ہے اور عشق صفت غیر محمود ہے وہ صحیح نہیں ہے، قدم کی طرح انسان کا قلم بھی پھسلتا ہے، قاضی سلیمان منصور پوری نے جو کچھ اس موضوع پر لکھا وہ مزلتہ الاقلام میں سے ہے کیا ضروری ہے کہ وہ بھی غلطی کی پیروی کریں، اصل یہ کہ لفظ عشق تصوف اور متصوفین کی اہم اصطلاح ہے اور کچھ لوگوں کو ان دونوں سے اللہ واسطے کا بیر ہے، عاجز کا قلم تابش مہدی کی کتاب کو نئی صدی کی اُردو تنقید کی بہترین کتاب قرار دینے ہی والا تھا کہ چند ناہمواریاں سامنے آگئیں اور قلم چلتا ہوا اس منزل پر پہنچ کر رک گیا۔

☆ ☆ ☆ ☆

آدابِ شناخت

ڈاکٹر سید عبدالباری زودنویس بسیارنویس مشاق ادیب اور پیکرعلم وتہذیب شخصیت کا نام ہے، دو درجن سے زیادہ کتابیں ان کے قلم فیض رقم سے نکلی ہیں موضوعات میں بھی تنوع ہے، ادب سے لے کر اسلامیات اور سماجیات اور اجتماعیات تک ان کی نگارشات کا دائرہ پھیلا ہوا ہے، ادارہ ادب اسلامی کے صدر ہیں، ماہنامہ پیش رفت کے ایڈیٹر ہیں اور ماہنامہ ملی اتحاد کے مدیر خوش تحریر، ملت کے مسائل اور معاملات کے بارے میں متفکر بھی اور خوش اُمید بھی۔ آدابِ شناخت ان کے تنقیدی مضامین کا پانچواں مجموعہ ہے، آدابِ شناخت ایک ادبی کتاب ہے؛ لیکن وہ ہر رنگ میں بہار کے اثبات کے قائل ہیں، جس موضوع پر لکھیں اس میں ادب اس طرح شامل ہوتا ہے جس طرح شاخ گل میں بادسحر گاہی کا نم شامل ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ ادیب ہوتے ہیں؛ لیکن دیکھنے سے ادیب نہیں لگتے؛ لیکن ڈاکٹر سید عبدالباری دیکھنے ہی سے ادیب معلوم ہوتے ہیں، جب بھی نظر آئیں گے انداز قلندرانہ اور طبع درویشانہ کے ساتھ نظر آئیں گے، نہ تام جھام نہ نخوت وتمکنت، نہ زرق برق پوشاک، نہ بنگلہ اور گملہ نہ موٹر اور شوفر، گویا زبان حال سے کہہ رہے ہوں ''ہیں کسی اور کی خاطر یہ نصاب زروسیم۔'' یہ انداز وہی شخص اختیار کرسکتا ہے، جو ذہنی زندگی گذارتا ہو فکر واحساس کی دنیا میں سانس لیتا ہو تخیل اور تعقل اس کا اوڑھنا بچھونا ہو افکار ونظریات کی سطح کو متموج کرنے والی تحریریں پڑھتا ہو اور ایسی تحریریں لکھتا ہو، سوسائٹی کا کریم یہی طبقہ ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ علم و ادب کی انجمن میں یا تعلیمی اداروں میں داخل تو ہوجاتے ہیں؛ لیکن ان کی ذہنیت ساہوکارانہ، تاجرانہ یا جاگیردارانہ ہوتی ہے، کبھی وہ کوئی کتاب از اول تا آخر نہیں پڑھ سکتے ہیں اور نہ کوئی فکر انگیز مضمون۔ اس لئے کہ حقیقتاً وہ علم وادب کی دنیا کے آدمی ہی نہیں ہوتے ہیں، کبھی اتفاق سے چند سطروں کی کوئی تحریر لکھی بھی تو اپنے اشتہار کے لئے اور یہ بتانے کے لئے کہ ان کا منصب یہ ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی شخص فوجی نہ ہو اور فوجی کی وردی پہن لے جس میں کئی چمک دار اسٹار لگے ہوئے ہوں۔ علم وادب کی دنیا کچھ اور شئی ہے، باعمل ہونا اچھی بات ہے اور ضروری بھی ہے؛ لیکن یہ

کام ہر شخص کے بس میں ہے اور اسی لئے ہر شخص اس کا مکلّف بھی ہے۔ فکر ونظر کی قندیل روشن کرنا اور نظریہ سازی کرنا بہت اونچے درجہ کی بات ہے، ڈاکٹر سید عبد الباری کا شمار اسی زمرہ کے لوگوں میں ہے، ان کی شخصیت میں کسی طرح کا تصنع نہیں ہے، ہر طرح کے کمپلکس سے آزاد، ان میں وہ شان ہے جو ایک سچے ادیب اور اسکالر کی ہوتی ہے۔

اس مجموعہ میں بہت سے اہم ادبی اور تنقیدی مضامین شامل ہیں، اکیسویں صدی میں ادب ''غالب اور نئے دور کا عرفان'' تحفظ حقوق انسانی اور اُردو ادب، سید ابوالحسن علی ندوی عصر آگہی اور فکر اسلامی کا کامل امتزاج، مجروح سلطان پوری، ادبیات شبلی، اُردو شاعری بیسویں صدی کے نصف آخر میں، عرفان صدیقی، جگن ناتھ آزاد، سہیل احمد زیدی، رشید کوثر فاروقی، کیفی اعظمی، طیب عثمانی کا ادبی اور تہذیبی مزاج، ابوالمجاہد زاہد، میر انیس، علقمہ شبلی حفیظ میرٹھی وغیرہ، کتاب کے کینوس میں بہت سی تصویریں اور تنویریں ہیں۔ تصویر بتاں اور تنویر چراغاں، ان مضامین کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ نظریات کی دنیا میں ان کا ایک کمٹمنٹ بھی ہے، بہت سے ادیبوں کے یہاں کوئی کمٹمنٹ نہیں ہوتا ہے، کسی نظریہ سے کوئی وابستگی نہیں ہوتی ہے؛ کیوں کہ زندگی کے سب سے بنیادی سوال کو انھوں نے سنجیدگی سے نہیں لیا، یہ زندگی کیا ہے، کہاں سے آئی ہے اور ہمارا مقصد وجود کیا ہے اور ہمیں آخر کار کہاں جانا ہے اور کیا زندگی دینے والے نے ہمیں کچھ ہدایات دی ہیں۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ آدمی ان بنیادی سوالوں کا غلط جواب پالے؛ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ آدمی ان بنیادی سوالوں پر غور ہی نہ کرے اور پوری زندگی لا ادریت اور تشکیک کا شکار رہے، لا ادریت کا شکار ہونے والوں کا ادب کی دنیا میں کمٹمنٹ نہیں ہوتا ہے وہ صرف ادب برائے زندگی، زندگی برائے ادب کے قائل رہتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبد الباری ادب برائے زندگی، زندگی برائے بندگی کے قائل ہیں، انسان اور کائنات کے بارے میں ان کا متعین نقطۂ نظر ہے، وہ اپنے ادب کے لئے اسی قندیل سے اکتساب نور کرتے ہیں، ان کے تمام مضامین میں یہ نور چمکتا اور دمکتا ہے۔ کسی نظریہ سے وابستگی اور ایقان واذعان کیا چیز ہوتی ہے اس کو اس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ جب اقبال جیسے اسلامی شاعر نے اپنے نثری خطبات میں غیبی حقائق کے بارے میں وہ باتیں کہیں جو اسلامی عقیدہ سے میل نہیں کھاتیں تو اقبال کے قدرداں اور عظمت شناس مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اس پر تنقید کی (نقوشِ اقبال) لیکن جو لوگ لا ادریت کے شکار تھے اور کسی عقیدہ سے مکمل طور پر وابستہ نہ تھے، جیسے معروف اسکالر شمیم حنفی وہ اقبال کے انحراف اور تحریف سے خوش تھے اور مولانا علی

میاں ندوی پر نقد کناں (ہم نفسوں کی بزم میں) اس کتاب آداب شناخت میں ایک مضمون میں مولانا علی میاں کی شخصیت کے بہت اہم پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

حقوق انسانی اور اُردو ادب کے موضوع پر طویل مضمون موضوع کا احاطہ کرتا ہے قدیم اور جدید تمام شعراء کے کلام سے موضوع سے متعلق اشعار نقل کئے گئے ہیں، اس سے اپنے ادبی ورثہ پر اعتماد بحال ہوتا ہے۔ اُردو کے شعراء اور ادباء انسانیت کا درد رکھتے ہیں اور ظلم وقساوت پر بے چین ہو جاتے ہیں، اس کتاب کے سارے مضامین بصیرت افروز ہیں، مجروح سلطان پوری کے جو خطوط ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس تحریک سے نالاں اور بے زار تھے۔ راشد انور نے اپنی کتاب میں ان کے بارے میں جو کچھ لکھا اس سے ان کو اتفاق نہیں تھا اور کتاب کو ناپختگی ذہن کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور اس پر افسوس ظاہر کرتے ہیں اس پوری کتاب کو انھوں نے ہفوات سے تعبیر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس لڑکے نے ''بے وضو اذان'' دے دی ہے۔ اس کتاب میں مصنف کے نام مجروح سلطان پوری کے خطوط کے اقتباسات ہیں، اب مجروح سلطان پوری کا کوئی مطالعہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کتاب کا یہ مضمون نہ پڑھ لیا جائے۔

کتاب کے تمام مضامین عالمانہ اور فاضلانہ ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ اس ادبی کتاب کی ادبی حلقوں تک رسائی ہو، کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

دیوانِ حاتم

پروفیسر عبدالحق سابق صدر شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی ادیب محقق ناقد اور انشا پرداز ہیں، مجھے اکثر ان کی تحریروں میں رشید احمد صدیقی کی تحریر کی دل پذیری، دلآویزی اور خوشبو کا احساس ہوتا ہے۔ دونوں کی بود و باش ایک ہی خطہ مشرق کی رہی ہے، میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا؛ لیکن یہ ''جمال ہم نشیں در من اثر کرد'' کا واقعہ بھی ہوسکتا ہے، معنوی ہم نشینی کسی مصنف کی کتابوں کے بالاستیعاب مطالعہ سے بھی حاصل ہو جاتی ہے، اس کا دوسرا مصرعہ ان کی شخصیت پر منطبق نہیں ہوتا ہے، اس لئے کہ ان کا روحانی ربط عالم خاک سے نہیں بلکہ عالم پاک سے ہے۔

پروفیسر موصوف اس کتاب دیوانِ حاتم میں ایک محقق کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے دیوانِ حاتم کے مخطوطے کو ایڈٹ کیا ہے اور دیوان کا انتخاب شائع کیا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جسے مولانا حسرت موہانی اور محی الدین قادری زور اپنی کاوش قلم کا عنوان بنا چکے ہیں، مولانا شبلی کی شعر العجم ہو یا محمد حسین آزاد کی آبِ حیات دونوں میں اس دیوان کا تذکرہ موجود ہے، میر تقی میر نے نکات الشعراء میں اس کا تذکرہ کیا ہے، اُردو ادب کے قدیم ورثہ کا جب تذکرہ آتا ہے، تو اس کتاب کا ذکر بھی ملتا ہے۔ کسی کو اگر یہ جاننا ہو کہ پانچ سو سال قبل اُردو کا اُسلوب کیا تھا تو وہ اس کتاب کا مطالعہ بھی کرے گا، شاہ حاتم شمالی ہند کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہیں، مرزا محمد رفیع سودا ان کے شاگرد رہ چکے ہیں، اگرچہ حاتم اور فائز کے درمیان شرف تقدم کا مسئلہ محققین کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے۔

شاہ حاتم اپنے عہد کے جلیل القدر شعر گو استاد سخن اور آشنائے فن اور شمالی ہندوستان کے پہلے صاحب دیوان شاعر تھے امراء کے دربار سے بھی ان کا تعلق رہا؛ لیکن پہلے کے زمانہ میں کوئی صاحب کمال شاعر اور فنکار فکر آخرت اور خیال عاقبت سے بے نیاز نہیں ہوا کرتا تھا، چنانچہ انھوں نے تصوف کی تعلیم بھی حاصل کی اور اس دنیا کے صاحب دل بزرگوں سے بیعت کا تعلق بھی رکھا کیوں کہ تخم دل کی بالیدگی اور روئیدگی خداوندان دل کی صحبت اور نگاہ سے حاصل ہوتی ہے۔

حاتم نے جس سخاوت کے ساتھ کمال فن کا اظہار کیا ہے اس کی وجہ سے ان کے دیوان کی اہمیت بڑھ گئی ہے اور اُردو زبان و ادب کی تاریخ کا کوئی طالب علم حاتم کے تذکرہ سے بے نیاز نہیں رہ سکتا ہے اور اسے نیاز مندی کے ساتھ پروفیسر عبدالحق کی اس کتاب کے مطالعہ پر بھی مجبور ہونا پڑتا ہے۔ انھیں اتفاق سے دیوان حاتم کا ایک نادر مخطوطہ ہاتھ آیا "قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری" انھوں نے گوہر شناسی کا ثبوت دیا، مخطوطہ شناسی ایک مستقل فن ہے، انھوں نے مخطوطہ پر محنت کی دیوان کا انتخاب کیا اور حاتم کی شاعری اور فن اور تاریخ پر جتنا مواد اُردو میں موجود تھا ان کو اس طرح جمع کیا، جس طرح چونٹی شکر کے دانے جمع کرتی ہے؛ بلکہ سچ یہ ہے کہ انھوں نے چونٹیوں کے منھ سے لے کر شکر کے دانے جمع کرنے میں فن تحقیق کا معیار پیش کیا ہے۔ اس لئے اس موضوع کا مطالعہ کرنے والا کوئی شخص اس کتاب سے کترا کے نہیں گذر سکتا ہے، جس طرح ایک عاشق صادق کسی کی یاد سے کترا کر گذرنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر راہ میں پھولوں کے لب اور سایوں کے گیسو آتے ہیں اور اس کی کوشش ناکام ہو جاتی ہے اسی طرح جب بھی اُردو ادب کی تاریخ کا طالب علم شاہ حاتم کی ذکر سے گذرے گا، اسے لامحالہ اس کتاب کا مطالعہ کرنا ہی پڑے گا اور جب وہ اس کتاب کا مطالعہ کرے گا تو اسے صرف دورِ قدیم کے حاتم کے محاسن شعری کا اندازہ نہیں ہوگا؛ بلکہ محاسن اُسلوب کا بھی اندازہ ہوگا، سنبھل سنبھل کر لکھنا، موزوں الفاظ کا انتخاب کرنا اُسلوب کے دروبست کا لحاظ رکھنا ،صنعت لفظی اور معنوی کا استعمال جملوں کی تحقیق وتزئین یہ سب مل کر دامان باغبان اور کف گلفروش کا منظر پیش کرتی ہیں، انھوں نے حاتم کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کے ثبوت میں اشعار بھی پیش کئے ہیں، ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

مثنوی بزم عشرت کو پڑھنے کے بعد ان کی قدرت کلام اور مسلسل بیان کی ہمہ گیر صورتیں ہمارے سامنے آتی ہیں نظم میں انتہائی روانی ہے، کہیں ٹھہراؤ نہیں، نظم بیانیہ ضرور ہے، مگر بیان کے تار ایسے مسلسل اور مربوط ہیں، جو ان کی فنی صناعی کا مظہر ہیں یہ گویا مسلسل موتی کی لڑی ہے۔ وہ جوانی میں پیر بنے یا نہیں مگر سخن بے نظیر کہنے کے لائق تھے، اگر متوجہ ہوتے تو طویل تر مثنویاں تخلیق کر سکتے تھے، بیان میں صحرائی چشمے کا بہاؤ ہے اور آبشاروں کا شور جو حرف وصوت کے نغمہ وآہنگ کا مرکب بن گیا ہے، یہ ایک سیل بے اماں کی طرح رواں دواں ہے۔ ہولی کے ذکر میں دوشیزاؤں کی کیفیات کا منظر دیکھئے، اس طرح "کوئی" سے شروع ہونے والے اٹھارہ اشعار مسلسل نظم کئے ہیں ایسے ہی باغ کے بیان میں بارہ اشعار ادھر کے اشاروں سے شروع ہوتے ہیں۔

ادھر نرگس کھڑی دیدے دکھاوے
ادھر نرگس نین انکھیاں لڑاوے

ادھر ظالم بنا گلومیں اپنے کا کل
ادھر بل پیچ کھاوے اپنے سنبل

ادھر بلبل کہے اپنی کہانی
ادھر ہے داستان عاشقانی
ادھر بلبل کرے ہے آہ و نالہ
ادھر عشاق پیتے ہیں پیالہ

ادھر لالہ کا گل پیالہ بناوے
ادھر مجھ کو پیا پیالہ پلادے

تحقیق کے اعتبار سے پروفیسر عبدالحق کی کتاب حال کی یافت اور ماضی کی دریافت کا مجموعہ ہے اور اُردو کے محققین نے جو کچھ لکھا ہے اسے انھوں نے بحث و تمحیص کا موضوع بنایا ہے اسے گہرائی اور گیرائی کے ساتھ جانچا اور پرکھا ہے، ہر بات کو دلیل کی میزان پر تولا ہے، کسی محقق کی شہرت کی وجہ سے اس کی بات کو نہ حرف آخر تسلیم کیا ہے نہ قول فیصل۔ کتاب کی خصوصیت براہین قاطعہ کی کشتی ہے، جو حسن زبان کے آب رواں میں چلتی ہے، حسن انشاء اور جوہر تحقیق کے اعتبار سے پوری کتاب عقد ثریا کی حیثیت رکھتی ہے۔ مصنف کے پاس دیوان حاتم کا ایک قدیم نسخہ ہے، انھوں نے اس کا انتخاب طویل بصیرت افروز اور محققانہ مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، اس نسخہ میں ۵۵ غزلیں ایسی ہیں جو کسی اور مخطوطہ میں موجود نہیں ہیں، ان تمام غزلوں کو جوں کا توں اس مجموعہ میں شامل کرلیا گیا ہے، مجموعی طور پر غزلوں کی تعداد ۱۳۴ ہے۔ دیوانِ حاتم کا مطالعہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ یہی وہ عہد ہے جس میں اُردو فارسی کی جگہ لے رہی تھی، نہ صرف عوام بلکہ خواص اور قلعہ معلّٰی کے اربابِ سخن اور اہل ذوق اس کی زلف گرہ گیر کے اسیر اور اس کی ناز و ادا کے نخچیر ہورہے تھے اُردو زبان میں شاعری اور تصنیف و تالیف کا آغاز ہورہا تھا، فارسی کے تخت اقتدار پر اُردو قابض ہورہی تھی، زبان کی تنگ دامانی وسعت اور ہمہ دانی سے تبدیل ہورہی تھی۔ جس کی

حیثیت کبھی پاپوش کی تھی، اس میں آفتاب کی کرن لگ رہی تھی جو ذرہ بے مقدار تھا، وہ ہمدوش ثریا بن رہا تھا، حاتم کا کلام پڑھ کر اس عہد کا سیاسی اور سماجی مرقع نظروں کی سامنے آجاتا ہے اور چلتی پھرتی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ''شہر آشوب'' خاص طور پر اس عہد کی تصویر ہے قدروں کی پامالی اور غیر ملکی طاقتوں کا قبضہ اور پھر غم دل سے دامن بچانے کے لئے یار طرحدار کا سہارا، اسی کے ساتھ وہ فن کی مشاقگی اور اس عہد میں زبان کی آراستگی کا نمونہ ہے۔ پروفیسر عبدالحق نے اپنی اس تصنیف لطیف کے ذریعہ اُردو ادب کی بایں طور عظیم الشان خدمت انجام دی ہے کہ اُردو کے قدیم ترین دور کا ایک معتبر شعری متن اپنے محققانہ مقدمہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆
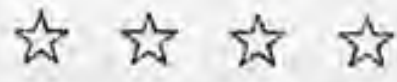
موجِ شمیم

شمیم جے پوری کا نام شعر و شاعری کی دنیا میں معروف نام ہے، اکیسویں صدی کے شروع ہونے سے پہلے ۱۹۹۹ء میں ان کی وفات ہوگئی، ابھی ان کو دیکھنے والے اور جگر کے انداز میں ان کی شوق آفریں غزلیں وجد آفرین ترنم سے سننے والے بہت ملیں گے۔ موجِ شمیم ان کا آخری دیوان ہے جسے پروفیسر ظفر احمد نظامی نے مرتب کیا ہے، پروفیسر ظفر احمد نظامی نے شروع میں ان کے سراپا کا نقشہ کھینچا ہے، منظر نگاری اور نثری پیکر تراشی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

چہرا مثل کتاب، آنکھوں پر شیشوں کا حجاب، چوڑی پیشانی ناموری کی کہانی، سر پر حنائی بال، ذہن محو خواب و خیال، خوش سیرت و خوش صورت عجز و انکساری کی مورت، یہ تھے شاعر با کمال ترنم میں بے مثال، صاحب 'شمیم' و 'شمیل گل' ریاض شاعری کا بلبل، بادہ نو میں شراب نوری یعنی فہیم الحسن شمیم جے پوری۔

شمیم جے پوری دبستانِ جگر کے غزل گو شاعر ہیں، غزل کامیاب اس وقت ہوتی ہے جب اس کی زیریں سطح پر حزن و ملال کی ایک لہر اور زخمی غزال کی آنکھوں کا قطرہ گہر موجود ہو بقول شاعر:

یہ غزل کی انجمن ہے کوئی اہتمام کرلو
کسی غم کو مئے بنالو کسی دل کو جام کرلو.

شمیم نے بھی غم محبت کو گلے لگایا ہے، جگر نے کہا تھا:

اب ان کا کیا بھروسہ وہ آئیں یا نہ آئیں
آ اے غم محبت تجھ کو گلے لگائیں

شمیم جے پوری کہتے ہیں:

اک تعلق تو ان کے غم سے ہے
بے خودی ہے تو بے خودی ہی سہی

دیدہ و دل کی تیرگی نہ گئی
ہجر کی رات چاندنی ہی سہی

جگر مرادآبادی دنیائے غزل کے کوہ کن بھی ہیں ناوک فگن بھی ہیں، ان کی شاعری حسن و عشق کے معاملات میں ڈوبی ہوئی شاعری ہے اس شاعری میں وارفتگی اور سرشاری ہے، وفور شوق ہے، بے ساختگی ہے، برجستگی ہے، حسن ادا ہے، اُسلوب کا بانکپن بھی ہے، وہ تیکھا پن ہے جو شعر کو سنوار دیتا ہے، جگر کہتے ہیں:

ہم پہ نازل ہوا صحیفہ عشق
صاحبان کتاب ہیں ہم لوگ

آنکھ ملتے ہی ہوش کھو بیٹھے
کتنے حاضر جواب ہیں ہم لوگ

شمیم جے پوری نے عاشقانہ غزلوں میں جگر مرادآبادی سے اکتساب فن کا اعتراف کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

عجیب حال ہوا ان سے جب نگاہ ملی
کہ مل کے آئی تو دنیائے دل تباہ ملی

جب اس نگاہ سے پہلے پہل نگاہ ملی
پھر اس کے بعد نہ اب تک کہیں پناہ ملی
خدا گواہ کہ میخوانہ جگر سے مجھے
شراب عشق ملی اور بے پناہ ملی

جگر کی مشہور غزل ہے، جس کا شعر ہے:

پیتا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال
در پردہ چشم یار کی شہ پاکے پی گیا

زاہد یہ میری شوخی رندانہ دیکھنا
رحمت کو باتوں باتوں میں بہلا کے پی گیا

پوری غزل اسی رنگ میں ہے، توبہ کو توڑ تاڑ کے تھرا کے پی گیا وغیرہ، تقریباً یہ سارے مضامین شمیم نے بھی استعمال کئے ہیں، ان کی غزل کے چند شعر یہ ہیں:

پیتے ہیں اور تیرے کرم پر نگاہ ہے
کس درجہ میکشوں کو شعور گناہ ہے

ساقی ہے خم ہے بادہ ہے ابر سیاہ ہے
ایسے میں اب گناہ نہ کرنا گناہ ہے

توبہ کے بعد سوچ رہا ہوں یہ بار بار
پینا گناہ تھا کہ نہ پینا گناہ ہے

میخانۂ جگر کی بادہ کشی اور مئے کشی کبھی اتنی نمایاں نظر آتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ چراغ سے چراغ جل رہا ہے، جگر کہتے ہیں:

دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد
اب کچھ بھی نہیں ہم کو محبت کے سوا یاد

حضرت شمیم جے پوری کہتے ہیں:

شکوہ ہے کسی کا نہ گلہ کچھ بھی نہیں ہے
اب دل میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

شمیم نے جگر اور تسکین دونوں سے استفادہ کا اعتراف کیا ہے؛ لیکن یہ واقعہ ہے کہ شمیم کی شاعری میں ان کا اپنا ذاتی رنگ اور اپنا داخلی آہنگ بھی شامل ہے، استفادہ تو ہر بڑا شاعر کسی بڑے شاعر سے کرلیتا ہے؛ لیکن شاعری بڑی اس وقت ہوتی ہے جب اس میں شاعر کا اپنا خون جگر اور خود اس کا زاویہ نظر بھی اپنے وجود کا احساس دلائے، اس کی شاعری کے لہجہ میں صرف روایت نہ ہو؛ بلکہ تازگی اور طرفگی بھی ہو، جدت بھی ہو اور ندرت بھی ہو۔ شمیم جے پوری کا دامن ان سب سے خالی نہیں، اس میں مضمون کی باریکیاں بھی ہیں تخیل کی جولانیاں بھی ہیں، سکوت گل بھی ہے، نالہ بلبل بھی ہے، صوفیانہ رنگ بھی ان کے کلام میں ملے گا سوقیانہ رنگ کہیں نہیں ملے گا، وصل و ہجر کا اظہار ملے گا؛ لیکن ہر جگہ ادب او روقار ملے گا، عریانیت اور فحاشی سے اجتناب ہے شرافت کا حجاب ہے۔ انھوں نے غزل کو کبھی چشم غزال کی طرح غم آلودہ بھی کردیا ہے اور کبھی میر کی یادوں کے چراغ روشن

کر دیئے ہیں اور کبھی نئے ساز اور نئے آواز میں باتیں کی ہیں، پرانی شراب کو نئے ساغر میں بھی پیش کیا ہے، روایت کی پابندی کرتے ہوئے نئے خیالات بھی پیش کیے ہیں؛ لیکن ہر جگہ ان کا لہجہ دلنشیں ہے۔

اب حوصلہ ترک ملاقات کرے ہے
اتنا سا دل اور اتنی بڑی بات کرے ہے

اہل چمن نے جشن بہاراں کے نام سے
وہ داستاں سنائی کہ دامن بھگو دیئے

غزل اُردو زبان کی آبرو ہے اور عصر حاضر میں جگر، حسرت، فانی اور اصغر گونڈوی سے غزل کی آبرو رہی ہے، یہ غزل کے اساطین اربعہ کہلاتے تھے؛ لیکن طرفہ تماشہ یہ ہوا کہ میر تقی میر کے بعد غالب کا اور غالب کے بعد اقبال کا اور اقبال کے بعد فیض احمد فیض کا اور اس کے بعد احمد فراز کا نام لیا جانے لگا اور یاروں نے بیچ کی تمام کڑیاں حذف کر دیں۔ فیض سے پہلے بھی بہت سے شعراء ہیں جنھوں اردو شاعری کو تاب و توانائی عطا کی، ستم ظریفی یہ ہوئی کہ غزل ہی کی اہمیت کا انکار کیا جانے لگا اور اس پر تنقید کی زبان دراز ہونے لگی، کلیم الدین احمد نے غزل کو نیم وحشی صنف سخن قرار دیا، گورکھپور کے قلعہ سے جگر مراد آبادی پر تابڑ توڑ حملے ہوئے، مجنون گورکھپوری نے کمان سنبھالی، فراق گورکھپوری نے بھی ساتھ دیا، گورکھپور کی ہم نوائی فتح پور کر چکا تھا، نیاز فتح پوری جگر کی مخالفت میں لکھ چکے تھے۔ ظاہر ہے جب غزل کا انکار ہونے لگا اور غزل کو گردن زنی قرار دیا جانے لگا اور جگر کے کلام پر خط تنسیخ پھیرا جانے لگا تو پھر شمیم جے پوری کو کون پوچھتا جن کا کلام "کلام جگر کی نسیم و شمیم سے معطر ہے" اور انھوں نے جگر کے بزم تغزل کے چراغ کو اپنی انفرادیت کے ساتھ روشن کر رکھا تھا اُردو تنقید کے دامن پر ایسے ایسے بہت سے قتل ناحق کے خون کی چھینٹیں ہیں، آج بھی وہ انصاف پسند نگاہیں جو اُردو غزل کے معماروں کا احترام کرتی ہیں، شمیم جے پوری کے کلام کو ضرور پسند کریں گی اور پڑھنے کے بعد کلمات تحسین سے نوازیں گی۔ چنانچہ آل احمد سرور نے بھی ریاض شاعری میں اس مجموعہ کا اس طرح خیر مقدم کیا جیسے کوئی صبا کا خیر مقدم کرتا ہے، بات ختم کرنے سے پہلے یہ کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں کہ ہر شریف انسان کی طرح جگر مراد آبادی اور شمیم جے پوری دونوں اندر سے ہی مذہبی انسان تھے اور روحانیت کی قدروں کے دلدادہ تھے۔ روحانیت

اور بلند مذہبی اقدار کی حمایت شرافت نفس کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے، مجموعہ کلام ''موجِ شمیم'' کی ابتداء چند نعتوں سے ہوتی ہے، یہاں جگر کی فارسی نعت کے چند اشعار یاد آ رہے ہیں:

اے اسم تو حرز جان عشاق — اے ذکر تو نور قلب و دیدہ
یک گوشہ چشم التفاتے — ہر امتیاں غم رسیدہ
استادہ بہ پیش بارگاہ ست — پیرے برخ آستیں کشیدہ
شاید جگر حزین ہمیں ست — از بار گنہ کمر خمیدہ

شمیم جے پوری کی نعتوں میں وہی سوز و گداز ہے جو ان کے آئیڈیل شاعر جگر مراد آبادی کی مذکورہ فارسی نعت میں موجود ہے، شمیم کہتے ہیں:

میں اسی کشمکش میں خود کو سمجھاؤں تو کس منہ سے
نہ آؤں میں تو کس دل سے اگر آؤں تو کس منہ سے

یہ کس منہ سے کہوں کہ آپ کا ہی نام لیوا ہوں
گدائے آستاں بن کے میں آؤں تو کس منہ سے

مرا دامن تو داغوں سے بھرا ہے یا رسول اللہ (ﷺ)
مرے آقا تمہارے سامنے آؤں تو کس منہ سے

کتاب کا سرورق طباعت اور کاغذ سب کتاب کے معنوی معیار کے مطابق ہے، اُمید ہے ہر صاحب ذوق اور ہر دست شوق تک موجِ شمیم کی رسائی ہوگی۔

☆ ☆ ☆ ☆

عربی زبان وادب کی محفل

فارسی کے معروف شاعر عرفی کا شعر ہے:

مدار صحبت ما بر حدیث زیر لبی است
کہ اہل بزم عوام اند وگفتگو عربی است

لیکن حیدرآباد کی گہربار اور گلبار سرزمین نے صرف اُردو کے نہیں عربی زبان وادب کے اتنے پھول کھلائے اور اتنے چمن زار سجائے کہ ان کا تذکرہ کرنے کو "حدیث زیر لبی است" کہنا مشکل ہے؛ کیوں کہ اس شہر میں عربی جاننے والوں کی تعداد بہت ہے۔ یہاں عربی کے سینکڑوں مدرسے ہیں، عربی زبان وادب پر اس شہر نگاراں کی نگارشات اتنی زیادہ ہیں کہ وہ مکمل اور مفصل کتاب کا موضوع ہیں، یعنی اس بحر بے کراں کے لئے ایک سفینہ درکار ہے اور سفینہ کے لئے ایک ذراسی جوئے کم آب یعنی اخبار کی تحریر متحمل نہیں ہوسکتی ہے۔ ہم آج کی بزم میں صرف ان چند کتابوں کا تذکرہ کریں گے، جن کا تعلق عربی زبان سے یا ان کی تدریس سے ہے اور جن کے مصنفین حیدرآباد کے ہیں یا حیدرآباد میں ہیں یا حیدرآباد میں رہ کر انھوں نے عربی زبان سے متعلق کتابیں لکھی ہیں اور حالیہ عرصہ میں وہ عربی زبان کے عروس فن کی آراستگی اور زلف ادب کی مشاطگی میں مصروف رہے ہیں۔

حیدرآباد شہر میں زبانوں کی تدریس کی مرکزی حکومت کی ایک یونیورسٹی ہے، جسے مختصراً سیفل کہتے ہیں اور اب اس کا نیا نام انگلش اینڈ فارن لینگویجز یونیورسٹی ہے۔ انگریزی اور بہت سی بیرونی زبانوں کے درمیان یہاں عربی زبان کی تدریس وتقدیس اور تصنیف وتالیف ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ یہاں کے سابق پروفیسر عبدالحلیم ندوی کی اُردو کتاب تاریخ ادب عربی پورے ہندوستان میں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے، یہاں کی سابق پروفیسر مسز عصمت مہدی نے جدید عربی شاعری پر انگریزی میں ایک وقیع کتاب لکھی ہے، انھوں نے عربی زبان کی ایک ریڈر بھی تیار کی ہے، یہاں کے سابق استاد پروفیسر ضیاء الحسن ندوی نے مہجری ادب یعنی امریکہ کے چمنستان میں

کھلتے ہوئے عربی گلابوں پر ایک کتاب لکھی جس کا خوبصورت نام ہے'' عربی ادب دیارِ غیر میں''
انھوں نے ان گلابوں کے حسن کو قیدِ تحریر میں اور لفظوں کی زنجیر میں اسیر کردیا، ان کی زبان بہت
شگفتہ تھی، انھیں لفظوں میں رنگ بھرنے اور جملوں کو خوش آہنگ بنانے کا ہنر آتا تھا۔ پھر اسی سیفل
کے سابق استاد اور ڈین پروفیسر معین الدین اعظمی نے عربی زبان کی خدمت میں نمایاں امتیاز
حاصل کیا اور اتنی اچھی کتابیں عربی انگریزی کے ترجمہ کے فن پر اور انگریزی زبان کے قواعد پر
انگریزی میں لکھ ڈالیں کہ عربی انگریزی ترجمہ کا طالب علم اور انگریزی زبان کے ذریعہ عربی نحو کو
سیکھنے والا شخص ان کتابوں سے صرف نظر نہیں کرسکتا۔ ترجمہ کا فن تخلیق کے فن سے کم نازک اور دشوار
نہیں، اس کے لئے دو زبانوں میں مہارت درکار ہوتی ہے، اس کے لئے مجمع البحرین اور جامع
النورین بننا پڑتا ہے، علم اور تحقیق کی دنیا میں حرف آخر اور قول فیصل تو کوئی چیز نہیں ہے؛ لیکن یہ سچ
ہے کہ انگریزی عربی ترجمہ کے فن کے بحر بے کراں کی شناوری کرنے والے کو پروفیسر اعظمی کی منہج
الترجمہ کا سہارا لینا ہوگا اور انگریزی جاننے والے جب اس زبان کے ذریعہ عربی نحو کو سمجھنے کی کوشش
کریں گے تو پروفیسر اعظمی کی کتاب النحو العربی الاساسی (Essential Arabic Syntex)
کو اپنا معلم اور اپنا رہنما بنانا ہوگا۔ یہ دونوں کتابیں الہدیٰ بک اسٹاک کالی کٹ نے شائع کی ہیں؛
لیکن باشندگان حیدرآباد جو انگریزی کے ذریعہ عربی زبان کی تحصیل کا ارادہ رکھتے ہیں، وہ خود
پروفیسر اعظمی سے بھی رابطہ قائم کرسکتے ہیں کہ وہ قاہرہ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ اور آل انڈیا ریڈیو میں
عربی زبان کے مترجم رہ چکے ہیں اور عربی زبان کی تعلیم و تدریس کا طویل تجربہ انھیں حاصل ہے اور
عربی زبان کی تدریس پر انھیں یہ کہنے کا حق ہے کہ'' مستند ہے میرا فرمایا ہوا'' اُمید ہے کہ ان کی یہ
دونوں کتابیں اہل ذوق کے حلقہ میں مقبول ہوں گی۔ حیدرآباد کے مکتبوں اور کتب خانوں میں ان
دونوں کتابوں کا رہنا ضروری ہے اور ان کے ذمہ داروں کو ناشر سے رابطہ قائم کرنا چاہئے، مصنف
کتاب نے اپنا ہنر پیرہن قرطاس میں سجا کر اور جنس گراں مایہ بنا کر پیش کردیا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ
اس متاع ہنر کے خریداروں کے دامان شوق میں کتنی وسعت ہے؟

سیفل کے اساتذہ کی عربی زبان و ادب کی خدمات کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے، یہاں
پروفیسر محمد اقبال حسین ندوی بھی ہیں، جو اس وقت صدر شعبہ بھی ہیں، صرف پی ایچ ڈی نہیں بلکہ ڈی
لٹ بھی ہیں، ان کی تازہ بہ تازہ عربی کتاب'' مناہج الدراسات العربیۃ فی الہند'' کے نام سے شائع
ہوئی ہے۔ کتاب عربی زبان کی تدریس اور ہندوستان میں اس کے نصابِ تعلیم کی تاریخ سے متعلق

ہے ناظم ندوۃ العلماء مولانا محمد رابع حسنی ندوی اور پروفیسر محمد اجتباء ندوی کے مقدمہ اور پیش لفظ نے کتاب کو وقیع اور معتبر بنادیا ہے، کتاب کی عربی نثر بھی صاف اور شگفتہ ہے، کتاب مصنف سے حاصل کی جاسکتی ہے؛ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہر کتاب کو ''سرمہ مفت نظر'' سمجھ لینے کی عادت کوئی صحت مند علامت نہیں ہے۔ سیفل کے اساتذہ میں ڈاکٹر سید جہانگیر عربی زبان کے صحافی ہیں، عربی زبان کی تدریس کا اچھا تجربہ رکھتے ہیں اور اُردو میں اس موضوع پر ان کی کتاب ''انوار العربیۃ'' بھی ہے، نام خدا شعر موزوں کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے عربی قصائد کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے، عربی میں مافی الضمیر کے اظہار پر ان کو قدرت حاصل ہے، اہم ترین بات یہ کہ وہ حرا کے نام سے عربی اخبار بھی نکالتے ہیں۔ حیدرآباد یا ہندوستان میں عربی صحافت کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس کا ذکر بھی آئے گا، اس کے ہر شمارہ کا معیار پہلے سے کچھ بہتر ہوتا ہے اور زبان پر یہ مصرعہ آتا ہے'' نقاش نقش ثانی بہتر کند زاول'' اسے خالص عربی جریدہ بنانا چاہئے، اس جریدہ میں اُردو صفحات کا شامل کرنا مناسب نہیں اور یہ اس لئے بھی کہ اس میں زبان کی غلطیاں بہت ہوتی ہیں۔ غلطیاں تو عربی میں بھی ہوتی ہیں؛ لیکن عربی میں جریدہ کا اجراء فائدہ سے خالی نہیں، اس جریدہ میں اُردو مضامین نہ ہوں اور اعیانِ شہر کی مخالفت میں تحریریں نہ شائع ہوں تو مستقبل میں اس سے اچھی اُمید رکھی جاسکتی ہے۔

اب ایک اور اہم عربی کتاب کا تذکرہ آتا ہے جس کے چار مصنفین میں تین کا تعلق حیدرآباد سے ہے، کتاب کا نام ہے'' اساس اللغۃ العربیۃ'' یہ کتاب تین جلدوں میں ہے، کتاب کے ایک مصنف مولانا نعمان الدین ندوی ہیں، جو دار العلوم حیدرآباد میں شعبہ عربی کے سربراہ اور عربی زبان کے علمی ادبی اور فکری میگزین ''الصحوۃ الاسلامیۃ'' کے مدیر خوش تحریر ہیں۔ دوسرے سید عبدالماجد غوری ہیں، جو ایک درجن سے زیادہ عربی کتابوں کے مصنف ہیں اور جن کی کتابیں دمشق سے شائع ہو چکی ہیں۔ کتاب کے تیسرے مصنف سیفل کے سینئر پرفیسر ہیں اور چوتھے ''الرائد'' کے ایڈیٹر ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم مولانا واضح حسنی ندوی ہیں۔ کتاب مشہور مصنف صاحب قلم ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کے زیر نگرانی تیار کی گئی ہے، عربی زبان کے ذریعہ عربی زبان کی تعلیم کے لئے جتنی ریڈریں تیار ہوئی ہیں، ان میں اس کو امتیاز خاص حاصل ہے، کتاب تو نہایت خوش نما دیدہ زیب اور نظر فریب انداز میں شام میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی ہے؛ لیکن ظاہر ہے کہ ہندوستان والوں کے لئے باہر سے اس کتاب کو منگانا آسان نہ تھا؛ اس لئے مکتبہ ندویہ ندوۃ العلماء لکھنو نے اس کا ہندوستانی ایڈیشن شائع کر کے اربابِ ذوق اور اہل مدارس کے لئے اس کا حصول آسان کردیا

ہے۔اس کتاب کے تینوں حصے کو اب اسلامک بک فاؤنڈیشن دہلی نے شائع کردیا ہے،عربی مدارس میں ابتدائی تین درجوں میں پڑھانے اور نصاب میں داخل کرنے کے لئے اور طلبہ میں عربی زبان کے ذوق کی نشو ونما کے لئے اس سے بہتر اور مفید تر کوئی دوسری کتاب نہیں۔اس سے پہلے اس طرز کی کتاب عبدالرحیم کی لکھی ہوئی ''دروس اللغۃ العربیۃ'' کے نام سے شائع ہوچکی ہے، یہ کتاب عربی زبان کے حلقوں میں معروف ہے، یہ دوسری کتاب ''اساس اللغۃ العربیۃ'' (تین جلدوں میں) اسی انداز کی کتاب ہے؛ لیکن اس میں عربی جملوں کی ترکیب میں عربیت کے ذوق کی زیادہ رعایت ہے۔ اگر طلبہ میں عربی زبان کا بہتر ذوق اور ادب کا صحیح مذاق پیدا کرنا ہے تو عربی مدارس میں اس کتاب کو داخل نصاب کرنا چاہئے۔

اہل حیدرآباد کی عربی زبان وادب اور اس کی تدریس سے متعلق تصنیفات کا احاطہ مشکل ہے، راقم السطور نے قدیم کتابوں کو نہیں؛ بلکہ صرف جدید تصنیفات کو اور دینی یا تحقیقی کتابوں کو نہیں؛ بلکہ صرف عربی زبان وادب یا اس کی تدریس سے متعلق کتابوں کو پیش نظر رکھا ہے، اس شہر حیدرآباد کی تمام عربی کتابوں کا تذکرہ موضوع سے خارج ہے۔اس سلسلہ گہر کی ایک لڑی نحو کے موضوع پر اُردو کتاب تدریب النحو ہے، جس کے مصنف کا نام سید ظفر احمد جمیل حسامی ہے، ان کی کتاب ''تدریب الصرف'' بھی منظر عام پر آگئی ہے، کتاب مرکز الدراسات الاسلامیۃ قاضی پورہ حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے، دو ہزار سے زائد سبق آموز عام فہم مثالوں پر مشتمل اس کتاب نے نحو کی مشکلات کو آسان بنادیا ہے، جو لوگ عربی مدارس میں نحو میں کتاب ''ہدایۃ النحو'' پڑھتے ہیں، ان کے لئے یہ کتاب بے حد مفید، مشکل کشا اور نحو کی راہ پر چلنے کے لئے بہترین رہنما اور راہبر ثابت ہوگی۔ اہل حیدرآباد کی خدمات میں میسکو کے تیار کردہ عربی نصاب کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کہ یہ بھی ایک وقیع کام ہے، ،جس کی بڑی افادیت ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ میں ڈاکٹر بدیع الدین صابری کی کتاب ''التصریف الواضح'' بھی صرف کی توضیح وتمرین کے موضوع پر اچھی کتاب ہے، حیدرآباد کے دائرۃ المعارف کے ایک مولانا عمران اعظمی ہیں، جن کی عربی زبان پر دست رس بہت اچھی ہے، بہت اچھے مترجم ہیں، برجستہ اور قلم برداشتہ فی البدیہ عربی اشعار کہتے ہیں، محبوب کی زلف دراز کی طرح کئی سو شعروں کا قصیدہ کہہ لینا ان کے لئے آسان ہے، قوافی ہاتھ باندھے ہوئے ان کے سامنے کھڑے رہتے ہیں۔زود نویسی اور بسیار نگاری کے کمال کی وجہ سے انھیں آیۃ من آیات اللہ کہا جاسکتا ہے، میرا ذاتی خیال ہے کہ ہندوستان میں عربی میں وقیع اور علمی کتابیں تو بہت لکھی گئی ہیں؛ لیکن اس زبان میں

بڑی شاعری آج تک نہیں کی گئی۔ شعر میں جب تک تخیل کی وہ رعنائی نہ ہو جو پورے وجود کو وجد اور اہتزاز سے دو چار نہ کردے اسے شعر نہیں کہا جاسکتا ہے، توضیح کے لئے میں کہوں گا کہ اُردو کے شاعر حالی کو صرف ان کے چند اشعار کی وجہ سے شاعر تسلیم کرلیا گیا ہے، ان کا شعر ہے:

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

اگر ان کی جھولی میں اس طرح کے کچھ اشعار نہیں ہوتے تو مسدس حالی کے باوجود بہت سے شعراء ان کے سر پر واعظ خوش نوا اور موزوں صدا کا عمامہ تو باندھ دیتے؛ لیکن شاعر تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، شاعری کا صحیح مفہوم سامنے ہو تو کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں اونچے معیار کی عربی شاعری نہیں کی گئی۔

مجالس قانون ساز میں خواتین کی نشستوں کی تخصیص کا مسئلہ بہت عرصہ سے گرم رہا ہے اور اب تک اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوسکا ہے، بقول اقبال ''رہا یہ مسئلہ زن وہیں کا وہیں'' لیکن عربی زبان و ادب کی دنیا میں حیدر آباد میں گرامی قدر خواتین نے اپنی پوزیشن محفوظ کرلی ہے۔ سیفل کی سابق پروفیسر عصمت مہدی اور ان کی خدمات کا تذکرہ اوپر آچکا ہے، عثمانیہ یونیورسٹی کی پروفیسر قمر النساء جن کی عربی کتاب فضل حق خیر آبادی پر ہے اور ڈاکٹر مہ جبین اختر جن کی کتاب امین ریحانی اور شیخ محمد عبدہ کے افکار پر ہے لائق تذکرہ ہیں۔ دونوں کے عربی مضامین عربی رسالوں میں شائع ہوتے ہیں، قمر النساء حیدر آباد میں خواتین کے حلقوں میں آسمان ادب کی مہر منور اور مہ جبین ادب کی پیشانی کا جھومر ہیں۔ یہاں ایک عروس زبان و ادب کا تذکرہ کرنا بھی مناسب ہوگا، جن کا نام ہے، عزت عروسہ، جن کی کاوش قلم سے قرآن کی زبان سکھانے والی انگریزی کتاب (Learn Quran, Easy Way) کے نام سے جلد منظر عام پر آنے والی اور مقبولیت حاصل کرنے والی ہے۔ ڈاکٹر مہ جبین اختر حیدر آباد سے شائع ہونے والے عربی سہ ماہی مجلّہ اقلام واعدہ کی نائب مدیر بھی ہیں، یہ مجلّہ عربی اساتذہ کی انجمن کی جانب سے شائع ہوتا ہے، یہ اپنی نوعیت کا منفرد مجلّہ ہے ''اقلام واعدہ'' ہندوستانی زبانوں کے ادب کو عربی زبان میں پیش کرنے کے مقصد سے نکالا گیا ہے، رسالہ کے چیف ایڈیٹر اور انجمن کے صدر اس کتاب کے مصنف ہیں اور وہ عربک اینڈ فارن لینگویجز یونیورسٹی حیدر آباد میں پروفیسر ہیں۔

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی میں عربی کا شعبہ ابھی نومولود ہے؛ لیکن یہ شعبہ جن

اساتذہ پر مشتمل ہے وہ اپنی عربی کی صلاحیت اور لیاقت کے لحاظ سے ہندوستان کی کسی یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے اساتذہ سے کم نہیں ہیں۔ صدر شعبہ ڈاکٹر عبد المعز کی عربی زبان دانی اور عربی لہجہ دونوں بہتر بھی ہیں، خوش تر بھی ہیں اور معتبر بھی ہیں؛ لیکن ابھی ان اساتذہ کو اپنی کتابوں کے ذریعہ حیدرآباد کی سرزمین سے اپنی علمی فکری اور ادبی صلاحیت کی سند حاصل کرنا باقی ہے، ابھی تک کسی کی کوئی وقیع کتاب سامنے نہیں آئی ہے :

اہل عالم کی نظر میں معتبر ہوتا نہیں
مرد جب تک صاحب کلک و ہنر ہوتا نہیں

اب حیدرآباد کے ایک صاحب کلک و ہنر اور صاحب طرز ادیب سے ملئے، یہ ہیں محمد نعمان الدین ندوی، دارالعلوم حیدرآباد کے استاد اور عالمی فکری مسائل کے نقاد، عربی مجلہ ''الصحوۃ الاسلامیۃ'' کے ایڈیٹر اور فکری رہنما اور رہبر۔ اہل زبان کی طرح عربی لکھنے والے؛ بلکہ بہت سے اہل زبان سے بہتر لکھنے والے جن کے دست ہنر مند اور فکر ارجمند سے کئی لائق مطالعہ کتابیں نکل چکی ہیں، جن کی ایک کتاب خصائص اللغۃ العربیۃ کے نام سے دمشق سے شائع ہو چکی ہے۔ کتاب کو عربی کے حلقوں میں بنظر استحسان دیکھا گیا، عربی زبان کی خصوصیات پر عربی زبان میں یہ ایک بیش قیمت کتاب ہے، اگر کسی کو عربی زبان کی عظمت اپنے دل میں اور غیرت اپنے ضمیر میں اتارنی ہو تو اسے اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔ بساط ادب پر ان کی تازہ بہ تازہ کتاب ''کتاب العربیۃ والادب'' آئی ہے، کتاب کے تمام مقالات عربی زبان میں عربی زبان و ادب سے متعلق ہیں، عربی مدارس میں یہ کتاب طلبہ کے مطالعہ کی فہرست میں ہونی چاہئے، عربی لکھنا اور خوبصورت ادبی زبان میں لکھنا کوئی آسان بات نہیں ادب ہیرے تراشنے کا فن ہے، یہ لفظوں سے تاج محل بنانے کا ہنر ہے، یہ اس سلیقہ کا نام ہے جس سے جملوں کو معطر اور مضمون کو منور کیا جاتا ہے۔

ذکر زیادہ تر عصری دانش گاہوں سے وابستہ لوگوں کا اور ان کی کتابوں کا تھا، دینی علمی مدارس میں بھی عربی زبان و ادب کے چند شعراء نثر نگار اور خدمت گار موجود ہیں، سب کے ناموں کا استقصاء مشکل ہے۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار بادہ ناخوردہ در رگ تاک است

☆ ☆ ☆ ☆

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
(خواجہ شوق کا نعتیہ کلام)

ذوق وشوق، دردِ دل، سوز دروں اور دل گداختگی انسان کی وہ صفت ہے جو اسے فرشتوں سے ممیز اور ممتاز کرتی ہے، فرشتے طاعت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور وہ ہر وقت مصروف تسبیح و اطاعت رہتے ہیں، ان کی تسبیح خوانی سوز سے خالی ہوتی ہے۔ لیکن انسان جب دل سے خدا کی حمد کرتا ہے یا جب دل سے پیغمبر خدا کی نعت کہتا ہے تو اس میں اس کے تمام احساسات وجذبات شامل ہو جاتے ہیں۔ اس کے قلم کی حرکت اس کے قلب کے ارتعاش کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے، اس کی آنکھوں سے چشمہ انفعال جاری ہو جاتا ہے، یہ خون دل ہوتا ہے، جو کبھی آنکھ کے آنسو بن کر ٹپکتا ہے اور کبھی روشنائی بن کر صفحہ قرطاس پر پھیل جاتا ہے۔

صدق دل سے پیغمبر خدا رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت خوانی کے وقت دل کی دھڑکن کیوں بڑھ جاتی ہے، سوز دروں کیوں فزوں ہو جاتا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام انسانی گروہ میں اور پوری تاریخ میں انسانیت پر سب سے زیادہ احسان پیغمبروں اور رسولوں کا رہا ہے اور پیغمبروں اور رسولوں میں بھی انسانیت کے سب سے بڑے محسن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہوئے ہیں، آپ ﷺ سے بڑھ کر مکارم اخلاق کا پیکر اور کوئی دوسرا نہیں ہوا، ظاہری اور باطنی ہر اعتبار سے آپ ﷺ مجسم خوبی ومحبوبی تھے۔ یہ احساس انسان کے جذبۂ محبت وسپاس کو جگانے کے لئے کافی ہے۔ لیکن ایک شاعر کے اندر حسن کی حس زیادہ پائی جاتی ہے، ایک شاعر کو شاعر اسی لئے کہتے ہیں کہ شعور کی قوت اس کے اندر دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے، قدرت کاملہ احساس کی فراوانی سے اسے نوازتی ہے۔ شاعر ہونے کی وجہ سے شعور کی شدت اس میں پائی جاتی ہے؛ لیکن شاعر ہونے کے لئے صرف شعور کی حدت وشدت کافی نہیں ہے، تنہا شعور کی شدت تو وہ ساز دل ہے جو ابھی شرمندہ مضراب ہے، یہ ساز دل شرمندہ مضراب اس وقت ہوتا ہے جب اس شعور کو لفظوں کا شعری لباس

پہنایا جاتا ہے، شاعر کے لئے ضروری ہے کہ اسے یہ فن بھی آتا ہو۔ احساس کو لفظی جامہ پہنانے کا ہنر تو بعد کی چیز ہے اصل چیز احساس کی شدت ہے اور یہ چیز حقیقی شاعر کے اندر ضرور پائی جاتی ہے، احساس کی شدت کے بغیر شاعر شاعر نہیں ہوتا ہے، شاعر کا تعلق قبیلہ عشاق سے ہوتا ہے اور جو عشق میں کشتہ نہ ہو چکا ہو وہ شاعر نہیں ''کسے نہ کشتہ شود از قبیلہ ما نیست'' شاعر خود صاحب وجد و حال ہوتا ہے اور دوسروں کو وجد میں لانے کا ہنر اسے آتا ہے۔ انسانیت پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بے پایاں احسانات جب شاعر کو یاد آتے ہیں تو اس کا پورا وجود سپاس گذار بن جاتا ہے، اس کا قلم رقص کناں ہو جاتا ہے اس کے جذبات شعر کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں اور اسی شاعری کا نام نعت گوئی ہے۔

کوئی شخص اگر دل کا گداز رکھتا ہے اور سرمایہ شوق کا مالک ہے تو اس کی اس دولت کا مقابلہ دنیا کی کوئی دولت نہیں کرسکتی ہے مال وزر کی ریل پیل اس کے آگے کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور اگر اسے اپنے گداز قلب کو لفظوں کے واسطے سے ترسیل کا ہنر آتا ہو تو اس کی قیمت اور عظمت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ اس خرمن کائنات میں وہی ایک دانہ محبت ہے باقی سب خس و خاشاک ہے، خواجہ شوق کا نعتیہ کلام پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ترکیب اضافی کے ساتھ خواجہ اقلیم شوق بھی ہیں اور مقام شوق کی بلندیوں پر فائز ہیں اور یہ وہ مقام ہے جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا کہ ''مقام شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں'' اس لئے ان کا نعتیہ کلام مطلع انوار معلوم ہوتا ہے، جب وہ نعت کہتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کنجِ لب سے صبح طلوع ہو رہی ہے، جیسے نسیم سحر اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی چل رہی ہے جیسے چمن کے تازہ پھول عطر بیزیاں کررہے ہیں، جیسے سحاب رحمت برس رہا ہے، جیسے نور کی بارش ہو رہی ہے۔

اس مجموعہ میں منقبت اور سلام بھی شامل ہے؛ لیکن سب سے بڑا حصہ نعت کا ہے، نعت گوئی بہت مشکل کام ہے اور پل صراط پر چلنا ہے، مقام رسالت اور مقام الوہیت میں خلط ملط حق کے راستہ سے انحراف ہے، اسی کے ساتھ نعت گوئی بہت بابرکت کام ہے اور نعتیہ کلام کے مجموعہ پر کچھ لکھنا سعادت میں شریک ہونا ہے اور اپنے آپ کو گویا خوش قسمت شاعر کا ہم قسمت بنانا ہے۔ خواجہ شوق کا مقام و مرتبہ شاعری کی دنیا میں اتنا بلند ہے کہ ان کی شاعری پر اظہار خیال کے لئے ان ہی کے مرتبہ اور مقام کا آدمی چاہئے؛ لیکن جب نعتیہ کلام کے مجموعہ پر اظہارِ خیال کے لئے اس عاجز و عاصی سے کہا گیا تو اس نے بے چون و چرا یہ حکم مان لیا کہ وہ مقام شوق حاصل نہ سہی جو خواجہ شوق

کو حاصل ہے، یہ عزت کیا کم ہے کہ خواجہ شوق کے نعتیہ کلام کے مجموعہ میں اس کی تحریر بھی شامل ہوگی اور اس نعتیہ کلام کے صدقہ میں جب شاعر کے لئے مغفرت کا پروانہ عطا ہوگا تو اس نعتیہ کلام پر اظہار خیال کرنے والا اس سے محروم نہ رہے گا؛ کیوں کہ کہنے والے نے کہا ہے کہ ''میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے'' ایک حدیث قدسی میں ذکر کی مجلس کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے: ''ھذا قوم لا یشقی جلیسھم'' (یہ وہ گروہ ہے جس کا ہم نشیں بھی محروم نہیں ہے) اگر اللہ کا ذکر کرنے والوں کا ہم نشین محروم نہیں ہے تو ذکر نبی کرنے والا کا جلیس اور ہم نشیں کیسے محروم رہ سکتا ہے۔ نہ نعت کہنے والا محروم رہ سکتا ہے اور نہ نعت کا سننے والا محروم رہ سکتا ہے اور نہ نعت کے بارے میں لکھنے والا اور اظہار خیال کرنے والا محروم رہ سکتا ہے، اللہ نے آپ کے ذکر کو رفعت عطا کی ہے ''ورفعنا لک ذکرک'' زمین سے آسمان تک فرش سے عرش تک اس ذکر کی رفعت میں جو جتنا شریک ہو سکے وہ اس کے لئے باعث سعادت بھی اور باعث نجات بھی ہے۔ آخر میں ایک آخری بات، اس مجموعہ کلام کا مطالعہ کرنے والا زبان بیان اور ردیف وقوافی پر خواجہ شوق کی بے حد مضبوط گرفت پر انگشت بدنداں رہ جاتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ زبان نے لفظوں کے خزانے نعت گوئی کے لئے بطور نذرانہ پیش کردیئے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زبان و بیان کا آبگینہ تندی صہبائے شوق سے پگھلا جارہا ہے، ''آبگینہ تندی صہبا سے پگھلا جائے ہے''۔

☆ ☆ ☆ ☆

جلوۂ جاناں جاناں

غزل نیم وحشی صنف سخن سہی؛ لیکن اُردو شاعری کی آبرو اسی صنف سخن سے قائم ہے، تمام اصنافِ سخن میں اس کو جو شہرت ملی اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی اور صنف کو حاصل نہ ہوسکی؛ اس لئے مرثیہ گوشعراء تک جب مسدس چھوڑ کر سلام لکھنے بیٹھتے ہیں تو غزل کی زمین اختیار کرتے ہیں۔

جس طرح نظم گوشعراء نے اپنا میدان چھوڑ کر غزل سرائی کی ہے اسی طرح غزل گوشعراء نے نظمیں بھی کہی ہیں، جہاں قطعیت اور صراحت کی ضرورت پیش آتی ہو وہاں نظم کا میدان موزوں ہوتا ہے؛ کیوں کہ غزل کا مزاج کنایہ اور ابہام کا متقاضی ہے، نظم کے مقتضیات دوسرے ہیں اور غزل کے دوسرے، کلیم عاجز ایک غزل گوشاعر ہیں اور انھوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔

منظور ہو محفل کا گر رنگ بدل دینا
اک اچھے مغنی کو عاجز کی غزل دینا

انھوں نے جگر کے انتقال پر جو مرثیہ لکھا ہے، اس میں بھی انھوں نے غزل کا دفاع کیا ہے، ان کے زمانے میں یعنی جب ان کی شاعری کا عہدِ شباب تھا، غزل کی مخالفت بہت شدید تھی۔ کلیم الدین احمد نے غزل کو نیم وحشی صنف سخن قرار دیا تھا، ایک دوسرے نقاد عظمت اللہ خاں نے غزل کو گردن زدنی قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ گلے سے قافیہ کے پھندے کو نکالا جائے۔ ترقی پسند حلقوں سے غزل گوئی کی حوصلہ شکنی ہو رہی تھی اور ترقی پسند ادب کے ترجمان رسالوں میں غزلوں کے لئے گنجائش بہت کم رکھی گئی تھی، اس صنف غزل کی سخت جانی کے باوجود آج بھی اس پر حملے جاری ہیں، ایک ڈاکٹر سیتہ پال آنند نے ماہنامہ ''صریر'' کراچی میں اور ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی کے ۱۹۹۱ء شمارہ نمبر: ۵ میں غزل کے خلاف مضمون لکھا ہے، گویا یہ جہاد انگیزی اب بھی جاری ہے، ایک اور بزرگ عندلیب شادانی تھے، ڈھاکہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ اُردو تھے، انھوں نے اس وقت جگر کی غزل گوئی کے خلاف مضمون لکھا، جب جگر کا طوطی بول رہا تھا، جگر مرادآبادی کے انتقال پر کلیم عاجز نے مرثیہ لکھا اور غزل کی صنفِ نازک پر ان حملوں کی طرف اشارہ کیا:

جلوۂ جاناں جاناں

غزل نیم وحشی صنف سخن سہی؛ لیکن اُردو شاعری کی آبرو اسی صنف سخن سے قائم ہے، تمام اصنافِ سخن میں اس کو جو شہرت ملی اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی اور صنف کو حاصل نہ ہو سکی؛ اس لئے مرثیہ گو شعراء تک جب مسدس چھوڑ کر سلام لکھنے بیٹھتے ہیں تو غزل کی زمین اختیار کرتے ہیں۔

جس طرح نظم گو شعراء نے اپنا میدان چھوڑ کر غزل سرائی کی ہے اسی طرح غزل گو شعراء نے نظمیں بھی کہی ہیں، جہاں قطعیت اور صراحت کی ضرورت پیش آتی ہو وہاں نظم کا میدان موزوں ہوتا ہے؛ کیوں کہ غزل کا مزاج کنایہ اور ابہام کا متقاضی ہے، نظم کے مقتضیات دوسرے ہیں اور غزل کے دوسرے، کلیم عاجز ایک غزل گو شاعر ہیں اور انھوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔

منظور ہو محفل کا گر رنگ بدل دینا
اک اچھے مغنی کو عاجز کی غزل دینا

انھوں نے جگر کے انتقال پر جو مرثیہ لکھا ہے، اس میں بھی انھوں نے غزل کا دفاع کیا ہے، ان کے زمانے میں یعنی جب ان کی شاعری کا عہدِ شباب تھا، غزل کی مخالفت بہت شدید تھی۔ کلیم الدین احمد نے غزل کو نیم وحشی صنف سخن قرار دیا تھا، ایک دوسرے نقاد عظمت اللہ خاں نے غزل کو گردن زدنی قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ گلے سے قافیہ کے پھندے کو نکالا جائے۔ ترقی پسند حلقوں سے غزل گوئی کی حوصلہ شکنی ہو رہی تھی اور ترقی پسند ادب کے ترجمان رسالوں میں غزلوں کے لئے گنجائش بہت کم رکھی گئی تھی، اس صنف غزل کی سخت جانی کے باوجود آج بھی اس پر حملے جاری ہیں، ایک ڈاکٹر سیتہ پال آنند نے ماہنامہ ''صریر'' کراچی میں اور ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی کے ۱۹۹۱ء شمارہ نمبر: ۵ میں غزل کے خلاف مضمون لکھا ہے، گویا یہ جہاد انگیزی اب بھی جاری ہے، ایک اور بزرگ عندلیب شادانی تھے، ڈھاکہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ اُردو تھے، انھوں نے اس وقت جگر کی غزل گوئی کے خلاف مضمون لکھا، جب جگر کا طوطی بول رہا تھا، جگر مرادآبادی کے انتقال پر کلیم عاجز نے مرثیہ لکھا اور غزل کی صنفِ نازک پر ان حملوں کی طرف اشارہ کیا:

زانوں نہیں بیٹھے، دیوار سے یا ستون سے کبھی ٹیک نہیں لگائی، مسجد نبوی میں فرطِ ادب سے مقدس جالیوں کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھ سکے، مسجد میں داخل ہو کر با ادب روضہ سے دور صف نعالی میں جہاں جوتے رکھے جاتے ہیں، بیٹھ جاتے ہیں، ایک بار کہنے لگے کہ ''کئی دن آئے ہوئے ہو گئے سلام کے لئے روضے کے قریب حاضری کی ہمت نہیں پاتا ہوں'' میر نے کہا ہے: ''عشق بن یہ ادب نہیں آتا''
کلیم عاجز کی تمام نعتیں ان کے سوزِ نہاں کی آئینہ دار ہیں، ایک نعت کے چند اشعار یہ ہیں:

زخم کھائے ہوئے سر تا بہ قدم آئے ہیں
ہانپتے کانپتے یا شاہ اممؐ آئے ہیں

آپؐ کے سامنے جس حال سے ہم آئے ہیں
ایسے مجرم کسی دربار میں کم آئے ہیں

کھو کے بازاروں میں سب اپنا بھرم آئے ہیں
شرم کہتے ہوئے آتی ہے کہ ہم آئے ہیں
سرنگوں آئے ہیں بادیدۂ نم آئے ہیں
آبرو باختہ ، دل سوختہ ، ہم آئے ہیں

اس کے بعد ایک سلام اور بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں مناجات دیکھئے، کلیم عاجز مسجد نبوی ﷺ میں داخل ہوتے ہیں، ایک ستون سے اپنا سر لگائے ہوئے کھڑے ہوئے روتے ہیں اور یوں عرض گزار ہوتے ہیں:

نثار ٹوٹے ہوئے دل کا جام کرنے کو
کلیم آہی گیا پھر سلام کرنے کو

حضورؐ یہ بے ادب و بے شعور و بے غیرت
کرے ہے صبح گناہوں میں شام کرنے کو

مگر بنا کے بڑی ہوشیاری سے بہروپ
چلا ہے تقویٰ گذاروں میں نام کرنے کو

اب آستانے پر حاضر ہی ہوگیا تو اسے
قبول کیجئے قید دوام کرنے کو

ملازموں کو بلا کر سپرد کردیں اسے
سگِ غلامِ غلامِ غلام کرنے کو

مسلم کش فسادات ہندوستان کی پیشانی کا داغ اور ہندوستانی مسلمان اور ہر شریف انسان کے سینہ کا چراغ بنتے جارہے ہیں، ایک حساس شاعر جب مسجد نبوی میں سلام کے لئے حاضر ہوتا ہے تو وہ اپنے غموں کو نہیں بھولتا، مرادآباد میں جب عین عید کے دن نماز عید کے بعد عیدگاہ میں قتل کا بازار گرم ہوا تو کلیم عاجز نے بادصبا کے ذریعہ یہ پیغام بھیجا:

مدینہ پہنچ کر سر عام کہیو
صبا کملی والے سے پیغام کہیو
یہاں میکدہ کہتے ہیں قتل گہ کو
لہو سے بھرے جاتے ہیں جام کہیو

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
محرم کا اب عید ہے نام کہیو

یہ اشعار ان سے نہایت ادب سے
نگاہیں جھکا اور دل تھام کہیو

۱۹۷۹ء میں جب جمشید پور میں فساد ہوا اس کے بعد کلیم عاجز کو خود حاضری کا موقع ملا، اس وقت ان کے نعتیہ کلام میں ان فسادات کا عکس نظر آتا ہے:

مدینہ جب بھی گئے بس یہ کام کرکے چلے
سحر سے رونے کو بیٹھے تو شام کرکے چلے

تھا ایک ہاتھ کلیجے پہ ایک آنکھوں پر
دل و نگاہ کا برہم نظام کرکے چلے

بڑے سلیقے سے آنکھوں نے ترجمانی کی
زباں کھلی نہیں لیکن کلام کر کے چلے

پھر جب میرٹھ میں مسلمانوں کا خون بہا اور کلیم عاجز بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے تو اپنی فریاد اس طرح پیش کی:

یہ سر کہ جس کا مول نہ تھا تاج قیصری
ہوتا ہے اب فروخت بہت سستے دام پر

اور سستے دام کی بھی ضرورت نہیں رہی
بے دام ہی تراش لئے جاتے ہیں یہ سر
گردن بریدہ پیرہن جسم سوختہ
یوں بھی ہم آئے کوچہ و بازار میں نظر

محفل اجاڑ شمع فسردہ فضا خموش
بکھری ہوئی پتنگوں کی لاشیں زمین پر

کیا کیا گذر رہی ہے وہ کیا عرض ہم کریں
ہوگی ضرور حضرتؐ والا کو سب خبر

رب کریم آپ کا اور آپ بھی کریم
اب درمیان دونوں کریموں کے ہے یہ سر

ہم سرنگوں ہیں اور معافی کے خواستگار
بس اک سخن بس ایک توجہ بس اک نظر

بلاشبہ کلیم عاجز کی شاعری کا یہ امتیاز ہے کہ انھوں نے اپنے وطن عزیز کے جسم پر فسادات کے ناسور کی طرف توجہ دلائی ہے، ان کی نظمیں ان کا نعتیہ کلام، ان کی غزلیں، ہر جگہ یہ موضوع چھایا ہوا ہے۔ انسان کی جان سب سے محترم ہے، اسلام نے ایک انسان کے قتل ناحق کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا ہے، جو شاعر بھوک کا اور افلاس کا تذکرہ کرتا ہے تو وہ ترقی پسند شاعر کہلاتا ہے، عوامی

شاعر کہلاتا ہے، محنت کش طبقے کا شاعر کہلاتا ہے۔لیکن انسانی جان کا معاملہ بھوک اور افلاس سے بھی زیادہ سنگین ہے، فسادات اب ہندوستان کے ضمیر و خمیر کا جز و بنتے جارہے ہیں اور اس کثرت سے اور اتنے بڑے پیمانے پر رونما ہونے لگے ہیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اب ملک کی فطرت ثانیہ قرار دیا جاسکتا ہے۔اس اعتبار سے کلیم عاجز کا یہ کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اس غم کو غم زمانہ بنادیا اور سینکڑوں غزلیں اس موضوع پر کہہ ڈالیں ، اُردو ادب و شاعری کا کوئی منصف اور حقیقت نگار مؤرخ کلیم عاجز کے نام کو اور کلام کو نظر انداز نہیں کر سکتا ہے کہ انھوں نے ہندوستانی زندگی کے ایک اہم رُخ کی بڑی فنکارانہ اور شاعرانہ عکاسی کی ہے۔کوئی شخص اگر بیسویں صدی کے ربع اخیر کے نصف درجن بڑے شعراء کے دیوان کا انتخاب کرنے کے لئے کہے تو ایک منصف نقاد کلیم عاجز کے مجموعہ کلام کو آسانی کے ساتھ نظر انداز نہیں کرسکتا ہے۔

لال قلعہ میں ہر سال آزادی اور ملک میں جمہوریت کے قیام کی یاد میں جشن بہاراں منایا جاتا ہے اور ایک آل انڈیا مشاعرے کا نظم ہوتا ہے، جس میں چوٹی کے اہل سخن اور اربابِ کمال جمع ہوتے ہیں، اس مشاعرے میں کلیم عاجز کو بھی دعوت سخن دی جاتی ہے۔اس ملک کا شعراء پر حق ہے اگر وہ آزادی کے گیت گائیں اور خوشی کے ترانے سنائیں تو بجا ہے کہ یہ اسی کا موقع ہے؛ لیکن کلیم عاجز کا گھر تو عین اسی بہار میں لٹا تھا ان سے خوشی کا نغمہ سننے کی توقع نہیں رکھنی چاہئے تھی ، یہ تو منتظمین کی غلط بینی اور غلط اندیشی ہے کہ انھوں نے دعوت نامہ بھیجا۔کلیم عاجز مشاعرے میں پہنچے تو اسٹیج پر لال بہادر شاستری موجود تھے اور کنور مہندر سنگھ بیدی نظامت کے فرائض انجام دے رہے تھے،شعرائے کرام میں عرش ملسیانی ، جوش ملسیانی ، پنڈت تلوک چند محروم ، جگن ناتھ آزاد ، علی سردار جعفری ، کیفی اعظمی ، ساغر نظامی ، روش صدیقی ، ساحر لدھیانوی ، بسمل سعیدی ، قدیر لکھنوی ، سراج لکھنوی ، نشور واحدی وغیرہ اسٹیج پر موجود تھے ، کلیم عاجز نے مشاعرے میں جو نظم پڑھی وہ منظومات کے تازہ مجموعے ''کوچہ جاناں جاناں'' میں شامل ہے، چند اشعار یہ ہیں:

یاران میکدہ یہ امامانِ بادہ نوش
یہ دشمن جنوں یہ محبانِ عقل و ہوش

گندم نما یہ دوست یہ احباب جو فروش
باطن سیاہ کار بظاہر سفید پوش

یہ تاجرانِ لالہ و گل تیغ در بغل
دیتے ہیں زخم کرتے ہیں فرمائش غزل
یہ جشن یہ جلوس یہ جلسہ یہ جلوہ گاہ
یہ شاعری یہ داد یہ تحسین یہ واہ واہ

یہ پیار کے معاملے یہ لطف کی نگاہ
سب جھوٹ، سب مغالطہ، سب جرم، سب گناہ

شاعر ہیں راز ہائے دروں جانتے ہیں ہم
دنیا کو ہر لباس میں پہچانتے ہیں ہم

کلیم عاجز کے اس مجموعۂ کلام میں مولانا آزاد، جواہر لال نہرو، جمیل مظہری، شاد عظیم آبادی اور جگر مرادآبادی کے انتقال پر لکھے گئے مرثیے بھی ہیں، شب معراج اور جشن عید پر نظم ہے، وہ اکتسابی شاعر نہیں؛ بلکہ فطری اور وہبی شاعر ہیں۔ شعر کی نموان کے نہاں خانہ دل میں اس طرح ہوتی ہے، جیسے برسات میں سبزہ اُگتا ہے، ان پر دل کا سخت دورہ پڑا ہے، اسپتال میں سخت نگہداشت کی حالت میں ہیں، گفتگو سخت منع ہے، اس حالت میں دل کے عنوان سے نظم کا ورود ہورہا ہے، ایک طویل نظم ہے جو عین حالت مرض میں تیار ہوتی جارہی ہے۔ ایسے ہی شاعر کو فطری شاعر کہا جاتا ہے، اس کے یہاں اشعار کی آمد ہوتی ہے، آورد نہیں، اشعار ساغر دل پر اس طرح اُترتے ہیں کہ جس طرح موسم سرما میں شبنم گلاب کے کٹوروں میں اُترتی ہے، دل کے عنوان سے نظم اس طرح شروع ہوتی ہے:

مری ہر غزل کے رُباب سے یہ نکل رہی ہے صدائے دل
تو کسی کا دل نہ دُکھائیو کوئی لاکھ تیرا دُکھائے دل

اسے کیا سلیقۂ شاعری جو پھرے ہے اپنے بچائے دل
وہ کلیم جیسی غزل کہے جو کلیم جیسا بنائے دل

☆ ☆ ☆ ☆

کلیدِ مغفرت

ڈاکٹر عقیل ہاشمی اُردو کے انشاء پرداز اور ممتاز شاعر ہیں، جب وہ غزل کہتے ہیں تو ہر شعر حاصل غزل ہوتا ہے اور جب نعت کہتے ہیں تو نعت ''کلید مغفرت'' ہوتی ہے۔ عقیدت اور محبت میں ڈوبی ہوئی نعت کہنا کچھ آسان کام نہیں یہ پل صراط پر چلنا ہے، ہر لحظہ اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ عقیدت میں عقیدہ کا دامن نہ چھوٹے اور خالق اور مخلوق کا فرق نظر انداز نہ ہونے پائے۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی کی شاعری میں فسوں سازی اور کمال نئے نوازی کی داد اہل نقد نظر نے دل کھول کر دی ہے، انھوں نے نعتیں لکھ کر اپنا شمار قافلہ ہائے رنگ و بو میں کرلیا ہے، جو اس کی تلاش میں نکلے جسے اقبال نے آیہ کائنات کا معنئ دیریاب قرار دیا ہے، بحیثیت نعت گو شاعر ان کی شخصیت مسلم ہے۔ آج کی نورانی اور روحانی محفل میں ہم صرف ان کے استغاثہ کا ذکر کرنا چاہیں گے، جس کی روایت اُردو کی نعتیہ شاعری میں جس قدر مضبوط ہے اس کی نظیر دوسری زبان کی نعتیہ شاعری میں نہیں۔ بچہ کسی مہیب صورت اور سایہ کو دیکھ کر اپنی ماں سے لِپٹ جاتا ہے، اس لئے اگر حالات کی اذیت ناکیوں، نامہربانیوں کا شکار اجتماعی طور پر مسلمان ہو رہے ہوں اور مسلمان ایسے میں رحمت دو عالم کی بارگاہ میں استغاثہ پیش کرنے لگیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات کو چھوڑ کر پیغمبر کی ذات کو معبود اور مسجود بنالیا ہے۔ شعر اور محبت کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے اور محبت کی زبان کو منطق اور کلام کی کسوٹی پر نہیں کسا جاسکتا ہے، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ یہ استغاثہ ہمیں شعری سرمایہ میں جتنا ملتا ہے، نثری سرمایہ میں نہیں ملتا ہے، کیوں کہ نثر کو ہمیشہ منطق کی ترازو پر تولا جاتا ہے اور خواجہ الطاف حسین حالی کے یہ اشعار یاد رکھے جاتے ہیں:

تم اوروں کے مانند دھوکہ نہ کھانا
کسی کو خدا کا نہ بیٹا بنانا

مری حد سے رتبہ نہ میرا بڑھانا
بڑھا کر بہت تم نہ مجھ کو گھٹانا

سب انساں ہیں واں جس طرح سر فگندہ
اسی طرح ہوں میں بھی اک اس کا بندہ

اُردو زبان کی نعتیہ شاعری میں جو استغاثے ہیں ان میں عصری حسیت اور حالات اور کوائف کی آگہی پائی جاتی ہے اور اتنی زیادہ پائی جاتی ہے کہ دوسری زبانوں کی نعتیہ شاعری ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو افتاد اور جو مصیبت ہندوستان کے مسلمانوں پر پڑی ہے وہ دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں زیادہ زہرہ گداز اور روح فرسا ہے اور اتنی اذیت ناک ہے کہ شاعر پکار اٹھتا ہے۔

اے خاصہ خاصان رسل وقت دُعاء ہے
اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

وہ دین ہوئی بزم جہاں جس سے چراغاں
اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے

عربی اور فارسی میں جو نعتیں لکھی گئی ہیں ان میں نعت گو شعراء ''پئے درماں طلبی'' مدینہ تک پہنچتے رہے ہیں اور اپنے ذاتی غموں کو بیان کرتے ہیں؛ لیکن اُردو زبان میں پہنچ کر یہ استغاثہ غم زمانہ کی روداد اور احوال ملی کی فریاد بن جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس غم دوراں سے یہاں کے مسلمانوں کو سابقہ پیش آیا ہے وہ بہت جانکاہ اور دلدوز ہے، ذرا تاریخ پر نظر ڈالئے انیسویں صدی کی شام سے نہیں؛ بلکہ صبح سے ہندوستان کی ملت اسلامیہ کا دل مفلس کے چراغ کی طرح ٹمٹمارہا تھا، آفتاب اقبال کو گہن لگ چکا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے اختتام پر مسلمان انگریزوں سے لڑائی ہار چکے تھے ایسٹ انڈیا کمپنی نے مسلمان امراء اور جاگیرداروں کو برطرف کردیا تھا، مسلمانوں کو سرکاری ملازمت سے ہٹا کر ہندوؤں کو ان کی جگہ دے دی گئی تھی، جنوب میں سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد انگریزوں کا کوئی حریف نہیں تھا۔ حکومت کی شکل میں ایک خزاں رسیدہ بہار تھی جو شمال میں ۱۸۵۷ء میں اور اس کے بعد ایک سو سال کے اندر دکن میں ختم ہوگئی۔ تہذیب وثقافت کا سرمایہ جس پر ناز تھا

وہ بھی ختم ہو رہا تھا سیاسی قوت کے ساتھ تہذیبی عزت اور معاشی خوش حالی بھی خاک آلودہ ہو رہی تھی اور اب زبان وادب کا سرمایہ بھی معرض خطر میں تھا، فارسی زبان کو پہلے ہی بے دخل کیا جا چکا تھا، اُردو کی سانس بھی اکھڑ رہی تھی عالمی سطح پر خلافت عثمانیہ کا چراغ پہلے ہی گل ہو چکا تھا، اندرون ملک بھی حکومت ختم ہو چکی تھی۔ عیسائیت کی تبلیغ ہندوستان میں پھیل رہی تھی اور مزید یہ کہ شدھی سنگھٹن کی تحریک چل رہی تھی، پھر فسادات کا غیر مختتم سلسلہ شروع ہوا جو گجرات تک پہنچا۔ الغرض آلام و مصائب کے ایسے گھنے بادل شاید ہی کہیں نظر آئے ہوں، ایسا لگ رہا تھا کہ پوری ملت اسلامیہ ایک چراغ سحری ہو اور مسلمان دود چراغ محفل، پریشان اور آشفتہ حال۔ اس تاریخی پس منظر کو سامنے رکھنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہندوستان کے نعت گو شعراء نے اتنے استغاثے کیوں لکھے ہیں اور ان استغاثوں میں اتنا سوز وگداز کیوں ہے اور ان میں ملی حالات کی عکاسی کیوں کی گئی ہے۔ شعراء کے استغاثوں میں ذات رسالت مآب سے بے پناہ شیفتگی کا اظہار ہے، یہ بے پناہ شیفتگی غور کیجئے تو حکمتِ الٰہی بھی ہے، جب ناموس دین کی حفاظت کے لئے تیغ باقی نہیں رہ جاتی ہے تو اللہ کی ذات جس نے ''وانالہ لحافظون'' کی ضمانت دی ہے دلوں میں سرچشمہ اسلام اور پیغمبر اسلام سے زبردست شیفتگی پیدا کر دیتی ہے اور یہ عشق و شیفتگی ایک حصار کا کام دیتی ہے اور سیاست کی تیغ سے بڑھ کر پاسبان ثابت ہوتی ہے، ہندوستان کی نعتیہ شاعری میں یہ عشق دل بیتاب کی بجلی اور چشم پرآب کا بادل بن کر چھا گیا ہے۔ استغاثہ کی روایت پر نظر ڈالئے جو اُردو کی نعتیہ شاعری کی روایت میں موجود ہے ایک شاعر ہے جس کا نام ہے عبد اللہ خاور جس کے طویل استغاثہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

حضور ! دشت بلا میں ہے شام غم کا ظہور
حضور ! آپ کی چشم کرم ہے آیۂ نور

جلائے شعلہ جاں ڈھونڈھتا ہے راہوں کو
گھرا ہے ظلمت ہجراں میں آپ کا مہجور

حضور ! ایک نظر التفات سے مملو
بنام آیہ رحمت بنام رب غفور

بہت طویل ہیں آلام دہر کے سائے
بہت دراز ہے اب دامن شب دیجور

ایک دوسرے شاعر کو دیکھئے جس کا نام ہے محسن لطفی کس طرح اپنا استغاثہ بارگاہ ختم المرسلین میں پیش کر رہا ہے:

شکر صد شکرِ خدا یہ زائر ہندی نژاد
آج ہے لبیک برلب، باب روضہ کے قریں

اس بعید اقلیم سے حاضرِ ہوا ہے یہ غریب
ہے جو عرف عام میں گنگ وجمن کی سرزمین

سلسلہ در سلسلہ ہے داستان کید و قید
آہ کب ٹوٹیں گی یہ زنجیر ہائے آستین

ملت بیضا کے حق میں حق سے کیجئے یہ دُعاء
رحم کر اس قوم پر رب رحیم الراحمین

اقبال عاشق رسول ﷺ ہیں اور عشق رسول کے موضوع پر متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، یہ استغاثہ اقبال کے کلام میں بھی پورے سوز و گداز کے ساتھ موجود ہے۔

مسلماں آں فقیرے کج کلا ہے
رمید از سینہ او سوز آ ہے

دلش نالد چرا نالد ؟ نہ داند
نگاہے یا رسول اللہ نگاہے

یعنی مسلمان وہ فقیر کج کلاہ ہے جس کے سینہ سے سوز آہ نکلتا ہے، اس کا دل روتا ہے کیوں روتا ہے؟ وہ نہیں جانتا، اے رسول اللہ! ایک نگاہ لطف ایک نگاہ کرم۔

ایک دوسرے شاعر عبدالباری اجمیری اپنے طویل استغاثہ میں کہتے ہیں:

اے رسول پاک اے پیکر قدسی صفات
اے حبیب ذات اے غارت گر لات ومنات

ہے زمین کا ذرہ ذرہ دشمن اسلام آج
حشر در آغوش ہے گویا یہ دشت کائنات

تل رہی ہیں دوسری قومیں مٹانے کے لئے
منقلب ہے اُمت مرحوم کا دورِ حیات

ایک شاعر خواہ وہ رند مشرب ہی کیوں نہ ہو جب استغاثہ میں خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارتا ہے تو بہت با ادب ہو کر پکارتا ہے، وہ استغاثہ سے پہلے عقیدت میں ڈوب کر ثنا خوانی میں رطب اللسان ہوتا ہے، دیکھئے یہ جوش ملیح آبادی کہتے ہیں:

اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزم کافری
رعشہ خوف بن گیا رقص بتان آزری
اے کہ ترا غبار راہ تابش روئے ماہتاب
اے کہ ترا نشان پا نازش مہر خاوری

اے کہ ترے بیان میں نغمہ حلم و آشتی
اے کہ تری سکوت میں خندۂ بندہ پروری

شاعر اسی انداز میں پہلے نعت کے اشعار پیش کرتا ہے اس کے بعد اسی زمین میں وہ حضور کی بارگاہ میں استغاثہ پیش کرتا ہے:

تجھ پر نثار جان و دل مڑ کر ذرا یہ دیکھ لے
دیکھ رہی ہے کس طرح ہم کو نگاہ کافری

تیرے گدائے بے نوا تیرے حضور آئے ہیں
چہروں پر رنگ خستگی سینوں میں درد پے بڑی

آج ہوائے دہر میں ان کے سروں پر خاک ہے
رکھی تھی جن کے فرق پر تو نے کلاہ سروری

اُٹھ کہ ترے دیار میں پرچم کفر کھل گیا
دیر نہ کر پڑ گئی صحن حرم میں ابتری

ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات کی جھلک اُردو کی نعتیہ شاعری میں اور استغاثوں میں موجود ہے، جبل پور کے فساد کے بعد شاعر اپنا استغاثہ حضور ﷺ کے دربار میں اس طرح پیش کرتا ہے:

اے عازم دربار شہنشاہ مدینہ
یاد آئیں اگر تجھ کو شہیدان جبلپور

کہنا بصد آداب کہ اے مرکز اُمید
بدلے گئے کیوں بارگہ ناز کے دستور

یہ حفیظ الرحمٰن کے طویل استغاثہ کے ابتدائی اشعار ہیں، اب ایک استغاثہ آج کے دور کے شاعر ڈاکٹر کلیم احمد عاجز کا دیکھئے، کہتے ہیں:

ادب سے پہلے سلام ان کو اے صبا کہیو
پھر اس کے بعد غریبوں کا ماجرا کہیو

نہ غم گسار نہ ہمدم کوئی رہا کہیو
بس ان کے نام کا باقی ہے آسرا کہیو

برائے نام ہی نسبت جو ان سے رکھتے ہیں
اس ایک جرم کی کیا کیا ملی سزا کہیو

اندھیری شب میں نہیں صبح کے اُجالے میں
لٹا ہے ان کے غلاموں کا کارواں کہیو

نعت گو شعراء کے چند اشعار استغاثہ سے متعلق میں نے بطور نمونہ پیش کئے تھے، ورنہ یہ تو پوری کتاب کا اور ریسرچ کا موضوع ہے اور اس میں دوسری زبانوں کے شعراء کے کلام کا تقابلی مطالعہ بھی ہوسکتا ہے اور اب تک کسی نے اس پہلو پر کوئی کام نہیں کیا ہے۔

ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے اپنے نعتیہ کلام میں استغاثہ کی روایت کو آگے بڑھایا ہے، ڈاکٹر عقیل

ہاشمی نے استغاثہ کی طاقتور روایت کو باقی رکھا ہے اسی کے ساتھ انھوں نے اُردو میں عربی کا پیوند بھی لگا دیا ہے:

وقت کیا اچھا برا کس سے کہیں
بخت کا بھی ماجرا کس سے کہیں

درد و غم کا مسئلہ کس سے کہیں
جز شہ ہر دوسرا کس سے کہیں
یا رسول اللہ اُنظر حالنا
یا حبیب اللہ اِسمع قالنا
آپ سے پوشیدہ ہیں احوال کب
ٹوٹتے ہیں کس قدر قہر و غضب

رحمۃ اللعالمین محبوب رب
ہو عنایت کی نظر شاہ عرب

یا رسول اللہ اُنظر حالنا
یا حبیب اللہ اِسمع قالنا

بے سہارا ہم پئے فریاد ہیں
اور دشمن سب ستم ایجاد ہیں

زیر گردوں خانماں برباد ہیں
ناتواں ہیں قابل امداد ہیں

یا رسول اللہ اُنظر حالنا
یا حبیب اللہ اِسمع قالنا

ڈاکٹر عقیل ہاشمی کی نعتیہ شاعری میں جو استغاثہ ہے اس میں وہی عصری حسیت اور وہی زمانہ کا شعور ہے جو اُردو کی نعتیہ شاعری کا امتیاز خاص ہے اور اس بارۂ خاص میں نہ تو عربی زبان کی

نعتیہ شاعری اُردو کا مقابلہ کرسکتی ہے اور نہ فارسی کی اور فرق وہی حالات کی سنگینی کا ہے جن سے یہاں کے مسلمانوں کو گزرنا پڑا اور دوسری جگہ کے مسلمانوں کو نہیں گزرنا پڑا۔ ہندوستان میں صورتِ حال یہ تھی کہ جو کبھی خسرو اقلیم تھے گدائے بے نوا بن گئے ایک طرف سیاسی قوت کا خاتمہ دوسری طرف معاشی خوش حالی کا خاتمہ، تیسری طرف تعلیمی پسماندگی، جس کا منھ بولتا ثبوت تازہ بتازہ سچر کمیٹی کی رپورٹ ہے، چوتھی طرف ان کا غیر محفوظ اقلیت میں ہونا، پانچویں طرف برادرانِ وطن کی جارحانہ نظر اور پھر مغربی تہذیب کا ناقابل مزاحمت سیلاب۔ اس ہشت پہلو، یلغار سے ایسا لگتا ہے کہ مسلمانوں کی زندگی ایک ملبہ میں تبدیل ہوتی جارہی ہے، اس پورے تاریخی پس منظر کو سامنے رکھئے اور ڈاکٹر عقیل ہاشمی کا استغاثہ پڑھئے تو اندازہ ہوگا کہ دل پر کیا گذر رہی ہے:

کفر کا طوفان ہے یلغار ہے
ظلم و استبداد ہے پیکار ہے

ایک اک لمحہ یہاں خوں بار ہے
زندگی آزار ہے دشوار ہے

یا رسول اللہ اُنظر حالنا
یا حبیب اللہ اِسمع قالنا

مصیبتیں تو دنیا کے اور ملکوں میں بھی مسلمانوں پر پڑی تھیں؛ لیکن وہ اتنی ہمہ جہت نہیں تھیں جتنی ہندوستان میں تھیں، اگر مصر پر نپولین کا حملہ ہوگیا، اگر مراکش اور الجزائر فرانس کے زیر نگیں ہو گئے، اگر لیبیا پر اٹلی کا اقتدار ہوگیا تو ان میں ہر جگہ مسلمان اکثریت میں تھے، اس سے ان کے لئے مصائب اتنے شدید نہ تھے جتنے ہندوستان میں تھے، یہاں تو مذہب تہذیب جان و مال آبرو ہر چیز نشانہ پر تھی، یہاں مکمل وجود معرض خطر میں تھا، یہی احساس کی تلخی ہے جو فریاد اور استغاثہ کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے:

اُک تلاطم میں سفینہ ہے حضور
درد سے معمور سینہ ہے حضور

آفتوں کا زہر پینا ہے حضور
یہ بھی جینا کوئی جینا ہے حضور

یا رسول اللہ اُنظر حالنا
یا حبیب اللہ اِسمع قالنا

اس طویل استغاثہ کا آخری بند یہ ہے:

ہاتھ پھیلائے ہیں سب دامن تہی
آنکھ نم اور دل سراپا ملتجی

عرض کرتا ہے عقیل ہاشمی
آپ کے ہو لطف سے حاصل خوشی

یا رسول اللہ اُنظر حالنا
یا حبیب اللہ اِسمع قالنا

حالی نے حالات کے گہرے شعور و عرفان کے ساتھ بارگاہ رسالت میں کہا تھا کہ ''اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے'' اسی شعور کے سلسلہ طلائی کی کڑیاں ہیں جو حالی سے ہاشمی تک چلی آ رہی ہیں، ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے اس روایت کو زندہ اور تابندہ رکھا ہے، ان کی نعتیہ شاعری میں استغاثہ بہت ملے گا؛ لیکن استغاثہ کے عنوان سے جوان کا منظومہ فن ہے ہم نے اسی پر ارتکاز کیا ہے اور اُردو شاعری میں استغاثہ کا پس منظر پیش کیا ہے اور اس پس منظر میں اس استغاثہ کا منظرنامہ اپنی پوری اہمیت کے ساتھ سامنے آتا ہے اور ڈاکٹر عقیل ہاشمی اس خوش نصیب، خوش گو اور خوش نوا گروہ شعراء کے ممتاز فرد نظر آتے ہیں، جس کے رگ و پے میں عشق رسول پیوست ہے اور جس کے ہاتھ نبض ہستی پر ہیں اور جسے حالات کا گہرا عرفان اور شعور حاصل ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

فاروق بانسپاری ــــ ایک شاعر خوش نوا

ڈاکٹر سید شکیب ارسلان نے فاروق بانسپاری کی حیات اور شعری خدمات پر کتاب شائع کر کے ایک گراں مایہ ادبی خدمت انجام دی ہے، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے کتاب کو زیورِ طبع سے آراستہ کیا ہے، کتاب اگر خود حسن رکھتی ہو اور پھر حسن طباعت سے بہرہ ور ہو تو حسن دوبالا ہو جاتا ہے، بانسپار مشرقی یوپی کا وہ علاقہ ہے، جہاں بہت سے شعراء اور اربابِ کمال پیدا ہوئے، جو گیسوئے فن کی مشاطگی میں مصروف رہے، ایک ہی وقت میں اسی ایک خطہ میں کئی چاند سر آسماں تھے، جنھوں نے شعر و ادب کو چار چاند لگائے۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کا درمیانی زمانہ تھا، اس دور میں ہر گھر میں علم و تہذیب کا چراغ روشن تھا، مشاعرے منعقد ہو رہے تھے، گیسوئے اُردو کی شانہ گری اور فن کی مشاطگی ہو رہی تھی، اس رومانی اور ادبی ماحول میں فاروق بانسپاری نے آنکھیں کھولیں اور شعر کہنا شروع کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں حسن خیال کے نام سے ان کا پہلا شعری مجموعہ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ یہ ان کا ابتدائی مجموعہ کلام تھا؛ لیکن کلام میں روانی اور شیریں سخنی ایسی تھی کہ فن کے قدردان اس کا احساس کئے بغیر نہیں رہ سکے، اس مجموعہ میں ایک نظم ''تقاضائے حسن'' کے نام سے ہے، اس کا رنگ و آہنگ بھی دوسری نظموں کی طرح عاشقانہ اور مستانہ ہے اس نظم میں محبوب اپنے عاشق سے بھول جانے کی فرمائش کرتا ہے، نمونہ کے طور پر ایک بند ملاحظہ ہو:

خواب رنگین کی حقیقت بخدا کچھ بھی نہیں
غمزہ و عشوہ و انداز و ادا کچھ بھی نہیں
تابش حسن کے سائے کے سوا کچھ بھی نہیں
دھوپ میں جان نہ دو سایہ کا پیچھا نہ کرو
بھول جاؤ مجھے اب میری تمنا نہ کرو

تقاضائے حسن کا جواب عاشق کی طرف سے ''التجائے محبت'' کے عنوان سے ہے اس نظم

کا ایک بند بطور نمونہ ملاحظہ ہو:

پڑ چکے ہیں دل پر شوق میں ناسور بہت
کردیا ہے خلش درد نے مجبور بہت
فیض قربت سے نکل آیا ہوں میں دور بہت
واپسی کے لئے اب کاوش بیجا نہ کرو
مہرباں ترک محبت کا تقاضہ نہ کرو

فاروق بانسپاری کی ایک چیز جو دوسرے بہت سے شعراء سے ممتاز کرتی ہے وہ منظوم خطوط کی صنف سخن ہے، شاعر کے مجموعہ کلام میں منظوم خطوط بہت ملیں گے، جن میں جذبہ اور وجدان کی فراوانی ہے مناظر قدرت کا بیان بھی ہے اور جو اُردو کے ممتاز اور مشہور شعراء کے کلام سے لگا کھاتا ہے، مثال ملاحظہ ہو:

باغ جہاں میں شاد رہو تم
بن کے بہار آباد رہو تم

خود بھی نہ آئے خط بھی نہ بھیجا
پتھر کا کیوں ہوا کلیجہ

مناظر قدرت کی تصویر کشی میں مہارت اور قدرت ملاحظہ ہو:

گھرے بادل کالے بادل
جم کے برسنے والے بادل
جوڑا پہنے دھانی دھانی
رقص میں ہے برسات کی رانی

سبزہ جاگا وادی جاگی
فطرت کی شہزادی جاگی

لہرا گاتا پانی برسے
مست گھٹا من مانی برسے

پھول چمن میں پھول رہے ہیں
شاخ پہ جھولا جھول رہے ہیں

دیکھ کے کھیتوں کی ہریالی
دوڑ گئی چہروں پر لالی

پردیسی سب گھر آئے ہیں
چھٹی لے لے کر آئے ہیں

میں دن رات برہ کی ماری
دیکھ رہی ہوں راہ تمہاری

فاروق بانسپاری کو صرف فطرت کے مسحور کن مناظر کی منظر کشی پر قدرت نہیں ہے؛ بلکہ وہ ماہ لقا اور زہرہ جبیں کا حسن بھی بہت قادر الکلامی کے ساتھ بیان کرتے ہیں، ملاحظہ ہوں چند اشعار:

لباس زرد میں اک مہ لقا نظر آئی
خدا کی شان کہ شان خدا نظر آئی
وہ بے خودی کہ خودی پر نکھار آجائے
وہ شوخیاں کہ جہاں کو خمار آجائے
وہ چال جس سے قیامت کا دل لرز اُٹھے
بنائے کار گہ آب و گل لرز اٹھے

اختر شیرانی کی نظمیں ''او دیس سے آنے والے بتا'' اور ''سلمی سے دل لگا کر'' اور ''یہی وادی ہے وہ ہمدم'' آج بھی اہل ذوق کے حافظہ کے نہاں خانوں میں محفوظ ہیں، فاروق بانسپاری کی بعض نظمیں پڑھ کر اختر شیرانی کی یاد آجاتی ہے۔

برسات کی بھیگی راتوں میں جب مطرب ساز اٹھاتا ہے
''پردیسی برکھارت آئی'' مستی میں لہک کر گاتا ہے
جب حسن ترنم کا جادو احساس پر آفت ڈھاتا ہے
جذبات کی لہروں پر ''لہرا'' نغمہ بن کر لہراتا ہے

ایسے میں کوئی یاد آتا ہے

لیکن فاروق بانسپاری کی زندگی میں ایک موڑ آنے والا تھا اور تحویل قبلہ کا وقت قریب تھا، وہ اپنی زندگی میں بعض ایسی شخصیتوں سے قریب ہو گئے جنھوں نے ان کے رُخ کو موڑ دیا ان میں ایک نصر اللہ خاں عزیز تھے اور دوسرے مسعود عالم ندوی، چوں کہ انقلاب فکر ونظر کے عامل اول مولانا مسعود عالم تھے اس لئے شاعر شباب نے اس انقلاب کا نام انقلاب مسعود رکھا۔ اقبال کی شاعری نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا، اب بلبل وطاؤس سے اور رامش ورنگ سے انھوں نے توبہ کی ان کے افکار ونظریات اسلام کے سانچے میں ڈھل گئے وہ کچھ سے کچھ ہو گئے اور بدل گئے، ان کے ڈگمگاتے ہوئے قدم سنبھل گئے، ان کی زندگی میں انقلاب آ گیا اور انھیں خود اس تبدیلی کا احساس ہو گیا، چنانچہ وہ کہتے ہیں:

وہی فاروق جو پہلے بتوں پر جان دیتا تھا
خدا رکھے کہ اب اللہ والا ہوتا جاتا ہے

۱۹۶۰ء میں دوسرا مجموعہ کلام سوز وساز کے نام سے شائع ہوا اور اس پر واضح طور پر اقبال کی چھاپ تھی، پاکیزگی اور مقصدیت بہت نمایاں تھی، اب وہ چمن حیات میں اسلام کی بہار لانے کے لئے بے چین تھے۔

خوشی سے پھولیں نہ اہل صحرا ابھی کہاں سے بہار آئی
ابھی تو پہنچا ہے آبلوں تک مرا مزاق برہنہ پائی

تبدیلی فکر ونظر کے بعد کی شاعری میں کلام اقبال کی بازگشت سنائی دیتی ہے، ان کے انتقال کے بعد ان کے لڑکے شمیم فاروق نے ان کے مجموعہ کلام کو کلیات فاروق کے نام سے شائع کر دیا ہے، ضرورت تھی فاروق بانسپاری کے کلام کا تنقیدی جائزہ لینے کی، یہ کمی ڈاکٹر سید شکیب ارسلان نے پوری کر دی ہے اور یہ کام اس لائق ہے کہ ہر صاحبِ ذوق کے ہاتھ تک پہنچ جائے۔

☆ ☆ ☆ ☆

درد کے خیمے کے آس پاس

ادب وتنقید کی دنیا میں خاص طور پر ادبی مجلّہ سب رس اور شعر وحکمت کے حوالہ سے مغنی تبسم کا نام اور کام بے حد روشن اور تابناک ہے، وہ سوزِ دکن اور سازِ دکن آوازِ دکن اور اعزازِ دکن ہیں۔ ان کا تخلیقی عمل پیہم رواں اور ہر دم جواں ہے، ان کے ذریعہ ادب کی اشاعت معیار کی ضمانت ہے۔ جس قدر پر کشش دیدہ زیب سرورق کے ساتھ اور قیمتی کاغذ پر وہ کتابیں شائع کرتے ہیں، اسے دیکھ کر کسی کو یہ گمان ہوسکتا ہے کہ اُردو والوں کے پاس خوش حالی اور خوش جمالی کی نعمت بہت وافر ہے؛ لیکن چوں کہ یہ خلاف واقعہ ہے اس لئے اس کی اس کے سوا اور کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی ہے کہ یہ مغنی تبسم کے ذوق کی نفاست کے ساتھ یہ ان کا اُردو کے ساتھ عشق ہے، جو ان کو بے دریغ قربانی کا حوصلہ بخشتا ہے۔

یہ بازی عشق کی بازی ہے جو چاہے لگادو ڈر کیسا
جو جیت گئے تو کیا کہنا ہارے بھی تو بازی مات نہیں

علم وادب کی قدردانی کی سب سے زیادہ توقع علم وادب کے اساتذہ سے کی جانی چاہئے ؛لیکن یہ تبصرہ نگار بہت سے ایسے اساتذہ علم وادب سے بھی واقف ہے، جو کبھی کوئی کتاب خرید کر نہیں پڑھتے، ایک دانش گاہ کے ایک استاذ نے تو یہ بھی دعویٰ کر دیا تھا کہ یہ ان کا ریکارڈ ہے کہ آج تک انھوں نے کوئی کتاب نہیں خریدی۔ اکثریت ایسے ''دانشوروں'' کی ہے کہ جب وہ کسی شہر میں کسی سیمینار میں جاتے ہیں تو کسی مکتبہ اور کتب خانہ، کسی ادیب، کسی عالم کی زیارت کرنے کے بجائے بازار کی سیاحت کو ترجیح دیتے ہیں اور آرائش اور آسائش کے سامان خرید کر اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک بک سے زیادہ چیک بک کی اہمیت ہوتی ہے، معیارِ ہنر سے زیادہ معیارِ زر اہمیت رکھتا ہے، معیارِ بندگی سے زیادہ معیارِ زندگی عزیز ہوتی ہے، بنگلہ ہو، گملہ ہو، موٹر ہو، شوفر ہو، یہی ان کا پیمانہ فکر ہوتا ہے۔ جس طرح مرتب کرنے والے اور کمپوزنگ کرنے والے کے لئے شاعر نے اظہارِ ممنونیت کیا ہے، ایسے جاں گسل ماحول میں جو لوگ اس کتاب کو خرید کر پڑھ لیں،

درد کے خیمہ سے ممنونیت کے کچھ تحفے انھیں بھی بھیج دینا چاہئے کہ وہ لوگ کم ہوگئے ہیں جو فکروفن کی مشعل سے روشنی پھیلانے والوں کا احترام کریں۔

اصل کتاب پر تبصرہ سے پہلے کتاب کو دیکھ کر خود ہمارے درد کے خیمہ کے آس پاس جو خیالات پھیلنے اور بکھرنے لگے قلم نے ان کو بھی صفحہ قرطاس پر مرتسم کردیا، ''درد کے خیمہ کے آس پاس'' بڑا خوبصورت شاعرانہ نام ہے اور سرورق پر تجریدی آرٹ کے عمل نے جو جستجو آمیز سرشاری کی کیفیت پیدا کردی ہے، کتاب کی کچھ قیمت تو اسی سے وصول ہوجاتی ہے۔ کتاب کا حسن آغاز حمد ونعت سے کیا گیا ہے، حمد اچھی ہے، درود ناریہ کے نیچے قوسین میں ترجمہ لکھا ہوا ہے، یہاں کچھ وضاحت ضروری تھی، اس نعت میں نار کے بجائے نور ہی نور اور سرور ہے، معلوم نہیں اس کا نام درود ناریہ رکھنے والے نے کیوں رکھا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ شاعر نے اپنے کنج لب سے مجموعہ کلام کا آغاز نہ کارل مارکس کی مدح سے کیا ہے، نہ لینن کی منقبت سرائی سے، نہ گاندھی جی کی تحسین سے، نہ نہروں کی قصیدہ خوانی سے، حمد اسی کی کی ہے جو سب سے زیادہ حمد کا سزاوار ہے اور نعت اسی کی لکھی ہے جو پوری تاریخ انسانی میں سب سے زیادہ خراج عقیدت کا مستحق ہے، شہادتیں یعنی کلمہ شہادت کے دونوں جزوان کے میزان شعر میں آب وتاب کے ساتھ موجود ہیں۔

مجموعہ کلام کی تقریباً تمام غزلیں کیف وانبساط اور لطف ونشاط سے معمور ہیں، درد کی زیریں لہر تہ صہبائے غزل محسوس ہوتی ہے؛ لیکن یہ درد بھی خمار آگہی سا ہے اور خیمہ شعر کے آس پاس سانولی سی شام اور سرمگیں سایہ کی طرح ہے، نزاکت احساس اور لطافت شعور کے ساتھ فن کی تہہ داری بھی ہے اور ہم نفسوں کے ساتھ غم خواری اور غم گساری بھی ہے، مقفی غزلوں کے ساتھ غیر مقفی نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں، جس سے دونوں پر شاعر کی دست رس کا اندازہ ہوتا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

مجتبیٰ حسین — ایسا کہاں سے لاؤں!

پروفیسر شفیع شیخ نے کتاب کا نام یہی رکھا ہے، وہ چاہتے تو کتاب کا نام ایسا کہاں سے لاؤں کے بجائے ''ذکر اس پری وش کا'' بھی رکھ سکتے تھے، پری وش کے حسن میں تو کوئی کمی نہ تھی؛ لیکن یہ شفیع شیخ کی تواضع تھی کہ، وہ نہیں چاہتے تھے کہ مصرعہ کا باقی حصہ ''اور پھر بیاں اپنا'' لوگوں کے ذہن میں آئے، وہ صرف مجتبیٰ حسین کی تعریف چاہتے تھے اپنی نہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمار تجویز کردہ نام زیادہ بہتر ہے؛ کیوں کہ جس نے مجتبیٰ حسین کو پڑھا ہے وہ تو ان سے عشق کرتا ہی ہے؛ لیکن شفیع شیخ کی یہ کتاب پڑھ کر بھی لوگ مجتبیٰ حسین کو دیوانہ وار چاہنے لگیں گے، تب شفیع شیخ دوسرا مصرعہ بھی پڑھنے لگیں گے، ''بن گیا رقیب آخر جو تھا راز داں اپنا''۔ حقیقت یہی ہے کہ ایک بہت بڑے مزاح نگار پر کتاب ایک بڑے مزاح نگار کے قلم سے نکلی ہے، کتاب کی قدر و قیمت تو بڑھ ہی جائے گی، اگر کسی ایک نوبل انعام یافتہ ادیب پر کوئی کتاب آسکر انعام حاصل کرنے والے ادیب کے قلم سے آجائے اور یہ واقعہ ہے کہ ہمارے ادب میں مجتبیٰ حسین نوبل انعام کے مستحق ہیں۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ ہندوستان میں کون ادب کے نوبل انعام کا مستحق ہے تو میں پورے اعتماد کے ساتھ دو نام لوں گا، ایک قرۃ العین اور دوسرے مجتبیٰ حسین دونوں نام ہم وزن اور ہم قافیہ ہیں، شفیع شیخ کو اب مجھ سے یہ شکایت نہیں ہوگی کہ میں نے طنز و مزاح کو ادب میں اس کا جائز مقام نہیں دیا۔

مصنف کتاب نے اپنے بلیغ مقدمہ کے آخر میں لکھا ہے کہ'' آج کے زمانہ میں لوگ نوشتہ دیوار تک نہیں پڑھتے کتابیں کیا پڑھیں گے'' مصنف نے بہت اچھی شکایت بہت اچھے انداز میں کی ہے، واقعہ یہ ہے کہ نہ پڑھنا سب سے بڑا مرض ہے، حالاں کہ پڑھا لکھا آدمی اس کو نہیں کہتے جو اسکول اور کالج سے ایک بار ڈگری لے لے؛ بلکہ اسے کہتے ہیں جو ہمیشہ پڑھتا رہے۔ جس طرح ہر دن کا درجہ حرارت بدلتا رہتا ہے، اسی طرح سے علم کا درجہ حرارت بھی گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، اگر کوئی شخص دو چار مہینہ تک کوئی کتاب نہیں پڑھے تو پھر درجہ حرارت درجہ جمود (فریزنگ پوائنٹ) تک پہنچ جاتا ہے اور اس کے بعد جہل کے درجات شروع ہو جاتے ہیں، جہل بسیط جہل مرکب

وغیرہ، اگر کوئی شخص روز ایک کتاب نہیں پڑھ سکتا تو کم از کم مہینہ میں اسے ایک کتاب ضرور پڑھ لینی چاہئے، ورنہ اسے خود اپنے قلم سے تعلیم یافتہ انسانوں کی فہرست سے اپنا نام کاٹ دینا چاہئے۔

معاملہ آج اس کتاب کا ہے، جو مجتبیٰ حسین پر شائع ہوئی ہے، جب جناب شفیع شیخ نے اس کتاب کی اشاعت کی خبر سنائی تو میں نے غلطی سے اس کام کی بہت تعریف کر ڈالی اور مزید غلطی یہ کی کہ کہہ دیا میں نے مجتبیٰ حسین کی تمام تحریریں پڑھ ڈالی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے مجتبیٰ حسین کے بارے میں حسن چشتی کی مرتب کردہ تمام تحریریں پڑھی ہیں، اس اعتراف کی سزا یا جزا یہ ملی کہ شفیع شیخ نے اپنی کتاب پر تبصرہ کرنے کا مجھے حکم دے دیا اور میں نے مجتبیٰ حسین کی محبت میں اس حکم کو قبول کر لیا۔

مجتبیٰ حسین کے فن پر تبصرہ کے لئے شفیع شیخ کچھ اور ہی طرز جنوں ایجاد کر رہے ہیں، تنقیدی مضمون کے اُسلوب کے بجائے تخلیقی انداز اختیار کیا ہے، الف لیلہ عربی ادب کی مشہور داستان ہے، ہروئن ہر شب اپنے ظالم اور عورت کش شوہر کو ایک لطیف کہانی سناتی ہے اور شوہر نئی کہانی کے لئے اسے زندہ رکھتا ہے، کچھ اس سے ملتی جلتی تکنیک شفیع شیخ نے بھی اختیار کی ہے، ایک فرضی کردار سرکش کے نام وہ دلکش خطوط لکھتے ہیں اور خط میں مجتبیٰ حسین کا نیا جلوہ دکھاتے ہیں، اگر اس قدر رتا بڑتوڑ جلوے وہ پری وش کے دکھائیں گے تو رقیبوں کی تعداد تو لازماً بڑھتی رہے گی۔

شفیع شیخ مجتبیٰ حسین کے اس قدر گرویدہ ہیں کہ جہاں تنقید کا موقع ہاتھ بھی آتا ہے وہاں بھی بہت مودب نظر آتے ہیں، مجتبیٰ حسین صاحب نے لفظ ہینڈ رائٹنگ کو ایک جگہ مذکر اور دوسری جگہ مونث استعمال کیا ہے، شفیع شیخ نے پہلے جناب مجتبیٰ حسین کی دونوں عبارتیں نقل کی ہیں اور پھر اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے، یہ مسئلہ دبستانِ دہلی و لکھنؤ کا نہیں؛ بلکہ دبستانِ انگلستان کا ہے، پھر اس کی تشریح اس طرح فرمائی ہے'' وہاں کا شہری ہو یا لفظ دونوں کی جنس پہلی نظر میں سمجھ میں نہیں آتی ہے اور آدمی کنفیوژن کا شکار ہو جاتا ہے۔

الفاظ کا سیاق وسباق بتاتا ہے کہ اس کے بعد ایک شعر ہونا چاہئے؛ لیکن وہ شعر اس لئے نہیں لکھ سکے کہ خط ورخسار پر سبزہ نہیں اُگا تھا اور سبزہ غالباً حج کے انتظار میں نہیں اُگا تھا اور حج اس لئے نہیں کیا تھا کہ سوکی تعداد پوری نہیں ہوئی تھی ورنہ میری طرح کوئی آدمی ہوتا جس کی سنچری کمپلیٹ ہو چکی ہو، حج کر چکا ہو اور سبزہ پہلے ہی اُگا چکا ہو اور تھوڑا بہت ادبی اور شعری ذوق رکھتا ہو تو وہ مذکورہ عبارت کے بعد شعر ضرور لکھ دیتا اور عبارت پھر یہ ہوتی کہ'' دونوں کی جنس پہلی نظر میں سمجھ

میں نہیں آتی ہے اور آدمی کنفیوژن کا شکار رہتا ہے، بقول شاعر:

زلفیں ادھر کٹی ہوئی داڑھی ادھر منڈی ہوئی
دونوں نے دھول جھونک دی دیدۂ امتیاز میں

جناب شفیع شیخ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ مسئلہ دبستانِ انگلستان کا ہے: ہماری تحقیق مزید یہ ہے کہ یہ مسئلہ دبستانِ عظیم آباد کا ہے۔ جو اس وقت روایت کر رہا ہے، اس کا تعلق عظیم آباد سے ہے اور جس سے روایت کی جارہی ہے اس کا تعلق بھی عظیم آباد سے ہے۔ عظیم آباد کے مشہور مصنف سیرت نگار علامہ سید سلیمان ندوی نے ایک بار ایک مجلس میں یہ فرمایا کہ بہت سے الفاظ ہیں جنھیں لکھنو کے لوگ مؤنث استعمال کرتے ہیں اور دہلی کے لوگ ان کو مذکر بولتے ہیں اس کے برعکس بھی ہوتا ہے؛ لیکن عظیم آباد کی مشکل یہ کہ ایک ہی لفظ کو اہل عظیم آباد صبح کو مذکر اور شام کو مؤنث بولتے ہیں۔ اگر چہ کہ یہ واقعہ ہے، مجتبیٰ حسین صاحب کے وسیع اور عالمی خاندان کے کچھ افراد کا رشتہ بہار سے قائم ہو گیا ہے؛ لیکن تذکیر و تانیث کی وجہ یہ نہیں ہو سکتی ہے؛ کیوں کہ یہ تحریر رشتہ قائم ہونے سے پہلے کی ہے۔

مجتبیٰ حسین کے پاس خنجر ظرافت ایسا اہنسائی قسم کا ہے کہ وہ کسی کو مجروح نہیں کرتا ہے، یہ احساس صرف ہمارا نہیں ہے شفیع شیخ کا بھی ہے، چنانچہ نامہ سوم میں مجتبیٰ حسین کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں:

ظرافت نگار کے لئے آدمی کا ظریف ہونا ہی کافی نہیں ہے، اس کا باظرف ہونا بھی ضروری ہے۔

اگر ظرف کی بات نہ ہو تو ظرافت نگاری ایسا میخانہ بن جائے جہاں شیشہ کم اور پگڑی زیادہ اچھالی جائے گی، عربی ادب کی تاریخ میں ہجو یہ شاعری کا ایک مقام ہے، مگر مجھے یہ صنف اسلامی تعلیمات کے مغایر معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ دہلی میں میرے ایک دوست ضیاء الحسن ندوی مرحوم نے جب مجھے بلایا کہ فارسی اور اُردو کے ایک ہجو گو شاعر آئے ہوئے ہیں ان کے اعزاز میں ایک نشست ہے، آپ آئیں؛ لیکن چوں کہ مجھے صرف اپنی نہیں دوسروں کی جان و دل بھی عزیز ہے اس لئے میں شریک نہیں ہوا۔ یہ بات اتنی زیادہ اہم ہے کہ میں اس کے باوجود کہ ہجو یہ شاعری عربی ادب کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے میں اسے پسند نہیں کرتا ہوں، زبان کی احتیاط کا حکم قرآن کی تعلیمات میں بہت زیادہ ہے؛ لیکن اسی حکم کے سلسلہ میں سب سے زیادہ بے احتیاطی ہمارے

معاشرہ میں پائی جاتی ہے، اسی لئے معاشرہ میں امن قائم نہیں ہوتا ہے، زبان کی وہ احتیاط اخلاق مطلوب ہے جو مجتبیٰ حسین کی ظرافت میں پائی جاتی ہے۔ راقم سطور نے دہلی یونیورسٹی میں شعبہ عربی کی صدارت کے زمانہ میں ایک سیمینار منعقد کیا تھا، مندوبین کی فہرست تیار کی جارہی تھی بھری محفل میں ایک صاحب نے فرمایا کہ فلاں صاحب کو نہ بلایئے وہ شراب نوشی کرتے ہیں، مجھے یہ بات بری لگی، میں نے کہا علماء کے نزدیک گناہ کی دو قسمیں ہیں، کبیرہ اور صغیرہ، میرے نزدیک گناہ کی دو قسمیں ہیں گناہ بے لذت اور گناہ بالذت، اگر ایک شخص میخوانہ میں جاتا ہے ٹھیک ہے وہ گناہ کرتا ہے؛ لیکن اسے کچھ تو سکر و سرور ملتا ہے؛ لیکن آپ نے یہ غیبت کا گنا حو فرمایا ہے اس میں فائدہ کچھ نہیں ہوا اور گناہ لازم آیا، گناہ کرنا ہی ہے تو ایسا گناہ کیجئے کہ کچھ حاصل ہو جیسا کہ ایک اچھے شاعر نے مشورہ دیا تھا کہ:

رات ہنس ہنس کے یہ کہتی ہے کہ میخوانے میں چل
یا کسی شہناز لالہ رُخ کے کاشانے میں چل

الغرض مجھے مجتبیٰ حسین کی ظرافت میں شرافت کی قدر بہت زیادہ اچھی لگتی ہے، شرافت مجتبیٰ حسین کی تحریروں کی اعلیٰ ترین اور روشن ترین قدر ہے اور شفیع شیخ کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اس قدر کو نمایاں ترین طریقہ سے پیش کیا ہے۔

جہاں مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری پر بحث کی ہے وہاں بھی اس کا ذکر ہے، ایک جگہ شفیع شیخ نے لکھا ہے کہ تعریف کرنا کوئی مشکل نہیں؛ لیکن کمزوری کو شائستگی کے ساتھ پیش کرنا سمندر کے کنارے کھڑے رہ کر پاپچوں کو خشک رکھنے کی کوشش کرنا ہے اور مجتبیٰ حسین اس فن میں ماہر ہیں۔ میں باصرار یہ کہنا چاہتا ہوں کہ طبیعت کی غیر معمولی شرافت کے بغیر یہ ملکہ حاصل نہیں ہوتا، میں اس کی ایک مثال دینا چاہتا ہوں۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی لکھی، ظاہر ہے ممدوح کی تعریف کا موقعہ ہے شبلی تعریف کے لائق ہیں اور قلم سید سلیمان ندوی جیسے عقیدت مند شاگرد کا ہے؛ لیکن حقیقت سے تجاوز نہ کرنا بھی ضروری ہے، چنانچہ ضخیم کتاب کے آخر میں سید صاحب لکھتے ہیں کہ: ''ان تمام صفات وکمالات کے باوجود شبلی شبلی تھے جنید و شبلی نہ تھے''۔ ایک دوسری مثال لیجئے ایک دانشور صدر جمہوریہ ہوئے، انھوں نے اس کے بعد شنکر آچاریہ کے پاس جاکر ان کے پیر چھوئے اور قشقہ بھی لگوایا، ان کے انتقال کے بعد مولانا علی میاں نے ان کا خاکہ لکھا جو ان کی کتاب پرانے چراغ میں شامل ہے، انھوں نے ممدوح کی جی کھول کر تعریف لکھی؛ لیکن ان کے صدر جمہوریہ بننے کے بعد جو واقعہ پیش آیا

اس کی جانب بہت خفیف اشارہ کیا اور اس مصرعہ پر مضمون ختم کیا۔

جس کو ہو جان و دل عزیز
اس کی گلی میں جائے کیوں

یہ معمولی بات نہیں ہے کہ آدمی اس طرح تنقید کرے کہ سچی بات بھی کہہ دے اور کسی کے آبگینہ دل کو ٹھیس نہ لگے اور رقیب تک بے مزا نہ ہو، مجتبیٰ حسین بہت بڑے ادیب ہیں اور اس لئے کہ شرافت کی غیر معمولی مقدار ان کی تحریروں میں پائی جاتی ہے اور خاص بات یہ کہ شفیع شیخ نے اسے اپنے خاص انداز میں پیش کیا ہے، دیکھئے وہ لکھتے ہیں:

خامیاں اور کمزوریاں انسانی سرشت کا خاصہ ہیں یہ نہ ہوں تو انسان اشرف المخلوقات کا میڈل گنوا کر فرشتہ بن جائے۔

شفیع شیخ نے لکھا ہے کہ مجتبیٰ حسین نے نیش کو نوش بنا دیا ہے میں کہتا ہوں کہ انھوں نے صرف نوش نہیں؛ بلکہ نشید بھی بنا دیا، بالکل ایک فردوش گوش نغمہ کے مانند، یعنی وہ تنقید بھی دل آزاری کے ساتھ نہیں بلکہ دل بری اور دل داری کے ساتھ کرتے ہیں۔

شفیع شیخ کی یہ کتاب بذاتِ خود فکاہی ادب کا خوبصورت نمونہ ہے، ایک دو جگہ تو رشید احمد صدیقی کا اُسلوب نظر آتا ہے، مثال کے طور پر یہ عبارتیں:

ہمارے بندھے بندھائے تصورات پر ضرب کاری ہے، اگر ایسا نہیں ہوتا تو اللہ کے نبی اور رسول اپنے پیغام کے سبب عوام کے غیض و غضب کا نشانہ نہیں بنتے، گاندھی جی کی ہتھیا نہیں ہوتی اور آپ مجتبیٰ حسین کے مخالف نہ ہوتے، صحت کا خیال رکھئے، صحت بڑی انمول چیز ہے وہ صحت جسم ہو یا صحت الفاظ، اس کے بغیر صالح معاشرہ کا تصور بھی ناممکن ہے ساتھ ہی صحت فکر و فہم بھی بے حد ضروری ہے، ورنہ انسان، ہٹلر اور تو گڑیا بن کر رہ جاتا ہے۔

شفیع شیخ نے اپنے تنقیدی مضامین کے لئے عجیب و غریب تکنیک اختیار کی ہے، فرضی خطوط لکھے ہیں ایک کردار یار بے عدیل عبدالوکیل کا ہے، جو مجتبیٰ حسین کا پرستار ہے، دوسرا کردار سرکش لکھنوی کا ہے جو مجتبیٰ حسین سے عناد کا شکار ہے۔ عبدالوکیل اپنے ترکش سے سرکش پر اتنے تیر چلاتے ہیں کہ وہ بے چارہ ہانپنے کانپنے لگتا ہے اور بالآخر ایک دوسرے مجتبیٰ سے جو مجتبیٰ حسین نہیں لات گھونسے کھا کر اسپتال کا رُخ کرتا ہے اور عبدالوکیل صاحب آنسو بہاتے اس کی عیادت کو روانہ ہوتے ہیں اور زبان حال سے یہ کہتے ہیں کہ حق پر ایمان نہ لانے اور کفر پر جمنے کا انجام یہی ہوتا ہے

اور پھر پردہ گر جاتا ہے، دلچسپ قصہ ختم اور پیسہ پوری طرح وصول۔

تنقیدی مضامین کے لئے کرداروں کی تشکیل شفیع شیخ کی جدت ہے مجھے اس کہانی کے فرضی کردار عبدالوکیل سے سو فیصد اتفاق ہے کہ حسن چشتی کا مرتب کردہ مجتبیٰ حسین کی تحریروں کا سٹ ایک ہزار روپے میں سستا ہے؛ کیوں کہ حسن انشاء لطف اظہار اور کلام بلیغ سے جو جمالیاتی اور ادبی آسودگی ملتی ہے وہ کئی ہزار روپے خرچ کرنے سے بھی نہیں ملتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سماج میں جو قدروں کا اختلال ہے اور عدم توازن ہے اور جو بے ہنگم پن پایا جاتا ہے اس کی ظریفانہ عکاسی بے چینی اور نا آسودگی کو جنم دیتی ہے۔ مجتبیٰ حسین کی تحریریں پڑھیے، آسودگی بھی ملے گی نا آسودگی بھی ملے گی، ان کی تحریریں، شعلہ بھی ہیں اور شبنم بھی، مسکراہٹ بھی ہیں اور آنسو بھی اور دونوں کے مجموعہ کو خندہ گریاں کہا جاتا ہے اور یہی مجتبیٰ حسین کا آرٹ ہے۔

شفیع شیخ کا آرٹ یہ ہے کہ اس نے مجتبیٰ حسین کے آرٹ کی ناقدانہ توضیح کردی ہے ایک نئے ڈھنگ سے ایک نئے آہنگ سے، اب ان کتابوں کی قدردانی کرنے والا کون ہے، مجتبیٰ حسین کا برجستہ جواب یہ ہے کہ دیمک کی ملکہ اور شفیع شیخ کا کنا یہ ہے کہ "لوگ نوشتۂ دیوار نہیں پڑھتے کتابیں کیا پڑھیں گے"۔ یہ ہماری زبان کا اور ہمارے ملک کا المیہ ہے کہ بک سے زیادہ چک بک کی اہمیت ہوگئی ہے، معیار بندگی کے بجائے معیار زندگی زیادہ اہم ہوگیا ہے، صارفیت اعلیٰ اخلاقی اقدار پر غالب آچکی ہے، موٹر اور شوفر بنگلہ اور گملہ ہر شخص کی زندگی کا مقصد بنتا جارہا ہے۔

یہاں زندان دلان حیدرآباد کی ایک جماعت موجود ہے؛ لیکن مجتبیٰ حسین کی تحریریں باغ ظرافت کے وہ پھول ہیں، جو مشام جاں کو معطر کردیتے ہیں اور اس حیثیت سے ان کو شہریار دکن اور تاجدار دکن کہا جاسکتا ہے۔ خدا کرے ان کے گلشن سخن کا کاروبار چلتا رہے، ان کا قلم منقار ہزار داستان بنا رہے اور ان کی بات قند و نبات محسوس ہوتی رہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

کچھ غمِ دنیا کچھ غمِ عقبیٰ

جناب یعقوب سروش کا قلم بقول غالب ''صریر خامہ نوائے سروش'' کا مصداق ہے اگر غالب کا دعویٰ ہے کہ غیب سے مضامین ان کے خیال میں آتے ہیں تو یعقوب سروش کے افسانوں میں تخیل کا دل فریب آب ورنگ ہے، اسی کے ساتھ حسن زبان کا شیریں آہنگ ہے، سطر سطر عظمت انسانیت کی خوشبو سے مہکی ہوئی ہے، تاریخ کے مؤثر واقعات کی بازگشت ہے۔ افسانوں کے مجموعے کا نام'' کچھ غم دنیا کچھ غم عقبیٰ'' ہے اُردو میں اسلامی تاریخ کو موضوع بنانے والوں میں نسیم حجازی کا قلم اعجاز رقم رہا ہے، یعقوب سروش کے مختصر افسانوں میں بھی وہی خوش نوائی اور وہی نغمہ سرائی کارفرما نظر آتی ہے، کتاب اس لائق ہے کہ تمام اُردو خواں اور زباں داں حلقہ میں پہنچے اور ہر شریف مسلمان گھر کے افراد خاندان اسے پڑھیں، اس سے تعمیر سیرت کا کام بھی لیا جاسکتا ہے اور زبان وادب کے ذوق کی پرورش کا بھی۔

کتابوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انسان کی بہترین دوست ہیں، میرا یہ خیال ہے کہ کتاب کا حال بھی دل کی طرح ہے جس کے بارے میں جگر نے یہ کہا تھا:

کامل رہبر قاتل رہزن
دل سا دوست نہ دل سا دشمن

کتابیں ذہن سازی کرتی ہیں کردار سازی کرتی ہیں، ان سے اچھا ذہن اور اچھا کردار بھی بنتا ہے؛ لیکن کتابیں کردار کو بگاڑنے میں بھی اپنا رول ادا کرتی ہیں، کتابوں کا مطالعہ شعور کی بالیدگی میں اور روح کی جلا میں اہم رول ادا کرتا ہے؛ لیکن غلط کتابوں کا مطالعہ انسان کو گم کردہ راہ بھی بناتا ہے اس لئے کتابوں کا انتخاب بھی کم اہم نہیں۔ فکر ناپختہ ہو اور شعور بالیدہ نہ ہو تو خراب کتابوں سے بڑھ کر انسان کا کوئی اور دشمن نہیں ہوتا ہے، قلم کی طاقت ایک زبردست طاقت ہے، یہ تیغ بے پناہ ہے، یہ حق کا پشتیبان بھی ہوتا ہے، یہ باطل کا پاسبان بھی ہوتا ہے، یہ دشنہ وخنجر بھی بنتا ہے، ندرتِ فکر کا جوہر بھی بنتا ہے، یہ بادنوبہار بھی ہوتا ہے عرصہ پیکار بھی ہوتا ہے۔ اس لئے قلم سے حق کی

حمایت بھی کی جا سکتی ہے اور باطل کی مدد بھی کی جا سکتی ہے، قلم بلا شبہ شہنشاہ بے سریر و بے تاج ہے؛ لیکن اس شہنشاہ کی رعیت اس کے قاری ہوتے ہیں اگر رعیت موجود ہے تو قلم کی سطوت قائم ہے اور جب ہی قلم کو اس دعویٰ کا حق ہے:

قلم گوید کہ من شاہ جہانم
قلم کش را بدولت می رسانم

پہلے جب اسلامی قدریں عام طور پر زندہ تھیں اور ادب کا حسن مزاق بھی گھروں میں پایا جاتا تھا تو راشد الخیری خواجہ حسن نظامی عبدالحلیم شرر وغیرہ کی کتابیں گھروں میں پڑھی جاتی تھیں، حفیظ جالندھری کی شاہ نامہ اسلام کی نظمیں لوگ یاد کرتے تھے، مسدس حالی اور کلیاتِ اقبال سے فکر اور ادب کے حاسہ کو غذا فراہم کرتے تھے۔ لیکن انگلش میڈیم اسکولوں کے نتیجہ میں ایسا انقلاب آ گیا کہ اُردو کتابیں گھروں سے غائب ہوگئی ہیں اور اُردو کے قلم ''شاہ جہانم'' کی مملکت ویران ہوگئی ہے اور اُردو کے قلم کش کی دولت تک رسائی نہیں ہے، وہ فقر و فاقہ کا شکار اور پریشان حالی میں گرفتار ہے آج ہر گھر میں بڑے اور چھوٹے ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر ٹی وی سے دل بہلاتے رہتے ہیں، کتاب ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے اور پڑھنے کی روایت ٹوٹ گئی ہے۔ جناب یعقوب سروش کی یہ کتاب اس لائق تھی کہ ایک ایک گھر تک پہنچے، ہر شخص کے مطالعہ سے گذرے، ہر دماغ اس سے فیض یاب ہو اور نیکی کی قدروں سے بہرہ یاب ہو؛ لیکن افسوس کہ اب نیا رنگ جہاں ہے اور دور گردوں کچھ اور ہے۔

آن قدح بشکست و آں ساقی نماند

جناب یعقوب سروش کئی کتابوں کے مصنف ہیں، اس وقت ادبی مجلّہ بساطِ ذکر و فکر کے ایڈیٹر ہیں پہلے برصغیر کے مجلات و جرائد میں ان کی مضامین اور افسانے زیورِ طبع سے آراستہ ہوتے رہے تھے اور اہل ذوق سے داد تحسین و آفرین وصول کرتے تھے۔ ان کی کتاب '' کچھ غم دنیا کچھ غم عقبیٰ'' ان کے شائع شدہ افسانوں کا مجموعہ ہے، ہر افسانہ نیکی اور شرافت کی قدروں کو اُجاگر کرنے والا ہے اسی کے ساتھ فن پر ان کی دست رس ہے اور زبان پر ایسی قدرت ہے جو اُردو زبان کے بہت سے نقادوں اور آج کے بیشتر دل بے قرار کے افسانے رقم کرنے والوں کو نصیب نہیں۔ آج کے بہت سے اہل قلم کی زبان روکھی پھیکی ہے وہ ہجے کر کر کے لکھتے ہیں، قلم کی زبان سے تو تلاہٹ اور لکنت کا اظہار ہوتا ہے، ایسی تحریروں کے برعکس یہ کتاب '' کچھ غم دنیا کچھ غم عقبیٰ''، شگفتگی کا نمونہ ہے، کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان ہے، یقین سے سرشار بیان ہے، ہر سطر میں شہد کی سی حلاوت ہے

اور ہر بات قند و نبات ہے۔ مضمون اور اُسلوب دونوں پاکیزہ جاذب دل اور جاذب نظر ہیں، کتاب ایسی ہے کہ اس کی پذیرائی ادب اور شرافت کی ہم رشتگی کو پسند کرنے والے ہر گھر میں ہونی چاہئے اور ٹکسٹ بک کی طرح نوجوانوں کو اور طالب علموں کو پڑھنی چاہئے، ہر مکتبہ اور ہر کتاب خانہ میں یہ کتاب موجود ہونی چاہئے، تاکہ معاشرہ میں شریفانہ قدروں کو فروغ ہو اور زبان و ادب کا صاف ستھرا ذوق پیدا ہو۔

یعقوب سروش اسلامی اور مشرقی قدروں کے علم بردار ہیں؛ لیکن انھوں نے اپنی بات فن کے دائرہ کے اندر کی ہے، اس فن اور افسانہ میں وعظ و ارشاد کا راست اُسلوب نہیں اختیار کیا جاتا ہے، قصہ نگاری کا فن شاعری کی طرح ریاض چاہتا ہے۔ شاعری کی طرح افسانہ کی صنف ادب مختلف تجربات کی جولانگاہ رہی ہے، اس کی مقبولیت پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے، اس سے تعمیر کا کام بھی لیا گیا ہے اور اسے تخریب کا ذریعہ بھی بنایا گیا ہے، اس نے گم کردہ راہ انسانوں کی رہبری بھی کی ہے اس نے نیکی اور شرافت کی دولت رکھنے والے گھروں میں رہزنی بھی کی ہے، وہ راحت جان بھی بنی ہے، آفت ایمان بھی بنی ہے، لوگ جس طرح شاعری سے مسحور ہوتے ہیں افسانوں سے بھی مخمور ہوتے ہیں، پریم چند سے کرشن چندر تک بے شمار نام ہیں، جنھوں نے مقبولیت کا رکارڈ قائم کیا ہے۔

لیکن قصہ نگاری کا میدان وہ ہے جسے دین و ایمان کی قدروں پر یقین کرنے والے دوسروں کے لئے چھوڑتے چلے جارہے ہیں، انھوں نے اسے شجر ممنوعہ سمجھ لیا ہے، جو لوگ دین کی خدمت کرتے ہیں وہ افسانہ کے فن سے نا آشنا ہیں اور جنھیں افسانہ نگاری اور ناول نویسی کا فن آتا ہے، وہ دینی قدروں پر یقین نہیں رکھتے۔ وہ حقیقت نگاری کے نام پر اور معاشرہ کی برائیوں کی تصویر کشی کے نام پر وہ انداز اختیار کرتے ہیں کہ برائی میں کشش اور نوجوانوں میں بے راہ روی پیدا ہو جاتی ہے، جنسی مسائل کو بے باکی سے بیان کیا جاتا ہے، فرائڈ کے متبعین اور ڈی ایچ لارنس کے حلقہ بگوشوں کی ہماری زبان میں کمی نہیں، عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو اُردو میں اور یوسف السباعی احسان عبدالقدوس اور یوسف ادریس عربی زبان میں عریاں نگاری کے میدان میں شہرت رکھتے ہیں۔ یہ ادبی صورت حال افسوسناک ہے؛ لیکن اس کی ذمہ داری ان اسلامی قدروں پر یقین رکھنے والوں پر بھی عائد ہوتی ہے، جنھوں نے ادب کی اس طاقتور صنف سے دست برداری اختیار کرلی ہے اور اس ہتھیار کو جس سے خیر کے دفاع کا کام لیا جاسکتا تھا، مریضانہ ذہن رکھنے والوں کے حوالہ کردیا ہے۔

یعقوب سروش کے افسانوں کی مسلم اور محترم صاحبانِ قلم نے داد دی ہے، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید رقم طراز ہیں:

افسانہ افسانہ پن سے عاری ہوتا جارہا ہے، کہیں بھول بھلیاں ہیں، کہیں ریاضی کے مسئلہ کا گمان ہوتا ہے اور کہیں تو پتہ ہی نہیں چلتا ہے کہ کہنے والے نے کیا کہہ دیا۔ یعقوب سروش کو افسانہ نگاری کے فن پر عبور ہے، منظر نگاری اور کردار نگاری کا ہنر وہ جانتے ہیں، کردار نگاری ہی سے افسانہ میں آن اور جان آتی ہے؛ لیکن ان کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی ان کی چست زبان، دلچسپ انداز بیان اور سہل و سادہ طرز نگارش ہے۔ وہ کفایت لفظی سے کام لیتے ہوئے افسانوں کو دلچسپ اور دل پذیر بنادیتے ہیں، زبان و بیان پر ایسی دست رس آج کے جدید افسانہ نگاروں کے پاس خال خال ملے گی۔

پروفیسر احمد سجاد نے لکھا ہے:

اس دور میں فکری بے سمتی اور فنی ترک تازیوں کے سبب اُردو افسانہ کا کہانی پن بطور خاص مجروح ہوا ہے، چنانچہ ادب کے قارئین کی ایک بڑی تعداد نفس ادب ہی سے بدظن ہوگئی، تجرباتی خام کاری کے اس دور میں سلامتی فکر اور افسانہ کی آبرو رکھنے والے جو چند اہم فنکار رہ گئے تھے، ان میں ایک اہم نام یعقوب سروش کا بھی ہے۔

پروفیسر عقیل ہاشمی نے لکھا ہے کہ:

جناب یعقوب سرورش کی یہ تخلیقات ادب اور تاریخ کا بہترین امتزاج پیش کرتی ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆

پہلو نہ دُکھے گا

خطوط نویسی ادب میں ایک مقام رکھتی ہے، غالب کے خطوط اپنی بے ساختگی کے لئے اور مولانا آزاد کے خطوط اپنی ساختگی یعنی اپنی صناعی اور ریزہ کاری کے لئے ادب کی دنیا میں مشہور ہیں، اس میں شعر و ادب ہے، علمی تجربہ ہے۔ قاضی عبدالغفار کی کتاب ''لیلیٰ کے خطوط'' کی بھی ادبی حلقہ میں شہرت ہوئی؛ لیکن یہ خطوط فرضی نوعیت کے تھے، ان میں ادب کی ہنر آفرینی تو تھی؛ لیکن گوشت پوست کا انسان ان خطوط کا مخاطب نہ تھا، اُلٹے ان میں تصنع تھا، زندگی نہ تھی، آورد تھا، آمد نہ تھی۔ خطوط کے اور بھی بہت سے مجموعے ہیں اور قابل قدر ہیں، مکاتبِ گیلانی، مکاتبِ شبلی، مکتوباتِ ماجدی وغیرہ، غالب کے خطوط سب سے زیادہ مشہور ہوئے، کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے خطوط کو مکالمہ بنا دیا، اس میں بے تکلفی ہے برجستگی ہے؛ لیکن کلیم عاجز کے خطوط الگ نوعیت کے ہیں۔ غالب کا ادبی مرتبہ مسلم؛ لیکن ان کے خطوط میں قلب و روح کے لئے کوئی ایسا پیغام نہیں ملے گا جو ان دونوں کو گرما بھی دے اور تڑپا بھی دے، کلیم عاجز سراپا دین دار مشرقی روایت کے امین ہیں، اس لئے بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لے چلنے کا پیغام ان کے خطوط میں صراحت کے ساتھ یا اشارت کے ساتھ ضرور مل جائے گا۔ کتاب میں ان کے طویل مقدمہ میں بھی اور خطوط میں بھی یہ پیغام موجود ہے، ان کے کلام میں جو انفرادیت ہے وہ ان کے مکاتیب میں بھی ہے، کلام میں بلند فلسفہ کی گہرائی نہیں ہے؛ لیکن خلوص دل ہے اور محبت ہے وہ کہتے ہیں:

کر نہ سکیے محبت تو مرجایئے
زندگی کام کی ہے اسی کام تک

یہ ایک شکستہ خاطر ماموں کے خطوط ہیں، شکستہ خاطر بھانجی کے نام، کلیم عاجز جو ماموں ہیں، مکتوب نگار ہیں، ان کے خاندان کے لوگ بہار کے ۴۷ کے فسادات میں شہید ہوئے تھے، ریحانہ جو بھانجی ہیں، مکتوب الیہ ہیں تعلیم یافتہ ہیں، ادب آشنا ہیں، اب امریکہ میں مقیم ہیں، ان کے والد بنگلہ دیش کے فسادات میں شہید ہوئے تھے۔ جب ایسٹ پاکستان نزع کے عالم میں تھا اور

بنگلہ دیش کا فاتحانہ ظہور ہونے والا تھا، ایک شکستہ خاطر ماموں نے شکستہ خاطر بھانجی کو مخاطب بنایا ہے ، اس میں ولداری ہے، حوصلہ افزائی ہے، نصیحتوں کی سوغات ہے، کلیم عاجز کی اپنی شاعری غم والم سوز وساز اور درد وداغ کا مرقع ہے، یہ شکستہ خاطری کلیم عاجز کے کلام کی سب سے بڑی شناخت بن گئی ہے اور جو کلام دل سے نکلتا ہے وہ دل پر اثر انداز بھی ہوتا ہے، کلیم عاجز کہتے ہیں:

کیا دل ہے کہ آرام سے اک سانس نہ لے ہے
محفل سے جو نکلے ہے تو خلوت میں جلے ہے

کلیم عاجز کے یہاں خلوص دل کی دولت بہت ہے جواب نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے، اب اہل خرد جون پور کے اس قاضی کی سادہ لوحی کا مذاق اُڑاتے ہیں، جس نے ایک مسلمان کے کہنے پر یقین کرلیا تھا کہ لوہے کا پل بارش اور سیلاب میں بہہ گیا۔ اس زمانہ کا قاضی جن قدروں پر یقین رکھتا تھا وہ قدریں اب ناپید ہیں، اب بے اعتمادی اور دجل وفریب کا زمانہ ہے، خلوص دل اور اعتماد اور سادگی اور بھولا پن کوئی نہیں چاہتا ہر شخص تیزی طراری، چالاکی، ڈپلومیسی، ہوشیاری، کا وطیرہ اختیار کرنا چاہتا ہے۔ قاضی جونپور کی سادہ لوحی پر اور قدروں پر ان کے غیر متزلزل یقین پر احترام سے سر جھکانے کو جی چاہتا ہے، جونپور کے قاضی کو یہ یقین ہی نہیں آتا تھا وہ یہ باور ہی نہیں کرسکتا تھا کہ ایک مسلمان بھی جھوٹ بول سکتا ہے، اس سادہ لوحی پر ہزاروں عقل مندوں کی عقل مندیاں قربان، اس کی معصوم نگاہ پر سوز پر سود وسودا اور مکر وفن کی دنیا ہزار بار صدقے۔

آنکھوں پہ تری صدقہ کرکے
جنگل میں ہرن کو چھوڑ دیا

کلیم عاجز پرانی قدروں کے قائل ہیں ان ہی کے قتیل اور گھائل ہیں اور ان ہی کی طرف مائل ہیں، ایک جگہ لکھتے ہیں "ہم پھوٹ کر روتے ہیں اور ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں" ایسا انسان کبھی دھوکا تو کھا سکتا ہے؛ لیکن کبھی بھی وہ کسی کو بھی دھوکا دے نہیں سکتا، اس پر آنکھ بند کرکے بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے قول پر، اس کے وعدے پر، اس کی محبت پر، اس کی وفا پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، کسی دوست، کسی محبوب سے جدا ہوتے ہوئے چشم حزین و پرنم اور دیدہ تر کی شبنم معمولی چیز نہیں ہوتی، آنکھ میں آنسو کا قطرہ انسان کے پورے وجود، اس کی پوری شخصیت سے کشید کیا ہوا قطرہ ہوتا ہے، یہ قطرہ موتی سے کم قیمتی نہیں ہوتا، اسی لئے ایک شاعر نے کہا ہے:

وہ لے لیں گوشہ دامن میں اپنے یا فلک چن لے
مری آنکھوں میں آنسو بار بار آیا نہیں کرتے

محبت میں رونے والا انسان مخلص ہوتا ہے؛ کیوں کہ اس کا رونا محبت اور خلوص کی دلیل ہوتا ہے، بے وفائی عہد شکنی کا سایہ بھی اس پر نہیں پڑتا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں: ''میرے دل میں خدا داد محبت ہے کیا کریں، ملتا ہوں، تو ہنستا ہوں، جدا ہوتا ہوں، تو روتا ہوں، اس رونے ہنسنے میں جو مزا ہے وہ کسی کو نصیب نہیں''۔

خطوط نگاری میں کلیم عاجز نے غالب کو اپنا رہنما نہیں بنایا؛ لیکن شاعری میں اپنا چراغ میر کے چراغ سے ضرور جلایا، میر تقی میر کے شعر میں بھی کتنا غم ہے:

درد جھیلے تھے زخم کھائے تھے
دل نے صدمے بہت اٹھائے تھے

فرصت زندگی سے مت پوچھو
سانس بھی ہم نہ لینے پائے تھے

دیکھئے کلیم عاجز نے اس غم کے سانچہ میں خود کو کس طرح ڈھالا ہے۔

مری ہر غزل کے رباب سے یہ نکل رہی ہے صدائے دل
تو کسی کا دل نہ دکھائیو کوئی لاکھ تیرا دکھائے دل

اسے کیا سلیقۂ شاعری جو پھرے ہے اپنا بچائے دل
وہ کلیم جیسی غزل کہے جو کلیم جیسا بنائے دل

مرے دل کے محرم راز کا یہی حکم ہے برائے دل
کہ اگر چراغ نہیں رہے تو کلیم اپنا جلائے دل

بڑی جھیلیں دل پہ مصیبتیں بہت آئی دل پہ بلائے دل
مگر اب تک اپنی زبان سے نہ نکلا کبھی کہ ہائے دل

کلیم عاجز کے خطوط میں بھی سوز ہے زندگی کے تجربات ہیں، سادگی ہے اور بے تکلفی ہے اور دل کی باتیں ہیں وہ لکھتے ہیں:

زخم کھا کر پھول کھلانے کی تمنا مجھ سے شعر کہلاتی ہے، ادب لکھواتی ہے، خطوط رقم

کرواتی ہے، سب کا سرچشمہ ایک ہی ہے زخم کھانا اور زخم سے دوسروں کو بچانا
ادب کا سرچشمہ اور ادب کا موضوع ہے، ریحانہ کو چشم زخم سے بچانا اور اس کے نام
خطوط لکھنا بنیادی تمنا۔

کلیم عاجز کی نثری کتابیں اور خودنوشت سوانح ان کے کلام کی بہترین تشریح ہیں، اسی طرح سے خطوط کا یہ مجموعہ کلیم عاجز کے مزاج وافتادنظریہ ادب اور نظریہ حیات پر روشنی ڈالتا ہے، کچھ اقتباسات اس کتاب کے نقل کئے جاتے ہیں، ان سے اندازہ ہوگا کہ کلیم عاجز جو اپنی پرسوز شاعری میں نظر آتے ہیں وہی نثر میں خطوط میں بھی نظر آتے ہیں۔

۱۔ مسلمانوں کو علم وعمل، یقین واعتماد کی خودآ گاہی اور خودشناسی کی ضرورت ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ مال سب چیزیں مہیا کردے گا، یہ غلط ہے، فطری قانون کے اعتبار سے بھی اور مشاہدہ تاریخ کے اعتبار سے بھی۔ مال ان کی کمی کو پورا نہیں کرے گا، کمی میں اضافہ کرے گا اور اضافہ ہورہا ہے، جس قدر مال مختلف شکلوں میں آرہا ہے، تعلیمی اداروں کی عمارتیں بن رہی ہیں ان تعلیمی اداروں میں پڑھنے والوں کا کردار نہیں بن رہا ہے، کردار بگڑ رہا ہے۔

۲۔ زبان میں بڑی طاقت ہے، یہ دل میں اتر بھی سکتی ہے اور دل میں اتری ہوئی باتوں کو نکال بھی سکتی ہے۔

۳۔ اُردو کے حسن کو اپنی زبان، اپنی تحریر، اپنے ادب میں سمونے کے لئے اچھی، معیاری کتابوں کا مستقل مطالعہ بہت ضروری ہے، اس سے پڑھنے والے کا ذہنی ذوق بھی بلند ہوگا، ذوق اور تخلیقی استعداد بھی اُبھرے گی۔

۴۔ انسان، فطرت سے دور اس لئے ہے کہ انسان نے فطرت کا ساتھ چھوڑ دیا ہے، چمکتی ہوئی صناعی اسے متاثر کرنے لگی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ اب فطرت بھی اسے درکنار کررہی ہے، اب غذا، لباس، مکان، رشتہ مندی، تعلق سب میں صناعی تیزی سے شامل ہورہی ہے۔

۵۔ المیہ یہ ہے کہ یہ دور اعتماد اور یقین سے خالی ہوتا جارہا ہے، موسم اور آب وہوا سے سب متاثر ہوتے ہیں، ادیب اور شاعر بھی اسی دنیا کے ہیں، اعتماد کا کھونا بھی انسان کو بے سمت اور بے مقصد بنادیتا ہے۔

۶۔ وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو (غالب)

۷- یہ سر پھوڑنا معمولی بات ہے، بتاؤ دنیا میں ایسا کوئی ہے جو اپنا سر پھوڑے، ساری دنیا دوسروں کا سر پھوڑنے پر تلی ہوئی ہے، دیکھو میاں بش کو افغانستان، عراق، دنیا دنیا کا سر پھوڑ رہے ہیں اپنا سر کون پھوڑتا ہے، ارے یہ دیوانگی کون اختیار کرتا ہے، سب تو ہوشیار چالاک بنے ہوئے ہیں، اپنا سر پھوڑنے کے بجائے دوسروں کا سر پھوڑنا کتنا آسان کام ہے، ادب وشعر جواب دوکوڑی کے مول بکتے ہیں، صرف اسی لئے دوکوڑی کے ہوگئے ہیں، ورنہ ادب وشعر کے ڈیوڑھی پر تو شاہان وقت کے سر جھکتے تھے۔

۸- ایک حدیث کا مفہوم ہے دنیا میں اور دنیا والوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے خود کو مایوس اور بے نیاز کرلو، سو میں نے کرلیا ہے، پچاس سال پہلے ہاتھ سے چمچہ چھوٹا، لبوں سے پیالہ چھوٹا، پھر کبھی پیالہ کی تمنا ہی نہیں کی جب انگلیاں سمیٹیں چلو بن گیا، سب کام اسی چلو نے آسان کردیا اور ہر طرح کی نیازمندی سے بے نیاز کردیا۔

۹- پچاس سال پہلے آشیانہ جل گیا تو پھر نشیمن نہیں بنایا، ڈالیوں پر پتوں کے سائے میں زندگی گذارتا رہا ہوں اور گذار رہا ہوں۔

دن بسر کر کے مشقت کی کڑی دھوپ میں ہم، شب کو سو رہتے ہیں ہاتھ سرہانہ دھر کے۔

۱۰- مردہ وہ نہیں جس کے جسم سے روح نکل گئی، مردہ وہ ہے جس کی زندگی سے خدا کا حکم اور رسول کا طریقہ نکل گیا ہو۔

۱۱- ہم بہت چھوٹے آدمی ہیں، بہت گوشہ گیر بہت خاموش، مشقت اور تکلیف کی دنیا میں، مگر خود کو بہت بڑا آدمی سمجھتے ہیں کہ ہم نے کائنات کی سب سے قیمتی چیز کی حفاظت کی ہے اور حفاظت کررہے ہیں، جانتی ہو وہ قیمتی اور انمول چیز کیا ہے؟ محبت اور بے لوث محبت۔

۱۲- مشقت میں رہنا کوئی نئی بات نہیں، زندگی تو مشقت میں سنورتی ہے، محنت میں نکھرتی ہے، مشقت میں، محنت میں، آئیڈیل بلند رہے، نظریہ اونچا رہے، اس کی بڑی اہمیت بڑی عظمت ہے، مجاہدہ کا لفظ قرآن میں اسی لئے آیا ہے اور اسی سے جہاد نکلا ہے، مشقت اور مجاہدے میں زندگی گذارنے والے اللہ کو مقبول ہیں۔

۱۳- یہ نعمت درد وسوز تم کو بھی ملی ہے تو اسے سنبھال کر رکھو، اس کا کوئی حصہ ضائع نہ ہونے دو، امریکہ میں یہ نہایت دشوار مسئلہ ہے اور اندازہ ہے کہ تم دشواریوں کے مقابلہ میں سپر ڈال

دوگی ،تو یہ تو آسان ہے، بہار کے ساتھ چلنا عافیت کا کام ہے، عافیت میں دشواری اختیار کرنے والے اہل ہمت ہیں مگر ایسے اہل ہمت اب کہاں۔

۱۴- بہت زیادہ آرام اور آسائش سے بچنا چاہئے کہ یہ دل کی موت ہے، جسم زندہ رہتا ہے؛ لیکن دل مر جاتا ہے اور مرگ دل کے بعد زندگی کیسی۔

۱۵- ہمارے نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو خدا کو یاد کرتا ہے، ذکر کرتا ہے، وہ زندہ ہے، جو خدا کا ذکر نہیں کرتا وہ مردہ ہے، مسلمانوں کے دلوں سے ایمان نکل کر باہر آ گیا ہے، گھروں میں طغرے ہیں، مسجدوں میں قرآن ہیں، کتابیں ہیں، تقریریں ہیں، کانفرنس ہیں، مباحثے ہیں، مناظرے ہیں، یہ سب علامتیں اس کی ہیں کہ دین زندگی سے نکل کر باہر سج گیا ہے۔

۱۶- تم کیا سمجھتی ہو کہ دنیا قدموں کے نیچے ہری بھری ریشمی گھاس، سر پر اودی اودی گھٹاؤں اور چہرے پر نسیم سحری کی نکہت آمیز سرسراہٹ کا نام ہے؟ تو اس مغالطہ میں نہ رہنا، دنیا کو سمجھنے کی کوشش کرو اسے جتنا سمجھوگی اتنا ہی جینے کا حوصلہ اور تاریکیوں میں راستہ طے کرنے کا عزم پیدا ہوگا ورنہ سر شام دیوانہ ہو کر، دامن پھاڑ کر، صحرا کو نکل جانا پڑے گا، اس فرار اور اعتراف شکست سے ہمیشہ اپنے کو بچانا۔

کلیم عاجز کے خطوط پڑھنے کے لائق ہیں، یہ کسی اور ہی دنیا کے خطوط ہے، ایسے انسان کے خطوط ہیں جس کی زندگی سراپا محبت، ایثار، دردمندی اور خلوص سے عبارت ہے، اس میں ذہنی اور فکری تربیت کا سامان بھی ہے اور وقت کے تیز دھاروں کی مخالف سمت میں تیرنے کی حوصلہ افزائی بھی ہے اور اس کا احساس کلیم عاجز کو خود ہے۔

یہی بچائے گی شمشیر وقت سے عاجز
ہماری بات قریب رگ گلو رکھیو

☆ ☆ ☆ ☆

اسماعیل میرٹھی کی اُردو کی ریڈریں

اُردو زبان کے بچوں کے ادب میں اسماعیل میرٹھی کی خدمات ناقابل فراموش رہی ہیں، کتنے خوش قلم اور انشار قم ادیب پیدا ہوئے جن کے ادبی ذوق کی تربیت اسماعیل میرٹھی کی نثر نے کی اور کتنے شاعر اور نظم نگار اٹھے جن کے قلم کو شاعری اسماعیل میرٹھی کی نظموں نے سکھائی۔ بچوں کے لئے اُردو کی ریڈر تیار کرنے والے بہت سے اہل قلم ہیں؛ لیکن زبان و بیان کا جو حسن اسماعیل میرٹھی کی کتابوں میں پایا گیا وہ اور کہیں نہیں ملتا، بارش کے قطرے تو بے شمار اور موسلا دھار برستے ہیں: لیکن کوئی ایک ہی قطرہ صدف میں موتی بن کر نکلتا ہے، بچوں کا لٹریچر بہت سے اہل قلم نے تیار کیا، ادب اور شاعری میں اسماعیل میرٹھی وہ گوہر بے بہا تھے جن کی کتابیں بچوں کے لئے ادب آموز ثابت ہوئیں۔

اسماعیل میرٹھی ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے، یہ انگریزوں کی حکومت کا زمانہ تھا، اس عہد میں ادب کی دنیا میں ایک آفتاب تازہ پیدا ہوا جس نے بچوں کی ادب کی دنیا کو روشنی سے بھر دیا، ان کی تحریریں بہت آسان؛ لیکن ادبی ذوق کو بالیدہ کرنے والی ہوتی ہیں اور جو وہ نظمیں لکھتے ہیں وہ اپنی سادگی کے ساتھ پرکاری میں بے نظیر ہوتی ہیں، آج ہندوستان میں اُردو زبان و ادب سے واقف کون شخص ہوگا جس کے حافظہ نے یہ شعر محفوظ نہ کر رکھا ہو۔

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

اس شعر میں کتنی خوبصورتی کے ساتھ شاعر نے بچوں کو خدا کا شکر گذار بندہ بننے کی نصیحت کی ہے اور گائے کی پرستش پر ضرب لگائی ہے، اسماعیل میرٹھی نے اُردو کا پہلا قاعدہ اور پانچویں درجہ تک کی کتابیں تصنیف کیں، کتابوں کے اس سلسلہ نے لاکھوں نوخیز ذہنوں کی ادبی پرورش کی، اسماعیل میرٹھی کی کتابیں پڑھ کر لوگ ادیب اور شاعر بن گئے، نظمیں سب نصیحت اور موعظت کا مرقع، ان کی نظمیں ''عجیب چڑیا، گھوڑا، ملمع کی انگوٹھی، محنت سے راحت اور تاروں بھری رات''

سادگی اور خوبصورتی کا نمونہ ہیں، انھوں نے خطاب تو بچوں سے کیا؛ لیکن بچوں کو بڑا بننے کا سلیقہ سکھایا۔

اسماعیل میرٹھی بچوں کے اتنے اچھے شاعر کیسے بن گئے اور ان کے کلام میں سادگی کے ساتھ پختگی کیسے پیدا ہوئی؟ اس سوال کا جواب ان کی زندگی سے واقف اہل خاندان نے دیا ہے، انھوں نے اُردو کے اساتذہ کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا اور کبھی کبھی استاد کی زمین پر غزل کہنے کی بھی کوشش کرتے تھے، یہ جوہر قابل مسلسل ادب کے مطالعہ سے وجود میں آیا، اسی تحقیق اور مطالعہ نے ان کی صلاحیتوں کو سنوارا اور نکھارا، ان کی شعر گوئی کی پوشیدہ صلاحیت اُبھر آئی۔

اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے برگزیدہ شاعر بننے سے پہلے ایام جوانی میں ۱۸۶۵ء کے آس پاس غزلیں بھی کہیں تھیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

آخر یہ حسن چھپ نہ سکے گا نقاب میں
شرماؤ گے تمھیں نہ کرو ضد حجاب میں

کس کس کے جور اُٹھائیں گے آگے کو دیکھئے
دشمن ہے چرخ پیر زمانہ شباب میں

اساتذہ کے کلام کے مطالعہ نے شروع ہی سے ان کی شاعری میں پختگی پیدا کردی تھی:

تو اور عذر طعن رقیباں غضب ہوا
دل پارہ پارہ جب نہ ہوا تھا تو اب ہوا

لیکن اسماعیل میرٹھی کو اصل شہرت بچوں کی اُردو کی نصابی کتابوں سے حاصل ہوئی، انھوں نے یہ نصابی کتابیں سر رشتہ تعلیم ممالک متحدہ آگرہ اودھ وصوبہ جات بہار واڑیسہ کی تجویز پر مرتب کی تھیں۔ ان درسی کتابوں میں اُردو کی گرامر غیر شعوری طور پر بچوں کے ذہن نشین کرائی گئی ہے، چھوٹی چھوٹی عبارتوں سے اُردو انشا کی مشق کرائی گئی ہے، زبان بہت سادہ؛ لیکن انشا کے حسن سے خالی نہیں، ہر سبق کے ذریعہ بچوں کو کام کی بات سکھائی گئی ہے، ہر درس پندو موعظت ہے، ایک سبق کے چند جملے ملاحظہ ہوں:

نیلا آسمان، روشن سورج، اجلا چاند اور جگمگاتے تارے کس نے بنائے؟ یہ سب چیزیں خدا نے پیدا کی ہیں، خدا بڑا مہربان اور کل عالم کا نگہبان ہے، وہی سب کو پالتا اور روزی دیتا ہے،

وہی جلاتا اور مارتا ہے، وہی بناتا اور بگاڑتا ہے، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

ان درسی کتابوں میں جو نظمیں دی گئی ہیں اور جو اشعار درج کیے گئے ہیں، وہ نہ صرف اسماعیل میرٹھی کی فنی پختگی کی آئینہ دار ہیں؛ بلکہ بچوں کی نفسیات تعلیم سے ان کی آگہی پر بھی ان سے روشنی پڑتی ہے، یہ اشعار جب بچوں کے زبان زد ہو جاتے ہیں تو ان سے جو موعظت حاصل ہوتی ہے وہ بھی ذہن نشین ہو جاتی ہے اور پھر ان سے شعری ذوق بھی پروان چڑھتا ہے:

صبح ہوئی نور کا تڑکا ہوا
ہوشیار اسکول کا لڑکا ہوا

ہونے کو آئی صبح تو ٹھنڈی ہوا چلی
کیا دھیمی دھیمی چال سے یہ خوش ادا چلی

لہرا دیا ہے کھیت کو ہلتی ہیں بالیاں
پودے بھی جھولتے ہیں لچکتی ہیں ڈالیاں
گھٹا کا تن گیا ہے شامیانہ
بجایا رعد نے نقار خانہ

گھٹا کس سوچ میں چپکی کھڑی ہے
برس آخر تو ساون کی جھڑی ہے

بھنبیری اُڑ کہ ساون آگیا اب
گھٹا اٹدی ہے بادل چھاگیا اب

کہو کویل سے امرودوں پہ بولے
پھدک ٹہنی پہ تو بھی او ممولے

کٹورا سا ہوا تالاب لبریز
کہو مینڈک سے اپنی لے کرے تیز

زبان اپنی بھگولے او ٹیٹری
بجا دے تو بھی اے جھنگر نفیری

اُردو کی کوئی بھی ریڈر نہیں جو ادبی اعتبار سے اسماعیل میرٹھی کی درسی کتابوں کا مقابلہ کر سکتی ہو، اس لئے یہ درسی کتابیں بہت زیادہ مقبول ہوئیں۔

☆ ☆ ☆ ☆
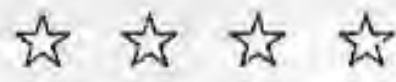
ادب کا اسلامی تناظر

پیش نظر کتاب ایک ایسے نوجوان فاضل کے ادبی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے، جس کے نام سے تعمیر پسند ادبی حلقے مانوس اور مریضانہ ذہن کے اہل قلم مایوس ہوتے جارہے ہیں۔ اس نوجوان کے مضامین میں کہنہ مشق ادیب کی سنجیدگی، فکر بلند کی روشنی اور زبان وادب کی چاشنی موجود ہے، انشاءپردازی کا یہ جوہر ادب کی دنیا میں طویل عرصہ تک بادہ پیمائی اور جبیں پر گرد سفر پڑنے کے بعد حاصل ہوتا ہے؛ لیکن ایک نوجوان جو ابھی نارسیدۂ زندگی ہے اگر اس کے اُسلوب میں سن رسیدہ اور سرد و گرم چشیدہ معمر حضرات کی متانت اور فضیلت کا رنگ پایا جائے تو اسے اللہ تعالیٰ کا انعام خاص کہا جاسکتا ہے۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

عزیز فاضل ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی نوجوان ہونے کے باوجود بساط ادب پر تازہ وارد نہیں ہیں، کئی کتابوں کے مصنف ہیں، نعت گوئی پر ان کی کتاب ادبی حلقہ میں پسند کی گئی، اُن کی یہ نئی اور تازہ کتاب ''ادب کا اسلامی تناظر'' ادب کے اُفق پر ایک نئے نجم السحر کے طلوع ہونے کی باقاعدہ بشارت ہے اور مژدہ ہے کہ اب جلد ایک نیا معیار سامنے آنے والا ہے اور اس نوجوان کے مضامین حلقۂ شام وسحر سے آزاد ہو کر رنگ ثبات دوام حاصل کرنے والے ہیں۔

مصنف نے اپنی کتاب کا نام ''ادب کا اسلامی تناظر'' رکھا ہے، اگر وہ اسلامی تناظر کا لفظ نہ لکھتے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا، مصنف کا تعلق جس دینی اور روحانی خانوادہ سے ہے اس کے کسی فرزند کے قلم سے ادب کا جو شہد ٹپکے گا اس میں اسلامی تناظر کی حلاوت اور ایمان کی مٹھاس پائی جائے گی۔ مصنف کے والد ماجد مولانا شاہ طیب عثمانی ندوی ہندوستان کے دینی وادبی حلقہ میں

اپنے سنجیدہ ادبی و علمی مضامین کی وجہ سے معروف ہیں مصنف کے دادا حضرت شاہ قاسم عثمانی فردوسیؒ کے مکتوبات بھی نقشِ دوام کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، گرچہ ان کا موضوع تزکیہ نفس اور تصوف ہے؛ لیکن قلم میں شگفتگی و رعنائی بھی ہے اور جد امجد حضرت مولانا حکیم شاہ محمد مجیب الحق کمالی فردوسیؒ اپنے وقت کے طبیب حاذق جسمانی و روحانی دونوں ہی تھے، ساتھ ہی عالم دین، فارسی زبان کے ادیب و شاعر تھے، جن کی نعتیں اور منقبتیں شعری و روحانی رفعتوں کی یادگار ہیں۔ اس خانوادہ کے اوپر کے ایک بزرگ حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء عثمانی پانی پتیؒ تھے جو سلسلہ چشتیہ کے مشہور بزرگوں میں سے ہیں، ان کے احفاد میں سے ایک بزرگ بہار تشریف لائے اور حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے سلسلہ میں وابستہ ہوئے اور اس طرح اس خاندان میں سلسلہ فردوسیہ کا طریقہ اصلاح و تربیت جاری رہا اور یہ میخانہ آج بھی قائم و دائم ہے:

ہنوز آں ابر رحمت درفشان است
خم و خم خانہ با مہر و نشان است

یوں تو بہار کے اس خانوادہ میں کئی معروف مصنف اور شاعر پیدا ہو چکے ہیں، جیسے حضرت شاہ باقر علیؒ پیر بیگھوی جن کا فارسی دیوان ''دیوانِ باقر'' حیدرآباد سے شائع ہوا ہے اور جس کے مقدمہ میں عثمانی خاندان کا حال تفصیل سے لکھا ہوا ہے اور جیسے اٹھارہویں صدی کے ایک بڑے باکمال شاعر حضرت سید شاہ کمال علیؒ دیوروی جو اگرچہ عثمانی نہ تھے؛ لیکن رشتہ مصاہرت کی وجہ سے خاندان کے بزرگوں میں تھے۔ لیکن اس خاندان کی اصل خوبی اور اصل ذہانت لفظی نہیں؛ بلکہ معنوی رہی ہے، زبانی نہیں؛ بلکہ روحانی رہی ہے، اہل نظر ذہانت کے چار مراتب بیان کرتے ہیں، چوتھا اور سب سے نیچا درجہ زبان کی ذہانت کا ہوتا ہے، جس میں الفاظ پر قابو حاصل ہو جاتا ہے، تیسرا اور زبان کی ذہانت سے اونچا درجہ دماغ کی ذہانت کا ہوتا ہے، جس سے بہت سی کتابیں مستحضر ہو جاتی ہیں اور صرف یہ دونوں ذہانتیں بھی کسی کو مل جاتی ہیں تو لوگ اس کو خوش قسمت سمجھتے ہیں اور اس کا نام دانشوروں اور دانش فروشوں کی فہرست میں آ جاتا ہے، اس سے آمدنی کے وسائل بھی بڑھ جاتے ہیں اور عزت و شہرت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مذکورہ دونوں قسم کی ذہانت سے بلند درجہ قلب کی ذہانت کا آتا ہے اور اس سے بھی بلند تر درجہ اور پہلا درجہ روح کی ذہانت کا ہے اور ان دونوں مؤخر الذکر ذہانتوں سے خود اپنے نفس کا سراغ ملتا ہے، یہ دونوں اعلیٰ درجہ کی ذہانتیں ہر شخص کو میسر نہیں آتیں، تا نہ بخشد خدائے بخشندہ؛ البتہ آدمی کتابوں کا مطالعہ کر کے تیسرے اور چوتھے درجے کی

ذہانت حاصل کر لیتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے:

علم سے دولت بھی ہے عزت بھی ہے شہرت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

اگر کسی شخص کو چاروں قسم کی ذہانتیں میسر آجائیں تو اس کی خوش قسمتی اور اس کی بلند مقامی پر آسمان کے تاروں کو بھی رشک آئے گا، مہر و ماہ اس کے ثنا خواں اور دشت و دریا اس کے لئے دست بدعا ہوں گے۔ وہ اپنی اس مجموعی خداداد ذہانت سے اپنی ذات کو بھی فائدہ پہنچائے گا اور اپنے سماج کو بھی، وہ مسترشد بھی ہوگا اور مرشد بھی، اصلاح یافتہ بھی اور مصلح بھی، صاحب قال بھی اور صاحب حال بھی اور عالم بھی معلم بھی، نیکیوں کا مجسمہ بھی اور نیکیوں کا مبلغ بھی، صاحب باطن بھی اور ظاہر میں ادیب، خطیب اور سحر طراز انشا پرداز بھی۔ لیکن ان چاروں قسم کی ذہانتوں کا ایک ہی ذات میں جمع ہو جانا نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے، بہت بڑی اور برگزیدہ روحانی شخصیتیں ایسی گذری ہیں جن کو زبان و قلم کی ظاہری طاقت اور ذہانت کا کوئی حصہ نہیں ملا اور بہت سے زبان آور ادیب و خطیب ایسے ملیں گے جن کو روحانیت کی ہوا تک نہیں لگی۔ ہر دور میں معدودے چند افراد ایسے ملیں گے جن کو ادب اور روحانیت کی جامعیت میسر آگئی ہو، ہندوستان کی سرزمین میں حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ سے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ تک اور خانوادہ ولی اللہی سے لے کر مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ تک ایک سلسلۃ الذہب موجود ہے جو ادب اور روحانیت دونوں کا سنگم رہا ہے۔

ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی کا تعلق جس روحانی خانوادہ سے ہے اس نسبت کی وجہ سے ان سے یہ توقع کرنا غلط نہیں ہوگا کہ وہ صف اول کے ادیب بھی بنیں گے اور اس روحانی ادب و ذہانت کے بھی وارث ہوں گے جو ان کے خاندان کا تمغہ امتیاز ہے۔ مغربی تہذیب کے سیلاب نے اس دور میں دینی اور روحانی گھرانوں اور خانقاہوں تک کا مزاج بدل کر رکھ دیا ہے، اس سیل سبک سیر و زمین گیر کے آگے بند باندھنا ایک کارِ دشوار نظر آنے لگا ہے، اس طوفان اور سیلاب نے دلوں کی دنیا کو ویران اور روحانیت کے محل کو کھنڈر بنا دیا ہے، رشاد عثمانی جیسے اُبھرتے ہوئے ادیب سے اقبال کے الفاظ میں یہ کہنے کا جی چاہتا ہے:

جس گھر کا مگر چراغ ہے تو
ہے اس کا مزاج عارفانہ

☆ ☆ ☆ ☆

نگارشات

پیش نظر کتاب ایسی شخصیت کے مضامین کا مجموعہ ہے جو محتاجِ تعارف نہیں ، مولانا عبداللہ عباس ندوی کی متعدد کتابیں شائع ہوکر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کرچکی ہیں، ان کے مضامین و مقالات کو جو زیادہ تر ماہنامہ ''ذکر و فکر'' میں شائع ہوتے رہے ہیں قبول عام حاصل ہوا ہے، ان مضامین میں ادب کی چاشنی بھی ہے اور فکر سلیم کی روشنی بھی اور علم و تحقیق کی سنجیدگی بھی۔ جب زبان ہوش مند کے ساتھ فکر ارجمند کی آمیزش ہوجاتی ہے تو ادب وجود میں آتا ہے اور جب اس میں دل دردمند بھی شامل ہوجاتا ہے تو تحریر کی تاثیر میں شتابہ لگ جاتا ہے۔ راقم سطور نے اس مجموعہ کا نام نگارشات رکھا ہے؛ کیوں کہ تحریریں عمدہ طرز نگارش کا نمونہ ہیں اور تمام معاصر علماء اور دانشوروں نے اس کو سراہا ہے، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے لکھا ہے کہ ''مولانا عبداللہ عباس ندوی ندوہ اسکول کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں اور ندوہ ایک تہذیب ہے، ایک نصب العین ہے، ایک روشنی ہے، تعلیم سے زیادہ قدروں کو سکھانے اور پھیلانے کا ادارہ ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ قدیم و جدید کا حسین نقطۂ اتصال ہے'' مولانا عبداللہ عباس ندوی کی تحریروں سے خواجہ احمد فاروقی کے خیال کی حرف بہ حرف تصدیق ہوتی ہے۔

راقم سطور کی نظر میں ندوہ اسکول کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اسلام کی دعوت اور خاص طور پر قرآن کریم سیرت اور سنت نبوی کو ادبی اور علمی اُسلوب میں پیش کرنے کا رواج سب سے پہلے اسی نے ڈالا اور آج بھی وہ اسی نہج پر قائم ہے۔ اس نہج کی نقلیں کی گئیں، ندوہ کے تصنیفی نہج پر ادارے قائم کئے گئے ہیں، ندوہ کے علمی و تصنیفی اسکول کی خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ کوئی بات بغیر حوالہ کے نقل نہیں کی جاتی، دوسروں کا حق غصب نہیں کیا جاتا، کوئی مضمون یا مقالہ تو بڑی چیز ہے، اگر کسی کا کوئی اچھا فقرہ بھی نقل کیا گیا تو اس کا حوالہ دیا گیا ہے، اگر حوالہ براہ راست اصل کتاب کا نہیں ہے؛ بلکہ کسی مضمون سے نقل کیا گیا ہے تو صراحت کردی جاتی ہے کہ فلاں جگہ سے نقل کیا گیا ہے۔ زبان و بیان کی دلکشی مشکل سے مشکل مضمون کا سمجھنا آسان کردیتی ہے، یہ بھی ندوہ کا امتیاز ہے اس کی مثال میں مولانا عبداللہ عباس ندوی کی حالیہ تصنیف ''تفہیم المنطق'' کو پیش کیا جاسکتا

ہے۔ جس میں پہلی بار منطق کو اسلامی ادب سے مربوط کر دیا گیا ہے۔

اس مجموعہ میں اس طرح کے مقالات ملیں گے، جن میں تحقیقی اُسلوب مکمل طور پر موجود ہے، مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن کا تجزیہ اس سے بہتر پہلے کسی نے نہیں کیا، خاص طور پر ان کے مراجع کی نشاندہی اور جہاں سے ان کی راہ دوسرے علماء اور مفسرین سے الگ ہوتی ہے اس کو بیان کر دیا گیا ہے، اسی طرح مولانا عبدالماجد دریابادی کی تفسیر کی انفرادیت، محسن کاکوروی کی لغت کا تجزیہ اور اس کے ہندوانہ تشبیب کی حقیقت پہلی بار اُردو ادب میں پیش کی گئی ہے۔

علمی وادبی ماہنامہ ذکر وفکر کے اداریے جو مولانا لکھتے رہے تھے وہ بھی خاصہ کی چیز ہیں، اس میں وقتی مسائل کا ربط دینی احساسات سے اس طرح قائم کیا گیا کہ اس کا اعتراف ان کے مخلصین ہی کو نہیں؛ بلکہ معاندین کو بھی ہوگا، اسی طرح سے تعمیر حیات میں ان کے قلم سے جو اداریے نکلے وہ بھی مقبول رہے اور عصمت چغتائی کے مرنے پر ''آتشیں لحاف'' کے قلم سے ان کا اداریہ سنجیدہ ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا؛ لیکن ان اداریوں کو مرتب کر کے شائع نہیں کیا جارہا ہے؛ کیوں کہ وقتی مسائل ہمیشہ کام نہیں دیتے؛ البتہ چند اداریے جن کی نفع بخشی ہمیشہ محسوس کی جاسکتی ہے، یا بعض وفیات جن سے بعض شخصیتوں کے نام اور کام سے موجودہ اور آئندہ نسل واقف ہوسکے اس مجموعہ میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔

مولانا کی تحریریں حسن زبان اور رعنائی بیان کا بہترین نمونہ ہیں اور اسی لئے یہ خیال آیا کہ انھیں رسالہ کی فائل سے نکال کر کتابی شکل میں اہل ذوق کے لئے پیش کر دیا جائے، یوں تو مولانا اُردو، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں پر قدرت رکھتے ہیں اور تینوں زبانوں میں ان کے قلم سے وقیع کتابیں نکلی ہیں؛ لیکن ان کی اُردو تحریریں ادب کا کامل عیار اور حسن انشاء کا معیار قرار دی جاسکتی ہیں۔ اُردو میں معیاری ادب کے لئے فارسی اور عربی پر عبور ضروری ہے اور اس کے ساتھ ادب عالیہ کے مطالعہ کا ذوق بھی لازمی ہے، فارسی اُردو اور عربی کے ہزاروں اشعار ان کی نوک زبان ہیں، شعر وادب کے دریائے ناپیدا کنار میں اس سے ان کی شناوری کا اندازہ ہوتا ہے، ادب کے ذوق اور مطالعہ نے ان کی تحریر میں دلکشی پیدا کر دی ہے۔ جس طرح سے غنچۂ چمن اور گلِ رنگین پیرہن زیورات ارضی کی حیثیت رکھتے ہیں، اسی طرح اچھے اشعار اور نثر پارے زیورات لفظی کی حیثیت رکھتے ہیں، مولانا کی تحریریں پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا قلم قدم قدم پر ادب وانشاء کے پھول کھلاتا ہے اور مسرت وانبساط کی خوشبو پھیلاتا اور افکار کے موتی لٹاتا چلتا ہے۔

مولانا ندوۃ العلماء میں عربی ادب کے استاذ رہے اور پھر سعودی عرب میں --- تین سال انگلینڈ میں رہ کر لیڈس یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، انگلینڈ کا سفرنامہ اور وہاں کے قیام کے مشاہدات جب ''چند دن دیارِ غیر میں'' کے نام سے شائع ہوئے تو راقم سطور کو پہلی بار ان کے ادبی ذوق اور شگفتہ اُسلوب نگارش کا اندازہ ہوا، اس کے بعد میں ان کی تحریروں کی تلاش میں لگا رہتا تھا۔ ہندوستان کے ایک معروف دینی رسالہ نے ''میں بھی حاضر تھا وہاں'' کے عنوان سے ایک ضخیم نمبر نکالا، یہ نمبر عالم اسلام کی ایک مؤقر ترین شخصیت کو عوام و خواص کی نظروں میں گرانے کے ارادہ سے نکالا گیا تھا، میں نے اسے پڑھا اور سخت کبیدہ خاطر ہوا خاص طور پر اس لئے کہ اس معروف دینی جماعت کے ترجمان کی طرف سے یہ نمبر شائع ہوا تھا جس کی خدمات کا خود میں بھی معترف تھا۔ مولانا ''میں بھی حاضر تھا وہاں'' پڑھ کر ضبط سخن کر نہ سکے اور اس کے جواب میں ایک دندان شکن کتاب لکھ دی، اگرچہ اس میں چند جملے زیادہ سخت تھے؛ لیکن یہ کتاب بھی مولانا کے شگفتہ اُسلوب نگارش کا نمونہ تھی۔ لیکن اگر مولانا یہ کتاب نہ لکھتے جب بھی اس شخصیت کی محبوبیت جو عالم اسلام کے دلوں کی دھڑکن بن گئی ہے کم نہ ہوتی، چاند پر خاک ڈالنے سے نقصان خاک ڈالنے والے کا ہی ہوتا ہے، چاند کا کچھ نہیں بگڑتا؛ لیکن اس سے لکھنے والے کے جوش محبت اور عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ندوۃ العلماء کی تعلیم اور مدرسی کے بعد مولانا کی زندگی کا بڑا حصہ ہندوستان سے باہر گذرا، یورپ میں رہے، سعودی عرب میں رابطہ عالم اسلامی اور پھر یونیورسٹی میں عربی زبان و ادب کے استاد رہے، وہیں انگریزی اور عربی میں کئی کتابیں لکھیں۔ اس پورے دور میں مولانا کا قابل تقلید امتیاز یہ رہا ہے کہ ان کا تعلق اپنے مادر علمی سے اور اپنے استاد اور شیخ و مربی مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ سے منقطع نہیں ہوا۔ وہ اس شاخ کے مانند رہے جو اپنے شجر سے ہمیشہ پیوستہ رہتی ہے اور اس تعلق میں دینی محبت اور خلوص کے سوا اور کسی جذبہ کی آمیزش نہیں تھی، ہندوستان سے باہر ان کے پاس عہدہ بھی تھا اور عزت بھی تھی اور مال و زر کی ریل پیل بھی، اس کے بعد اس تعلق کو اخلاص کے سوا کسی اور چیز سے تعبیر نہیں کی جاسکتی ہے، یہ پہلوان کی زندگی کا بہت قابل قدر اور بہت قابل فخر ہے۔

لیکن مولانا کی شخصیت کا جو پہلو اس سے بھی زیادہ تابناک اور اس سے بہتر برتر بلند تر اور روشن تر ہے وہ کچھ اور ہے یوں سمجھ لیجئے کہ مولانا کی دو کتابیں ''عربی میں نعتیہ کلام' اور قصیدہ بردہ کی شرح پر ان کی کتاب ''ردائے رحمت'' اتفاقی واقعہ کے طور پر وجود میں نہیں آئیں ہیں، یہ دونوں کتابیں ان کی اندرونی شیفتگی کی کیفیت کا خارجی اظہار ہیں یہ ان کے جذبات محبت کا عکس جمیل ہیں

یہ عشق رسالت مآب سے سرشاری کی دلیل ہیں۔ اس کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ رابطہ ادب اسلامی کی طرف سے اکتوبر ۱۹۹۰ء میں حیدرآباد میں سیمینار منعقد ہوا تھا، اس سیمینار میں مولانا اپنا مقالہ سنا رہے تھے۔ شرکاء جلسہ نے ایک منظر دیکھا اور یہ منظر لوگوں کے قرطاس دل پر مرتسم ہوگیا، جب اس ذات گرامی کا ذکر آیا جس کی غلامی ہی نہیں؛ بلکہ اس کے غلاموں کی غلامی باعث صد افتخار ہے تو مولانا کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی آواز گلوگیر ہوگئی اور آنسوؤں کی برسات شروع ہوگئی، احساس کی شدت سے جسم کانپنے لگا اور ان کے لئے مقالہ جاری رکھنا مشکل ہوگیا۔

جب نام تیرا لیجئے چشم بھر آوے
اس طرح سے جینے کو کہاں سے جگر آوے
ایک آنسو اور اس میں داستانِ صد ملال
کتنے دریا قطرۂ شبنم میں لہرانے لگے

مولانا کی دونوں کتابیں ''ردائے رحمت'' اور ''عربی زبان میں نعتیہ کلام'' قلم کو خون دل میں ڈبونے کے بعد وجود میں آئی ہیں اور یہ کام اتنے مؤثر طریقہ سے وہی شخص انجام دے سکتا ہے جسے بادہ عشق رسول سے بھی کچھ حصہ ملا ہو ورنہ اس ''حال'' کے بغیر اس موضوع پر لکھنا صرف ایک قال اور کمپیوٹر کا کمال ہوکر رہ جائے گا اور ایسی تحریر وجود میں آئے گی جو چوبِ قلم کی طرح خشک اور بے کیف اور بے مشک ہوگی۔ کوئی حرج نہیں اگر عربی میں نعتیہ کلام کے مصنف کے بارے میں کتاب کے مقدمہ میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا اقتباس پیش کیا جائے:

> اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت برادر عزیز مولوی عبداللہ عباس صاحب کے لئے مقدر فرمائی تھی جو ہمارے علم کی حد تک ان صفات سے متصف ہیں جو اس کتاب کی تالیف کے لئے شرط ہیں، نیز خاندانی اور تربیتی لحاظ سے بھی وہ اس موضوع سے فطری مناسبت رکھتے ہیں۔

اہل بیت سے محبت بھی محبت رسول ﷺ کا لازمہ ہے، بے شمار روایتیں اس حقیقت کی تصدیق کے لئے کافی ہیں اور یہی سلف صالحین کا مسلک بھی ہے، پھر محبت اور غیرت ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ادارہ الفرقان سے ایک کتاب شائع ہوئی جس کے سطور اور بین السطور سے یہ بات جھلک رہی تھی کہ اس کا مصنف یزید کے خلاف حضرت حسینؓ کے اقدام کو درست نہیں سمجھتا ہے، تو مولانا ندوی کی غیرت جوش میں آگئی اور انھوں نے ایسا تبصرہ لکھا

جس میں اس کتاب کے نظریہ کو چیلنج کیا گیا تھا۔ کتاب قابل تنقید تھی اور کتاب پر مولانا کی تنقید ائمہ سلف کے موقف کے مطابق تھی؛ البتہ جوش غضب میں چند جملے نادرست اور ناہموار بھی نکل گئے جسے مولانا نے اپنے بیانات کے ذریعہ واپس لے لیا۔ لیکن اس ایک غلطی کو کینہ وحسد رکھنے والوں نے دار العلوم ندوۃ العلماء اور خود مولانا علی میاں دامت برکاتہم کی ذات پر تہمت تراشیوں کا بہانہ بنالیا اور الزام تراشیوں کا ایسا محاذ کھول دیا جیسے کہ مصنف کتاب نے خود کوئی غلطی ہی نہیں کی تھی اور سلف کے مسلک سے انحراف ہی نہیں کیا تھا اور مسلک اہل سنت کی خلاف ورزی نہیں کی تھی؛ بلکہ سارا قصور تعمیر حیات کا اور ندوہ کا تھا۔ حالاں کہ اصل غلطی واقعہ کربلا پر کتاب شائع کرنے والوں کی تھی جس میں اہل سنت اور علماء دیوبند کے مسلک سے کھلا ہوا انحراف تھا، حقیقت یہ ہے کہ حضرت حسینؓ نے کوئی غلطی نہیں کی تھی، تاریخ اسلام میں واقعہ کربلا ایک اُصولِ حیات، ایک زاویہ فکر اور پیغام حرم کا نام ہے۔

نہایت سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسین ابتداء ہے اسماعیل

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اسلام کے سیاسی نظام میں یزید کی خلافت سے جو رخنہ پڑ گیا تھا اسے بند کرنے کی کوشش کی تھی، انھوں نے جبر وظلم کی آندھی میں ایک چراغ روشن کیا تھا، یہ چراغ جو صبح ازل میں روشن ہوا تھا شام ابد تک جلتا رہے گا۔

جگر گوشۂ رسول حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مخالفت کا یہ وبال سامنے آیا کہ اس حلقہ کے ایک ذمہ دار اور ماہنامہ کے مدیر کی زبان سے ایک مصدقہ روایت کے مطابق یہ الفاظ نکل گئے کہ ''خدا کا شکر ہے کہ ہمارا تعلق اہل بیت سے نہیں ہے'' ان الفاظ کے بعد کسی تبصرہ کی گنجائش نہیں ہے نہ اہل بیت سے کدورت سے بڑھ کر کوئی بے توفیقی کی بات ہو سکتی ہے۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، آخر میں مجلس علمی کی طرف سے ہم مولانا عبد اللہ عباس ندوی کے شکر گذار ہیں کہ انھوں نے اس مجموعہ کو شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی، ہم پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا شکریہ بھی ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے گراں قدر مقدمہ لکھ کر مخصوص انداز میں مولانا ندوی کا تعارف کرایا، خواجہ صاحب کا تحسین واعتراف ''قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری'' کا مصداق ہے۔ (مقدمہ کتاب)

☆ ☆ ☆ ☆

کتابوں کے درمیاں

متفرقات

اُردو صحافت اور جنگِ آزادی

اُردو صحافت کے اُفق پر نئے طلوع ہونے والے درخشندہ ستارے کا نام معصوم مرادآبادی ہے، جو خبردار جدید جیسے مقبول عام اور نیک نام پندرہ روزہ میگزین کے ایڈیٹر بھی ہیں، بہت کم وقت میں انھوں نے اپنی ذہانت وذکاوت، محنت اور صلاحیت اور حرکت وعمل سے نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ یوں تو ان کی کئی کتابیں منظرعام پر آچکی ہیں؛ لیکن ''اُردو صحافت اور جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء'' اس اعتبار سے اہم ہے کہ جنگِ آزادی میں اُردو صحافت اور اس کے اہل قلم کو نظر انداز کرنے کا رجحان بڑھتا جارہا ہے اور چمن میں گلوں کے ساتھ کانٹوں کا معاملہ کیا جارہا ہے، جن کی حیثیت سنبل وریحاں کی تھی ان کے ساتھ خارمغیلاں کا برتاؤ کیا جارہا ہے۔ مصنف کتاب اگرچہ ایک صحافی ہیں؛ لیکن کتاب سے ان کے ادبی ذوق کے ساتھ ان کے تحقیق کے شوق کا بھی اندازہ ہوتا ہے، زبان و بیان کے اعتبار سے صحافتی دنیا میں ان کی تحریریں امتیاز کی حامل ہیں۔ انھوں نے اس کتاب کی تصنیف کے لئے کتاب خانوں کی سیر کی ہے، نیشنل آرکائیوز میں وثیقوں کی ورق گردانی کی ہے اور اس طرح سے انھوں نے وہ مطلوبہ مواد حاصل کیا ہے، جس نے تصنیفی ترتیب کے بعد پیش نظر کتاب کی خوبصورت شکل اختیار کرلی ہے اور اب اس کتاب کے ذریعہ یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ چکی ہے، جنگ آزادی میں قائدانہ کردار اُردو صحافت نے ہی ادا کیا ہے، اس اُردو زبان نے ادا کیا ہے جس کے ساتھ آزادی کے بعد مسلسل ناروا اور غیر منصفانہ سلوک کیا جارہا ہے۔

مسلمان اس ملک کے حکمراں تھے؛ لیکن بتدریج انگریز اس ملک پر قابض ہوتے چلے گئے، اس لئے انگریزوں کے خلاف ملک میں فضابندی، جدوجہد اور جہاد میں قدرتی طور پر مسلمان ہی آگے تھے، تحریک آزادی میں شریک پوری قوم تھی؛ لیکن مسلمان آزادی کی تحریک کے میر کارواں تھے اور ۱۸۵۷ء کے خوں فشاں اور جاں سوز واقعات اور ہزیمت سے سب سے زیادہ متاثر بھی وہی تھے اس لئے بازوئے قاتل کے زور کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ بھی ان ہی کو زیادہ تھا اور سرفروشی کی تمنا بھی سب سے زیادہ ان ہی کو تھی۔ اس لئے زیادہ قربانیاں بھی انھوں نے دیں اور چوں کہ اُردو

صحافت کی زمام کاران کے ہاتھ میں تھی ، اس لئے قدرتی طور پر اُردو صحافت ہی انگریزوں کے عتاب کا نشانہ سب سے زیادہ بنی۔ اُردو صحافت کی ابتداء ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے ہوئی وہاں سے پہلا اُردو کا اخبار ''جام جہاں نما'' کے نام سے نکلا پھر اس کے بعد دہلی سے '' دہلی اُردو اخبار'' کے نام سے ۱۸۳۷ء میں اخبار جاری ہوا، اس کے ایڈیٹر مولوی محمد باقر تھے، جو محمد حسین آزاد کے والد تھے۔ ۱۸۵۷ء کے خوں چکاں واقعات کی اشاعت کے جرم میں مولوی محمد باقر کی گرفتاری عمل میں آئی اور بالآخران کو شہید کر دیا گیا، صحافت کی جانب سے یہ پہلا خون کا قطرہ تھا جس سے زمین ہند سیراب ہوئی ، مادر وطن کے لئے یہ وہ اولین نذرانہ عقیدت تھا جسے اُردو صحافت نے پیش کیا تھا ، معصوم مراد آبادی لکھتے ہیں:

> یہ ہمارا ہی سرمایہ افتخار ہے قلم کی آبرو اور وطن کی سرخروئی کے لئے ہندوستان کی تاریخ میں اپنی جان قربان کرنے والا پہلا صحافی اسی اُردو زبان نے پیدا کیا تھا، جس کی کوکھ سے انقلاب کے لازوال نعرے نے جنم لیا تھا۔ اُردو صحافت کی پیدائش بھی انقلاب کے بطن سے ہوئی اور اس میں آج بھی پچھلے زمانے کا وہ بانکپن اور جرأت اظہار بدرجہ اتم موجود ہے، اُردو صحافت ایک بڑے مشن اور مقصد کے تحت وجود میں آئی تھی اور یہ آج بھی ایک پروفیشن سے زیادہ ایک مشن کا درجہ رکھتی ہے۔

اُردو اخبارات نے جنگِ آزادی میں کیا اہم اور شاندار رول ادا کیا ہے، اس کی پوری تفصیل اس کتاب میں موجود ہے، یہ پوری کتاب ''لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم'' کا مصداق ہے اور اس لائق ہے کہ ہندی انگریزی اور دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ شائع ہوتا کہ برادرانِ وطن کو معلوم ہو، اُردو صحافت نے کس طرح وطن کی سرزمین کو خون جگر سے سینچا ہے اور جانبازی اور سرفروشی کی کیسی تاریخ رقم کی ہے، اُردو صحافت کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ:

آغشتہ ایم ہر سر خار بخون دل
قانون باغبانی صحراء نوشتہ ایم

مصنف کتاب نے ۱۸۵۷ء اور اس کے آس پاس جو اُردو کے اخبارات نکل رہے تھے، ان کے اقتباسات کثرت سے نقل کئے ہیں، ان سے ان کی محنت اور تلاش و جستجو کا اندازہ ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں یعنی ڈیڑھ سوسال پہلے کیسی زبان لکھی جاتی

تھی۔ اس دور کے لوگ عربی اور فارسی سے واقف تھے، اس لئے نثر عربی آمیز اور فارسی آمیز ہوا کرتی تھی ۱۸۵۷ء کے واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے اس عہد کا ایک اخبار لکھتا ہے:

وہ حکام ظاہر الاستحکام جن کے استقلال حکومت وانتظام کے زوال کا نہ ان کو خیال تھا اور نہ کسی غفال کو وہم وگمان آسکتا تھا، ایک طرفۃ العین میں وہ نمایاں ہوگیا۔

اب اس دور میں کتنے لوگ ہیں جو یہ زبان سمجھ سکتے ہیں، عربی اور فارسی تو بڑی چیز ہے اب والدین اپنے بچوں کو اُردو سکھانے میں بھی غفلت برتتے ہیں۔ بہر حال یہ کتاب قابل مطالعہ ہے اور اس لائق ہے کہ ہندوستان کی کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا جائے؛ کیوں کہ بے حد اہم موضوع پر یہ کتاب ہے اس میں اُردو صحافت کی تاریخ بھی آگئی ہے اور اُردو صحافت کی قربانیوں کا تذکرہ بھی تفصیل سے آگیا ہے۔ اس عہد کے اخبارات پر تحقیقی مواد بھی پیش کردیا گیا ہے اور ہندوستان میں انگریزی دور اقتدار کے بہت سے تاریخی واقعات بھی اس میں آگئے ہیں، مولوی محمد باقر کی شہادت کی تفصیلات شاید پہلی مرتبہ اتنی تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں اُردو صحافت سے وابستہ لوگوں کو خاص طور پر اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ قدیم عہد کی اُردو صحافت کا شعار آئین حق گوئی اور بے باکی تھی، ان کا کہنا تھا کہ ہمارے قلم کو توڑا تو جاسکتا ہے؛ لیکن موڑا نہیں جاسکتا ہے، اس فاضلانہ کتاب کا مقدمہ بھی فاضلانہ ہے، جو گربچن چندن کے قلم سے ہے اور اس سے کتاب کی قیمت اور اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆
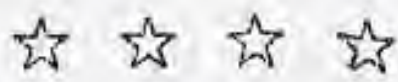
سہ ماہی ''مطالعات''

وہ عہد ختم ہوا جب کتابت اور طباعت کی مشکلات کی وجہ سے علمی رسالہ نکالنے کا کام جوئے شیر لانے کے مرادف تھا، پہلے اسلامی علوم وفنون کی تحقیق کے چند رسالے نکلتے تھے، ان میں ماہنامہ معارف اور ماہنامہ برہان کو امتیاز خاص حاصل تھا۔ اب کمپیوٹر کے زمانہ میں کتابت وطباعت کی جو سہولتیں حاصل ہوگئی ہیں ان کی وجہ سے اُردو رسالوں کی برسات ہوگئی ہے اور آبروئے شیوہ اہل نظر معرض خطر میں پڑگئی ہے، خالص علمی تحقیقی وقیع مجلات ابھی بہت کم ہیں۔ ''ماہنامہ معارف،

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، سہ ماہی فکر ونظر، اسلام اور عصر جدید'' اب ایک اور نئے علمی رسالہ سہ ماہی ''مطالعات'' کا اضافہ ہوگیا ہے، رسائل کے ہجوم میں ایک ضخیم سہ ماہی مجلّہ ''مطالعات'' دہلی اپنے دلکش سرورق دیدہ زیب کتابت وطباعت اور فکر انگیز تحقیقی مضامین کی وجہ سے اہل ذوق اور اہل علم کے باعث کشش بن گیا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی، سرگرم اور فعال ادارہ ہے، اس نے بہت سی وقیع کتابیں شائع کی ہیں اور انگریزی میں وقیع علمی رسالے بھی نکالے ہیں، اب پہلی مرتبہ اس کا اُردو ترجمان ''مطالعات'' کے نام سے منظر عام پر آرہا ہے، چیف ایڈیٹر ڈاکٹر منظور عالم ہیں جن کی دردمندی، ہوش مندی، ہنرمندی اور منصوبہ بندی اور فکر کی ارجمندی، جوش عمل اور نشاط کار اربابِ دانش وبینش سے مخفی نہیں۔ انھوں نے مختصر وقت میں ملک کے طول وعرض میں اتنے سارے ملی اور علمی پروگرام کرڈالے کہ ان کا حساب وکتاب بھی آسان نہیں، ان کے کام متنوع، ہمہ گیر، ہشت پہل اور مختلف الجہات ہیں، ان کے ادارے آبجکٹیو اسٹڈیز کی عمر بیس سال ہے، یعنی اس کے عین شباب کا زمانہ ہے، مطالعات کے پہلے شمارہ میں ان کا ایک اچھا مضمون نظام افتاء و قضاء پر موجود ہے۔

رسالہ کے ایڈیٹر ڈاکٹر اوصاف احمد ہیں جو اسلامک ڈیولپمنٹ بینک جدہ سے وابستہ رہ چکے ہیں، معاشیات کے ماہر ہیں اور اسلامیات اور ادب سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں، ایک اسکالر اور مصنف کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، اب ہندوستان میں مقیم ہیں اور انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز کے لئے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مطالعات کے اولین شمارہ میں ان کا مضمون جو اسلامی معاشیات سے متعلق ہے فکر انگیز اور قابل مطالعہ ہے، اس رسالہ کی مجلس مشاورت میں ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی کا اور جناب سید حامد چانسلر ہمدرد یونیورسٹی کا نام ہے، یہ دونوں نام برگزیدہ اور قابل احترام ہیں اور اس بات کی ضمانت ان سے ملتی ہے کہ یہ رسالہ اپنا علمی معیار باقی رکھے گا۔

مقالہ نگاروں میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی، پروفیسر محمد اجتباء ندوی، پروفیسر محمد یاسین مظہر صدیقی، ڈاکٹر حسن الدین احمد جیسے ممتاز اور معروف اہل قلم کے مضامین ہیں۔ موضوعات کے لحاظ سے اس رسالہ کا دامن اسلامی نظام معاشرت سے لے کر نظام قضاء مالیات اور عربی اور اسلامی علوم وآداب تک پھیلا ہوا ہے، بعض خشک موضوعات کو اصحاب قلم نے شگفتہ اور دلنشیں اُسلوب میں ڈھال دیا ہے۔ اس اولین شمارہ کا ایک بہت قیمتی مضمون پروفیسر محمد اجتباء ندوی کے قلم سے ہے، یہ اس عربی مضمون کا ترجمہ ہے جسے انھوں نے حیدرآباد میں (Ciefl)

کے شعبہ عربی کے سیمینار میں پیش کیا تھا، اس کا موضوع ہے "عربی علوم و آداب کے ارتقاء میں ایران کا حصہ" یہ ایک جامع اور معلوماتی مضمون ہے، انھوں نے عجم کے لالہ زاروں میں عربی گلابوں کی بہار کے نمونے پیش کئے ہیں۔ ہم لوگ بہت سے عربی زبان کے مصنفین سے واقف ہیں، جو ایران میں پیدا ہوئے؛ لیکن ان کی باقاعدہ فہرست سازی مضمون کی شکل میں پہلی بار کی گئی ہے۔

مطالعات ایک علمی ادبی اور معلوماتی رسالہ ہے، اُردو کی علمی صحافت میں اسے ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہوگی؛ لیکن غم اکثر درد والم کی حد تک بڑھ جاتا ہے، جب یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں علمی رسالوں کی سرپرستی اور پذیرائی نہیں ہوتی اور ان کا پرجوش استقبال نہیں کیا جاتا ہے۔ بہت سے علمی رسالے ان غنچوں کے مانند ہوتے ہیں جو بن کھلے مرجھا جاتے ہیں، یہ رسم بے گانگی اور یہ ادائے بے نیازی اُردو تہذیب و معاشرہ کی علامت بنتی جارہی ہے، اس کا سبب بے زری اور افلاس نہیں ہے، ہزاروں ایسے خاندان ہیں جو خوش حالی اور خوش جمالی کا نشان ہیں، ان کے یہاں مال وزر کی ریل پیل ہے اور ہر طرح کا سامان تعیش ان کے گھروں میں موجود ہے، بنگلہ، گملہ، موٹر اور شوفر کسی چیز کی کمی نہیں؛ لیکن ان کے گھروں میں اُردو اخبار اور رسالہ نہیں آتا ہے۔ ایک گھر کی اُردو تہذیب سے وابستگی اور علمی ذوق کا ادنی ترین معیار یہ ہے کہ ایک اُردو اخبار، ایک علمی رسالہ اس کے گھر میں آتا ہو اور سال میں دو تین اُردو کتابیں خریدی جاتی ہوں، اس معیار پر اُردو والوں کو اپنا جائزہ لینا چاہئے اور اپنا محاسبہ کرنا چاہئے۔ دوسروں کے سامنے اُردو کے سلسلہ میں مطالبات پیش کرنے سے پہلے ہمیں خود اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھنا چاہئے کہ ہم خود پہلے اُردو کے سلسلہ میں اپنا فرض ادا کرتے ہیں یا نہیں؟ اگر ہم خود اُردو زبان کے حقوق کو پامال کرتے رہے ہیں تو اُردو کا شجر نہال اور برگ و ثمر سے مالا مال کیسے ہوسکتا ہے۔ کیوں نہ ہم خود دوسروں سے پہلے اپنے آپ کو اُردو کا قاتل قرار دے لیں، گھروں میں اُردو اخبار اور اُردو رسالے نہیں آئیں گے تو نئی نسل اُردو رسم خط سے مانوس کس طرح ہو سکے گی، اسلامی علوم کی کتابوں کا مطالعہ کون کرے گا، قرآن و حدیث کے اُردو ترجمے کون پڑھے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ سیرت و سوانح کی کتابیں اپنے قارئین کے لئے ترسیں گی اسلامی تاریخ ماتم کناں ہوگی کہ اس کا پڑھنے والا کوئی نہیں، گھر میں ایک اُردو اخبار، ایک اُردو رسالہ اور چند اُردو کتابوں کا وجود گھر کی شائستگی، تہذیب اور ثقافت کا آئینہ دار ہوتا ہے، اگر یہ چیزیں گھر میں نہ ہوں تو آسائش اور زیبائش کے تمام سامان مزاج اور ذوق کی پستی اور سوقیانہ پن کی علامت بن جاتے ہیں۔

صرف چار سو روپے اس ضخیم خوبصورت اور وقیع رسالہ کی سالانہ زر خریداری ہے، اگر سنجیدہ علمی ذوق اور تحقیقی علمی کاموں کی قدردانی کا شوق ہے تو چار سو روپے کی حقیر رقم کے مقابلہ میں یہ قیمتی رسالہ بار خاطر نہیں؛ بلکہ یار عاطر محسوس ہونے لگے گا، اس کی عطر بیزی مشام جان کو معطر کرے گی، دست شوق اس کی جانب بڑھے گا اور اہل ذوق اس کو اپنی غذا سمجھیں گے۔

☆ ☆ ☆ ☆
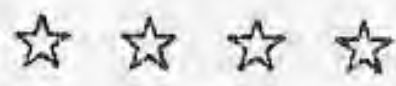
عبداللہ الدرعی کا قدیم سفرنامۂ حج

حج کے سفرنامے سینکڑوں سے متجاوز ہیں اور دنیا کی ہر زبان میں ہیں اور ہر زمانہ میں لکھے گئے ہیں اور لکھے جارہے ہیں، نفس سفرنامہ میں کوئی خصوصیت نہیں ہوتی، خصوصیت صاحب سفر کے اپنے احساسات، ذوق وولولہ اور اس کے اظہار کے انداز میں ہوتی ہے اور اس کے ہم مذاق، اصحاب واعزہ یا مرید وشاگرد کے لئے اس میں سبق آموزی کا سامان ہوتا ہے۔ اس طرح ہر سفرنامہ ایک محدود حلقہ (خواہ وہ کتنا ہی وسیع ہو) میں پڑھا اور دہرایا جاتا ہے؛ مگر بعض سفرنامے ایسے بھی ہوتے ہیں جو زبان کے البیلے پن انشاء وطرز تحریر کے بانکپن کی وجہ سے زیادہ پائیدار ثابت ہوئے اُردو میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا سفر حج ہے اور عربی میں علامہ شکیب ارسلان کا سفرنامہ "المشاعر اللطاف الی خیر مطاف" اس طرح کے اور بھی سفرنامے ہوں گے، ان دونوں سفرناموں کا ذکر صرف مثال کے طور پر کیا گیا۔ عربی میں علماء مغاربہ کے سفرنامے بہت مشہور ہیں، ابن بطوطہ کا سفرنامہ تو مشہور ہے، ان کے ہم وطنوں کے متعدد سفرنامے علمی وتاریخی دستاویزوں کی حیثیت رکھتے ہیں جن کا تذکرہ پیش نظر سفرنامہ کے مترجم سید ضیاء عبداللہ صاحب نے مستقلاً کیا ہے، خالص علمی وتاریخی لحاظ سے یہ مقالہ بہت معلومات افزا ہے۔

پیش نظر سفرنامہ بھی ایک مغربی عالم علامہ عبدالسلام الدرعی کا ہے، جن کا مکمل تعارف اور ان کے سفرناموں کی تفصیل اس کتاب میں موجود ہے، جس کے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں؛ البتہ اس سفر حج کی روداد پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ آج سے دو سو برس پہلے اونٹوں پر خشکی کے راستے

سے سفر ایک طرح کی ''مہم جوئی'' (Adventure) تھی، مہم جوئی کی داستانوں میں جو کشش ہوتی ہے وہ اس میں بدرجۂ اتم موجود ہے، زبان کی شگفتگی اور ذوق ووجدان کی فراوانی نے اس سفر نامہ کو ایک دینی وادبی تحفہ بنادیا ہے۔

مسرت کی بات ہے کہ اس کا اُردو ترجمہ بھی بہت دلنشیں اور ذوق آفریں ہے، تحریر بہت ہی شگفتہ اور دل آویز ہے اور خوبی یہ ہے کہ اس میں کوئی رنگ آمیزی یا خیال آفرینی نہیں ہے۔

یہ سفر نامہ ''ذکر وفکر'' دہلی میں بالاقساط شائع ہو چکا ہے، اب اس کو کتابی شکل میں ''مجلس علمی'' ذاکر باغ کی طرف سے پیش کیا جارہا ہے، اس کے مترجم سید ضیاء عبداللہ صاحب ہماری مجلس کے صدر ڈاکٹر مولانا عبداللہ عباس ندوی مدظلہ، سابق پروفیسر اُم القریٰ یونیورسٹی وحال معتمد تعلیم ندوۃ العلماء کے صاحبزادے ہیں۔ دینی ادب کا ذوق ان کو ورثہ میں ملا ہے، انھوں نے ثانوی تعلیم ندوہ میں حاصل کی اور انگلستان سے کمپیوٹر سائنس میں گریجویشن کیا اور مشغلہ بھی یہی ہے؛ لیکن وہ ایسے خاندان کے فرد ہیں، جس میں پشت ہا پشت سے دینی علوم ومعارف منتقل ہوتے آرہے ہیں، پھر ندوہ کی ابتدائی وثانوی تعلیم نے ان کو علم وادب سے وابستہ رکھا ہے؛ اس لئے ان کے قلم سے ایسے ترجمہ کا نکلنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

سفر نامہ کا جہاں تک تعلق ہے، اس کے بارے میں پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اُردو میں اس طرح کا کوئی سفر نامہ پہلے نہیں شائع ہوا، اس کے مطالعہ سے قاری کو دوسو برس پہلے کے بزرگان سلف کے ذوق وشوق کا اندازہ ہوگا، ان کے اندر زیارت بیت اللہ اور دیار حبیب کی کیا تڑپ تھی، اس کا اس زمانہ میں اندازہ کرنا بھی مشکل ہے، مخدومی مولانا سید ابوالحسن علی میاں مدظلہ کی کتاب ''الطریق الی المدینۃ'' کے مقدمہ میں شام کے مشہور عالم ومؤرخ علامہ سید علی طنطاوی نے اس بات کو ایک جملے میں بیان کردیا ہے جس کے اظہار کے لئے اس سے بہتر تعبیر پر کم ازکم میری نظر نہیں پڑی، وہ لکھتے ہیں کہ شام سے حجاز کا سفر ایک زمانہ میں بڑی تیاریوں کے ساتھ شروع ہوتا تھا اور انواع واقسام کے مصائب سے دوچار ہونا پڑتا تھا اور اب چند گھنٹوں میں ہم یہ سفر طے کرلیتے ہیں؛ لیکن پہلے جو ذوق وشوق تھا اور حرمین کی زیارت کا دل کو جو اشتیاق رہا کرتا تھا وہ جاتا رہا'' کسبنا الوقت وخسرنا العواطف'' ہم نے وقت بچانے کا فائدہ تو اٹھالیا، مگر ذوق ووجدان کی نعمت ہاتھ سے کھو بیٹھے۔

پیش نظر سفر نامے میں آپ کو رنگ برنگ کی تاریخی جھلکیاں ملیں گی، مصر میں غلاف کعبہ

تیار ہونے کی تقریب، خلافت عثمانیہ کا جاہ وجلال، اس کے وائسرائے کا غلاف کعبہ رخصت کرنا، اہل مصر کا مذاق عام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی سنتے ہی جذبات سے معمور ہو جانا، وہ پورا منظر اس طرح اُردو میں نقل ہو گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ان صفحات کو پڑھنے والا خود اس کارواں میں چل رہا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب سفر (طیبہ کا مسافر) اس نعمت بیدار کو کن آرزوؤں اور کتنی مشقتوں سے حاصل کیا کرتا تھا۔ ممکن ہے ہمارے جیسے تن آسانوں کو اس میں عبرت کا سامان حاصل ہو اور ان رہ روانِ شوق کے قافلوں کو دیکھ کر ہمارے تن مردہ میں بھی جان آجائے اور مادیت کے حجابات سے نکل کر روحانی فضا میں چند لمحے گزار سکیں۔

ادارہ مجلس علمی کی طرف سے ایک علمی و روحانی اور ادبی تحفہ کے طور پر یہ رسالہ اہل شوق اور اربابِ ذوق کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ (مقدمہ کتاب)

☆ ☆ ☆ ☆

مقالاتِ فاروقی

پروفیسر نثار احمد فاروقی اُردو ادب، تصوف اور تاریخ وتنقید کی دنیا کے معروف بزرگ صاحبِ قلم ہیں، دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر اور صدر شعبہ عربی رہے، ہندوستان کی جامعات کے شعبہ ہائے زبان عربی کی ان مستثنیٰ شخصیتوں میں ہیں، جو علم وتحقیق کے قافلہ کے ہم رکاب رہے ہیں اور جن کی نمایاں علمی خدمات ہیں اور جن کی خدمات کا علمی حلقوں میں بجا طور پر اعتراف کیا گیا ہے، زیر تبصرہ کتاب تاریخی تہذیبی اور علمی موضوعات پر چند اہم مضامین کا مجموعہ ہے۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی جب تاریخ وتصوف کی شخصیتوں پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کا قلم ابر گوہر بار بن جاتا ہے، اس کتاب میں ان کے مضامین ابوریحان البیرونی پر ملا عبدالقادر بدایونی اور ان کی کتاب منتخب التواریخ پر مولوی محمد جعفر تھانیسری پر عالمانہ اور محققانہ شان رکھتے ہیں، ان کا مضمون ''دبستانِ مذاہب میں سکھ مذہب کا بیان'' بھی ان کے وسعت مطالعہ کی دلیل ہے۔ عہد وسطیٰ کی تاریخ پر ان کی بہت اچھی نظر ہے، اس عہد کی دوسری کتابوں کے حوالے بھی ان کے

مضامین میں ملتے ہیں، تاریخ کی کتابوں اور روایات کے بارے میں ایک جوہری کی طرح خوب و ناخوب کی پرکھ ان کو حاصل ہے، حرف و معنی کے ارتباط کا سلیقہ انھیں آتا ہے۔ کتاب کے بعض دوسرے مضامین جیسے جدید سائنس اور اس کا مقصد اور تہذیب انسانی کی بقاء کا مسئلہ بھی وہ مضامین ہیں جن میں انھوں نے صحیح اور متوازن فکر کا اظہار کیا ہے اور جن سے مصنف کی ژرف نگاہی اور دروں بینی کا اندازہ ہوتا ہے، ڈارون کے نظریہ ارتقاء اور اس کی مضرت کو انھوں نے بہت اچھے ڈھنگ سے بیان کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں تہذیب جدید کا عمیق مطالعہ ملتا ہے، تہذیب کی عشرت سامانیاں صرف قابل تحسین نہیں ہیں؛ بلکہ انسانیت کے لئے اس میں تباہ کن مواد بھی موجود ہے، وہ نظر کو خیرہ ضرور کرتی ہیں؛ لیکن اس میں جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری بھی شامل ہے۔ مصنف کا انداز بیان ہر جگہ شاداب اور نو دمیدہ گلاب کی طرح شگفتہ ہے، علمی مسائل کو بھی ادبی اُسلوب میں بیان کرنے کا ہنر انھیں آتا ہے، کہیں کہیں بعض فقرے اور جملے اتنے اچھے ملتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ نسیم سحر کا تازہ جھونکا آگیا ہے، ایسی حسین تحریر کا بہترین نمونہ مولانا آزاد پر ان کا ایک مضمون ہے جو اس مجموعہ میں شامل نہیں؛ لیکن وہ تعمیر حیات لکھنؤ اور اُردو دنیا دہلی میں ۲۰۰۴ء میں چھپا ہے۔

اس مجموعہ میں ایک مضمون بعنوان ''دبستانِ مذاہب میں سکھ مذہب کا بیان'' فاروقی صاحب کی وسعت مطالعہ اور ذوق تحقیق کی اہم پہچان ہے، نہ صرف دبستان مذاہب کے مصنف کے بارے میں ان کی تصریحات ان کی تلاش و جستجو کی غمازی کرتی ہیں؛ بلکہ تقابلی مذاہب پر کتابوں سے متعلق ان کی معلومات کی آئینہ دار ہیں۔ اب تک یہی پڑھتے آئے تھے کہ دبستان مذاہب محسن فانی کشمیری کی تصنیف ہے، مگر نثار احمد فاروقی کی تحقیق یہ ہے کہ اس کا مصنف آزر کیوان کا بیٹا کیخسرو اسفندیار ہے جو ۱۶۱۸ء میں پٹنہ میں پیدا ہوا تھا، اسے بچپن سے مذاہب کے عالموں سے ملاقات کا شوق تھا۔ فاروقی صاحب نے دبستان مذاہب کے حوالہ سے سکھ مذہب کا اچھا تعارف کرایا ہے، فاروقی صاحب نے اس فارسی کتاب کو مذاہب کے معروضی مطالعہ پر مبنی قرار دیا ہے، سکھ مذہب کے بیان میں کتاب کا یہ واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں کہ گورو ہر گوبند اپنی جماعت کے ساتھ جب پنجاب کے علاقہ کتار پور آئے تو پہاڑ کی چوٹی پر ایک مندر میں گئے جس کا نام ''نینا دیوی'' تھا گورو کے ماننے والے سکھوں میں ایک سکھ نے جس کا نام بھیروں تھا مندر کی دیوی کی ناک توڑ دی، پجاریوں اور عقیدت مندوں نے محسوس کیا کہ ان کی اپنی عزت کی ناک کٹ گئی، گورو ہر گوبند سے شکایت کی گئی، بھیروں کی طلبی ہوئی اور اس نے صاف انکار کر دیا، لوگوں نے جرم کی چشم دید گواہی

پیش کی، بھیرون نے جواب میں ہنس کر کہا کہ اس علاقہ کے راجہ کو چاہئے کہ خود اس دیوی سے معاملہ دریافت کرلیں، لوگوں نے اور خود راجہ نے کہا کہ بھلا دیوی نام کیسے بتا سکتی ہے، جواب میں بھیرون نے کہا کہ جو دیوی اپنی ناک کو سلامت نہ رکھ سکے اور آزار دینے والے کا نام بھی نہ بتا سکے اسے معبود بنا کر پوجنا کوئی اچھی بات نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کا جو قصہ بیان ہوا ہے اس کی بازگشت سکھوں کے ایوان مذہب تک پہنچی ہے۔

چاند میں بھی داغ ہوتے ہیں، اس مجموعہ میں بھی بعض تحریریں اور عبارتیں درست نہیں، مثال کے طور پر پروفیسر فاروقی اپنے مضمون ''تقابلی مطالعہ مذاہب'' میں صفحہ ۵۲ پر رقم طراز ہیں:

بڑے خانوں میں باٹیں تو مذاہب میں ایک طرف کثرت پرستی ہے جس میں مظاہر فطرت کی پوجا ملے گی، حیوانوں کی پرستش، درختوں کی پوجا، دریاؤں کی تقدیس، کسی نہ کسی شکل میں ہر مذہب میں موجود ہے؛ لیکن کثرت پرستی کا فطری سفر توحید کی طرف ہوا ہے۔

پروفیسر فاروقی کا یہ بیان اسلامی نظریہ کی نہیں؛ بلکہ علماء عمرانیات کے نظریہ کی تصدیق کرتا ہے، علماء عمرانیات مذہب کو انسانی دماغ کی اختراع مانتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ابتداء میں انسانوں نے اس بارے میں غور کیا ہوگا کہ کائنات کی تخلیق کس طرح ہوئی، چشم حیراں نے عالم حیرانی میں آسمان پر ستاروں کی جھرمٹ دیکھے، شب کو ماہتاب دیکھا جو چاندنی کی دلکش چادر پھیلا رہا تھا، اس نے سورج کی حرارت اور روشنی دیکھی، کبھی بجلی کی چمک اور بادل کی گرج نے اسے خوف زدہ کیا، سمندر کی تیز وتند موجوں نے اسے سراسیمہ کیا، اس طرح سے کائنات کی تابناک اور خوفناک چیزیں اس کی معبود بن گئی ہوں گی اور انسان کی پیشانی وہاں جھکی ہوگی۔ اہل عمرانیات کا کہنا ہے، انسانی فکر کا ارتقاء بتدریج شرک سے توحید کی طرف ہوا ہے، اسلام کا تصور اس سے مختلف ہے، اسلام کے مطابق انسانی فکر کے بالکل آغاز میں صرف توحید کا نظریہ پایا جاتا ہے، یعنی خدا ایک ہے وہی رب العالمین ہے، توحید کے بعد خدائی پیغام کو بھلا دینے کے نتیجہ میں تکثیر کا عقیدہ پیدا ہوا، اسی عقیدہ کی اصلاح کے لئے پیغمبر آتے رہے۔ علماء عمرانیات صرف کلید عقل سے کام لیتے ہیں، مذہب سے رہنمائی حاصل نہیں کرتے ہیں، مذہب سے رہنمائی حاصل کی جاتی تو ڈارون کی تھیوری بھی منصۂ شہود پر نہ آتی اور نہ یہ نظریہ قائم ہوتا کہ انسانیت کا آغاز شرک اور تکثیر معبود سے ہوا ہے۔

پروفیسر فاروقی صفحہ ۷۴ پر لکھتے ہیں:

اس (انسان) نے اپنے تحفظ کے لئے جتنی پناہ گاہیں بنائی ہیں اور جتنی مادی اور غیر مادی

قوتیں زندگی کو آفات سے بچانے کے لئے پیدا کی ہیں، ان میں سب سے زیادہ قوی پر اثر اور دیر پا قوت ''عقیدہ'' ہے۔

یہاں بھی فاروقی صاحب کی عبارت میں بے اعتدالی نمایاں ہے اور ان کے اس جملہ سے ماہرین عمرانیات کے اس نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے ''مذہب انسان کے دماغ کی پیدا کردہ چیز ہے''۔

پروفیسر فاروقی نے صفحہ ۲۳ پر لکھا ہے:

ابلیس نے سجدہ کرنے سے استکبار کے سبب انکار کیا، یعنی وہ فرشتوں کو انسان سے افضل ماننے والوں میں تھا۔

ابلیس نے بلا شبہ استکبار کے سبب انکار کیا، ابلیس کا قول قرآن نے نقل کیا ہے ''خلقتنی من نار وخلقتہ من طین''، یعنی تو نے مجھے آگ سے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا ہے، دلیل یہ تھی کہ آگ مٹی سے برتر چیز ہے، ابلیس کا تعلق جنات سے تھا اور جن ہی سے آگ پیدا کئے گئے ہیں، نہ کہ فرشتے جو نوری مخلوق ہیں۔

صفحہ ۱۰۵ پر انھوں نے حدیث کے الفاظ اس طرح نقل کئے ہیں: ''رب أرنی حقیقۃ الاشیاء کما شئ'' حدیث کے صحیح الفاظ یہ ہیں: ''...... وأرنی الأشیاء کما ھی''، نقل کردہ حدیث میں لفظ شئ تو کتابت کی غلطی ہے، لیکن ''حقیقۃ'' کا اضافہ کتابت کی غلطی نہیں ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆
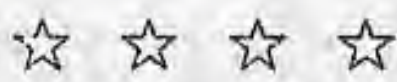
کاروانِ حیات

''کاروانِ زندگی'' مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی خودنوشت سوانح ہے اور کئی جلدوں میں ہے اور ''کاروانِ حیات'' قاضی اطہر مبارک پوری کی خودنوشت سوانح ہے، ایک جلد میں ہے، مختصر بھی ہے نامکمل بھی ہے، غیر مطبوعہ بھی ہے، کتاب کی تکمیل سے پہلے مصنف کا سفینہ حیات ساحل سے آلگا۔ ایک ماہنامہ ''ضیاء الاسلام'' نے یہ نامکمل کتاب اپنے اوراق میں نہ شائع کردی ہوتی تو بہت سے لوگوں کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی، مصنف نے پہلے اپنی زندگی کا ایک حصہ ''قاعدہ بغدادی سے صحیح

بخاری تک'' کے نام سے شائع کر دیا تھا، آیئے پہلے بغداد اور بخاری کی سیر کرلیں، جس سے اس مقولہ کی صحت کا اندازہ ہوگا کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، پھر غبار کارواں پر ایک نظر ڈالیں۔

قاضی صاحب کی پیدائش ۱۹۱۶ء میں مبارک پور میں ہوئی تھی جو دیار پورب کا ایک چھوٹا شہر ہے، یہ قاضی خاندان تھا جس میں غیرت وحمیت اور عزت نفس کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، گھر میں علم کا چرچا تھا۔ ان کے نانا کی کتاب سبیل الآخرۃ چھپ کر آئی اور گھر میں پڑھی گئی، جس سے موت، قبر اور قیامت کا خوف دل میں پیدا ہوا، قصبہ کا ماحول بھی علمی تھا، مختلف علماء یہاں رہتے تھے اور مختلف شہروں کے مدرسوں میں تدریس کا کام انجام دیتے تھے، ایک استاد سے انھوں نے یہ جملہ سنا اور اسے اپنی گرہ میں باندھ لیا'' من ساوا یوماہ فہو فی الخسر ان'' (یعنی جس کے دونوں دن برابر ہوں وہ گھاٹے میں ہے) اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے ہر دوسرے دن کو پہلے دن سے بہتر ہونا چاہئے۔ بچپن میں انھوں نے اپنے ماموں سے لے کر ابن خلکان کی مشہور کتاب وفیات الاعیان پڑھی، یہ گویا دریائے علم کی پہلی شناوری تھی، اسلامی تاریخ کے مشہور اہل علم سے ان کا تعارف ہوا، اس کے بعد انھوں نے ابوالعلاء معری کی کتاب رسالۃ الغفر ان پڑھی۔ دارالمصنفین کا رسالہ معارف ان کے علمی اور ادبی ذوق کی نشو ونما میں مددگار ثابت ہوا، قاضی صاحب کے چاروں طرف جو مدرسوں کا ماحول تھا اس میں دارالمصنفین اور وہاں کے ندوی علماء کی کتابوں کی حیثیت شجر ممنوعہ کی تھی، قاضی صاحب اپنے ماحول کے خلاف دارالمصنفین کی تصنیفات کا مطالعہ نہ کرتے تو ان کے اندر علمی، ادبی اور تصنیفی کاموں کا ذوق نہ ابھرتا، اس کا اعتراف انھوں نے خود کیا ہے۔ یہی اعتراف پہلے مولانا سعید احمد اکبر آبادی بھی کر چکے ہیں کہ اگر ان کے لئے علامہ شبلی کی تصنیفات نمونہ نہ ہوتیں تو وہ کامیاب مصنف نہ بن سکتے تھے، ندوۃ المصنفین کو دہلی میں دارالمصنفین کے طرز پر قائم کیا گیا تھا، دارالمصنفین سے علمی اور تحقیقی رسالہ معارف شائع ہوتا تھا اور ندوۃ المصنفین دہلی سے برہان، برہان کے ایڈیٹر مولانا سعید احمد اکبر آبادی تھے، ندوۃ المصنفین شخصی ادارہ تھا، اس لئے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے انتقال کے بعد ختم ہوگیا، دارالمصنفین آج بھی باقی ہے اور اس کا رسالہ معارف آج بھی نکل رہا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند کے درمیان کی خلیج پاٹی جا چکی ہے، ندوہ کے جو امتیازات تھے یعنی علمی وادبی انداز تصنیف اور جدید عربی زبان وادب پر مہارت، نصاب تعلیم کی اصلاح اور اتحاد اُمت اور مناظرہ بازی سے پرہیز وغیرہ یہ ساری باتیں اب دارالعلوم دیوبند کے ماحول میں بھی بڑی حد تک موجود ہیں اور وہاں کے اہل بصیرت علماء

ان ہی قدروں کو عزیز رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ جماعت اسلامی بھی اب پہلے کی طرح شجر ممنوعہ نہیں، اصل وفاداری دین اسلام سے ہونی چاہئے اور اسی کی سربلندی مقصود ہونی چاہئے، مسلکی اختلافات کو اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ وسائل کی کمی کی وجہ سے قاضی اطہر مبارکپوری دور کسی بڑے اور مشہور مدرسہ میں تعلیم کے لئے نہیں جا سکے؛ لیکن اپنی محنت اور شوق اور لگن سے انھوں نے وہ سب کچھ حاصل کرلیا جو مشہور مدارس میں جا کر بھی لوگ حاصل نہیں کر پاتے ہیں، اصل چیز ہے حوصلہ، محنت اور عزم اور پھر سفینۂ عزم کو دریائے عمل میں اُتار دینا، پھر سفینہ ساحل مراد تک پہنچ جاتا ہے۔

چیتے کا جگر چاہئے شاہیں کا تجسس
جی سکتے ہیں بے روشنی دانش و فرہنگ

تجربہ یہ رہا ہے کہ جو طلبہ صرف اور صرف درسی کتابوں تک خود کو محدود کر دیتے ہیں وہ علم کے کوچہ میں کوئی نمایاں کام نہیں کر پاتے ہیں، قاضی صاحب درسی کتابوں کے ساتھ غیر درسی کتابیں بھی بہت پڑھتے تھے اور سفر و حضر ہر وقت کتاب ہاتھ میں ہوتی۔ اسی وسعت مطالعہ نے قاضی صاحب کو اس مقام تک پہنچایا کہ وہ علم و تحقیق کے دریا کی شناوری اور غواصی کر کے موتی نکال کر لائیں اور علم کی دنیا میں اپنی جگہ بنائیں، وہ بمبئی میں رہے جسے علم کش شہر سمجھا جاتا ہے؛ لیکن وہاں بیٹھ کر انھوں نے بہترین کتابیں تصنیف کیں۔

قاضی صاحب نے ان کتابوں کے نام گنائے ہیں، جن کے مطالعہ سے ان کو بہت فائدہ ہوا اور علم کی جستجو بڑھی، اُردو کتابوں میں انھوں نے مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کی ''علماء سلف'' کا اور مولانا حالی کی '' مسدس حالی'' کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، آج کل کے طلبہ کو ان دونوں کتابوں کا اور خود قاضی صاحب کی کتاب '' تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں'' کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔ قاضی صاحب کو کتابوں کا شوق اس قدر تھا کہ جس دن کوئی کتاب ڈاک سے آنے والی ہوتی تو بیتابی سے رات کو نیند نہ آتی اور اگر آتی تو خواب میں دیکھتے کہ وہ ڈاک خانے سے کتاب کا پارسل چھڑا کر لا رہے ہیں اور جس دن کتاب آجاتی وہ روز عید ہوتا اور کتاب آنے پر شکرانہ کی نماز ادا کرتے، جو کتابیں انھیں پسند آتیں؛ لیکن وہ بازار میں دستیاب نہ ہوتیں ان کو وہ اپنے ہاتھ سے نقل کر لیتے تھے اس طرح بنتا ہے علم کا ذوق۔ آج کل ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر گھنٹوں وقت گذارنے والے نوجوان اور روزانہ کی خبروں پر تبصرہ کرنے والی نئی نسل کو کیا خبر کہ علم کیا چیز ہوتی ہے، قاضی صاحب بہت بڑے اسکالر ہوئے، عرب و عجم میں ان کے قدردان پیدا ہوئے؛ لیکن ان کے بچپن اور طالب علمی کا

زمانہ اسی طرح سے مطالعہ کی عادت میں گذرا ہے۔ گھروں میں والدین کو چاہئے کہ خود معیاری علمی ادبی دینی کتابیں خریدیں، بچوں سے کتابیں خریدوائیں، مصنفین کو اچھی کتاب کی تصنیف پر مبارکباد بھیجیں اوران کی ہمت افزائی کریں، خود مطالعہ کریں اور بچوں کو مطالعہ کی عادت ڈالیں۔ ہر وقت ٹی وی کے سامنے بیٹھنا یا صرف اخبارات کی ورق گردانی کرنا اپنے اور بچوں کے ذوق کو بگاڑنے کے مرادف ہے۔ قاضی صاحب کی خودنوشت کے مطابق ان کی طالب علمی کا پورا دور عسرت اور تنگی میں گذرا؛ البتہ علم کی دولت وافر ملی تھی، چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں، پڑھنا اور لکھنا، طالب علمی کے زمانہ سے ہی ان کے مضامین چھپنے لگے، قاضی صاحب کی انشاپردازی اور منظر نگاری کا اندازہ ان کے ایک پیراگراف سے کیا جاسکتا ہے:

مدرسہ کے طلبہ جو اکثر قصبہ اور اطراف کی بستیوں کے ہوا کرتے تھے، عصر کے بعد عیدگاہ پر جمع ہوتے تھے، یہ بہت پرفضا جگہ ہے، شمال میں سامنے سمودی کا وسیع وعریض تالاب، عیدگاہ کے پیچھے کچے صحن میں نیم کے درختوں کی قطار، جنوب میں تاحد نظر میدان اور آس پاس سرسبزی اور شادابی عجیب جاذب نظر اور دل کش منظر پیدا کرتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حافظ شیرازی کا ''کنار آب رکنا باد وگل گشت مصلی را'' یہیں پر آگیا ہے، اسی زمانہ میں 'برسات کی چاندنی رات کے عنوان سے میں نے ایک نظم کہی تھی جس میں یہ شعر بھی تھا:

دور کچھ یاں سے سمودی کے کنارے آم پر
اک پپیہا دے رہا تھا جاں پیا کے نام پر

انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

کفایت شعاری کی عادت ایسی پڑی کہ بمبئی جیسے شہر میں مدت دراز تک رہنے کے باوجود میں بمبئی والا بالکل نہیں بن سکا اور میں نے بڑی بڑی پیشکش کو شکریہ کے ساتھ واپس کردیا اور مدرسہ کی فضا میں جو مزاج بنا تھا وہ شہر کی رنگینی کی نذر نہ ہوسکا۔

آگے چل کر علم کی دنیا میں علم اور قلم کے اس دھنی کو یہ اعزاز ملا کہ اس کی آٹھ کتابیں ندوۃ المصنفین دہلی سے تین کتابیں بمبئی سے اور تین کتابیں قاہرہ سے عربی میں شائع ہوئیں؛ لیکن شہرت اور اعزازات اور بڑی تنخواہ تو بعد کی بات ہے پہلے تو تنگی اور ترشی میں گذر ہوئی، آٹا گھول کر نمک کے ساتھ پی لیا، سالن کی جگہ پیاز، ایک سال ایک مدرسہ میں حبۃ للہ کام کیا، پھر تنخواہ ہوئی تو ۱۵ روپے پھر ۱۸ روپے، سوچنے کی بات ہے کہ آج بھی مدرسہ کا ایک فارغ پریشان حال رہتا ہے،

قرآن اور حدیث کا ایک عالم اور نان شبینہ کا محتاج، دینی علوم کا ماہر اور دنیا داروں کے در پر دریوزہ گر۔ آخر نصاب تعلیم ایسا کیوں نہیں بنایا جاتا کہ فراغت کے بعد انسان اپنی خودداری کی حفاظت کر سکے اور پھر بات صرف خودداری کی نہیں ؛ بلکہ عصر جدید کے تقاضوں کے مطابق خدمت دین کی ہے، بعد میں قاضی اطہر مبارکپوری کی علمی شہرت نکہت گل کی طرح پھیل گئی تو پھر ان کو اچھی ملازمتوں کے آفر ملے، اس کی وجہ یہ تھی اُردو زبان وادب کی دنیا میں بھی انھوں نے اپنی جگہ بنالی تھی، زمزم لاہور اور سہ روزہ مسلمان اور کوثر اور مدینہ بجنور میں ان کے مضامین اور نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ شاعری میں وہ اصغر گونڈوی اور احسان دانش کا تتبع کرتے تھے، ادبی رسائل نیرنگ خیال، ادبی دنیا اور ادب لطیف وہ پابندی سے پڑھتے تھے، ان کا ادبی اور شعری ذوق کتنا بلند تھا اس کا اندازہ ان کی ایک غزل کے مطلع سے ہوتا ہے۔

خلوت بے نیاز کو سلطنت شہی سمجھ
بے خودئ خودی میں ڈوب سر قلندری سمجھ

ان کی زندگی کا بڑا حصہ بمبئی میں گذرا، جہاں پہلے انھوں نے حامد الانصاری غازی صاحب کے ساتھ مل کر روزنامہ جمہوریت نکالا، پھر جمہوریت بمبئی کا مقبول ترین اخبار بن گیا اور انقلاب کی مقبولیت بھی اس کے آگے ماند پڑنے لگی۔ قاضی صاحب نے اپنی خودنوشت میں شکایت کی ہے کہ حامد الانصاری غازی صاحب نام لکھنے کی اجازت نہیں دیتے تھے اور کہتے تھے کہ تمہیں بنیاد کا پتھر بننا چاہئے، جس پر عمارت قائم ہوتی ہے؛ لیکن وہ کہیں نظر نہیں آتا، اخبار کے قارئین بھی تمام مضامین کو غازی صاحب کے کھاتہ میں ڈال دیتے تھے اور اصل مضمون نگار بنیاد کے پتھر کی طرح آنکھوں سے اوجھل ہوتا۔ اسی سے ملتا جلتا معاملہ الہلال میں بھی پیش آیا تھا، اخبار میں صرف مولانا آزاد کا نام ہوتا تھا، چنانچہ سارے مضامین کو لوگ مولانا آزاد کی طرف منسوب کردیتے تھے، مشہور مضمون ''مشہد اکبر'' اب تک مابہ النزاع ہے، مولانا سید سلیمان ندوی نے اسے اپنا مضمون قرار دیا ہے، مولانا آزاد کے حلقہ کے لوگ سید صاحب کی تصریح کے باوجود اسے مولانا آزاد کا مضمون سمجھتے رہے، مولانا آزاد سے کسی نے سوال کیا تو انھوں نے مبہم جواب دیا کہ ''کیا حرج ہے اگر میرے کسی مضمون کو کوئی شخص اپنی طرف منسوب کرلے''۔

قاضی اطہر مبارکپوری کا مزاج عالمانہ اور محققانہ تھا؛ لیکن معاش کے لئے وہ صحافت سے وابستہ رہنے پر مجبور رہے، وہ انقلاب کے کالم نویس رہے؛ لیکن فاضل وقتوں میں وہ اپنا تصنیفی اور علمی

کام جاری رکھتے تھے، بمبئی جیسے کاروباری اور صنعتی شہر میں بھی انھوں نے علم وتحقیق سے اپنے رشتہ کو منقطع نہیں ہونے دیا، اخبارات میں ان کے علمی مضامین چھپتے رہے اور ان کا تعارف ہوگیا، بمبئی میں ۲۶ سال تک وہ البلاغ کے مدیر رہے، بہت سی کتابوں کے مصنف بنے، اب ان کا شمار بڑے مصنفین اور مؤرخین میں ہوتا ہے اور انھیں طبقہ علماء کے قیس وفرہاد کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے۔

قاضی اطہر مبارکپوری بہت بڑے عالم تھے؛ لیکن ان کی دو کتابیں غالباً ابھی تک غیر شائع شدہ ہیں ایک ''منتخب التفاسیر'' دوسری کتاب ''علماء اسلام کی خونیں داستانیں'' غالباً ایک اور معروف کتاب ''مذہبی داستانیں'' اس سے بالکل الگ ہوگی، قاضی صاحب کی سب سے مشہور کتاب جس نے عرب فضلاء کے درمیان جگہ بنائی وہ ''رجال الہند والسند'' ہے، عرب وہند کے تعلقات کے موضوع پر ان کی کتابوں کا سلسلہ جو ندوۃ المصنفین سے شائع ہوا قابل مطالعہ ہے۔ عرب وہند کے تعلقات کے موضوع پر سب سے اہم کتاب سب سے پہلے علامہ سید سلیمان ندوی کی شائع ہوئی ''عرب وہند کے تعلقات'' جس کا نام ہے اور پھر انھوں نے ''عربوں کی جہاز رانی'' لکھی۔ سید صاحب کے بعد بلا شبہ سب سے اہم کتابیں قاضی اطہر صاحب کی ہیں، عرب وہند تعلقات کے موضوع پر ان کا مقالہ معارف میں ''نارجیل سے نخیل تک'' کے نام سے شائع ہوا ہے، عرب وہند عہد رسالت میں ''العقد الثمین فی فتوح الہند، الہند فی عہد الفاطمیین، خلافت راشدہ اور ہندوستان، خلافت بنی امیہ اور ہندوستان، اسلامی ہند کی عظمت رفتہ، آثر ومعارف، علی وحسین، ائمہ اربعہ، تدوین سیر ومغازی'' اور دوسری بہت سی کتابیں ہیں، ان سے قدیم تاریخ اور مصادر پر ان کی نظر ثاقب کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک بوریہ نشین درویش نے علم کے کتنے ہفت خواں طے کرلئے'' ''خلافت عباسیہ اور ہندوستان'' کے پیش لفظ میں مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی نے بجا طور پر لکھا ہے:

اس میں شک نہیں کہ قاضی صاحب اس بے آب وگیاہ صحراء میں تنہا چلے اور جب لوٹے تو باغ وبہار کا ایک پورا قافلہ اپنے ساتھ لائے۔

قاضی اطہر مبارکپوری کی علمی عظمت کی اس سے بڑھ کر دلیل اور کیا ہوسکتی ہے کہ عبدالعزیز میمنی جیسے مشہور ادیب اور فاضل یگانہ نے ایک صاحب کے سامنے یہ کہا کہ:

ہندوستان میں عربی کے دو عالم اور مصنف قابل ذکر ہیں ایک مولانا ابوالحسن علی ندوی، دوسرے قاضی اطہر مبارکپوری۔

☆ ☆ ☆ ☆

''بیسویں صدی کے سو عظیم مسلم قائدین''

کسی مفکر کا قول ہے کہ ''جس قوم کو اپنے عہد گذشتہ کی تاریخ یاد نہیں رہتی اس کے حال کا زمینی جغرافیہ بھی محفوظ نہیں رہتا ہے''، یعنی جادہ حیات میں منزل سے ہم کنار ہونے اور پیش رفت جاری رکھنے کے لئے ہمیں اپنے اسلاف کے روشن کارناموں سے واقف ہونا ضروری ہوتا ہے، یہی احساس تھا جس نے علامہ شبلی کو ''ہیروز آف اسلام'' کے موضوع پر سلسلہ تصنیف شروع کرنے پر آمادہ کیا تھا، ان انقلاب انگیز اور عہد آفریں مسلم شخصیات کے کارناموں کو اجاگر کرنے پر مجبور کیا جن کا نقش قدم آج بھی پوری دنیا کے مسلمانوں کے لئے چراغ راہ ہے اور یہی جذبہ تھا جس نے مولانا ابوالحسن علی ندوی سے ''تاریخ دعوت وعزیمت'' جیسی مکمل اور مفصل کتاب لکھوائی جس کی اہمیت کا عالم یہ ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ کے بغیر کسی شخص کے اسلامیات کے مطالعہ کو مکمل نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کے جذبہ نے مصر کے مشہور ادیب اور مؤرخ ڈاکٹر احمد امین سے ''زعماء الاصلاح'' لکھوائی اور عبداللہ العقیل سے ''من اعلام الدعوۃ والحرکات الاسلامیۃ'' لکھوائی اور یہی جذبہ ہے جس نے انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز کے دانشور ڈاکٹر منظور عالم کو بیسویں صدی کی سو عظیم مسلم شخصیتوں پر انگریزی زبان میں اس کتاب کو لکھوانے اور تیار کرانے پر آمادہ کیا ہے۔ یہ کتاب زبانِ حال سے مسلمانوں کی نئی نسل کو حرکت وعمل اور سعی مسلسل کا پیغام دے رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا رہنا محرومی اور موت کو دعوت دینا ہے، بیسویں صدی کی یہ انقلاب انگیز شخصیتیں تمہارے لئے مینارۂ نور ہیں، ان کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کرو اور ان سے ذوق عمل سیکھو اور زندگی کو بامقصد بناؤ اور منزل کی جستجو میں اپنی زندگی کو کھپادو۔ صرف رزق کی تلاش اور آشیانے کی فکر کسی انسان کو حیوان کی سطح سے بلند نہیں کرسکتی ہے، اس کتاب میں پچاس مسلم ملکوں کی ان شخصیتوں کا انتخاب کیا گیا ہے جو اہم شخصیتیں ہیں، اس کتاب میں کسی مسلک اور مکتبِ فکر کے ساتھ جانب داری نہیں برتی گئی ہے۔ اگر اس میں ایک طرف مولانا اشرف علی تھانوی کا نام ہے تو دوسری طرف مولانا احمد رضا خاں صاحب کا بھی نام ہے، اگر اس میں جماعتِ اسلامی کے بانی کا نام شامل ہے تو تبلیغی جماعت

کے مؤسس کا بھی تذکرہ ہے اور جمعیۃ علماء کے قائدین کے تذکرہ سے بھی کتاب خالی نہیں، عالم اسلام کے چمن کے رنگ برنگ کے پھول اپنی بہار دکھاتے ہیں، ان کی عطر بیزی سے مشام جاں معطر اور ان کی جلوہ نمائی سے دیوار و در منور اور ہر طرف چراغاں کا منظر ہے۔

بیسویں صدی آرام وراحت کی صدی نہیں تھی، یہ مصائب کا پر آشوب زمانہ رہا ہے، نہ صرف ہندوستان؛ بلکہ پورا عالم اسلام استعمار کی یورش یا فکری یلغار کا شکار رہا ہے۔ بلقان کی جنگ اسی صدی میں ہوئی، خلافت عثمانیہ کا چراغ اسی صدی میں گل ہوا اور عالم اسلام ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا، اسرائیل کا ناسور پیدا ہوا، مصر اور الجزائر سے لے کر بوسنیا تک سرزمین خون مسلم سے لالہ زار ہو گئی، ہندوستان میں شدھی سنگھٹن کی تحریک اُٹھی، مسلمانوں کو ملازمتوں سے بے دخل کیا گیا، انگریزی سرکاری زبان بنی، مسلمانوں کی جاگیریں ضبط ہوئیں اور آزادی کی تحریک چلانے کے جرم میں سخت ترین سزائیں ان کو دی گئیں، آخر میں ملک کی تقسیم جس نے بہت سے مسائل پیدا کر دیئے گویا پورے عالم اسلام میں زندگی ایک ملبہ سے تبدیل ہو گئی تھی۔ لیکن نہایت حیرت خیز اور استعجاب انگیز بات یہ ہے کہ اسی صدی میں جو پیہم آزمائشوں کی صدی ہے اسلامی تحریکیں اٹھیں اور مسلمانوں میں ایسی انقلاب انگیز اور قد آور شخصیتیں پیدا ہوئیں جن سے اندھیرے میں چراغاں کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، یہ وہ شخصیتیں ہیں جن کی عظمت کا اعتراف سب نے کیا ہے، ان کا مقام بلند مسلم اور ان کی شخصیت سب کے لئے محترم ہے۔

مسلمانوں کی نئی نسل کو تاریخ کا یہ آئینہ دکھانے کی ضرورت تھی جو مایوسی اور فکری انتشار کا شکار بن رہی ہے، اس کے سامنے اندھیرا ہے اور راستہ نظر نہیں آتا ہے۔ غیر مسلموں کے لئے بھی یہ کتاب اہم ہے کہ تاریخ کو مسخ کرنے اور مسلم شخصیتوں کو نظر انداز کرنے کا دنیا میں رجحان پایا جاتا ہے۔ تاریخ اور سماجی علوم کا غیر جانب دارانہ مطالعہ کرنے والوں کے لئے بھی یہ کتاب اہمیت رکھتی ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ اس مسلم ذہن اور مزاج کو سمجھنے میں مدد ملے گی جو زمان ومکان کے فرق کے باوجود اور زبان وتہذیب کے اختلافات کے باوجود وحدت اور یکسانیت سے خالی نہیں؛ کیوں کہ اس کی تشکیل اور شیرازہ بندی میں ایک عقیدہ اور ایک دین کا نمایاں حصہ ہے۔ لوگ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کا مخصوص مزاج کیا ہے اور ان کی ترجیحات کیا ہیں، ان کے لئے کیا کیا چیزیں لائق ستائش اور کونسی باتیں ہیں جن سے وہ دور اور نفور ہوتے ہیں، اسلام کی ایک مشترک تہذیب اور مزاج کو سمجھنے میں اس کتاب سے مدد ملے گی۔

تاریخ کی کوئی کتاب ہو وہ اپنے لکھنے والے کے مزاج کا آئینہ ہوتی ہے، اس کی محبتوں اورعقیدتوں کی چھاپ اس پر موجود ہوتی ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ''خلافت وملوکیت'' لکھی ،اس میں انھوں نے مثالی شخصیت اور مجدد کی حیثیت سے امام ابوحنیفہ کو پیش کیا ہے اور ان کے تشکیل فقہ اسلامی کے کارنامہ کو اُجاگر کیا ہے، مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ''تاریخ دعوت وعزیمت'' لکھی، اس میں مستقل باب امام احمد بن حنبل پر ہے، امام ابوحنیفہؒ پر نہیں ہے، مولانا مودودی کے قانونی ذہن کو امام ابوحنیفہؒ سے مناسبت زیادہ تھی، اس لئے ان کے نزدیک مثالی شخصیت امام ابوحنیفہؒ کی تھی، مولانا علی میاں اپنے ذوق ومزاج کے اعتبار سے تاریخ کی جن باعزیمت شخصیتوں کو منظر عام پر لانا چاہ رہے تھے ان میں امام احمد بن حنبل کا نام، امام ابوحنیفہ پر مقدم تھا۔ اسی طرح سے زیر تذکرہ کتاب کے بورڈ کی بھی جو دانشوروں پر مشتمل ہے، اپنی پسند اور اپنی ترجیحات ہیں، چنانچہ کتاب میں فلسطین کے شیخ احمد یٰسین کا نام شامل کیا گیا ہے، یاسر عرفات کا نہیں، پاکستان کی مریم جمیلہ، پروفیسر خورشید احمد، مصر کی زینب الغزالی، بنگلہ دیش کے ضیاء الرحمٰن، ہندوستان کے مولانا قاضی مجاہدالاسلام کے نام شامل ہیں۔ لیکن شیخ الہند محمود الحسن، علامہ شبلی، سید سلیمان ندوی اور مولانا محمد علی جوہر کے نام غائب ہیں، یہ انتخاب کا معاملہ ہے، بہت سے لوگوں کو انتخاب سے اتفاق نہیں ہوگا؛ لیکن کوئی بھی انتخاب ہو اس پر سب کا متفق ہونا مشکل ہے، اس سے کتاب کی اہمیت کم نہیں ہوتی ہے اور ڈاکٹر منظور عالم نے اس کا اظہار اپنے فکر انگیز مقدمہ میں کردیا ہے۔ کتاب جس خلوص اور جس جذبہ سے لکھی گئی ہے وہ بہر حال قابل قدر ہے اور ڈاکٹر منظور عالم اور پورا ایڈیٹوریل بورڈ اس کے لئے قابل مبارکباد ہے اور کتاب اس لائق ہے کہ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو اور کوئی مکتبہ اور کوئی کتب خانہ، کوئی مدرسہ، کوئی دانش کدہ اس سے خالی نہ ہو۔ عالم اسلام کے لعل و جوہر کو ایک کتاب کی شکل میں اہل ذوق اور اہل علم وادب کے لئے پیش کردیا گیا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ اس جنس گرانمایہ کی کتنی طلب دامانِ شوق میں موجود ہے اور یہ کہ ملت کا خوش حال طبقہ کتاب کا خریدار بنتا ہے، یا صرف سامان تعیش کا، فکری غذا اسے عزیز تر ہے یا مادی طمطراق۔

کتاب انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے سائز کی ہے، ضخیم ہے، سرورق بہت خوبصورت جاذب نظر اور دیدہ زیب ہے؛ لیکن مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات، سو بلند قامت مشہور زمانہ شخصیتوں کا تذکرہ ہے اور ان کی تصویریں نہیں ہیں، کتاب دیوبند، ندوہ اور مظاہر العلوم سے شائع ہوتی اور تصویر نہ ہوتی تو کوئی اعتراض نہیں کرتا؛ لیکن کتاب انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز سے

شائع ہوئی ہے، جہاں کے ذمہ دار حضرات فوٹو گرافی کو ناجائز نہیں سمجھتے ہیں۔ پھر یہ کیا کہ اتنی خوبصورت قیمتی اور دستاویزی کتاب اور تصویروں کے بغیر، اُردو زبان کا محاورہ ہے کہ چاند بہت خوبصورت سہی؛ لیکن اس میں بھی داغ ہوتے ہیں، کتاب بہت قابل قدر ہے، زیادہ قابل قدر ہوتی اگر اس میں تمام شخصیتوں کی تصویریں موجود ہوتیں۔

کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس کا کینوس بہت وسیع ہے، اس میں مسلم حکمراں اور قائدین بھی ہیں اور اطباء و مصلحین بھی ہیں، اسلامی تحریکوں کے علم بردار بھی ہیں اور علماء اور ماہرین قانون بھی ہیں، مصنفین اہل قلم، ادباء، شعراء کی بزم بھی ہے اور مجاہدین آزادی کی رزم بھی ہے۔ سو کے عدد کی پابندی تھی اس لئے کچھ اہم نام بھی چھوٹ گئے ہیں؛ لیکن جو نام ہیں وہ سب کے سب نیک نام اور خوش نام ہیں اور آسمان پر جگمگاتی ہوئی کہکشاں کے مانند ہیں۔ اتنی اچھی کتاب کی اتنی خوبصورت طباعت اور اشاعت اس بات کی دلیل ہے کہ ہماری قیادت کسی درجہ میں کم کوش تو ہو سکتی ہے؛ لیکن بے ذوق و کم شوق نہیں ہے، کتاب میں معلومات افزا بیسویں صدی کا تعارف شامل ہے، جس سے تمام نشیب و فراز سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

ڈاکٹر محمد منظور عالم نے اپنے فکر انگیز مقدمہ میں عروج وزوال کے اسباب پر بھی گفتگو کی ہے اور بجا طور پر صنعت اور سائنس اور جدید ٹکنالوجی میں پسماندگی کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے، افغانستان ہو یا عراق، جتنے بھی زخم لگے ہیں اسی پسماندگی کی وجہ سے مسلمانوں کو لگے ہیں، کاش اس بات کا شعور عام ہوتا اور منبر ومحراب سے بھی یہ بات کہی جاتی اور بار بار دہرائی جاتی اور اس حقیقت کو دینی اور شرعی ضرورت کے طور پر پیش کیا جاتا۔ لیکن برا ہو فکری جمود کا کہ ان علوم کے تحصیل کا کام بعض علماء کے نزدیک محض دنیاداری کا کام ہے، ڈاکٹر صاحب نے مستقبل سے اچھی اُمیدیں وابستہ کی ہیں، یقیناً اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔

اس اہم کتاب کی رسم اجراء بھی بڑے طمطراق سے ہوئی، دانشوران شہر دہلی کے دل یعنی انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں ۱۳؍اپریل ۲۰۰۶ء کو جمع ہوئے اور تقریب رسم اجراء منعقد ہوئی، ہال شربت کے جام کی طرح لبریز تھا؛ بلکہ چھلک رہا تھا، دور دور تک لوگ صحن میں کھڑے تھے، جسٹس احمدی کی صدارت تھی، وی پی سنگھ اور لالو پرشاد مہمان خصوصی تھے، جناب سید حامد اور دوسرے معززین شہر موجود تھے اور شہر کے باہر سے آئے ہوئے مہمان بھی تھے۔

☆ ☆ ☆ ☆

دائرۃ المعارف اور اس کی چند مطبوعات

مسلمانوں نے تاریخ میں علوم وفنون کی جتنی خدمت کی ہے کم قوموں نے کی ہے، علوم و فنون کا یہ خزانہ مخطوطات کی شکل میں صدیوں تک الماریوں میں بند پڑا رہا ہے، چوں کہ یہ کتابیں زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکیں، اس لئے عام اہل علم کی وہاں تک رسائی نہیں ہوسکی۔ دائرۃ المعارف دنیا کے ان اہم اداروں میں سے ہے جس نے نصوص کی تحقیق اور تدوین کے بعد نادر مخطوطات کو شائع کیا اور علم کی اس دولت بے بہا کو وقف عام کردیا، عالم اسلام کے علمی حلقے حیدر آباد کو دائرۃ المعارف کے حوالے سے جانتے ہیں۔ انھیں خبر ہے کہ ''کنز العمال، طبقات الشافعیہ، کتاب المقفی الکبیر، اعجاز البیان فی تفسیر ام القرآن، الاشباہ والنظائر، الاقتراح فی اُصول النحو، جمہرۃ اللغۃ، کتاب الامثال اور المحمدون من الشعراء'' جیسی اہم نادر اور نایاب کتابیں اسی ادارہ نے ایڈٹ کر کے شائع کی ہیں، اس ادارہ نے جو نادر کتابیں تحقیق نصوص کے بعد شائع کی ہیں۔ ان کی تعداد کئی سو ہے اور یہ بہت قدیم اور بہت اہم کتابیں ہیں، عرب دنیا اور عالم اسلام کے علمی حلقے جو تحقیق اور ریسرچ کا ذوق رکھتے ہیں، حیدر آباد کو جامعہ عثمانیہ یا سالار جنگ میوزیم یا چار مینار اور مکہ مسجد سے نہیں جانتے ہیں؛ بلکہ دائرۃ المعارف کے ذریعہ سے جانتے ہیں، دائرۃ المعارف شہر حیدر آباد کے گلے کا زیور اور اس کے سر کا تاج ہے۔

دائرۃ المعارف حسبِ ضرورت دنیا کے مختلف اہم اور علمی کتب خانوں سے علمی، ادبی، اہم مخطوطات کو حاصل کرتا ہے، مخطوطات کے انتخاب کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دائرۃ المعارف کے شعبہ تصحیح سے تعلق رکھنے والے علماء اور فضلاء دنیا کے مشہور ومعروف مکتبات کی فہرست مخطوطات دقت نظری سے ملاحظہ کرتے ہیں، ان فہرستوں میں قابل ذکر فہرست دار الکتب المصریۃ، فہرست مخطوطات رامپور، فہرست مخطوطات سالارِ جنگ، فہرست مخطوطات آصفیہ، فہرست مخطوطات برو کلمان، فہرست دار الکتب الظاہریۃ، فہرست المکتبۃ الازھریۃ، فہرست الخزانۃ التیموریۃ، فہرست مخطوطات الموصل ہیں۔ ایسے ہی بعض امہات الکتب اور مصادر علمیہ جیسے فہرست ابن ندیم حاجی

خلیفہؒ کی کشف الظنون وغیرہ دیکھ کر مخطوطات کی ایک فہرست بنالیتے ہیں، پھر انٹرنیٹ کے ذریعہ مقدور بھر کوشش کر کے اس بات کا پتہ لگاتے ہیں کہ آیا یہ مخطوطات ہند یا بیرونِ ہند کہیں سے شائع ہوئے ہیں یا نہیں۔ جن مخطوطات پر کامل یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کہیں سے طبع نہیں ہوئے ہیں ان کی فہرست تیار کر کے صدر مصحح کو سونپ دی جاتی ہے اور صدر مصحح دائرۃ المعارف کی علمی نگرانی کرنے والی کمیٹی کو یہ فہرست پیش کرتا ہے، اس کمیٹی میں بحث و مباحثہ کے بعد جن مخطوطات کو منتخب کیا جاتا ہے، ان پر کام کیا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ پانچ سالہ پروگرام ہوتا ہے، مخطوطہ پر کام کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ جس مخطوطہ پر کام کرنا مقصود ہوتا ہے، ان سب نسخوں کو یا اکثر نسخوں کو مختلف لائبریریوں سے خط و کتابت کے ذریعہ یا ذاتی تعلقات کی بنیاد پر حاصل کرلیا جاتا ہے، کبھی ذاتی روابط کی بنیاد پر بات بن جاتی ہے تو کبھی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ مخطوطہ کے نسخوں کو جمع کرنے کے بعد ان میں سے بہتر اور کامل نسخہ کو اصل مان کر دوسرے نسخوں سے مقابلہ کرتے ہیں، فروق اور اختلافات کو نوٹ کرنے کے بعد ماہر مصحح کی نگرانی میں اس کی تصحیح و تحقیق ہوتی ہے، تصحیح شدہ حصہ صدر مصحح کی نظر سے گزرتا ہے، تصحیح و تحقیق کے مراحل مکمل ہونے پر اس کو طباعت کے لئے بھیج دیا جاتا ہے۔

تحقیق کا فن اپنے اُصولوں کے ساتھ ایسا فن ہے جسے شروع کرنے اور برتنے کا سہرا مستشرقین یورپ کے سر ہے، انھوں نے سیکڑوں کتابوں کو جو مخطوطات کی شکل میں کتاب خانوں میں بند تھیں، ایڈٹ کر کے شائع کیا اور عربی نصوص کے گنج ہائے گراں مایہ کو قدر دانوں تک پہنچایا، انھوں نے اشاعت علم کا ایک دروازہ کھول دیا۔ پھر عالم عرب اور عالم اسلام میں بڑے بڑے محققین پیدا ہوئے، جنھوں نے اس فن کو آگے بڑھایا اور اسے جلا بخشی پھر عربی ادب، تاریخ، سیرت، دینیات، طب، جغرافیہ، سائنس اور دوسرے فنون کی کتابیں ایڈٹ کر کے شائع کی گئیں۔ ہندوستان میں جو لوگ عربی اور اسلامی علوم کی قلمی کتابوں کی تحقیق کے میدان کے شہسوار ہوئے ان میں ڈاکٹر حمید اللہ، پروفیسر عبد المعید خاں، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، عبد العزیز میمن، پروفیسر عبدالعلیم، مختار الدین احمد آرزو، امتیاز علی عرشی، عبدالوہاب بخاری، پروفیسر خورشید احمد فاروق وغیرہ کے نام ہیں۔ ان میں کئی شخصیتوں کی کتابیں تحقیق کے بعد دائرۃ المعارف سے شائع ہوئی ہیں، اس عظیم ادارہ کے محققین اور تصحیح متن کا کام کرنے والے مولانا ابوبکر ہاشمی، مولانا عمران اعظمی، مولانا سمیع اللہ خان نے بھی قابل قدر کام کیا ہے۔ یہ لوگ بھی اس بزم کے چراغ سحری ہیں یعنی ان کا رٹائرمنٹ قریب ہے، اس کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا ہے کہ اسٹاف میں دوسرے لوگوں کو

تحقیق وتدوین نصوص کے کام کی یہ حضرات تربیت دیں اوراس کے بعد رخصت ہوں، ان کے بعد تو ادارہ کا شعبہ تحقیق یتیم ہوکر رہ جائے گا۔ پہلے اس شعبہ میں مستقل کام کرنے والے افرادمتعدد تھے، غالباًدس بارہ یااس سے زیادہ، اب ایک دو جو مستقل رہ گئے ہیں ان کا چل چلاؤ ہے، ان کے بعد کون شعبہ تحقیق کا محافظ ہے؟ یعنی ادارہ کے علمی کاموں کا اب خدا حافظ ہے۔ اب اس شجر کی بہار خزاں آلودہ ہے، تجہیز وتکفین اور فاتحہ خوانی کے آثار نمایاں ہیں، یعنی اگر اہل علم وتحقیق رخصت ہوجائیں گے اوران کی جگہ پر کام کرنے والوں کی ٹریننگ نہ ہوگی تو ایسے لوگوں پر اقبال کا یہ شعر صادق آئے گا:

میراث میں آئی ہے انھیں مسند ا؁ شاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

نایاب اور قیمتی مخطوطات کی طرح خوددائرۃ المعارف ایک کمیاب اور قیمتی ادارہ ہے؛ لیکن وہ صرف دوسروں کی نہیں؛ بلکہ اپنوں کی بھی بے التفاتی کا شکار ہے، کہا گیا ہے ''قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری'' اس ادارہ کے نصیب میں نہ کوئی قدر کرنے والا شاہ باقی رہ گیا ہے نہ جوہری، اب ناقدری کا دور ہے اوراب ہیروں کے ساتھ خزف ریزوں کا معاملہ کیا جارہا ہے، خدابخش لائبریری کی طرح یہ ادارہ بھی اگر مرکزی حکومت کی نگرانی میں آجائے تو شاید صورتِ حال زیادہ بہتر ہوجائے۔

☆ ☆ ☆ ☆

میری کتاب
''حالات بدل سکتے ہیں''

سوچتا ہوں کہ کیا اپنی اس نئی تصنیف '' حالات بدل سکتے ہیں'' کے شائع ہونے سے حالات بدل جائیں گے اور کیا اس سے ملت کا مریض نیم جاں صحت مند ہوجائے گا۔ دماغ نے سوال کا جواب دیا کہ حالات کی تبدیلی کے لئے شعور کی بیداری ضروری ہے اور یہ تصنیف شعور کو بیدار کرنے کی ایک کوشش ہے۔ دل نے پھر سوال کیا کہ کیا اس تصنیف سے ملت کا شعور بیدار

ہو جائے گا؟

راقم سطور کو ایسی کوئی خوش فہمی نہیں کہ اس کی اس کتاب سے مسلمانوں کا شعور بیدار ہو جائے گا، تاہم یہ ایک ٹوٹی پھوٹی کوشش ہے۔ اندھیرا جب ہر طرف پھیل جائے تو اندھیرے کا غم انگیز نوحہ کہنے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ انسان ایک موم بتی یا ایک چراغ جلادے، یہ کتاب بھی اندھیرے میں ایک چراغ سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتی ہے۔ حالات بدل سکتے ہیں یا حالات کیوں بگڑ گئے، اس موضوع پر پہلے اہل فکر وقلم حضرات جیسے مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی، عبدالرحیم قریشی، پروفیسر خورشید احمد، ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی، مولانا محمد رابع حسنی ندوی، سید حامد، وحید الدین خاں وغیرہ کی تحریریں شائع ہو چکی ہیں، ان بیش قیمت تحریروں کا حلقہ اثر چند ہزار سے متجاوز نہیں ہوگا۔ یہ کتاب اگر چہ زیادہ مفصل ہے اور مسائل کا حل قرآن کی روشنی میں، مسائل کا حل سیرت کی روشنی میں، مسائل کا حل تاریخ کے مطالعہ کی روشنی میں اور حالات وحوادث کے سبق اور دوسرے عنوانات پر مشتمل ہے؛ لیکن یہ کیسے توقع کرلی جائے کہ یہ کتاب دس ہزار ہاتھوں تک بھی پہنچ جائے گی۔

۳۱/دسمبر ۲۰۰۴ء کی صبح اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ مشہور آرٹسٹ ایم ایف حسین کی بائیس پینٹنگس دس لاکھ ڈالر میں فروخت ہوگئیں، جس شخص نے قدر دانی کا مظاہرہ کیا وہ لندن میں مقیم ایک ہندوستانی ہے۔ ایک طرف ایک مصور کی تصویریں ہیں، دوسری طرف مفکر حضرات کی تحریریں ہیں، تصویروں کی خوش قسمتی ہے کہ وہ دس لاکھ ڈالر میں فروخت ہوگئیں، تحریروں کی شومئی قسمت ہے کہ وہ شاید دس ہزار انسانوں تک بھی نہیں پہنچ سکیں اور فکر کی ساکن سطح میں کوئی ارتعاش اور کوئی تموج نہیں پیدا کرسکیں۔ تصویروں میں اگر مصور کا خون جگر شامل ہے تو مذکورہ تحریریں بھی یقیناً خون دل کی روشنائی سے لکھی گئی تھیں اور ان کے رگ ساز میں بھی صاحب ساز کا لہو رواں تھا۔

مسلمانوں کی قسمت کا چاند مدتوں سے سیاہ بادلوں میں لپٹا ہوا ہے، تاریک اور طویل رات ہے کہ ڈھلنے کا نام نہیں لیتی، پورے عالم اسلام میں آج کوئی کاسۂ سر نظر نہیں آتا ہے، جو عزت اور ظفر مندی کا تاج پہن سکے، وہ حاکمان احرار اور صاحبان عز ووقار اب موجود نہیں، جنھوں نے حقیقی خودمختاری اور واقعی آزادی کی خلعت فاخرہ پہن رکھی ہو۔ کاسۂ دریوزہ گری اور کشکول گدائی بہت سے حکمرانوں کے ہاتھ میں ہے، وہ دوسروں کے زیر دست ہیں وہ اگر تخت طاؤس پر بھی جلوس افروز ہوں تو اس کا ہر تختہ ان کی نااہلی کا گواہ بن جائے، بہت سے ملک دولت مند ہیں؛ لیکن ان کی سیاست غیروں کی مرہون منت، ان کی سلطنت شیشہ شراب سے نازک تر ہے۔ ایک وہ وقت تھا

جب مسلمانوں کی عظمت اور کارناموں سے گنبد مینا گونج رہا تھا، ایک یہ وقت ہے کہ مسلسل شکست و ہزیمت سے ملت کا جسم لہولہان ہے، آسماں را حق بود گر خوں بہا در بر زمیں۔

جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو اس کی عقل پر بھی انحطاط طاری ہو جاتا ہے، اگر مسلمانوں میں عقل و شعور موجود ہوتا تو حالات دگرگوں نہ ہوتے اور ان کے مفکرین کی کتابیں کم از کم دس لاکھ انسانوں تک ضرور پہنچ جاتیں۔ کیوں کہ حالات کی تبدیلی کے لئے ملت کے بے حس و حرکت جسم کو جھنجھوڑ دینے کی ضرورت ہے، آج اس نفخ صور کی ضرورت ہے، جو مردہ لاشوں میں زندگی پیدا کر دے، آج ان تیز وتند ہواؤں کی ضرورت ہے کہ جو جمود کے خیموں کو اکھاڑ دے۔ ہر انقلاب سے پہلے فکر کی تربیت کا مرحلہ ضرور آتا ہے، جس کے لئے کتاب ایک ضروری عامل ہے اور ذہن سازی کے بغیر کوئی انقلاب رونما نہیں ہوتا ہے؛ لیکن یہ کتاب کتنے انسانوں تک پہنچ سکے گی؟

لوگ ایک دوسرے کو نئے سال کی مبارکباد پیش کررہے ہیں اور نیک تمناؤں کا اظہار کررہے ہیں؛ لیکن نہیں معلوم کہ یہ نیا سال مسلمانوں کے لئے کامرانی اور شادمانی کی سوغات لے کر آئے گا، یا بربادی اور نامرادی کی آفات لے کر آئے گا اور پھر کوئی نئی برق بلا مسلمانوں پر گرے گی، پہلے زور وشور سے دعویٰ کیا گیا تھا کہ اکیسویں صدی ہماری ہوگی؛ لیکن سوچنے کی بات ہے کہ پہلے سے تیاری کے بغیر صدی ہماری کیوں کر ہوسکتی ہے۔

مایوسی پیدا کرنا مقصد تحریر نہیں، صحیح بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، قرآن میں غلبہ اسلام کی بشارتیں آئیں ہیں، ان بشارتوں سے اطمینان ہوتا ہے اور اُمید کے چراغ جل اُٹھتے ہیں؛ لیکن صرف اطمینان کافی نہیں؛ بلکہ تیاریوں کے آغاز کی ضرورت ہے۔

مسند احمد کی حدیث ہے اور مقداد بن اسود کی روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اس روئے زمین پر پتھر یا مٹی کا کوئی گھر ایسا نہیں ہوگا، مگر یہ کہ اس میں اللہ تعالیٰ اسلام کو داخل کر دے گا، اسلام سے تعلق عزت اور سربلندی کا باعث ہوگا، جب کہ اس سے دوری انسانوں کے لئے ذلت اور پستی کا سبب بنے گی۔

مسند احمد کی دوسری حدیث ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی سے متعلق صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ قسطنطنیہ اور رومیہ میں سے کونسا شہر پہلے مسلمان فتح کریں گے، آپؐ نے جواب دیا کہ ''ہرقل کے شہر کو پہلے فتح کیا جائے گا'' رومیہ روم ہے، اٹلی کا دارالسلطنت اس سے مراد ہے، ہرقل کا شہر قسطنطنیہ پہلے سلطان محمد فاتح کے ہاتھ سے فتح ہو چکا ہے؛ لیکن اٹلی کی فتح باقی ہے۔

ابھی یہ پیشین گوئی پوری نہیں ہوئی ہے۔ لفظ فتح سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس کا رشتہ تلوار سے وابستہ ہے، قرآن میں صلح حدیبیہ کو فتح مبین قرار دیا گیا ہے، علم اور قلم کے عہد میں دلیل اور دعوت کے ذریعہ بھی ملک فتح ہو سکتے ہیں، جدید عہد میں مختلف عالمی نظریات کی ناکامی دراصل غلبہ اسلام کا دیباچہ ہے، زبردست تیاری کے ذریعہ غلبہ کی نئی تاریخ کی داغ بیل ڈالی جا سکتی ہے۔

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ یہودی تم سے جنگ کریں گے اور تم ان پر غلبہ حاصل کر لو گے، یہاں تک کہ پتھر پکار کر کہے گا کہ ''اے مسلم ادھر آ، دیکھ میرے پیچھے ایک یہودی چھپا ہوا ہے، تو اسے قتل کر دے''۔

غلبہ اسلام تو پتھر کی لکیر کی طرح اٹل ہے، حالات کا اندھیرا کتنا ہی سخت ہو غلبہ اسلام کی صبح نمودار ہو کر رہے گی، جب تک غلبہ اسلام نہیں ہوگا، آفتاب سوا نیزے پر نہیں آئے گا، پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح نہیں اُڑیں گے، میزان عدل برپا نہیں ہوگی اور قیامت نہیں آئے گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں کسی کام کے لئے عجلت اور جلد بازی نہیں ہے، پہلے غلبہ اسلام کے لئے مسلمانوں کو اپنے اندر ایمان وعمل کی اہلیت پیدا کرنی ہوگی، تب یہ خدائی وعدہ ''وکان حقا علینا نصر المومنین'' پورا ہوگا اور اگر ہم نے اہلیت پیدا نہیں کی تو اللہ تعالیٰ دوسری قوم پیدا کر دے گا، جس کے اندر اہلیت ہوگی، اللہ نے کہا ہے ''وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم''۔ (محمد: ۳۸)

کتاب کا آخری ورق اس لئے لکھا جا رہا ہے کہ پڑھنے والا دوسروں کو کتاب کا مخاطب سمجھنے کے بجائے خود اپنے آپ کو مخاطب سمجھے، دوسروں کا انتظار کئے بغیر خود اپنی زندگی میں انقلاب لائے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو بہت سی دوسری تحریروں کی طرح یہ کاوش بھی بے نیل ومرام ہوگی، یہ آواز بھی صدا بصحرا ثابت ہوگی اور فضا میں تحلیل ہو جائے گی، پورے عالم اسلام کو ایک طویل لکیر کی صورت میں فرض کر لیا جائے تو ہر فرد کی حیثیت ایک نقطہ کی ہے، ہر لکیر نقطوں کا مجموعہ ہوتی ہے، ہر فرد کو چاہئے کہ اصلاح کا کام اپنے سے شروع کرے۔ مسلمانوں کا مزاج یہ ہو گیا ہے کہ صرف دوسروں پر تنقید کرتے ہیں، ہر شخص کی زبان یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتی کہ عالم اسلام میں اتحاد نہیں، وہ یہ نہیں دیکھتا کہ وہ خود جس تنظیم، جس ادارے، جس شعبہ سے وابستہ ہے خود اس کے اندر اتحاد نہیں ہے، دوسروں کا احترام نہیں ہے، کسی پر اعتماد نہیں ہے، ہر مجلس ہر محفل ہر مشورت شکایتوں کے دفتر سے شروع ہوتی ہے اور اسی پر ختم ہوتی ہے، ''حالات بدل سکتے ہیں'' بشرطیکہ ہم میں سے ہر شخص نئے سال میں نیا عہد کرے اور:

۱- اللہ کی طرف رُجوع ہو، گناہ سے تائب ہو، قرآن وسنت کو مضبوطی سے پکڑ لے، روزانہ ان کے مطالعہ کا اہتمام کرے۔

۲- اپنے دائرے کار اور میدان عمل میں خواہ وہ تجارت ہو یا زراعت ہو، صنعت ہو یا حرفت ہو، ملازمت ہو یا طالب علمی ہو، اپنے اندر امتیاز وتفوق کی شان پیدا کرے، دوسروں سے کئی گنا زیادہ محنت کرے اور وقت کو ضائع ہونے سے بچائے۔

۳- اپنے کردار کو جگمگائے، حسن اخلاق میں دوسروں کے لئے نمونہ بن جائے۔

۴- خود تعلیم یافتہ ہو اور خاندان میں دوسروں کو تعلیم یافتہ بنائے، اپنی اور دوسروں کی اقتصادی حالت درست کرے، دولت کو اللہ کی راہ میں اور مسلمانوں کی ترقی پر خرچ کرے۔

۵- اپنے قول وعمل، گفتار وکردار سے ماحول میں اسلام کا تعارف کرائے اور غلط فہمیوں کو دور کرے۔

۶- عظمتِ رفتہ کی باز آفرینی کے لئے جو نسخہ تجویز کیا گیا ہے، خود اس پر عمل کرے اور اسے دوسروں تک پہنچائے۔

۷- باہمی افتراق سے بچے، اتحاد کی کوشش کرے، انفرادی زندگی میں بیجا تنقید اور غیبت سے مکمل پرہیز کرے۔

آسمان سے جب بادل اُٹھتے ہیں تو دور اور قریب ہر خطہ زمین کو سیراب کردیتے ہیں، اس ملت کو بھی جو دنیا کے کئی براعظموں میں پھیلی ہوئی ہے، ایمان ویقین اور علم وعمل کی تحریک کی ضرورت ہے، جو بادل بن کر چھا جائے اور بارش بن کر برس جائے، جس سے خشک کھیتیاں لہلہا جائیں، باغ سرسبز وشاداب ہوجائیں اور روٹھی ہوئی بہار پھر واپس آجائے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

(آخری صفحات کتاب: ''حالات بدل سکتے ہیں'' شائع کردہ قاضی پبلشرز، دہلی)

☆ ☆ ☆ ☆

مسلمانوں کے لئے حصول طاقت

(امپاورمنٹ کے موضوع پر کتابیں)

شہر میں جب کوئی بیماری پھیل جاتی ہے، کوئی بخار وبائی شکل میں پھوٹ پڑتا ہے تو دواؤں کی فروخت بھی بہت بڑے پیمانہ پر ہوتی ہے، کچھ پہلے آشوب چشم کی بیماری ملک کے کئی مقامات پر پھیل گئی تھی تو دواؤں کی دکانوں پر آنکھوں میں ڈالنے کی دوائیں بہت کثرت سے ملنے لگی تھیں۔ علم الاقتصاد کا نظریہ ہے کہ بازار میں کسی چیز کی رسد اس کی طلب کے برابر ہوتی ہے، جتنی بیماریاں اتنی دوائیں۔ عالمی سطح پر اور قومی سطح پر بھی مسلمانوں کی ذلت اور رسوائی، فقر وافلاس اور پسماندگی نکبت اور ناسازگاری، سر بزیری اور سرافگندگی ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے، یہ بیماریاں بھی وبائی شکل میں پھیلی ہوئی ہیں، قریہ قریہ شہر شہر ہر گھر ہر خاندان اس سے متاثر ہے، پوری اُمت اس میں مبتلا ہے۔ ان بیماریوں کا علاج کیا ہے ان مسائل کا حل کیا ہے اس موضوع پر بڑے بڑے سیمینار اور سمپوزیم منعقد ہوئے ہیں بڑے بڑے مفکر اور ہر قسم کے لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں، کسی بھی عملی اقدام سے پہلے منصوبہ بندی اور منصوبہ بندی سے پہلے نظریہ سازی ضروری ہوتی ہے۔ نظریہ کی حد تک یہ چند بہترین کتابیں ہیں جو انگریزی میں اس موضوع پر کچھ عرصہ پہلے سامنے آئی ہیں، محروم وقار و تمکین اُمت کے لئے ان کتابوں کا مطالعہ بہت ضروری ہے، بے حد ضروری ہے تاکہ کامیابی اور کامرانی کی راہ روشن ہو سکے، یہ عالمانہ اور مفکرانہ کتابیں انگریزی میں ہیں؛ لیکن انگریزی داں طبقہ کو ان کتابوں کی خبر نہیں ہے اور خبر ہے تو دلچسپی نہیں، یہ بے فکری اور بے حسی اور آرزو کی بے نیشی خود بہت بڑا مرض ہے۔ انفرادی طور پر جسم اگر مریض ہو تو انسان فوراً ڈاکٹر کے پاس چلا جاتا ہے اور دوا خرید کر لے آتا ہے اور اگر اجتماعی طور پر ملت مریض ہو تو اس کی فکر بس وہی لوگ کرتے ہیں جن کو اپنے بارے میں ملت کے ایک فرد ہونے کا احساس ہوتا ہے جن کا ملی شعور بیدار ہوتا ہے، جو خود کو کاروانِ ملت کا ایک فرد سمجھتے ہیں اور بہار کی اُمید میں پیوستہ شجر رہنا چاہتے ہیں اور وہ ملت کو کامران اور کامیاب بنانے کے موضوع پر کتابیں بھی پڑھ لیتے ہیں؛ لیکن

افسوس کہ ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کی فکر کا معیار بلند ہو۔ متاع شعور لٹ چکی اور ''کاروانِ کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا'' چند سطروں میں ان کتابوں کا تعارف مناسب محسوس ہوتا ہے، یہ پانچ فکر انگریز کتابوں کا سٹ ہے جسے باشعور طبقہ کو ضرور پڑھ لینا چاہئے۔

پہلی کتاب کا نام ہے (The Empowerment of Muslims in India) یعنی ہندوستان میں مسلمانوں کے استحکام اور قوت کی باز آفرینی کی راہ، مصنف ایک معروف مفکر اور بمبئی یونیورسٹی کے استاذ پروفیسر عبدالرحمٰن مومن ہیں۔ مسلمانوں کی علمی تاریخ اور اسلام میں علم کی اہمیت پر بھی ان کی انگریزی میں عالمانہ کتاب آچکی ہے، ان کی زیادہ تر کتابیں انگریزی میں ہیں، وہ عربی سے بھی واقف ہیں، دینی مدارس کا حلقہ ان سے عام طور پر واقف نہیں، یہ حلقہ اپنے دائرہ سے باہر بہت سے ارباب کمال کو نہیں جانتا ہے۔ مصنف نے مسلمانوں کی پسماندگی کے اسباب کا تجزیہ کیا ہے، دنیا میں قومیں کس طرح اُبھرتی ہیں اور بام عروج تک پہنچتی ہیں اس کا گہرا مطالعہ اگر نہ ہوتو کوئی شخص اسباب انحطاط وزوال کا صحیح تجزیہ نہیں کرسکتا ہے اور نہ صحیح رہنمائی کرسکتا ہے۔ مصنف کا مطالعہ وسیع ہے، ذہن زرخیز اور قوت مشاہدہ تیز ہے، موضوع پر گفتگو ملک کے حالات کے پس منظر میں بھی ہے اور گفتگو دین اسلام کے حوالہ سے بھی کی گئی ہے، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو فرقہ پرست طاقتیں کام کررہی ہیں ان کا تذکرہ بھی بے لاگ طریقہ سے کیا گیا ہے، حکومت کے اعلیٰ عہدوں سے مسلمانوں کا بالکلیہ انخلا اور اس کے پس پردہ سازشی ذہن کو کھول کر بیان کیا گیا ہے، پس ماندگی کا پورا منظر نامہ آئینہ کی طرح حوالوں کے ساتھ زیب قرطاس کردیا گیا ہے اور مسلم کمیونیٹی کو ترقی کی راہ پر پیش رفت کے لئے مفید مشورے دیئے گئے ہیں۔

اس سلسلہ زریں کی دوسری کڑی وہ کتاب ہے جس کا نام ہے (Empowerment of Muslims through Education) مصنف پروفیسر محمد اختر صدیقی ہیں، انھوں نے بی ایڈ، ام ایڈ کرنے کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ایجوکیشن میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی پھر لیڈس یونیورسٹی انگلینڈ سے ایک سال کی تعلیم کے بعد ڈپلوما کی سند حاصل کی، اس وقت وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبہ تعلیم کے پروفیسر اور شعبہ کے صدر ہیں۔ اگر انھوں نے تعلیم کے واسطہ سے مسلمانوں کی ترقی اور طاقت کو اپنا موضوع بنایا تو یہ ان کا حق تھا اور یہ ان کا میدان تھا، مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور اس کی شرح اور اس کے اسباب اور اس کے علاج دوسرے فرقوں سے مسلمانوں کا تعلیم کے میدان میں تقابلی مطالعہ اور اس کے دستاویزی اعداد وشمار، مسلم خواتین کی تعلیم، مدارس

اسلامیہ کا نظام اس کی خوبیاں اور اس کی اصلاح کی ضرورتیں، اُردو زبان کی اہمیت اور اُردو بطور ذریعہ تعلیم، حکومت کی تعلیمی پالیسی، ان تمام موضوعات پر شرح وبسط کے ساتھ مفصل اور مدلل گفتگو اس کتاب میں موجود ہے اور مسلمانوں کے تعلیمی مسائل اور ان کے حل پر اور تعلیم کے ذریعہ ترقی پر انگریزی میں اس سے بہتر کوئی دوسری کتاب نہیں۔

اس جامع اور مکمل سلسلہ کی تیسری کتاب (Economic Empowerment of Muslims of India) ہے، تعلیمی ترقی اور اقتصادی ترقی دونوں ایک دوسرے کا تکملہ ہیں اور دونوں ایک دوسرے پر منحصر ہیں، تعلیم اگر نہیں ہے تو اقتصادی ترقی ممکن نہیں ہے اور اقتصادی مضبوطی کے بغیر تعلیم کے میدان میں نمایاں کامیابی امر دشوار ہے۔ یہ تیسری کتاب ابو صالح شریف اور مہتاب اعظم کی مشترکہ تصنیف ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کا اقتصادی علمی جائزہ اس کتاب کا موضوع ہے۔ ابو صالح شریف مصنف کتاب نے بنگلور سے علم الاقتصاد میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور اسی میدان میں آسٹریلیا کی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی مکمل کی، امریکہ میں بھی تعلیم حاصل کی، ہندوستان میں علمی کاموں پر ان کو متعدد اعزازات مل چکے ہیں، ورلڈ بینک کے مشیر کار بھی رہ چکے ہیں۔ شریک تصنیف ڈاکٹر مہتاب اعظم دہلی یونیورسٹی سے اکنامکس میں اعلیٰ ترین ڈگری حاصل کر لینے کے بعد اسی یونیورسٹی میں استاد ہیں۔ الغرض یہ کتاب انھوں نے لکھی ہے، جنھیں اس فن پر پورا عبور حاصل ہے اور مسلمانوں کے مسائل کا علم ہے اور وہ اس میدان میں مسلمانوں کی رہبری کی پوزیشن میں ہیں۔ مسلمانوں کی ترقی اور طاقت کی پوزیشن کی جانب رہنمائی کرنے والی چوتھی کتاب (Empowerment of Muslims in India through Information and Communication) ہے، مصنف کا نام ہے اے یو آصف، یہ اُردو، ہندی، انگریزی کے صحافی ہیں، مسلمانوں کی انگریزی صحافتی کوششوں میں شریک رہ چکے ہیں، ریڈینس اور نیشن اینڈ دی ورلڈ سے وابستہ رہ چکے ہیں اور اس وقت بمبئی ٹائمس اور عرب نیوز کے لئے کام کرتے ہیں۔ اس لئے وسائل ابلاغ اور میڈیا کی طاقت کو جانتے ہیں اور طاقت کے اس میدان میں مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن کیا ہے انھیں اس کا علم ہے اور طاقت کے اس سرچشمہ تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے اس بارے میں بہتر رہنمائی دے سکتے ہیں؛ کیوں کہ صحافت ان کا خاص میدان ہے۔ مسلمانوں کو اس ملک میں طاقتور بنانے میں میڈیا کتنا موثر ہو سکتا ہے اور اس میں اپنی پوزیشن کس طرح مضبوط بنائی جا سکتی ہے، یہ ساری باتیں اس کتاب کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتی ہیں، یہ تمام کتابیں طاقت اور

قوت کے خزانے کی شاہ کلید کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس سلسلہ کی آخری کتاب (Empowerment of Musiim Youth in India) ہے، مصنف کتاب کا نام اشتیاق دانش ہے، دانش، دانشور نوجوان ہیں اور نوجوانوں کو بیدار کرنے کا اشتیاق رکھتے ہیں اس لئے انھوں نے کتاب کا موضوع وہ منتخب کیا جس کا تعلق مسلم نوجوانوں سے ہے، ہمدرد یونیورسٹی میں استاد ہیں، فعال اور متحرک انسان ہیں، اسلامیات کا مطالعہ براہ راست ہے۔ کتاب اپنے موضوع پر مفید اور مؤثر ہے، ان تمام تعلیمی اور رفاہی انجمنوں کو جو کسی نہ کسی حیثیت سے مسلمانوں کے درمیان مسلمانوں کی بہبود اور فلاح کے لئے کام کر رہی ہیں ان تمام کتابوں کو اپنے ارادوں اور منصوبوں کی تکمیل کے لئے رہنما؛ بلکہ حرز جاں بنالینا چاہئے، ان تمام شخصیتوں کو جو مسلمانوں کے مسائل اور ان کے حل کے لئے متفکر رہتے ہیں امپاورمنٹ کے اس پورے سٹ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

یہ ساری کتابیں بلا شبہ ماہرین فن نے تیار کی ہیں، ان تمام کتابوں میں سنجیدہ بحث و تحقیق کی روح جاری وساری ہے؛ لیکن کتابوں کے پس پردہ جو شخصیت موجود ہے اس کا نام ڈاکٹر منظور عالم ہے۔ ہندوستان میں سرمایہ ملت کی نگہبانی، پاسبانی اور گلہ بانی کا منصب انھیں گویا تفویض کر دیا گیا ہے، یہ ساری کتابیں انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز نیو دہلی نے چھاپی ہیں جس کے وہ چیرمین ہیں، ڈاکٹر منظور عالم کو اللہ نے جودت فکر و عمل اور فہم وفراست سے نوازا ہے۔ انھوں نے طالب علمی کے زمانہ میں دینی لٹریچر کا مطالعہ کیا، خاص طور پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابوں سے استفادہ کیا، عرب دنیا میں قیام کے زمانہ میں وہاں کے مسلم مفکرین اور اخوان المسلمین سے قریب رہے اور ان کی محفلوں میں شریک ہوتے رہے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد ملی قیادت کی طرح نو ڈالی اور انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز کے نام سے ادارہ قائم کیا جو ان کی فعال ذہن اور دور اندیش شخصیت کا مظہر ہے، یہ ادارہ ہندوستان کی مسلم فکری قیادت میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر منظور عالم نے جب یہ ادارہ قائم کیا تو ان کے دست راست اور رفیق کار مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی تھے، صلاحیتوں کے اشتراک وتعاون سے دونوں کو فائدہ پہنچا، ایک عالم دین تھا دوسرا صاحب فکر متین تھا، ایک مدرسہ کا سند یافتہ تھا دوسرا عصری تعلیم یافتہ تھا، ایک کے پاس دین کی مشعل ہدایت تھی دوسرے کے پاس زمانہ کی عقل اور درایت تھی، ایک کے پاس دلائل تھے دوسرے کے پاس وسائل تھے۔ اس اشتراک وتعاون سے قاضی صاحب شہرت میں آفتاب اور ڈاکٹر

صاحب پھولوں میں گلاب بن گئے۔اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ تعمیر ملت کا کام جدید اور قدیم تعلیم یافتہ لوگوں کے تعاون سے ہی انجام پا سکتا ہے، ڈاکٹر صاحب کے تمام کاموں میں تنوع اور تازہ کاری ہے، ذہنی اختراع ہے اور تہہ داری ہے، ملت کے لئے کاموں کی منصوبہ بندی کی بے مثال صلاحیت ان کے اندر پائی جاتی ہے، وہ اپنے منصوبوں کو تکمیل تک پہنچانا جانتے ہیں۔مثال کے طور پر اسی امپاورمنٹ کے مسئلہ کو لیجئے، انھوں نے صرف کتابیں نہیں شائع کیں؛ بلکہ اس موضوع پر دہلی میں ایک بہت بڑی کانفرنس دستوری حقوق کی بازیافت اور امپاورمنٹ کے لئے کی، مسلمانوں میں یہ شعور پیدا کرنے کے لئے کی کہ جب تک وہ طاقت، قوت، توانائی اور جوش عمل اپنے اندر نہیں پیدا کریں گے وہ اس کارزار حیات میں برومند اور ظفر مند نہیں ہوسکتے ہیں۔ترقی کا راز ذوق پرواز میں پوشیدہ ہے، زندگی تابندگی کا نام ہے، جذبہ مسابقت کامیابی کی ضمانت ہے، بے عملی موت ہے۔یہ کانفرنس گذشتہ مہینہ جولائی میں ہوئی جس کی صدارت جسٹس احمدی نے کی جو عدلیہ کی ایک ممتاز شخصیت ہیں، مولانا مفتی اشرف علی صاحب نے خطبہ افتتاحیہ پیش کیا، جن کی شخصیت میں علم دین اخلاق، معرفت، روحانیت اور سوز باطن کا امتزاج ہے، اس چیز نے ان کی شخصیت کو پرکشش بنا دیا ہے۔ان کی تقریریں پراثر ہوتی ہیں۔کانفرنس میں ہندوستان بھر کے مندوبین شریک ہوئے، یہ کانفرنس آل انڈیا ملی کونسل کی طرف سے منعقد کی گئی تھی، ڈاکٹر صاحب جس کے روح رواں بھی ہیں اور جنرل سکریٹری بھی ہیں، اس میں بھی دو رائے نہیں ہے کہ ملی کونسل ہی اس وقت مسلمانوں کی سب سے زیادہ فعال تنظیم ہے۔مسلم مجلس مشاورت کسی زمانہ میں فعال تھی وہ اب بھی مفید ہوسکتی تھی؛ لیکن وہ اب دو حصوں میں تقسیم ہوچکی ہے ”اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے“۔مسلم پرسنل لا بورڈ بھی فعال ہے؛ لیکن اس کا دائرہ کار شخصی قوانین یعنی پرسنل لا تک محدود ہے، جن لوگوں نے پرسنل لا بورڈ کے نام سے دوسری تنظیمیں بنالی ہیں ان تنظیموں کا حقیقت میں کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

مسلم امپاورمنٹ یعنی مسلمانوں کے استحکام کے مسئلہ پر مذکورہ بالا کتابیں اتنی زیادہ اہم ہیں کہ ان کا مطالعہ ہر اس شخص کو کرنا چاہئے، جسے ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے مستقبل کی فکر ہے، جس کا دل ملت اسلامیہ کے شجر کے لئے اُمید بہار سے خالی نہیں اور جو مستقبل میں اس شجر کی شاخ نہال اور شاخ ثمر دار بننا چاہتا ہے اور جسے اپنی ملت کی پسماندگی کا علم ہے اور جسے معلوم ہے کہ یہ ملت اس ملک میں پندرہ فیصدی سے بھی زیادہ ہے؛ لیکن بہت سے زمروں میں اس کی عددی قوت صفر کے برابر ہے اور بعض زمروں میں صرف ایک دو فیصد۔مسلمان سیاسی سماجی تعلیمی اور اقتصادی

اعتبار سے شاہ راہ ترقی پر کس طرح گامزن ہو سکتے ہیں اور اس کے لئے انھیں کیا کرنا ہے، یہی موضوع ہے ان کتابوں کا، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر تعلیم یافتہ گھر میں اور ہر لائبریری میں کتابوں کا یہ سٹ موجود ہو، لوگ ان کا مطالعہ کریں اور اپنے اپنے علاقہ میں اس کے مطابق مسلمانوں کی عملی رہبری کریں، ان کتابوں کے اُردو ترجموں کی بھی ضرورت ہے۔

اگر امپاورمنٹ کی یہ تمام کتابیں اس وسیع وعریض ملک کے طول وعرض میں تعلیم یافتہ طبقہ تک نہیں پہنچتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دست شوق موجود نہیں ہے جو ملت اسلامیہ کی عمارت کی تعمیر سے دلچسپی رکھتا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

سفرنامہ ابن بطوطہ

تاریخ میں سفرنامے بہت سے لکھے گئے ہیں؛ لیکن ابن بطوطہ کا سفرنامہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک ماخذ بھی ہے، اگرچہ کہ اس سفرنامہ میں مشاہدات اور تاریخ وسنین کی غلطیاں بھی ہیں؛ کیوں کہ سفرنامہ کے مسودہ کے ضائع ہونے کے بہت بعد ابن بطوطہ نے یادداشت کے سہارے اسے دوبارہ لکھا تھا خود ابن خلدون نے بعض مقامات کی صحت پر شبہ ظاہر کیا ہے۔ ۷۵۶ھ میں اس نے سفرنامہ لکھا تھا، ابن جزی نے اس کی تلخیص کی، اصل سفرنامہ کہیں دستیاب نہیں ہے، جنوبی ہندوستان میں بحری قزاقوں نے اس کے جہاز پر حملہ کیا تھا اور ہندوستان سے متعلق جتنی تحریریں یادداشتیں اس نے تیاری کی تھیں وہ سب تلف ہوگئیں بعد میں اس نے حافظہ کے سہارے دوبارہ لکھا تھا اس بازنوشت میں ظاہر ہے کہ غلطیاں رہ گئی ہوں گی۔

ابن بطوطہ دنیا کے ملکوں کے سفر پر روانہ ہوا تو اس کی عمر ۲۲ سال کی تھی اور سال ۷۲۵ھ تھا وہ طنجہ سے روانہ ہوا، وہ دمشق مکہ معظّمہ مدینہ منورہ عراق ہوتا ہوا ایران کی حدود میں داخل ہوا اصفہان اور شیراز بھی گیا افریقہ اور اناطولیا گیا، قسطنطنیہ پہنچا سمرقند بلخ ہوتا ہوا غزنی میں داخل ہوا پھر کابل گیا اور سندھ میں داخل ہوا اور ہندوستان کے مختلف علاقوں کی اس نے سیر کی سیلون بھی گیا ہندوستان سے چین چلا گیا پھر بغداد اور شام واپس آیا پھر مصر اور تیونس ہوتا ہوا مراقش کے شہر فاس

آ گیا، اس نے پچیس سال تک ملکوں کی سیاحت کی اس نے خشکی تری بحر و بر کو اپنی جولانگاہ بنایا اور اس بادیہ پیمائی اور صحرا نوردی سے اس نے بہت سے تجربات حاصل کئے جن کو اس نے اپنے سفرنامہ میں پیش کیا ہے، یہ سفرنامہ معلومات کا خزانہ ہے ایسا خزانہ ہے، جو عجائبات سے بھرا ہوا ہے۔

اسلامی ممالک کی ترقی میں تجارت اور سیاحت کو بڑا دخل حاصل ہے، کوفہ، بصرہ، بغداد قاہرہ، دمشق، اناطولیہ، ہرات، قرطبہ اور بخارا تہذیب اور علوم کے مرکز تھے، صنعت اور حرفت کے مخزن تھے، تہذیب کی یہ عالی شان عمارت اس لئے کھڑی تھی کہ مسلم ملکوں کے باشندوں کو سیاحت اور تجارت کا شوق تھا دنیا میں جہاں کہیں علم و حکمت کے موتی ملتے انھیں جمع کرلیا جاتا تھا۔ حالی نے کہا تھا کہ ''بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی'' تہذیب کی کنجی مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی، تہذیب کا تجارت اور سیاحت کے ساتھ چولی دامن کا رشتہ ہے، آٹھویں صدی عیسوی تک بڑے بڑے سیاح اور جغرافیہ داں مسلمان گذرے ہیں وہ زمین کا گز بن گئے تھے اور دنیا کا علم ان کی مٹھی میں تھا، مسلمانوں نے دنیا کے جغرافیہ پر اور ملکوں کی سیاحت پر جو کتابیں لکھی ہیں وہ بے شمار ہیں، ابن واضح کی کتاب 'البلدان' ابن خرواذبہ کی کتاب 'المسالک والممالک' ابوزید کی کتاب 'الہند والصین' ہمدانی کی کتاب 'جغرافیۃ جزیرۃ الغرب' اصطخری کی کتاب 'الاقالیم' مسعودی کی 'مروج الذہب' ابن حوقل اندلسی کی 'کتاب الممالک والمسالک'، علامہ بشاری کی 'احسن التقاسیم' ابوعبداللہ کی کتاب 'معجم' سرخسی کی 'رحلۃ السرخسی' اور ادریسی کی 'نزہۃ المشتاق' یاقوت حموی کی 'معجم البلدان' ابوالفداء کی 'تاریخ البلدان' ابن وردی کی 'فریدۃ العجائب' عیسٰی ابوالبقاء کی 'تاج المشرق فی تجلیۃ المشرق' وغیرہ وغیرہ بے شمار کتابیں ہیں جن سے مسلمانوں کے علم جغرافیہ اور ان کی سیاحتی سرگرمیوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ابن بطوطہ کے زمانہ تک اسلامی ممالک میں سفر و تجارت کے شوق فراواں کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن بطوطہ نے غرناطہ میں ہندوستان والوں سے اور ہندوستان اور چین میں غرناطہ والوں سے ملاقات کی تھی، مشرق اور مغرب کی تجارت مسلمانوں کے قبضہ میں تھی۔ چودہویں صدی میں یورپ کے سیاحوں نے ایسے راستہ کی تلاش شروع کی جس سے کہ انھیں مسلمان ملکوں کا ممنون احسان نہ ہونا پڑے ۱۴۹۸ء میں افریقہ کے گرد گھوم کر کیپ آف گڈ ہوپ کا راستہ دریافت کیا پھر کولمبس نے ایک اور دوسرا راستہ ڈھونڈا اور اس طرح سے امریکہ کی دریافت کا سہرا اس کے سر رہا اگرچہ کہ محققین کی رائے میں اندلس کے مسلمان جہاز راں نے اس کی مدد کی تھی اور بعض مسلمان پہلے امریکہ میں موجود

تھے۔ کیپ کے راستہ کی دریافت نے عالمی تجارت مسلمانوں کے ہاتھ سے چھین لی اور اسی وجہ سے مسلمان ممالک پستی اور مفلوک الحالی کا شکار ہوئے تھے، علوم کا زوال بھی اسی سبب شروع ہوا، مسلم ممالک کا باہمی ربط اور تعلق ختم ہوا۔ آٹھویں صدی تک مسلمان اہل علم ایک ملک سے دوسرے تک جاتے تھے اور اسی سے علم کی توسیع ہوتی تھی، وہ پرانی دنیا کے ایک کنارہ سے دوسرے کنارہ تک آسانی سے پہنچتے تھے؛ لیکن کیپ کی دریافت کے بعد پرانا راستہ متروک ہوگیا، جس کی وجہ سے اسلامی ممالک کا تنزل ہوا اور یورپ کی تہذیب کی ترقی شروع ہوئی۔ جب بحری تجارت پر اہل مغرب کا قبضہ ہوگیا تو پرتگیزی قزاق مسلمانوں کے جہازوں کو لوٹنے لگے شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں ہندوستانی علماء نے حج کے مخدوش ہوجانے کی وجہ سے حج نہ کرنے کا فتویٰ دیا، اس طرح سے اسلام کی تجارتی علمی اور سیاحتی تہذیب کی کمر ٹوٹ گئی اور تہذیب کی قیادت ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔

ابن بطوطہ نے بے شمار انسانوں سے ملاقات کا تذکرہ کیا ہے، ان کی ملاقات سندھ میں شیخ شمس الدین محمد شیرازی سے ہوئی اس وقت شیرازی کی عمر ایک سوبیس سال کی تھی۔ اس نے تہذیبی رسم و رواج کا بھی تذکرہ کیا ہے کھانے کے بعد پان سپاری کا استعمال ابن بطوطہ کے وقت سے ہندوستان میں تھا، پان ہندوستان کی تہذیب کی خاص چیز رہی ہے، اس نے یہاں کے میووں اور پھلوں کا بھی تذکرہ کیا ہے، ہندوستان میں اس وقت آم کا پھل موجود تھا؛ لیکن قلمی آم نہیں تھے کہ یہ طریقہ باغبانی مغلوں کی دین ہے، یہاں وہ آم تھے جسے تخمی آم یعنی بیجو آم کہتے ہیں ابن بطوطہ نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ہندوستان کے خاص پھلوں میں اس نے کٹھل اور جامن کا بھی تذکرہ کیا ہے، اسی طرح اس نے سنگترے یا نارنگی کا اور مہوہ کا تذکرہ کیا ہے مہوہ سے شراب بنتی ہے، لکھا ہے کہ انجیر اس ملک میں نہیں ہے اور انگور بہت کم، اس نے ککڑی تربوزے کا ذکر کیا ہے۔

غلہ میں اس نے کودو کا تذکرہ کیا یہاں محاورہ ہی ہے کودو دلنا۔ ماش مٹر اور مونگ کا ذکر کیا ہے، کھانوں میں کھچڑی کا تذکرہ کیا ہے جسے چاول اور مونگ ملا کر پکاتے ہیں، مکئی اور جوار کا تذکرہ بھی سفرنامہ میں ہے، پھولوں میں گل شبو، رائے بیل اور گل نسرین کا ذکر ہے۔

ابن بطوطہ نے ہندوؤں کے رسم و رواج کا تذکرہ کیا ہے اس نے ایک بار دیکھا کہ ایک عورت ستی ہونے کے لئے لے جائی جارہی ہے اس روح فرسا منظر کو دیکھنے کے لئے ابن بطوطہ بھی ساتھ ہوگیا۔ جب لکڑی میں آگ لگائی گئی تو عورت کے بدن پر موٹی ساڑی باندھی گئی تھی، آگ میں کود گئی، لوگوں نے اس پر بھاری بھاری لکڑیاں ڈال دیں تاکہ وہ حرکت نہ کرسکے اور نکل نہ سکے

ابن بطوطہ ستی کا یہ منظر دیکھ کر بے ہوش ہو گیا، ہندوستان میں ستی کا رواج تھا اور عربوں میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے کا دونوں ہی رسمیں وحشیانہ اور ظالمانہ تھیں۔ عالم انسانیت پر اسلام کا احسان ہے کہ اس نے عورتوں کو مردوں کے برابر درجہ دیا اور تاریخ انسانی میں پہلی بار اسے وراثت میں شریک کیا گیا، آپ جب دنیا سے تشریف لے گئے تو آخری وصیت میں بھی عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کا آپ نے حکم دیا، خواتین کے ساتھ ادنی درجہ کی ناانصافی مزاج اسلام کے خلاف ہے۔

ہندوستانی تاریخ کے مسلم فرماں رواؤں کا بھی اس نے تذکرہ کیا ہے، سلطانہ رضیہ کا تذکرہ ہے محمد تغلق کا تذکرہ ہے، ابن بطوطہ نے محمد تغلق کا انصاف دکھایا ہے اور اس کی بربریت کے قصے بھی لکھے ہیں۔ عید کیسی منائی جاتی تھی بادشاہ کا جلوس کیسا ہوتا تھا بادشاہ کا دسترخوان کیسا تھا، اس کی سخاوت کیسی تھی، شادیاں کس طرح سے ہوتی تھیں۔ محمد تغلق کے ایک انصاف کا تذکرہ ایسا ہے کہ ضروری ہے کہ اسے لکھا جائے، ایک ہندو امیر نے بادشاہ پر دعویٰ کیا کہ بادشاہ نے اس کے بھائی کو بے سبب مار ڈالا ہے، عدالت میں مقدمہ پیش ہوا، بادشاہ پیدل بغیر کسی ہتھیار کے قاضی کے محکمہ میں گیا اور وہاں جا کر تعظیم بجالایا، قاضی تعظیم کے لئے کھڑا نہیں ہوا قاضی نے فیصلہ سنایا کہ بادشاہ مدعی کو راضی کر لے ورنہ قصاص کا حکم دیا جائے گا بادشاہ نے اس کو راضی کر لیا۔

ایک دفعہ ایک امیر کے لڑکے نے دعویٰ کیا کہ بادشاہ نے بلا سبب مجھے مارا ہے، قاضی نے فیصلہ سنایا، یا لڑکے کو راضی کر لو ورنہ قصاص دو ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ بادشاہ نے لڑکے کو دربار میں بلایا اور اس کو چھڑی دے کر کہا کہ اپنا بدلہ لے لو اور مجھے مارو، لڑکے نے بھرے دربار میں بادشاہ کو چھڑی سے مارا، یہاں تک کہ بادشاہ کی کلاہ زمین پر گر گئی۔

بادشاہ کا حکم تھا کہ ہر شخص فرائض اسلام اور نماز سیکھے، لوگوں سے سوال کئے جاتے تھے اور لوگ بازاروں میں مسائل نماز یاد کرتے پھرتے تھے اور کاغذوں پر لکھواتے تھے دوسری طرف اس کی سخت گیری کا یہ عالم تھا کہ اس کے دروازہ پر روزانہ کسی نہ کسی شخص کو کسی جرم میں قتل کیا جاتا تھا، بہت سے مجرموں کو سزائیں دی جاتی تھیں، زنا کا اقرار کرنے والے کو سنگسار بھی کیا گیا تھا۔

ابن بطوطہ کی ہندوستان میں عزت بہت کی گئی ہر جگہ وہ شاہی محل میں پہنچتا تھا، امراء کے حلقہ میں رہتا تھا اسی لئے شاہی خاندانوں اور سرداروں کی زندگی کی تصویریں اس کے سفرنامہ میں بہت نظر آتی ہیں۔ کئی جگہ اسے قاضی بنایا گیا اسے معزز مہمان بنایا گیا، وہ کنیزوں کے جلو میں چلتا تھا، اس کے ہر سفر میں کنیزیں اس کے ساتھ ہوتی تھیں، غلام بھی ہوتے تھے۔ اس نے ہندوستان میں

کئی نکاح کیے اور نکاح بھی معزز گھرانہ میں ہوا، ایک نکاح بادشاہ کے ایک منشی کی بہن سے ہوا جس کا نام حور نسب تھا وہ بہت تہجد گذار خاتون تھیں، اس کا ایک نکاح وزیر سلیمان امیر البحر کی بیٹی سے ہوا تھا، اس نے سلطان شہاب الدین کی بہن کی بیٹی سے بھی نکاح کیا تھا اس نے کچھ عرصہ کے بعد سلطان شہاب الدین کی بیوہ سے بھی نکاح کیا تھا۔ جب وہ جنوبی ہندوستان جاتا ہے تو لکھتا ہے کہ اس وقت اس کے نکاح میں چار بیویاں تھیں اور کنیزیں اس کے علاوہ وہ مزواج اور مطلاق یعنی کثرت سے شادی کرنے والا اور کثرت سے طلاق دینے والا تھا۔ جب وہ کالی کٹ سے مال دیپ گیا تو وہاں اس نے دو شادیاں کیں، اس دور میں کثرت ازواج سماج میں عزت کی علامت تھی اور اسے کوئی برا نہیں سمجھتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بہت عبادت گزار اور شب زندہ دار نظر آتا ہے ہر روز کلام پاک کا ایک ختم کرتا ہے، مسجد میں بیٹھا رہتا ہے اور رمضان میں اعتکاف کرتا ہے، اس نے ہندوستان میں اسلام کی اشاعت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور خاص طور پر جنوبی ہندوستان میں قبول اسلام کے واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔

سفرنامہ ابن بطوطہ دلچسپ سفر نامہ ہے اور ہندوستان کے شاہی دربار خواص و عوام پیداوار اور کاروبار رسم و رواج کا بہت تفصیلی تذکرہ اس میں موجود ہے، یہ وہ وقت تھا جب مسلمانوں کے قدم یہاں جم چکے تھے اور مسلم حکومتیں یہاں مستحکم ہو چکی تھیں، مال و دولت کی ریل پیل تھی اور سیم و زر کی فراوانی تھی اور راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆
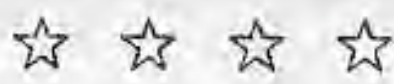
متاعِ سفر

اُردو ادب میں اور ہر زبان کے ادب میں سفر ناموں کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے، ادب کی یہ صنف بہت مقبول پہلے بھی تھی اور آج بھی اس کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ مسلمان سیاحوں نے اپنے عروج تہذیب کے زمانے میں سفر نامے بہت لکھے ہیں؛ بلکہ سچ یہ ہے کہ سفر و سیاحت کا رشتہ عروج و ترقی کے عہد سے جڑا ہوا ہے؛ کیوں کہ عروج و ترقی کے زمانے میں تجارت کو فروغ ہوتا ہے، مالِ تجارت لے کر اہل تجارت بحر و بر کو عبور کیا کرتے تھے۔ صرف سامانِ

تجارت ہی کو فروخت نہیں کرتے تھے ؛ بلکہ اپنے مذہب اور تہذیب کا تعارف بھی کراتے تھے ، دوسروں کی زبان ، تہذیب اور صنعت وحرفت سے اور مختلف قسم کے علوم وفنون سے بھی آگاہی حاصل کرتے تھے اور یہ آگاہی تہذیب کے ارتقاء میں معاون اور مددگار ہوتی تھی ۔ جب سے عالمی تجارت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی سفر وسیاحت پر بھی زوال آیا ، چنانچہ جتنے مشہور سفر ناموں کے نام ملتے ہیں ، سب آٹھویں صدی ہجری سے پہلے کے ہیں ۔ جب عالمی تجارت کی منڈی پر مسلمانوں کا قبضہ تھا اور مسلمانوں کے شہر تجارتی شاہراہ پر واقع تھے ، تجارت کے یہ راستے بالعموم خشکی کے راستے تھے ، چند مشہور سفر ناموں کے نام یہ ہیں : '' کتاب البلدان ، کتاب الممالک والمسالک ، کتاب الہند والصین ، جغرافیہ جزیرۃ العرب ، کتاب الاقالیم ، مروج الذہب ، احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم ، کتاب الہند ، معجم البلدان ، نزہۃ المشتاق ، تقویم البلدان ، رحلۃ السرخسی ، فریدۃ العجائب ، تاج المشرق فی تجلیۃ المشرق ، عجائب الاسفار '' ان کے علاوہ بھی کئی سفر نامے ہیں ۔ ان کے مصنفین سینکڑوں سیاحوں میں صرف چند ہیں ؛ کیوں کہ ہر سیاح سفر نامہ نہیں لکھتا تھا ، ہر سیاح ابن جبیر اندلسی اور مسعودی اور ابن حوقل موصلی اور ابن بطوطہ نہیں ہوتا تھا ، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے ان کے عروج کے زمانے میں بحر وبر کی طنابیں کھینچ دی گئیں تھیں ، سمندر پایاب ہو گیا تھا اور دشت ودر کو کبۂ شہر یارانِ تجارت کے روندے ہوئے تھے اور مسلمان دنیا کے تمام ملکوں میں پھیلے ہوئے تھے ۔

چودھویں صدی عیسوی میں یورپ کے اہل ہمت نے عالمی تجارت کے لئے نئے بحری راستے کا انکشاف کیا ؛ ایسے راستے کا جو شام ومصر ، ایران وعراق اور ترکی ویمن سے ہو کر نہیں گذرتا تھا ، ایسے راستہ کا جس میں عرب تاجروں کا زیر بار احسان نہیں ہونا پڑتا تھا ، ایسے راستہ کا جس میں تجارت کی شاہ کلید اہل یورپ کے ہاتھ میں باقی رہتی تھی اور عرب جس سے مستفید اور متمتع نہیں ہو سکتے تھے ۔ یہ راستہ ایک پرتگالی سیاح واسکوڈیگاما نے ۱۴۹۸ عیسوی میں دریافت کیا تھا ، دریافت کے دوران ۹۳ دنوں تک واسکوڈیگاما کی آنکھیں خشکی کو دیکھنے کو ترس گئیں ، اس مہم جوئی میں سو سے زیادہ آدمی لقمہ اجل ہو گئے ؛ لیکن اب یورپ سے ہندوستان تک کا مختصر بحری راستہ دریافت ہو گیا ۔ یہ تجارتی راستہ جنوبی افریقہ کے پاس کی بندرگاہ کیپ آف دی گڈ ہوپ یعنی راس اُمید سے ہو کر جاتا تھا ، چین اور ہندوستان کے سامانِ تجارت یورپ یا خلیج فارس تک یا افریقہ تک اب خشکی کے راستہ کے بجائے ، اس نئے بحری راستے سے بھیجے جانے لگے جو مسلمان ملکوں سے نہیں گذرتے تھے ۔ پہلے

بحر ہند کے تجارتی راستوں پر مسلمانوں کا قبضہ تھا، اب اس میں پرتگالی اور اہل یورپ شریک ہو گئے اور اس طرح تجارت کی منڈیاں مسلمانوں کے ہاتھ سے بالکل نکل گئیں اور اہل یورپ کے ہاتھ میں آ گئیں، مسلمان ملک مشرق و مغرب کی فائدہ مند تجارت سے محروم ہو گئے اور اب سمندری راستوں پر اغیار کا قبضہ تھا۔ پہلے اسپین سے لے کر چین کے مشرقی ساحل تک، جہاں خشکی کے راستے تھے وہاں مسلمان تاجروں اور اہل علم کے قافلے گذرتے تھے اور سمندر پر مسلمان جہاز رانوں کے پرچم لہراتے تھے اور مسلمانوں کے سارے شہر تہذیب وتمدن اور صنعت وحرفت کا مرکز ہوا کرتے تھے۔ تجارتی شاہراہ کی تبدیلی نے مسلمانوں کو اقتصادی اعتبار سے کمزور کر دیا، اقتصادیات کی شہ رگ کٹ گئی، بحری راستے دوسروں کی گذرگاہ بن گئے، راستے مخدوش ہو گئے، مسلمانوں کے بحری قافلے لوٹے جانے لگے اور ایک بار تو ہندوستان میں مفتیوں نے ان ہی خطرات کے پیش نظر حج کی فرضیت کے ساقط ہو جانے کا بھی اعلان کر دیا تھا۔ یاد رہے کہ جب واسکوڈیگاما پرتگال سے چلا تھا اور اس کے جہاز کالی کٹ کے ساحل پر پہنچے تھے تو اس نے عرب تاجر اور سیاح کے جہاز کو روک کر سارا سامان تجارت لوٹ لیا تھا اور پھر جہاز کو آگ لگا دی تھی، جس کی وجہ سے لوگ جل کر مر گئے تھے، واسکوڈیگاما نے کالی کٹ کے حاکم زامورن سے مطالبہ کیا تھا کہ مسلمان یہاں کی بندرگاہ سے پورے طور پر دست بردار ہو جائیں، جب زامورن کو مطالبہ کے تسلیم کرنے میں تردد ہوا تو واسکوڈیگاما نے ۳۸ ہندو ملاحوں کو پکڑ کر قتل کر دیا اور بندرگاہ پر گولہ باری کی۔

مسلمان اب بھی دنیا کا سفر کرتے ہیں اور ہوائی جہازوں میں نظر آتے ہیں؛ لیکن یہ مردانِ احرار کا سفر نہیں ہوتا ہے، یہ غلاموں کا یعنی اہل ملازمت کا سفر ہوتا ہے نان شبینہ کے لئے، رزق میں اپنا مقسوم پانے کے لئے، دوسروں کی خدمت کے لئے، چاکری کے لئے، اب نہ سیاحت ہے، نہ صنعت ہے نہ تجارت ہے، نہ حصولِ علم کا شوق بے پایاں ہے، اب نہ بحر بازی گاہ ہے اور نہ "ہر ملک ملک ماست" کا جذبہ ہے، جو دنیا کو اپنی جولان گاہ بنا کر رکھ دے۔ عالمی تجارت میں غیروں کا منت کش نہ رہنے اور عالم اسلام کے درمیان تجارت اور صنعت کو از سر نو فروغ دینے کے لئے دنیا کے بیشتر مسلمان ملکوں کو ریلوے لائن سے ملایا جا سکتا تھا؛ لیکن آج تک ایسا نہیں ہو سکا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم میں وہ شعور پیدا نہیں ہو سکا کہ ہم نے گذشتہ صدیوں میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے اور اپنی کھوئی ہوئی طاقت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے کیا کرنا ہے؟ یہ تفصیل ہم نے اس لئے بیان کی ہے کہ معلوم ہو کہ سفر و سیاحت کا بہت گہرا تعلق قوموں کے عروج و زوال سے ہے۔

سفرنامے جس طرح قدیم زمانوں میں لکھے گئے اب بھی لکھے جاتے ہیں؛ بلکہ اب زیادہ لکھے جاتے ہیں؛ کیوں کہ سفر آسان ہوگیا ہے، سفر کی تمام سہولتیں اغیار کی عطا کردہ ہیں، اس میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے، یہاں تک کہ ہمارا حج کا سفر بھی دوسروں کی فراہم کردہ اور ایجاد کردہ سواریوں پر ہوتا ہے، ہمیں منت کش غیر ہونے کا احساس تک نہیں ہوتا ہے۔ ہم سفر کرتے ہیں ا۔ سفرنامے لکھتے ہیں، پہلے کے سفرناموں میں انکشافات ہوتے تھے، اب مشاہدات ہوتے ہیں، یہ بھی غنیمت ہے، ان سفرناموں سے دنیا کا حال تو معلوم ہوتا ہے، قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں، علماء کے طبقہ میں بہت سے لوگوں نے سفرنامے لکھے ہیں، علامہ شبلیؒ کا ''سفرنامۂ روم ومصر وشام'' مولانا علی میاںؒ کا سفرنامہ ''ترکی میں دو ہفتے'' اور دوسرے سفرنامے، مولانا محمد رابع حسنی ندوی کا سفرنامہ ''دو مہینے امریکہ میں'' اور ''سفر بخارا اور سمرقند'' مولانا محمد تقی عثمانی کا سفرنامہ ''جہانِ دیدہ'' اور ''دنیا میرے آگے'' قابل تذکرہ ہیں۔ یہاں میں نے حج کے سفرناموں کا تذکرہ نہیں کیا ہے، جن کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے، جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں ڈاکٹر عابد حسین کا سفرنامہ ''رہ نوردِ شوق'' ڈاکٹر یوسف حسین خان کی خود نوشت اور سفرنامہ کا مجموعہ ''یادوں کی دنیا'' جگن ناتھ آزاد کی کتاب ''کولمبس کے دیس میں''، حکیم محمد سعید صاحب مرحوم مالک ہمدرد دواخانہ پاکستان، ابن انشاء، قمر علی عباسی، جمیل الدین عالی اور مجتبیٰ حسین کے سفرنامے قابل مطالعہ ہیں۔ ایک سفرنامہ راقم سطور مقدمہ نگار کے قلم سے بھی ہے کتاب کا نام ہے ''دنیا کو خوب دیکھا'' جسے قاضی پبلشرز دہلی نے شائع کیا ہے، یہاں کتابوں کا استقصاء مقصود نہیں ہے، سفرناموں کی صرف فہرست تیار کی جائے تو اس کے لئے کئی صفحات درکار ہوں گے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کے یہ سفرنامے، جو متاعِ سفر کے نام سے شائع ہو رہے ہیں سفرناموں کے لٹریچر میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں، وہ ایک وسیع المطالعہ، وسیع النظر اور وسیع الفکر عالم دین ہیں، جامعہ رحمانی اور دارالعلوم دیوبند کے گلِ سرسبد، بہار کی بہار اور دکن کے لئے افتخار ہیں، علماء کے نئے طبقہ میں ممتاز، مصنف اور انشا پرداز ہیں، فعال اور متحرک، بہت سے اداروں کے ذمہ دار اور روح رواں اور اسی کے ساتھ بے حد متواضع، حلقہ یاراں میں بریشم کی طرح نرم ہیں۔ انھوں نے سیمیناروں میں شرکت کے لئے اور جلسوں کو خطاب کرنے کے لئے بہت سے ملکوں کا علمی سفر کیا ہے، اگر مشاہدہ تیز، ذہن زرخیز اور قلم گل ریز ہو تو ایسے مسافر کے سفرنامے بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں، چنانچہ ان کے سفرنامے اخبارات میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے

ہیں۔اب ان سفرناموں کو کتابی شکل میں ''متاعِ سفر'' کے نام سے شائع کیا جارہا ہے، سفرنامہ کی ابتدا حج کے سفر سے ہوتی ہے، یہ ہر مومن کی منتہائے آرزو ہے اور اس کی عمر عزیز کے سب سے قیمتی دن وہ ہوتے ہیں، جو حرمین شریفین میں گذر جائیں، وہاں کے ہر ذرہ کو وہ رشک آفتاب و ماہتاب سمجھتا ہے۔سفرنامہ مومنانہ جذبات کے ساتھ لکھا گیا ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے اور ایک بار تو مسافر کے جذباتِ محبت گنبدِ خضراء کو دیکھ کر چھلک پڑتے ہیں، اسے ہندوستان میں بابری مسجد کی شہادت اور رقص بتانِ آذری کا منظر یاد آجاتا ہے، پھر اس کے الفاظ شعر کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں وہ چہرہ پر رنگ خستگی کے ساتھ حضورا کی خدمت میں اپنا منظوم استغاثہ پیش کرتا ہے۔

سفرنامے تمام بہت معلوماتی ہیں، قلم نے مصوری کا کمال دکھایا ہے اور بعض مقامات پر تحریر کو رشک مہ و پروین بنادیا ہے، کتاب میں مسلمانوں کے درمیان باہمی اتحاد کا جذبہ نمایاں ہے، مسافر کا قلم اور قدم مسلکی تعصّبات سے بالاتر؛ بلکہ اس سے دور اور نفور ہے، ایران اور قطر کے سفرنامہ میں بھی اس جذبہ کا عکس موجود ہے، اس کتاب کو بہترین سفرناموں کی صف میں ہونا چاہئے۔الفاظ اور جملوں کے درمیان جگہ جگہ معتدل مزاجی آشکارا ہوتی ہے اور فکر کے آبدار موتی چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اسی کے ساتھ دل ملت پر ڈھائی گئی قیامتوں سے دونیم، یہ عبارت ملاحظہ ہو:

بحیثیتِ مجموعی اس وقت عالم اسلام کی بے کسی نہایت قابل افسوس ہے، امریکہ اس طرح ان لوگوں پر مسلط ہے کہ اب یہ ممالک اور ان کے حکمرانوں کی مثال ایسے قیدیوں کی ہے، جن کو سونے کے پنجروں میں بند کردیا گیا ہو، اس حال میں بھی ان کے دل آپس میں ٹوٹے ہوئے ہیں اور اپنے بڑے دشمن کی ستم انگیزی بھی انھیں متحد کرنے سے قاصر ہے۔

مقدمہ نگار کے لئے دیر تک قاری اور مصنف کے درمیان حائل ہونا مناسب نہیں، اس کتاب کے حسن ذاتی کو کسی مقدمہ نگار کی سفارش کی یا کسی خارجی زیبائش اور آرائش کی ضرورت نہیں ہے، مشک آپ اپنا اشتہار ہوتا ہے، اسے عطار کی تعریف کی کوئی حاجت نہیں ہوتی ہے۔

(مقدمہ کتاب، ناشر کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، سہارنپور، یوپی)

☆ ☆ ☆ ☆

''تعلیم ایک تحریک ایک چیلنج''

جناب محمد اسحٰق ان دردمند اور دانشمند لوگوں میں ہیں، جنھوں نے ملت کو جگانے اور اسے زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کا بیڑا اُٹھا رکھا ہے، انھوں نے جو کچھ لکھا ہے زیادہ تر اسی موضوع پر لکھا ہے اُردو میں بھی لکھا ہے اور انگریزی میں بھی لکھا ہے، مختصر بھی لکھا ہے اور طویل بھی لکھا ہے۔ بقول سید حامد ان کے لفظ سے وہ تڑپ ٹپکتی ہے جو ان کے دل میں ملت کے لئے اُٹھتی ہے، انھیں مجاہد تحریک تعلیم قرار دیا جاسکتا ہے اور ان کی کتاب کو انگریزی محاورہ کے مطابق ہر گھر کی انجیل بنانے کی سفارش کی جاسکتی ہے۔ نہ صرف تعلیم کی اہمیت کو جاں گزیں کرنے کی ضرورت ہے؛ بلکہ مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت کا احساس بھی پیدا کرنے کی ضرورت ہے؛ ادارہ سیاست نے اس محاذ پر کوششوں کو تیز اور اسپ ہمت کو مہمیز کیا ہے۔

حیدرآباد کی حالت اُردو کے اعتبار سے بسا غنیمت ہے اہل اُردو پورے ملک میں مختلف مشکلات سے دوچار ہیں اور ہر ایک مشکل ان کے راستہ کی رکاوٹ ہے زندہ قوموں کے لئے خطرہ کی چیز راستہ کی رکاوٹ نہیں ہوتی خطرہ کی بات ایک زندہ انسان کے لئے یہ ہے کہ وہ مقصد اور منزل کو بھول جائے اور مادیت اور آرام پسندی ہی کو مقصد بنالے، اہل ہمت کبھی ہمت نہیں ہارتے ہیں، ان کا عزم راسخ ہر مشکل کو آسان بناتا ہے اور اہل یقین کا فیصلہ اور اصحاب عمل کا حوصلہ تاریخ کے دھارے کو بدل دیتا ہے۔

جناب محمد اسحٰق نے لکھا ہے ''عربی زبان کے بعد اسلامیات کا سب سے بڑا ذخیرہ اُردو میں ہے، اگر اُردو سے ہمارے بچے ناواقف رہ جائیں تو وہ یک لخت اپنے مذہب، ثقافت، تمدن اور آرٹ اور ادب کے بیش بہا خزانوں سے محروم رہ جائیں گے اور یہ قیمتی سرمایہ کوئی ایک ہزار برس میں تشکیل پایا ہے'' جناب محمد اسحٰق ماہر تعلیم ہیں اور ان کا اس پر ایقان ہے کہ ابتدائی تعلیم مادری زبان میں ہونا چاہئے، حیدرآباد میں ادارہ سیاست کی طرف سے موسم گرما کی تعطیل میں بچوں کو اُردو زبان سکھانے کا مفت انتظام کیا جاتا ہے۔

آندھرا پردیش کے بیشتر اضلاع میں اُردو دوسری سرکاری زبان ہے، بیشتر اسکولوں اور کالجوں میں اُردو پڑھائی جاتی ہے، یہ کوشش جاری رہنی چاہئے کہ ہر سطح پر اسکولوں میں اُردو پڑھائی جائے اور بچے اسکول میں اُردو ایک مضمون کی حیثیت سے ضرور لیں، جہاں اسکولوں میں اُردو نہیں ہے وہاں والدین بچوں کو اُردو سکھانے کا انتظام کریں۔ ظاہر ہے کہ اسکولوں سے بچوں کو ہٹایا نہیں جاسکتا ہے، انھیں اسکولوں میں تعلیم دلانا بھی ضروری ہے اور یہ کوشش بھی ضروری ہے کہ وہ امتیازی نمبروں سے پاس ہوں؛ لیکن یہ کام مادری زبان کی قیمت پر ہرگز نہیں ہونا چاہئے، ورنہ یہ اسکولی تعلیم روحانی اور لسانی نسل کشی کے مرادف ہوگی۔ ہمیں برادرانِ وطن سے سبق سیکھنا چاہئے انھوں نے ایک ہزار سال تک اپنی زبان اور اپنی تہذیب اور مذہب کی حفاظت کی اور اہل اُردو نے (ان میں بہت سے برادرانِ وطن بھی شامل ہیں) صرف پچاس سال کی ناموافق فضا کی وجہ سے اُردو کو بھلا دیا بہت سے والدین اپنے بچوں کو صرف اس عذر کی بناء پر اُردو نہیں پڑھاتے کہ اس کی جگہ اسکول کے نصاب میں نہیں۔ ابھی حال میں ریلوے کے اسکول میں اُردو ٹیچر کے انٹرویو میں اکسپرٹ کی حیثیت سے میرا جانا ہوا وہاں ایک مسلمان ریلوے سینئر افسر سے ملاقات ہوئی وہ اگرچہ محبوب نگر کے رہنے والے تھے؛ لیکن اُردو زبان کے پڑھنے اور لکھنے پر قادر نہیں تھے، انھوں نے یہ عذر لنگ پیش کیا کہ انھوں نے جس اسکول میں تعلیم پائی اس میں اُردو کی تعلیم کا انتظام نہیں تھا۔ یہ عذر زبان سے بے وفائی کا ہم معنی ہے اور جس شخص کی وفاداری اپنی زبان سے نہ ہو اس کی وفاداری کسی چیز سے نہیں ہوسکتی ہے، اسکولوں میں اُردو پڑھائی جائے یا نہ پڑھائی جائے یہ والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ بچوں کو اُردو سکھائیں، گھروں میں اُردو اخبارات اور رسالے منگائیں، اُردو کتابیں خریدیں اور اپنے سرمایہ کا ایک حصہ ان چیزوں پر خرچ کریں کہ اس کے بغیر اُردو سے ان کی وفاداری مشکوک ہے۔ جو لوگ اُردو جانتے ہیں؛ لیکن نہ اُردو کا اخبار خریدتے ہیں اور نہ کوئی اُردو کا رسالہ منگاتے ہیں اور ایک سال میں بھی اُردو کی کوئی ایک کتاب نہیں خریدتے ہیں، ان کا نام اُردو کے قاتلین کی فہرست میں ہونا چاہئے؛ بلکہ انھیں خود اپنے آپ کو کسی چوراستہ پر کھڑے ہوکر ببانگ دہل اور بآواز بلند اُردو کا قاتل کہنا چاہئے، ان کے اعتراف جرم سے دوسروں کو فائدہ ہوگا۔

اہل اُردو اس وقت ایک فیصلہ کن موڑ پر کھڑے ہوئے ہیں، ایک راستہ لسانی اور تہذیبی ارتداد کی طرف جاتا ہے، دوسرا راستہ عزت وسربلندی کی طرف، اہل اُردو کو یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ ایک زندہ قوم ہیں اور تمام موانع اور مشکلات کے باوجود اُردو کی حفاظت کے لئے قربانی دینے کے

لئے تیار ہیں۔

اہل حیدر آباد نے اُردو کے سلسلہ میں پورے ملک کو راہ دکھائی ہے، یہاں اُردو ذریعہ تعلیم رہ چکی ہے، یہاں ۱۹۱۷ء میں دارالترجمہ قائم ہوا اور جدید سائنس کی کتابوں کے کامیاب اُردو ترجمے ہوئے۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق اور جوش ملیح آبادی اور عبداللہ عمادی، مرزا ہادی رسوا، پروفیسر ہارون خان شیروانی، ڈاکٹر میر ولی الدین، سید ہاشمی فرید آبادی، مولانا عبدالباری ندوی، عبدالحلیم شرر جیسی شخصیتیں یہاں اس ادارہ سے وابستہ رہ چکی ہیں۔ اس ادارہ نے وضع اصطلاحات کا مشکل اور اہم کام انجام دیا تھا، دارالترجمہ سے جو کتابیں شائع ہوئی تھیں وہ طباعت کے اونچے معیار کے مطابق ہوتی تھیں جلد سازی کا معیار بھی بلند تھا، انجمن ترقی اُردو مولوی عبدالحق صاحب نے قائم کی تھی اور اورنگ آباد سے اس انجمن کے ذریعہ اُردو کتابوں کی اشاعت ہوئی۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے یہاں ادارہ ادبیات اُردو کے نام سے ۱۹۳۱ء میں ایک علمی ادارہ قائم کیا جس نے نمایاں خدمات انجام دیں، اس ادارہ کی طرف سے 'سب رس' کے نام سے ادبی رسالہ تاہنوز شائع ہورہا ہے۔ ریاست حیدر آباد میں طویل عہد تک اُردو رابطہ کی زبان رہ چکی ہے اور اسے قبول عام حاصل رہ چکا ہے، ۱۸۸۴ء سے نواب میر محبوب علی خاں کے زمانہ سے اُردو یہاں کی سرکاری زبان بھی رہی ہے، یہ زبان جامعہ عثمانیہ میں جو 1918ء میں قائم ہوئی تھی ذریعہ تعلیم رہ چکی ہے، اب یہاں اُردو یونیورسٹی قائم ہوئی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے اس کے مراسلاتی کورس سے فائدہ اٹھانے والے تمام ریاستوں کے لوگ ہیں؛ کیوں کہ یہ ایک قومی یونیورسٹی ہے، اس کا ابر کرم بیرون ملک بھی برستا ہے اور اس سرچشمہ فیض سے فیضان حاصل کرنے والے کئی ملکوں کے باشندے ہیں۔ مراسلاتی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسے ایک اقامتی یونیورسٹی بنانے کی کوشش بھی جاری ہے، یہاں بی ایڈ کی تعلیم بھی ہوتی ہے، جامعہ عثمانیہ کے قدیم دارالترجمہ کے طرز پر یہاں بھی بڑے پیمانہ پر انگریزی سے کورس کی کتابوں کے ترجمے ہورہے ہیں اور اس طور پر اُردو زبان سائنس اور کامرس کی زبان بھی بن رہی ہے ترجمہ کی زبان ادق نہیں؛ بلکہ آسان ہوتی ہے۔

شہر حیدر آباد کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ یہاں اُردو کا ٹی وی چینل ای ٹی وی موجود ہے اور اسے مقبولیت بھی حاصل ہے۔ ادبی، مذہبی، تہذیبی، سیاسی، سماجی ہر قسم کے پروگرام پیش کئے جاتے ہیں خواتین کے پروگرام بھی ہوتے ہیں ہر گھنٹہ خبریں بھی نشر ہوتی ہیں، سیریل بھی تیار ہوتے

ہیں، اُردو کے مسائل پر بھی مذاکرے منعقد ہوتے ہیں، مذاکرے بھی ہوتے ہیں اور مشاعرے بھی ہوتے ہیں۔ یہاں عظیم الشان عالمی اُردو کانفرنس منعقد ہو چکی ہے، عالمی سطح پر حیدرآباد اُردو زبان اور تہذیب کی علامت بن گیا ہے، یہاں اُردو زبان و ادب کے نام پر بہت سی انجمنیں قائم ہیں، اکیڈمیاں کام کر رہی ہیں، جیسے اُردو اکیڈمی، اقبال اکیڈمی، انجمن تحفظ اُردو، ایوانِ اُردو وغیرہ جن کی نمایاں خدمات ہیں۔ یہاں دینی مدارس کا جال بچھا ہوا ہے، کتب خانے ہیں، مخطوطات کے اعتبار سے یہ شہر عالمی شہرت کا حامل ہے، اُردو مزاح نگاری میں اس شہر کو امامت اور امارت کا درجہ حاصل ہے، وقیع ادبی اور تحقیقی رسالے یہاں سے نکلتے ہیں، یہاں ملک کے سب سے بہتر اُردو اخبارات نکلتے ہیں ان کی تعداد اشاعت بھی ملک بھر میں تمام اُردو اخبارات سے زیادہ ہے۔ اس شہر کے لوگ سنجیدہ اور باشعور ہیں، اُردو کی حفاظت بقا اور ترقی کے لئے قیادت کے اہل ہیں اور پورے ملک کو راستہ بتا سکتے ہیں، یہاں کے عوام میں بھی اُردو کے خلاف کوئی تعصب نہیں، حکومت بھی مخالف نہیں، یہاں غیر اُردو داں لوگوں میں بھی رواداری اور شرافت شمالی ہند کی ریاستوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ شمال میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے لئے ۲۲ لاکھ کی دستخطوں کے ساتھ میمورنڈم بھی پیش کیا گیا تھا، یوپی میں اُردو کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی، بہار کی صورت حال یوپی اور کئی ریاستوں سے بہتر ہے، وہاں اسکولوں میں اُردو پڑھائی جاتی ہے، اُردو وہاں دوسری سرکاری زبان ہے اور نئی نسل اُردو سے یوپی کی طرح بے بہرہ نہیں۔ یوپی میں اُردو اگر زندہ ہے تو صرف مدارس دینیہ کی وجہ سے زندہ ہے، حکومتیں آتی اور جاتی ہیں اور اُردو کے سلسلہ میں وفا نہ کئے جانے والے وعدے کرتی ہیں بقول شاعر:

ایک ہی ہوتا ہے لیلائے حکومت کا مزاج
جھوٹے وعدوں کی ادا کل بھی رہی تھی اب بھی ہے

بلاشبہ اس وقت بچوں کے لئے عصری تعلیم بے حد ضروری ہے، مسلمان بچوں کے لئے دینی تعلیم اور اُردو کی تعلیم بھی ضروری ہے، اگر اہل اُردو زبان اور تہذیب کے اعتبار سے اہل اُردو نہ رہے تو پھر ان کوششوں کا کیا حاصل اور ان کا کیا فائدہ؟۔ اس لئے نئی نسل کی لسانی اور تہذیبی حفاظت بالکل بنیادی کام ہے اور اس سے غفلت وہ جرم ہے جسے تاریخ معاف نہیں کرے گی، نصابِ تعلیم کے اندر اور بعض اسکول کے ماحول میں کچھ زہر بھی ہو سکتا ہے؛ لیکن اس کا تریاق مہیا کرنا بھی والدین کی ذمہ داری ہے۔ ببول کے سائے میں بیٹھنا ایک مجبوری ہے؛ لیکن بچوں کو اس کے کانٹوں

سے بچانا بھی ضروری ہے، ہمارے آباء واجداد نے اُردو زبان اور تہذیب وروایات کو ایمان داری کے ساتھ ہم تک پہنچایا تھا، اب ہماری باری ہے کہ زبان اور ان روایات کو نئی نسل تک پہنچائیں۔

''تعلیم ایک تحریک ایک چیلنج'' ان کتابوں میں ہے، جسے ہر گھر میں موجود ہونا چاہئے، تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر یہ ایک جامع کتاب ہے، مسلمانوں کے صاحبِ فکر طبقہ نے اس کتاب کو بہت سراہا ہے، اس کتاب کی عمومی اشاعت مسلمانوں کو برسرِ تعلیم، برسرِ روزگار، برسرِ عزت بنانے میں معاون ثابت ہوگی۔

☆ ☆ ☆ ☆
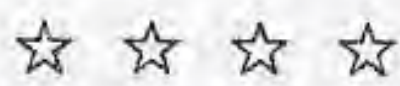
بیرونی اربابِ کمال اور حیدرآباد

حیدرآباد کی مسلم ریاست نے علوم وفنون اور اہل علم اور اربابِ کمال کی سرپرستی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، کسی کو اس ریاست کی علمی سرپرستی اور اہل علم کی قدردانی کو شواہد کے ساتھ دیکھنا ہو تو اسے ڈاکٹر داؤد اشرف کی محققانہ اور فاضلانہ کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ انھوں نے بیرونی اربابِ کمال کی بزم بڑے سلیقہ سے سجائی ہے اور قیمتی معلومات کو مختلف کتابوں سے اس طرح جمع کیا ہے جس طرح چونٹی شکر کے دانے جمع کرتی ہے اور جس طرح شہد کی مکھی پھولوں کے رس سے شہد تیار کرتی ہے۔

کتاب کا حسن آغاز نواب عماد الملک کے تذکرہ سے ہوتا ہے، جنھوں نے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ کیا، وہ صاحب گنج گیا بہار میں پیدا ہوئے ان کا تعلق بلگرام کے سادات خاندان سے تھا، ترجمہ تو پورے قرآن مجید کا کبرسنی اور علالت کی وجہ سے مکمل نہ ہوسکا؛ لیکن قرآن مجید کے انگریزی مترجم اور ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی نے ترجمہ کی بہت تعریف کی ہے اور ان کی عطا کی ہوئی سند سے بڑھ کر اور کوئی سند نہیں ہوسکتی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اس ترجمہ کا اعجاز یہ ہے کہ باوجود انتہائی احتیاط اور لفظی پابندیوں کے التزام کے سلاست اور روانی میں کسی اہل زبان کے ترجمہ سے کم نہیں، کتاب میں فرہنگ آصفیہ کے مصنف سید احمد دہلوی کا تذکرہ ہے یہ وہ کتاب ہے

جس کے چار ایڈیشن قومی کونسل برائے فروغ اُردو نے شائع کئے ہیں، کتاب کی اشاعت میں ریاست حیدرآباد نے مالی سرپرستی کی، پانچ ہزار روپے دیئے گئے، پچاس روپے ماہانہ کا وظیفہ الگ جاری کیا گیا پھر نو ہزار میں کتاب کی چار سو جلدیں خریدی گئیں، پھر مصنف کا اعزاز اس طرح کیا گیا کہ ان کے لئے پچاس روپئے کا وظیفہ بھی جاری کیا گیا، ۱۹۱۰ء کے آس پاس یہ رقم بڑی رقم ہوتی تھی، جب لوگ دو چار روپے میں گھر کا خرچ چلا لیتے تھے۔ جب مصنف کتاب کے گھر میں آگ لگی تو کتاب کے مسودہ کو شائع کرنے کے لئے دوبارہ مالی امداد دی گئی، بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب کی اُردو لغت جس کے بے شمار ایڈیشن نکل چکے ہیں، دربار کی فیض رسانیوں کا منھ بولتا ثبوت ہیں، اس لغت کی تیاری کے لئے ایک ہزار روپئے ماہانہ کا وظیفہ انھیں دیا جاتا تھا، انجمن ترقی اُردو کے استحکام اور کتابوں کی اشاعت کے لئے بھی روایتی سخاوت اور فیاضی کا طریقہ اختیار کیا گیا جس کی وجہ سے انجمن کا دفتر اورنگ آباد میں اپنی شان وشوکت میں بے نظیر تھا۔ ایک عظیم الشان عمارت، اطراف میں آب رواں اور سبزہ جواں اور چاروں طرف دور دور تک قدرتی مناظر، راوی چین ہی چین لکھتا تھا اور خود بابائے اُردو عیش وآسائش کی زندگی بسر کرتے تھے، اس آرام اور عافیت کا تصور بھی وہ علی گڑھ میں نہیں کر سکتے تھے جہاں سے وہ حیدرآباد آئے تھے۔ انھیں دو سو روپے الاؤنس کے ساتھ دارالترجمہ حیدرآباد کی نگرانی بھی سپرد کی گئی تھی، اُردو میں اسکول کے نصاب کی تیاری کا کام اور اس کا الاؤنس اس پر مستزاد۔ لیکن لغت کی کتاب کا مسودہ جس کی تیاری پر ریاست حیدرآباد میں زرکثیر صرف کیا گیا تھا، دہلی کے فسادات میں ضائع ہو گیا، یہ بیش قیمت اندوختہ جسے دل کہیں جسم کے ساتھ جل گیا۔ ایک نسخہ تھا؛ کیوں کہ اس زمانہ میں زیروکس کی مشین ایجاد نہیں ہوئی تھی اور وہ مستقبل کے پردہ خفا میں تھی، پھر مولوی عبدالحق صاحب نے پاکستان جا کر از سر نو محنت کر کے اپنے علمی کام کو حیات نو اور عمر دوام عطا کی۔ اُردو زبان وادب کی تاریخ ریاست حیدرآباد کے احسانات سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی ہے اور نہ ارباب کمال اعیان حیدرآباد کے مراحم خسروانہ کا انکار کر سکتے ہیں۔

حیدرآباد کی فیض رسانیوں کے ابر کرم سے شبلی جیسے صاحب طرز ادیب مؤرخ اور سحر طراز انشاء پرداز کا دامن بھی خالی نہ رہا تھا، ان کے لئے از راہ قدردانی پہلے سو روپئے کا وظیفہ اور پھر پانچ سو روپئے کا وظیفہ مقرر ہوا، وہ سررشتہ علوم وفنون کی نظامت کے عہدہ پر فائز رہے تھے اور یہاں ان کی کتابیں ’’الغزالی، علم الکلام، الکلام، سوانح مولانا روم اور موازنہ انیس ودبیر‘‘ شائع ہوئی تھیں۔

ان کے انتقال کے بعد ان کا وظیفہ دارالمصنفین اعظم گڑھ منتقل کر دیا گیا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں کا شمار شعراء اور مشاہیر اہل قلم میں ہے وہ بھی طویل عرصہ تک ریاست حیدرآباد کی ملازمت سے وابستہ رہے تھے، وہ رجسٹرار کے عہدہ پر فائز ہوئے، ولی عہد شہزادہ عثمان علی خان کے اتالیق بھی رہے، انھوں نے دارالترجمہ حیدرآباد میں بحیثیت مترجم بھی کام کیا۔ بحیثیت مترجم ان کی یافت پانچ سو روپئے ماہانہ تھی، انھوں نے لارڈ کرزن کی انگریزی کتاب کا ترجمہ خیابان فارس کے نام سے کیا تھا، اس طرح ایران اور اس کی زبان پر ایک وقیع کتاب اُردو میں شائع ہوئی۔ پنجاب میں انگریزوں کے خلاف ان کی سرگرمیوں کی وجہ سے حالات میں نشیب وفراز آئے، ان کو ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا؛ لیکن پھر ان کا وظیفہ جاری کر دیا گیا، میر عثمان علی خان اپنے دور حکمرانی میں ان پر بہت مہربان رہے؛ کیوں کہ وہ ان کے اتالیق رہ چکے تھے۔

حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے وابستہ رہنے والے بیرونی اربابِ کمال میں سر اکبر حیدری کا نام بھی اہم ہے وہ حیدرآباد کے اہم معماروں میں سے ہیں، انتظام وانصرام، نظم ونسق اور مالیاتی اُمور میں ان کو غیر معمولی مہارت تھی، وہ صدر اعظم کے عہدہ پر فائز ہوئے، وہ ممبئی کے رہنے والے اور بوہرہ خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ انھوں نے محکمہ آثار قدیمہ قائم کیا اور تعلیم کے شعبہ کو ترقی دی اور اُردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا، تعمیرات اور شہر کی تنظیم وتنظیف ریلوے کا قیام اور بہت سی چیزیں ان کے فضل وکمال کی مرہون منت ہیں، ان کے ناخن تدبیر نے بہت سے عقدہائے لاینحل کی گرہ کشائی کی اور ریاست کی بہبود وفلاح کے لئے انھوں نے جو کچھ کیا وہ ان کی وفاداری بطریق استواری کا ثبوت ہے۔ ان کا ابر فیاض غیر مسلموں پر بھی برسا اور ٹوٹ کر برسا، ریاست حیدرآباد نے غیر مسلموں کی پوری قدردانی کی ریاست کے غیر مسلم باشندوں پر مہربانیاں کیں اور باہر بھی کوئی جوہر کامل، گوہر بیش بہا ملا تو اس کا اعزاز بھی کیا۔ پیارے لال شاکر بھی ان باکمال لوگوں میں تھے جو اُردو کے مشہور زمانہ رسالوں کے ایڈیٹر تھے اور اُردو زبان کے نامور ادباء اور شعراء مضامین ان کے رسالوں میں لکھتے تھے وہ ادیب کے اور العصر کے ایڈیٹر رہے، حیدرآباد سے ان کے لئے وظیفہ مقرر ہوا اور مالی امداد ہوئی۔

حیدرآباد نے بہت سے اربابِ کمال کی سرپرستی کی، ناموں کی طویل فہرست ہے، غلام یزدانی اور مولانا حمید الفراہی جو عربی زبان وادب اور تفسیر قرآن کے ماہر تھے، علامہ سید سلیمان ندوی نے انھیں اپنے عہد کا ابن تیمیہ اور فضل وکمال کا مجسمہ قرار دیا تھا، سر راس مسعود اور مولانا عبد

الماجد دریابادی، سید ہاشمی فرید آبادی، عبداللہ عمادی اور مشہور مؤرخ اور سیرت نگار علامہ سید سلیمان ندوی، امراؤ جان ادا جیسی مشہور کتاب کے مصنف مرزا ہادی رسوا اور شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی اور مترجم قرآن مارماڈیوک پکتھال اور فانی بدایونی اور حفیظ جالندھری اور دیگر بے شمار نام۔ کسی کو تفصیل سے اس موضوع کا مطالعہ کرنا ہو تو ڈاکٹر سید داؤد اشرف کی کتاب کا مطالعہ کر لے، حیدرآباد نے اہل علم وکمال کی سرپرستی کی اور اہل علم وکمال نے اس شہر کو پسند کیا۔ جن علماء اور ادباء نے حیدرآباد کی سرزمین سے اپنا تعلق قائم کیا، ان میں کچھ اور نام بھی ہیں، جو مذکورہ کتاب میں نہیں ہیں جیسے مناظر احسن گیلانی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، مولانا الیاس برنی، مولانا عبد القادر بدایونی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبد الباری ندوی اور ماہر القادری، حیدرآباد کے بارے میں ان سب لوگوں کا خیال تھا کہ:

لطیف و دل کشا آب و ہوائے
مبارک منزلے فرخندہ جائے

☆ ☆ ☆ ☆

گیتا حقیقت کے آئینہ میں

''گیتا حقیقت کے آئینہ میں'' ایک مقبول انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ ہے، گیتا مذہبی فلسفیانہ فکر کی کتاب ہے، حقیقت کی جستجو اور نامعلوم حقیقتوں تک رسائی کی انسانی کوششوں کا قدیم نام فلسفہ ہے۔ سائنس اور طبیعیات کے مسائل قدیم زمانہ میں فلسفہ کی کتابوں میں داخل تھے، صرف طبیعیات نہیں بلکہ مابعد الطبیعیات کے بارے میں بھی گفتگو فلسفہ کے دائرہ کے اندر سمجھی جاتی تھی، زندگی کیا ہے؟ موت کیا ہے؟ لالہ وگل کہاں سے آئے ہیں؟ ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟ ایک فلسفی اس جیسے سوالات اور ان تمام عقدہ ہائے لاینحل کو عقل کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ مابعد الطبیعیات حقیقتیں خلاف عقل تو نہیں لیکن ورائے عقل ضرور ہیں، عقل اپنی تمام محدودیتوں کے ساتھ صرف اپنے وسائل یعنی حواس خمسہ سے ان کے ادراک سے قاصر ہے، ان کا ادراک عقل نہیں

کر سکتی۔ وجدان سے ان حقیقتوں کو پایا جا سکتا ہے؛ لیکن یہ پانا ایک انسان کا داخلی معاملہ ہے، یہ نہ دلیل ہے اور نہ دوسرے انسانوں کے لئے حجت ہے۔ مابعد الطبیعیات یا غیبی اُمور کا یقینی علم انسان کو صرف پیغمبر کے واسطے سے ہو سکتا ہے؛ لیکن کسی پیغمبر اور اس کی باتوں پر یا کسی آسمانی صحیفہ پر اور اس کے مشتملات پر اعتقاد و یقین کرنے کے لئے بھی عقل کے استعمال کی ضرورت پیش آتی ہے۔ کسی مدعی پیغمبری کی اپنی زندگی غلطیوں سے پاک نہ ہو اور طہارت و نزاہت کا اعلیٰ نمونہ نہ ہو یا اس کی زندگی تاریخ کی روشنی میں نہ ہو تو اس پر ایمان لانا انسان اور انسانیت کے لئے مفید نہ ہو گا، اسی طرح سے کسی صحیفہ کے بارے میں آسمانی صحیفہ ہونے کا دعویٰ کیا جائے اور اس کی ہدایت و نصیحت عقل کے خلاف ہو تو اس پر یقین کر لینا حد سے بڑھی ہوئی خوش اعتقادی کے تحت ہی ہو سکتا ہے۔ کسی پیغمبر اور کسی صحیفہ کی صداقت کو جانچنے کے لئے، جس کا یقینی ثبوت کسی تاریخی اور عقلی اعتبار سے مسلم آسمانی کتاب سے نہ ملتا ہو، یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس میں تاریخی دلالت و شہادت ہے یا نہیں، یعنی اس کا زمانہ نزول متعین طور پر ثابت ہے یا نہیں، مابعد کی تاریخ میں اس کے اندر تحریف اور حذف و اضافہ تو نہیں کیا گیا ہے۔ تاریخ کی تصدیق کے بغیر کوئی شخصیت یا کتاب معتبر نہیں ہو سکتی؛ بلکہ اس کی حیثیت اساطیر کی ہو گی اور اساطیر پر ایمان لانا خود کو خود فریبی میں مبتلا کرنا ہے اور یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ وہ عقل سلیم کے خلاف تو نہیں ہے اور انسانی سیرت و کردار کی تعمیر کے لئے اس میں نمونہ بننے کی صلاحیت ہے یا نہیں؛ کیوں کہ صحیفہ آسمانی کا مقصد اخلاق ذمیمہ کو مٹانا اور اس خاکدان ارضی پر نیکیوں کا چمن کھلانا ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ قابل اعتبار صحیفہ آسمانی اور لائق ایمان پیغمبروں کی ہدایت اور بنیادی عقیدوں سے اس میں پوری موافقت پائی جاتی ہے یا نہیں، اس لئے کہ یہ ممکن نہیں کہ کائنات کا مالک اور خالق کائنات میں ایک گروہ کو کچھ عقیدوں پر ایمان لانے کی دعوت دے اور دوسرے گروہ کو ان عقیدوں سے متعارض عقیدوں کی تلقین کرے، الغرض صداقت کو جانچنے کے کم از کم چار معیار لازمی ہیں:

(۱) تاریخ کی شہادت۔

(۲) عقل کی مطابقت۔

(۳) اخلاق و اقدار کی مسلمہ اُصول کی کسوٹی پر پورا اترنا۔

(۴) تاریخی اعتبار سے قطعی الثبوت آسمانی صحیفوں اور عقیدوں سے موافقت۔

قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، تاریخ کی مکمل روشنی میں ہے، عقل

ان کے احکام کی تصدیق کرتی ہے، اخلاق عالیہ کے معیار پر ان کو پرکھا جا سکتا ہے، ان کی تعلیمات سابق پیغمبروں اور الہامی کتابوں کی تعلیمات کے مطابق ہیں۔

پیش نظر کتاب میں گیتا کی اصلیت اور اس کی تعلیمات اور اس کے ہیرو کرشن کی سیرت کو تاریخ اور عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ گیتا کی تفسیریں اور شرحیں بہت لکھی گئی ہیں، ہر فرد کی تشریح الگ ہے، ان میں عقیدت مندانہ تشریحات بھی ہیں اور ناقدانہ نگارشات بھی ہیں، ہمارا یہ منصب اور مقام نہیں کہ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں پر تنقید کریں؛ لیکن مذہب اور تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے ہم یہ ضرور جاننا چاہتے ہیں کہ ان کتابوں کی تاریخی اور علمی حیثیت کیا ہے اور خود ہندو اسکالر ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ وی آر بارلا کی انگریزی کتاب علمی دنیا میں ایک مقام رکھتی ہے، اس کے مشمولات سے اختلاف کی گنجائش بھی ہو سکتی ہے؛ لیکن یہ کتاب اس لائق ہے کہ مذاہب عالم کا مطالعہ کرنے والوں کے سامنے پیش کی جائے، اسی جذبہ کے ساتھ اس کتاب کا ترجمہ اُردو قارئین کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ علمی زبان میں شائستگی کے ساتھ تنقید علم وادب کے فروغ کے لئے ضروری ہے، ہر چیز کو گہری عقیدت کی نظر سے دیکھنا اور عقل کو درمیان میں نہ لانا کوئی قابل تعریف بات نہیں، اس سے جہالت، تاریک خیالی اور توہم پرستی کو فروغ ملتا ہے، بہتر انسان وہ ہے جو سچائی کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے اور صرف دلیل کی بنیاد پر کسی حقیقت کو تسلیم کرتا ہے۔

مصنف کے قول کے مطابق گیتا کا زمانہ تاریخ کی تہہ بتہ تاریکی میں گم ہے، خود ہندو مؤرخین کسی ایک بات پر متفق نہیں، اس کتاب کو اور اس کی اصل مہابھارت کو بہت سے ناقدین محض افسانہ اور دیومالائی کہانیوں کا مجموعہ قرار دیتے ہیں، نہ کسی کو مصنف کا علم ہے اور نہ زمانہ تالیف کے بارے میں کسی کو یقینی معلومات حاصل ہیں۔ بعض ناقدین بھگوت گیتا کو مہاتما بدھ کے پند ونصائح کی مقبولیت کو مٹانے اور برہمنیت کو آخری زوال سے بچانے اور ویدک دھرم کو پھر سے سربلند کرنے کے جذبہ سے ایک سیاہ تازہ کی حیثیت سے سامنے لانے کی برہمنی کوشش قرار دیتے ہیں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے آریوں کے غیر ملکی ہونے کے الزام کو بیخ وبن سے اُکھاڑنے کے لئے ابھیناش چندداس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آریہ ہمیشہ سے ہندوستان میں تھے اور یہیں سے وہ دنیا میں پھیلے؛ کیوں کہ بیرونی حملہ آوروں کا ذکر بہت سے لوگوں کو پسند نہیں آتا تھا۔ مہاتما بدھ کی مساوات کی تعلیم بھی خصوصی مراعات سے بہرہ مند طبقہ کو راس نہیں آئی اور انھوں نے آخر کار اپنے ترکش سے آخری تیر پھینکا۔ یہ گمان گیتا کی اس تعلیم سے ہوتا ہے کہ ذات پات بھگوان کی ہی پیدا

کردہ ہیں اور اس کو ترک نہیں کیا جا سکتا، اس کی حفاظت کے لئے خوں ریزی تک درست ہے، مہابھارت میں، گیتا جس کا ایک جز ہے، بدھوں کو برا کہا گیا ہے، رامائن میں بھی خود رام کے منھ سے مہاتما بدھ کو چور کہا گیا ہے۔ حیرت ہے کہ اس کے باوجود رامائن اور مہابھارت دونوں کو بدھ کے دور سے پہلے کی کتاب قرار دیا جاتا ہے، اس تضاد کا کیوں احساس نہیں ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندو قوم تاریخ کے ذوق سے محروم رہی ہے، بس بھگوانوں کی تقدیس کی کتابیں ہیں، جن کی نہ کوئی سند ہے اور نہ واقعات کی کوئی تاریخ ہے اور اسی کے ساتھ شودروں کو خدمتگار بنانے اور انھیں ذلیل کرنے کا جذبہ ہے۔ گیتا میں ویش اور شودروں اور عورتوں کو گناہوں کی پیداوار قرار دیا گیا ہے، کہاں یہ تعلیم ہے اور کہاں اسلام کی یہ تعلیم کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے اس کا مرتبہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑا ہے۔ خود رام چندر جی کی ذات پرستی پر یقین کا یہ حال تھا کہ انھوں نے ایک شودر شمبو کا کو اس لئے قتل کر دیا تھا کہ وہ نیچی ذات کا ہو کر بھی تپسیا یعنی ذکر و عبادت میں مشغول تھا، رامائن میں اس کا ذکر موجود ہے، گیتا میں ستی کے رسم کی بھی پرزور وکالت کی گئی ہے۔

جہاں تک گیتا کی اخلاقیات کا تعلق ہے، اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کرشن جی کی سولہ ہزار ایک سو آٹھ بیویاں تھیں، بے شمار داشتائیں تھیں، پہلی بیوی رکمنی کے ہوتے ہوئے دوسرے کی بیوی رادھا سے ان کے تعلقات تھے، شہوت رانی کے تعلقات کی جو تفصیل اس کتاب میں ہے اسے پڑھ کر شمع حیا جھلملا کر رہ جاتی ہے۔ حیرت بالائے حیرت اس کی دوراز کار تاویلات ہیں جو عقیدت مند شارحین نے کی ہیں اور وہ یہ ہیں کہ بے شمار درویشوں اور رشی منیوں نے سابقہ جنم میں بھگوان سے استدعا کی تھی کہ وہ ان کو اپنی قربت التفات سے محروم نہ رکھیں، مستجاب الدعوات رشیوں کی دعا قبول ہوئی، چنانچہ یہ تمام زہاد گوپیوں کی صورت میں بعد کے جنم میں ظہور پذیر ہوئے اور بھگوان کرشن نے ان سے جنسی تعلقات اس لئے قائم کئے کہ اس سے زیادہ قریبی تعلقات کا اظہار کسی اور صورت سے ممکن نہ تھا۔ جمنا میں غسل کرتی ہوئی عورتوں کے کپڑے لے کر درخت پر چڑھ جانے اور برہنہ سامنے آنے کی شرط پر کپڑے دینے کی تاویل یہ ہے کہ اسی طریقہ سے اس بے حیائی کا خاتمہ ممکن تھا جو اس دور میں رواج پا رہی تھی، بھگوان کرشن کا یہ کردار ہے اور اس کے مقابلے میں اسلام کے نظام عصمت و عفت کی یہ تعلیم ہے کہ کسی غیر محرم عورت کو دیکھنا تک جائز نہیں اور عورت کو حجاب کا حکم دیا گیا ہے، تاریخ کی کسوٹی ہو، عقل کی میزان ہو یا اخلاق

قدروں کا معیار ہو، بھگوت گیتا کو کسی اعتبار سے آسمانی اور ربانی صحیفہ نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کے باوجود یہ ہمارے ہندو بھائیوں کے درمیان مقبول ترین کتاب ہے، کیا اب اس کی ضرورت نہیں کہ مسلمان اپنے غیر مسلم بھائیوں کو شائستگی اور شرافت کے ساتھ اور حکمت و دانائی کے ساتھ ان کمزوریوں کی طرف توجہ دلائیں اور اپنی اور ان کی عاقبت درست کرنے کی فکر کریں؟

(مقدمہ کتاب، شائع کردہ یونیوسل پیس فاؤنڈیشن، دہلی)

☆ ☆ ☆ ☆

مسلمانوں میں ہندو مذہب کے مطالعہ کی روایت

(کتابوں کا جائزہ)

مسلمان اور ہندو کئی سو برس سے اس ملک میں ایک دوسرے کے پڑوسی کی حیثیت سے زندگی گزارتے آئے ہیں، ہندوستان میں مسلمان جہاں کہیں آباد ہوئے ان کے پڑوسی غیر مسلم ہی تھے۔ اسلام میں پڑوسی کا حق بہت زیادہ ہے، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جبرئیل پڑوسیوں کے بارے میں اتنی مسلسل وصیت کرتے رہے کہ مجھ کو خیال ہونے لگا کہ ان کو وراثت میں حصہ دار بنادیں گے۔ (بخاری: کتاب الادب)

اس حق کا تقاضہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنے برادرانِ وطن کے مذہب کو جانیں، اس لئے کہ انسان کے بہت سے کار وافکار اور اس کے افعال و اعمال کی بنیاد عقیدہ پر ہوتی ہے، کسی انسان کے رویہ، اس کے طرز عمل، اس کی نفسیات کو جاننے اور سمجھنے کے لئے اس کے مذہبی پس منظر کا جاننا بھی ضروری ہوتا ہے، دین اسلام کے تعارف کے کام کے لئے بھی جو مسلمانوں پر فرض ہے، مخاطب کے مذہبی معتقدات کا جاننا لازمی ہے؛ کیوں کہ اس کے بغیر وہ حکمت میسر نہیں آسکتی جو دعوت کے کام کے لئے اساس کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کے اختیار کرنے کا حکم قرآن میں دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مسلمان داعی اگر ایک آریہ سماجی ہندو سے اپنی گفتگو میں بت پرستی کی خرابی بیان کرے گا تو یہ عمل لاحاصل اور غیر حکیمانہ ہوگا؛ کیوں کہ آریہ سماجی خود ہی بت پرستی کے خلاف اور توحید کے قائل

ہیں۔ غیر حکیمانہ اور غیر عاقلانہ گفتگو مخاطب کے دل میں نور و سرور پیدا کرنے کی بجائے ناسور پیدا کرسکتی ہے، اس لئے دعوت سے پہلے مخاطب کو اچھی طرح جاننے کی کوشش کرنا چاہئے، عقل کی پیشوائی کا تقاضہ ہے کہ برادرانِ وطن کو مخاطب بنانے کے لئے ان کے ساتھ حسن سلوک اور اکرام واحترام کا معاملہ کرنا چاہئے، ان کے مذہب کا مطالعہ کیا جائے۔ یہ بات ایک داعی کو یاد رکھنی چاہئے کہ داعی اعظم رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کفار ومشرکین کو برا نہیں کہتے تھے؛ بلکہ ہمیشہ ان کی ہدایت کی دُعاء کرتے رہتے تھے کہ اللہ میری قوم کو ہدایت دے وہ حق و باطل کے درمیان تمیز نہیں کرتے، ایک مرتبہ مشرکین کے مظالم سے تنگ آکر بعض صحابہ نے آپ سے بددُعاء کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا کہ میں لعنت کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا ہوں؛ بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

ہندو مذہب کا مطالعہ اس ملک میں مسلمانوں کی روایت بھی رہی ہے، سلطان محمود غزنوی کے دربار میں ابوریحان البیرونی تھا جو علم و تحقیق کے قلم رو کا سلطان تھا، اس کا شمار دنیا کے بڑے اربابِ علم و فضل میں کیا جاتا ہے۔ اس کے انتقال پر ساڑھے آٹھ سو برس گزر جانے کے باوجود اس کی اہمیت اور مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے، وہ علم ہیئت، علم نجوم، علم تاریخ اور ادب میں مہارت رکھنے کے ساتھ ادیان و مذاہب پر بھی گہری نظر رکھتا تھا، وہ عربی فارسی عبرانی زبان کے ساتھ سنسکرت کا بھی ماہر تھا۔ اس زبان کی مذہبی کتابوں کا براہ راست اس نے مطالعہ کیا تھا، وہ ہمیشہ تصنیف و تالیف میں مشغول رہتا تھا، اس کے ہاتھ سے قلم نہیں چھوٹتا تھا، اس کی آنکھوں کے سامنے سے کتاب نہیں ہٹتی تھی، اس کا دماغ ہمیشہ گہرے غور و فکر کا عادی تھا، انتہا یہ ہے کہ بوقت مرگ حالت نزع میں بھی وہ علمی مسائل سلجھانے میں لگا رہا۔ اس نے ایک کتاب ''کتاب الہند'' کے نام سے لکھی جس میں اس نے ہندوؤں کے مذہبی معتقدات، ہندوستان کی معاشرتی حالت، ہندوؤں کے لباس، کھانے پینے کے آداب، رسوم و رواج، ذات پات کے نظام، ان کے مذہب کے حلال اور محرمات اور تہواروں تک کا بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ البیرونی کی بے تعصبی اور خالص علمی اُسلوب کی خود ہندو دانشوروں نے تعریف کی ہے، اگر ہر زمانے میں ہندو اور مسلمان دونوں میں البیرونی جیسی شخصیتیں پیدا ہوتی رہتیں تو اس ملک کی تاریخ مہر و وفا، رواداری اور یگانگت کی تاریخ ہوتی۔

ہندوستان کے مذہبی ذہن و فکر رکھنے والے مسلم بادشاہ بھی ہندو مذہب کی واقفیت کی فکر رکھتے تھے، سلطان محمد تغلق ہندو اور جین مذہب سے متعلق معلومات کی تلاش میں لگا رہا، وہ ان مذاہب کے فضلاء کو اپنی مجالس میں مدعو کرتا اور ان سے آدھی آدھی رات تک مذہبی گفتگو کرتا تھا۔

اس سلطان کے بارے میں ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ وہ شریعت کا پابند تھا، صبح کی نماز کے بعد اوراد و وظائف میں مشغول رہتا اور فسق و فجور سے پرہیز کرتا تھا، اذان کے احترام میں کھڑا ہو جاتا، جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھنے والوں کو سزا دیتا۔

فیروز شاہ نے ہندوؤں کے علوم سے متعلق کتابوں کا فارسی ترجمہ کروایا، یہ کتابیں فلسفہ علم نجوم اور الٰہیات سے متعلق تھیں، اس طرح کی ایک کتاب کا نام اس نے دلائل فیروز شاہی رکھا۔ وہ ہندو راجاؤں کی تعظیم و تکریم کرتا تھا اور ان کو شاہانہ نوازشوں سے نوازتا تھا، اس سلطان نے ترغیب و تحریص کے ذریعے ہندوؤں کو دائرہ اسلام میں لانے کی کوشش کی تھی، اس نے اعلان کیا تھا کہ جو کوئی دین اسلام قبول کرلے گا تو نہ صرف اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے گا؛ بلکہ انعام و اکرام سے بھی نوازا جائے گا، اعلان کے بعد بکثرت ہندو مسلمان ہوئے۔

سلطان ناصر شاہ (1282-1325) بنگالی زبان کا بہت بڑا سرپرست تھا، اس کے حکم سے مہابھارت کا بنگالی زبان میں ترجمہ ہوا، پھر سلطان حسین شاہ نے بھاگوت پران کے بنگالی ترجمہ کے لئے جالا دھر باس کو مامور کیا، ان ہی سلاطین کی کوششوں سے بنگالی اس خطہ میں ان مسلمانوں کی زبان بھی ہوگئی جو اس زبان سے واقف نہ تھے۔ کشمیر میں سلطان زین العابدین کو ہندی اور تبتی زبان پر بڑا عبور حاصل تھا، اس نے اپنے دربار میں سنسکرت کے فضلاء کو متعین کیا اور اس کے حکم سے انھوں نے سنسکرت میں کشمیر کی تاریخ لکھی، سلطان نے ایک دارالترجمہ بھی قائم کیا، جہاں سنسکرت کی کتابوں کا فارسی میں اور فارسی کتابوں کا سنسکرت میں ترجمہ بھی ہوتا تھا، پنڈت اس کے دربار میں شاستر سناتے تھے۔ مسلمان صوفیاء نے یگانگت اور محبت کی خاطر ہندوستان کی مقامی زبان میں دوہے لکھے، حضرت فریدالدین گنج شکرؒ نے پنجابی میں اور حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ نے ہندی میں دوہے لکھے، یہاں کے باشندوں نے عربی اور فارسی کو چھوڑ کر مقامی زبانیں اختیار کرلیں اور اسی سے اُردو کی نشو ونما بھی ہوئی۔

مسلمانوں کے ذوق جستجو اور مذاہب عالم کے مطالعہ کا شوق پوری تاریخ میں اور ہر عہد میں پایا جاتا ہے، ہندو مذہب کے بارے میں جاننے اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کا ترجمہ کرنے کی کوشش ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں مسلسل پائی جاتی ہے۔ مغلیہ عہد کے دور ہمایونی میں محمد گوالیاری نے سنسکرت کی مشہور تصنیف امرت کنڈ کا فارسی ترجمہ بحرالحیات کے نام سے کیا، اس کتاب میں برہمنوں کے مذہبی خیالات وعقائد پر مباحث ہیں اور یہ کتاب مخطوطہ کی شکل میں برٹش

میوزیم میں موجود ہے۔ شیر شاہ کے دور میں ملک محمد جائسی نے ہندی میں پدماوت لکھ کر لسانی اور مذہبی رواداری کا ثبوت دیا، اکبر نے سنسکرت کی کلاسیکل کتابوں کو فارسی میں منتقل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، اس کے حکم سے نقیب خان، ملا عبدالقادر بدایونی، ملا شیری اور سلطان حاجی تھیسری نے مل کر مہابھارت کا فارسی ترجمہ ۹۹۵ھ میں کیا اس کی خواہش پر اس کو مصور بھی کیا گیا اور اس کا فارسی نام رزم نامہ رکھا گیا۔ پھر ملا عبدالقادر بدایونی نے لگاتار چار سال کی محنت کے بعد رامائن کا بھی فارسی ترجمہ ۹۹۶ھ میں مکمل کیا، اتھر وید کا فارسی ترجمہ حاجی ابراہیم سرہندی نے کیا، ملا شیری نے فارسی میں ہربنس کا ترجمہ کیا جس میں کرشن جی کی زندگی کے حالات ہیں، آئین اکبری اور منتخب التواریخ وغیرہ میں ان کتابوں کا تذکرہ موجود ہے۔ اکبری دور میں ابوالفضل نے ہندوؤں کے علوم وفنون کا گہرا مطالعہ کیا اور ان کی عقل و دانش اور نفس کشی کو دلکش پیرایہ میں پیش کیا، اکبری عہد کا یہ عظیم مؤرخ انڈولوجی کا ماہر اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کا عالم تھا، اس نے ہندوؤں کے مذہبی عقائد کا تجزیہ بڑی دیدہ دری سے کیا ہے، اس کی کتاب آئین اکبری اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

جہانگیر ایک دانشور فرماں روا تھا، توزک جہانگیری سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو مذہب اور عقائد پر اس کی اچھی نظر تھی وہ پنڈتوں کے ساتھ مذہبی بحث ومناظرہ بھی کرتا تھا اور ان کو مظاہر پرستی سے ہٹا کر ذات مجرد کے اعتراف پر لانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس نے اپنی توزک میں ہندو مذہب پر تبصرے بھی کئے ہیں، اسی کے عہد میں شیخ سعد اللہ نے رامائن کو فارسی میں منظوم کیا اور اس کا نام رام وسیتا رکھا۔ اسی عہد کے مؤرخ قاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ میں ہندوؤں کے مذہبی عقائد کا ذکر تفصیل سے کیا ہے، تاریخ فرشتہ میں مہابھارت کا تذکرہ بھی ہے اور تجزیہ بھی ہے۔

شاہ جہاں کے دور میں مولانا عبدالرحمٰن چشتی نے بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ فارسی زبان میں کیا، یہ ترجمہ بھی مخطوطہ کی شکل میں برٹش میوزیم میں موجود ہے، پھر اس عہد میں شمس بازغہ کے مصنف ملا محمود جونپوری نے ہندوستان کے خاص فن نایکا بھید کا گہرا مطالعہ کیا اور اس پر ایک کتاب لکھی۔ مولانا نجم الدین حسن کے رسالہ شطاریہ میں ہندوؤں کے مراقبے کے طریقے لکھے ہیں، شاہ جہاں نے اپنا ولی عہد دارا شکوہ کو بنایا تھا، دارا شکوہ کا علمی اور مذہبی مطالعہ بہت وسیع تھا، اس کی کتاب مجمع البحرین مذہب کے بارے میں اس کے وسیع المطالعہ ہونے کا ثبوت ہے، اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی تصوف اور فلسفہ ویدانت میں کوئی خاص فرق نہیں

ہے۔ وہ اکبر کی طرح وسیع المشرب تھا، راسخ العقیدگی سے اس کو کوئی مناسبت نہ تھی، مجمع البحرین لکھنے کے بعد اس نے ہندو مذہب کے کئی کتابوں کے ترجمے کئے یا اس کام پر لوگوں کو مامور کیا، اس نے ۱۰۶۷ھ میں اپنشد کے پچاس ابواب کا فارسی ترجمہ بنارس کے ہندو پنڈتوں کی مدد سے کیا، بھگوت گیتا کا ایک ترجمہ بھی اس کی طرف منسوب ہے۔ اس نے غلو سے کام لے کر ہندو مذہب اور اسلام کا ملغوبہ تیار کرنے کی کوشش کی؛ لیکن جس طرح اکبر کو ناکامی ہوئی، ناکامی اس کا بھی مقدر بنی اور اس طرح کی غلط کوشوں کا انجام یہی ہوتا آیا ہے، تاریخ میں وحدت ادیان کی کوششیں کبھی کامیاب نہیں ہوئی ہیں، نہ اس طرح کے بے معنی کام سے دلوں کی تسخیر میں کوئی مدد ملی ہے، اس عہد میں محسن فانی کی کتاب دبستان المذاہب لکھی گئی۔

۱۷۳۲ء میں امانت نام کے ایک مصنف نے شری کرشن کے قصے فارسی زبان میں لکھے، اس کے بعد شاہ نیاز احمد بریلوی بھی ہندو مذہب کے بارے میں تفصیلی معلومات رکھتے تھے، انھوں نے ہندو گیان دھیان کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا ہے۔ مرزا مظہر جان جاناں ایک صوفی بزرگ تھے؛ لیکن ہندو مذہب کے بارے میں ان کا مطالعہ وسیع تھا، وید کو الہامی کتاب مانتے تھے اور ہندوؤں کو شبہہ اہل کتاب قرار دیتے تھے۔ انھوں نے عربوں کی بت پرستی اور ہندوؤں کی بت پرستی میں فرق ثابت کیا ہے اور کہا ہے کہ ہندو بتوں کے تصرف کو ان کا تصرف نہیں؛ بلکہ تصرف الٰہی سمجھتے ہیں، وہ شرک کے ذریعہ الوہیت کو پہنچتے ہیں، بتوں کے سامنے ان کا سجدہ عبودیت کا سجدہ نہیں ہے؛ بلکہ سجدہ تعظیمی ہے جو اسلام سے پہلے کے مذاہب میں جائز تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن میں ہے کہ ''وان من قریۃ الا خلا فیہا نذیر'' (اس سے ظاہر ہے کہ ہندوؤں میں بشیر اور نذیر ضرور آیا ہوگا اور ممکن ہے رام چندر جی اور کرشن جی ان میں نبی رہے ہوں)۔

(مقدمہ کتاب ہندو مذہب مطالعہ اور جائزہ، شائع کردہ قاضی پبلشرز، دہلی)

☆ ☆ ☆ ☆

اسلامی رواداری کے موضوع پر کتابیں

۱

افغانستان اور عراق اور اب ایران کے خلاف عیسائی دنیا کی کارروائی ایک تاریخی پس

منظر رکھتی ہے۔ سازش، عیاری، غداری، تخریبی کاروائی، فریب کارانہ سیاست اور میدان جنگ میں خونریزی کے پہلو بہ پہلو مسلمانوں کے خلاف وسائل ابلاغ کی ثقافتی جنگ بھی تاریخ میں جاری رہی ہے۔ صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد عیسائی دنیا نے اپنا سارا زور ایک طرف دولت عثمانیہ کو ختم کرنے پر لگایا دوسری طرف اس نے اسلام پر علمی اور ثقافتی یلغار کا آغاز کردیا۔ سیرت اور اسلامی تاریخ کو داغدار بنا کر پیش کرنا شروع کردیا، بدنام کرنے کے لئے بے شمار کتابیں لکھی گئیں، لٹریچر تیار کیا گیا۔ واقعہ کے بالکل برعکس پوری اسلامی تاریخ کو جارحیت اور خونریزی کی داستان بنا کر دنیا کے سامنے لایا گیا، یہاں تک کہ انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ذہن بھی اس پروپیگنڈے سے متاثر ہونے لگا۔ جس نے دولت عثمانیہ کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتا ہے کہ روسیوں اور یونانیوں نے اور مغربی ملکوں نے جب بھی انھیں موقع ملا مسلمانوں کے خلاف کیسے کیسے مظالم کیے اور مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں دوسری قوموں سے کیسا فراخدلانہ سلوک کیا، اس کا اعتراف غیر جانبدار غیر مسلم مؤرخین نے بھی کیا ہے۔

ایک معاصر غیر جانبدار مؤرخ ولیم ڈالریمپل (William Dalrymple) نے آخری مغل The Last Mughal کے نام سے حال میں کتاب لکھی ہے، ریڈئینس ویوز ویکلی دہلی کی ۶ رجنوری ۲۰۰۷ء کی اشاعت میں اس کتاب پر تفصیلی مضمون اور تبصرہ سرور احمد کے قلم سے شائع ہوا ہے۔

مصنف کتاب ڈالریمپل نے ہندوستان میں قتل عام کا، پھانسی دینے کا، اور بڑے پیمانہ پر عصمت دری کا اور ہزاروں مردوں، عورتوں اور بچوں کی تعذیب، مقدس مذہبی مقامات کے انہدام اور بے حرمتی کا ذمہ دار انگریزوں کو قرار دیا ہے، تعلیمی اداروں کی بربادی ان انگریزوں کا مقصد خاص تھا۔

مصنف کتاب نے اس وقت کے وزیر اعظم پامراسٹون کے حکم نامہ کا حوالہ دیا ہے کہ دہلی کو دنیا کے نقشہ سے مٹا دیا جائے اور ان شہری عمارتوں کو جن کا تعلق مسلم تہذیب سے ہو مسمار کردیا جائے، قدامت تاریخی اہمیت، تقدس اور تعمیر کے ذوق جمال کسی چیز کی پرواہ نہ کی جائے۔ مصنف نے اس کی بھی صراحت کی ہے کہ انگریزوں نے مسلمان عورتوں کے ساتھ شرمناک سلوک کیا؛ لیکن مسلم مجاہدین کو جہاں قابو ملا انھوں نے کوئی قابل اعتراض حرکت عیسائی خواتین کے ساتھ نہیں کی یہ تو مصنف نے ہندوستان کے بارے میں شہادت دی ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی

پوری تاریخ میں چند واقعات کے استثناء کے ساتھ غیر مسلموں کے ساتھ ہمیشہ اور ہر جگہ ہی انتہائی رواداری اور شرافت کا معاملہ کیا ہے۔

دنیا جانتی ہے کہ صلیبیوں نے فلسطین کو فتح کرنے کے بعد مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا اور صلاح الدین ایوبی نے فلسطین فتح کرنے کے بعد عیسائیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ خود دور حاضر میں بوسنیا اور ہرزیگووینا میں، فلسطین میں، تیونس اور الجزائر میں اور ہندوستان میں ممبئی اور گجرات میں مسلمانوں کے ساتھ جس سفاکی اور بربریت کا سلوک ہوا مسلمانوں نے اپنی پوری تاریخ میں بشری کمزوریوں کے باوجود غیر مسلموں کے ساتھ ایسا بربریت کا سلوک نہیں کیا۔ مسلمانوں نے آپس میں خونریزی ضرور کی ہے؛ لیکن پُر امن غیر مسلم رعایا کے ساتھ ہمیشہ اچھا برتاؤ کیا ہے، یہ اسلامی احکام اور روایت کا نتیجہ تھا۔ دولت عثمانیہ تین براعظموں اور دو بحر اعظموں تک پھیلی ہوئی تھی جو عیسائیوں کے آنکھ کا کانٹا بنی ہوئی تھی، عیسائی دنیا چاہے آپس میں برسر پیکار ہو؛ لیکن مسلمانوں کے خلاف اس درجہ متحد رہتی کہ جب جب یونانی، ترکوں کے خلاف بغاوت کرتے پوری عیسائی دنیا یونانیوں کا ساتھ دیتی اور جب یونان میں مسلمانوں کے خلاف دین مسیحی کے احیاء کی تحریک اٹھی، انگلستان کے شاعر لارڈ بائیرن نے اور فرانس کے شاعر وکٹر ہیوگو نے اس کا ساتھ دیا۔ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کو ختم کرکے برٹش امپائر قائم کی گئی، مظالم مسلمانوں پر کئے گئے؛ لیکن یہ مغربی لٹریچر کا اور ذرائع ابلاغ کا کمال تھا کہ مسلمانوں کے خلاف فضا بنائی گئی اور فضا میں ہر طرف سے یہ آواز آنے لگی کہ ''بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانہ سے''۔

اسلام کے علمی دفاع کے لئے پہلا رُخ جو تعلیم یافتہ مسلمانوں کی طرف سے سامنے آیا وہ یہ تھا کہ اسلام میں جنگ مدافعانہ ہے جارحانہ نہیں جیسا کہ یورپ کا الزام ہے۔ سرسید اور ان کے اسکول کا نقطۂ نظر یہی تھا، اس نقطۂ نظر کو غلط نہیں کہا جاسکتا، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جتنی جنگیں ہوئی ہیں وہ سب مدینہ کے قریب ہوئی ہیں یہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ حملہ آور مکہ کے مشرکین تھے اور مسلمان اپنا دفاع کرنے والے تھے۔ جنگ بدر، جنگ اُحد، جنگ احزاب، سب دفاعی جنگیں تھیں، جنگ موتہ میں بھی جو سن آٹھ ہجری میں ہوئی تھی مسلمانوں نے جو اقدام کیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر حارث بن عمیر ازدی کو والیٔ بصرہ شام نے جو قیصر روم کا گورنر تھا قتل کردیا تھا، سفیر کو قتل کرنا اس زمانہ کے قوانین کے تحت بھی جائز نہ تھا اور یہ قتل ناحق اعلان جنگ کو مستوجب تھا، اگر اس وقت اس کا انتقام نہیں لیا جاتا اور خاموشی اختیار کی جاتی تو

یہ اسلامی حکومت کی کمزوری سمجھی جاتی، چنانچہ اقدام کیا گیا اور فوج زید بن حارثہ ؓ کی سرکردگی میں بھیجی گئی، تین ہزار مسلمانوں کی فوج کے مقابلہ ہرقل دولاکھ کی فوج لے کر آیا تھا، بلقائے شام میں معرکہ کارزار گرم ہوا تھا، اسی جنگ موتہ کا ایکسٹینشن یعنی توسیع ہے جو مسیحی ملکوں سے جنگوں کی صورت میں بعد میں خلفائے راشدین کے زمانہ میں جاری رہا، یہاں تک کہ اسلام پورے طور پر غالب آگیا اور رومی شہنشاہیت کا خاتمہ ہوگیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب مسلمانوں نے دمشق، حمص اور اُردن پر قبضہ کیا تو ہرقل بہت سراسیمہ ہوا، اس نے اپنے فوجی امراء کو بلاکر پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ عرب تعداد میں اور اسلحہ اور سامان میں ہم سے بہت کم ہوتے ہیں، پھر بھی کامیاب ہوتے ہیں۔ اس کا جواب ایک تجربہ کار شخص نے دیا کہ مسلمانوں کے اخلاق ہمارے اخلاق سے اچھے ہیں وہ رات کو عبادت کرتے ہیں، دن کو روزہ رکھتے ہیں، کسی پر ظلم نہیں کرتے، آپس میں مساوات برتتے ہیں، وعدہ کی پابندی کرتے ہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ ان کے ہر کام میں جوش اور استقلال ہوتا ہے اور ہمارے کام ان سے خالی ہوتے ہیں۔ ایک اور جنگ میں رومیوں کی خواہش پر گفتگو کے لئے حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت معاذ بن جبل ؓ کو سفیر بنا کر بھیجا، انھوں نے رومیوں کے قیمتی فرش پر بیٹھنے سے انکار کردیا اور کہا جس فرش کی خوبصورتی اور بہار غریبوں کا خون چوس کر کے تیار کی گئی ہو اس پر میں نہیں بیٹھ سکتا۔ اسلام نے روئے زمین پر ایک نئی قوم کی شکل میں نئے قسم کے پھولوں کی ایک نرسری تیار کردی تھی جس کی خوبصورتی اور خوشبو ہر شخص کو مسحور اور مخمور کردیتی تھی، ان خوشبودار پھولوں سے پوری سرزمین طبلہ عطار بنی ہوئی تھی، ایسا لگتا تھا کہ خرابہ عالم پر ایک حسن افروز محل تعمیر ہوگیا ہے جس کے فرش پر زریں پچی کاری ستونوں پر منبت کاری اور دیواروں پر کاشی کاری کے کام ہیں جو اپنی صناعی اور خوشنمائی میں بے مثال ہے۔ اسلام نے ایک زندہ قوم کو پیدا اور برپا کردیا تھا، ایسی قوم جو ہر طرح کے نفسیاتی عقدے اور کمپلیکس سے آزاد تھی، خدا کے سوا نہ کسی سے ڈرتی تھی نہ کسی سے مرعوب ہوتی تھی۔

یورپ کے مؤرخین کو حیرت واستعجاب اس بات پر ہے کہ نہایت قلیل عرصہ میں اس وقت کی متمدن دنیا کا بڑا حصہ کیوں کر مسلمان ہوگیا، جب کوئی بات ان کو سمجھ میں نہیں آتی تو اسلام کی تلوار پر الزام عائد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دنیا میں اسلام تلوار سے پھیلا اور ظلم وتشدد سے گردنیں خم کی گئیں، حالاں کہ آج بھی یورپ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پروپیگنڈہ کے لئے کارٹون بنائے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں میں خوف خدا، زہد وتقویٰ،

رحم دلی اور رواداری، راست بازی اور انصاف اور تلطف وترحم کی ایسی روح پھونک دی تھی کہ وہ جس ملک میں گئے ان کی زندگی کو دیکھ کر لوگ مسلمان ہوگئے۔ یہ لوہے کی تلوار نہیں تھی؛ بلکہ اخلاق کی تلوار تھی جو لوگوں کو مسلمان کر دیتی تھی، خاص طور پر غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کا سلوک مثالی تھا اور چشم فلک نے کبھی کسی قوم کو غیر قوم کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مفتوحہ ممالک کے غیر مسلم، مسلمانوں کی معاشرت کو دیکھ کر مسلمان ہو جاتے تھے، مسلمانوں کا لشکر جب شام پہنچا تو رومیوں کے سفیر جارج نے اسلام قبول کر لیا (طبری) مسلمانوں کا لشکر مصر پہنچا تو وہاں کے شہر کے رئیس نے دو ہزار آدمیوں کے ساتھ اپنے مذہب کو ترک کر کے اسلام میں داخل ہونا پسند کیا (مقریزی) دمشق کا بشپ فاتح دمشق خالد بن ولیدؓ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا (معجم البلدان) جلولہ کی فتح کے بعد یہاں کے امراء اور وزراء اجتماعی طور پر مسلمان ہو گئے (فتوح البلدان) قادسیہ کی فتح کے بعد ایرانیوں کا شاہی رسالہ چار ہزار لشکریوں کے ساتھ مسلمان ہو گیا، عراق، شام، مصر اور ایران کی ساری آبادی اسی طرح اسلام قبول کرتی گئی یہاں تک کہ اسلام یہاں کی کثیر آبادی کا مذہب بن گیا۔

اب بھی سوال ہو سکتا ہے کہ پیغمبر کے زمانہ کی جنگیں دفاعی تھیں تو خلفائے راشدین کے زمانہ میں ان ملکوں پر حملے کیوں کئے گئے، کیوں نہیں مسلمان جزیرۃ العرب تک مقید اور محصور اور محدود رہے۔ صدر اول کی جتنی جنگیں ہوئی ہیں وہ بھی دراصل دفاعی جنگیں تھیں، اس وقت روئے زمین پر دو بڑی طاقتیں تھیں فارس اور روم۔ روم والے بلاد اسلام کی سرحدوں پر دھاندلی مچایا کرتے تھے، جو شخص اسلام قبول کر لیتا اسے طرح طرح کی تکلیفیں دیتے تھے، فارس کے لوگ ان سے بھی دو قدم آگے بڑھے ہوئے تھے، یہ وہ تھے جنھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب گرامی کو چاک کر دیا تھا، مسلمانوں کو شدید ایذائیں پہنچاتے تھے، اسلام کے قاصدوں کو دھمکی دیتے تھے، خلفائے راشدین کے زمانہ میں جن ملکوں کو فتح کیا گیا وہ سب دنیا کی ان ہی دو طاقتوں کے زیر نگیں تھے، اگر ان کی طرف سے جارحانہ کارروائیاں نہیں ہوتیں اور دعوت اسلام کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جاتی تو ان لڑائیوں کی نوبت بھی نہ آتی؛ کیوں کہ یہ لڑائیاں جوع الارض اور توسیع پسندی کے جذبہ سے نہیں کی گئی تھیں۔ جنگ تو ایک بار کسی ملک سے چھڑ جاتی ہے تو پھر اس کا سلسلہ اس وقت ختم ہوتا ہے جب دشمن اپنی آخری شکست تسلیم کر لیتا ہے، مسلمانوں نے کسی شخص کو بھی زور اور زبردستی سے مسلمان نہیں بنایا، مسلمانوں نے اپنے اخلاق سے دلوں کو فتح کر لیا تھا، مفتوحہ ممالک

کے لوگ مسلمانوں کے برتاؤ اور حسن سلوک سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے تھے۔

لیکن یورپ کے اہل قلم نے اسلامی تاریخ پر جارحیت اور بربریت کا الزام اس زور وشور سے لگایا کہ دنیا میں اسلام کو تلوار کا مذہب کہا جانے لگا، جس شخص نے پریم چند کا ہندی افسانہ ''جہاد'' پڑھا ہے وہ آسانی سے اندازہ کر سکتا ہے کہ یورپ کے اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کے اثرات کہاں تک پہنچے تھے۔ پریم چند کی یہ کہانی بہار میں ہائی اسکول کے کورس میں داخل ہے، جس سے جہاد اور مسلمانوں سے نفرت پیدا ہوتی ہے، خود انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان بھی اس پروپیگنڈہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس ثقافتی یلغار کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں میں کون لوگ قلم کو تلوار بنا کر میدان میں آئے، یہ سیرت نگار علامہ شبلی نعمانی تھے جنھوں نے الجزیہ فی الاسلام جیسا طویل تحقیقی مضمون لکھا، انھوں نے ثابت کیا کہ جزیہ کفر کا جرمانہ نہیں؛ بلکہ ان کی حفاظت کرنے کا معاوضہ ہے۔ ندوۃ العلماء کے نامور فرزند ادیب اور مصنف رئیس احمد جعفری نے ''اسلام اور رواداری'' کے نام سے دو جلدوں میں کتاب مرتب کی، پھر ان کی دوسری کتاب ''اسلام اور عدل و احسان'' کا موضوع بھی موضوع کے اعتبار سے اس سے قریب تر ہے۔ علامہ شبلی نعمانیؒ کے قائم کردہ ادارہ دار المصنفین میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے ''اسلام میں مذہبی رواداری'' کے نام سے محققانہ کتاب لکھی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے ''غلامانِ اسلام'' لکھی، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے ''الجہاد فی الاسلام'' لکھی۔ مولانا مودودی یورپ کی ثقافتی یلغار کے مقابلہ میں دفاعی نقطۂ نظر اختیار کرنے کے لئے تیار نہ تھے، انھوں نے یورپ کی تاریخ اور تہذیب پر وار کیا اور بہت مؤثر الزامی جواب اہل یورپ کو دیا، ان کے خیال میں اسلام میں جنگ صرف مدافعانہ نہیں ہے، انھوں نے ذہانت وذکاوت سے ''جارحانہ جنگ'' کے لفظ کو مصلحانہ جنگ سے بدل دیا اور جہاد کے موضوع پر اسلامی لٹریچر کو تاریخ میں پہلی بار ایک نئی اصطلاح عطا کردی۔ ان کی کتاب جدید ذہن کو بہت زیادہ متاثر کرنے والی ہے، انھوں نے دنیا کی تمام جنگوں کا اسلامی جنگوں سے موازنہ کر کے ثابت کر دیا کہ دین اسلام دین رحمت ہے، اس کی تلوار بھی اُٹھتی ہے تو رحمت ہی بن کر اُٹھتی ہے۔ مولانا مودودی کی جماعت اسلامی کے ایک رکن متین طارق باغپتی نے بھی اسلام اور رواداری کے نام سے اچھی کتاب تیار کی، جماعت اسلامی کے اخبار دعوت نے رواداری کے موضوع پر خاص نمبر شائع کیا، اور اب ان تمام کتابوں اور تحریروں کا مجموعی اثر یہ ہے کہ یورپ کے پروپیگنڈے کا شور مسلمانوں کے حلقہ میں دب گیا اور اسے اسلام کے خلاف یورپ کی ثقافتی جنگ کا نام دیا جانے لگا

اور اسلام پر مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کا اعتماد بحال ہوا۔

لیکن یہ اعتماد بحال کرنے والے لوگ کون تھے؟ یورپ کے پروپیگنڈہ کا مقابلہ کرنے کے لئے جو لوگ میدان میں آئے وہ مدارس کے بوریہ نشین علماء اور اُردو کے اہل قلم اور دینی تحریک کے لوگ تھے۔ آج اتنے بڑے ملک میں دین کے خدمت گزاروں کی فہرست بنائی جائے تو ان میں بڑی تعداد ایسے ہی بوریہ نشیں فقیروں کی ملے گی، جن کے دم قدم سے مسجدیں آباد اور جن کے دم قلم سے کتاب خانے معمور ہیں۔ اہل قلم علماء نے تاریخ کے ہزاروں صفحات سے عرق ریزی کر کے اسلام کی رواداری پر عظیم الشان مواد جمع کر دیا ہے، اس مواد کو سامنے رکھ کر مسلمانوں کے انگریزی داں طبقہ کو چاہئے تھا کہ امیر علی کی طرح علمی معیار کی کتابیں لکھتے جو لندن اور آکسفورڈ سے شائع ہوتیں اور یورپ اور امریکہ میں پڑھی جاتیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ہندی زبان میں بھی اس موضوع پر اچھے معیار کی کتابیں لکھی جاتیں جنھیں، غیر مسلم ناشرین شائع کرتے اور تعلیم یافتہ غیر مسلموں میں پڑھی جاتیں؛ لیکن افسوس کہ ابھی تک ایسا نہیں ہو سکا۔ اُردو زبان میں یہ خدمت جلیلہ اہل قلم علماء کے حصہ میں آئی، کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے، اہل قلم علمائے دین نے اپنے قلم سے اور خانہ بدوش خادمان دین نے اپنے قدم سے اور اساتذہ علم دین نے قال اللہ اور قال الرسول کے زمزمہ سے اور سالکین طریقت نے کیمیاء اثر زبان اور صحبت سے اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کی جو عظیم الشان خدمت کی ہے اس سے صرف نظر ممکن نہیں۔ اسلام اور رواداری کے موضوع پر انگریزی، ہندی اور دوسری مقامی زبانوں میں کتابوں کی ضرورت ہے، مسلمان علماء نے اپنے حصہ کا کام انجام دیا ہے، کیا مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی اپنے حصہ کا کام انجام دے گا؟

☆ ☆ ☆ ☆

خدابخش لائبریری کی اہم مطبوعات